مطالب الطالب

المعروف به

شرح آداب المریدین

تالیف

سلطان المحققین حضرت مخدوم جہاں

شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری فردوسی قدس سرہٗ العزیز

ترجمہ

سید شاہ قسیم الدین احمد البلخی الفردوسیؒ

ڈاکٹر مولانا محمد علی ارشد شرفی مدظلہ العالی

ترتیب وتقدیم

حضرت سید شاہ محمد سیف الدین فردوسی

سجادہ نشیں حضرت مخدوم جہاں قدس سرہ

مکتبۂ شرف، خانقاہ مخدوم جہاں شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری، بہار شریف، نالندا، بہار

اردو ترجمہ

مطالب الطالب

المعروف بہ

شرحِ آداب المریدین

تصنیف

حضرت خواجہ ضیاء الدین ابو نجیب سہروردی رحمۃ اللہ علیہ

شارح

سلطان المحققین حضرت مخدوم جہاں

شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری قدس اللہ العزیز

مترجمین

حضرت سید شاہ قسیم الدین احمد شرفی البلخی الفردوسیؒ

ڈاکٹر محمد علی ارشد شرفی مدظلہ

ترتیب و تقدیم

حضرت سید شاہ محمد سیف الدین فردوسی

سجادہ نشیں حضرت مخدوم جہاں قدس سرہ

ناشر

مکتبہ شرف، خانقاہ معظم حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری

بہار شریف، نالندا، بہار (انڈیا)

یہ کتاب بہار اردو اکادمی، پٹنہ کے مالی تعاون سے شائع ہورہی ہے

نام کتاب : شرح آداب المریدین

تصنیف : حضرت خواجہ ضیاء الدین ابونجیب سہروردی رحمۃ اللہ علیہ

ملفوظات : حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری

مترجمین : سید شاہ قسیم الدین احمد شرفی البلخی الفردوسی مدظلہ

ڈاکٹر محمد علی ارشد شرفی البلخی الفردوسی مدظلہ

ترتیب وتقدیم نو : جناب سید شاہ محمد سیف الدین فردوسی، زیب سجادہ خانقاہ معظم

ناشر : مکتبۂ شرف، خانقاہ معظم، بہار شریف، نالندہ

اشاعت دوم : ۲۰۱۱ء

صفحات : ۴۸۸

کمپوزنگ : منعمی کمپیوٹر، احمد مارکیٹ، دریاپور، لنگر ٹولی چوراہا، پٹنہ-۴

طباعت : پارس پبلی کیشن پرائیویٹ لمیٹیڈ، حاجی پور، ویشالی

تعداد : ۲۰۰۰

قیمت : ۳۰۰ روپے

SHARAH AADABUL MUREEDEEN

By

Sultanul Muhaqqeqin Hazrat Makhdoome Jahan

Shaikh Sharafuddin Ahmad Yahya Maneri

ملنے کے پتے :

★ مکتبۂ شرف، خانقاہ معظم حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری

بہار شریف، نالندا، بہار (انڈیا)

Mob. 93348133[illegible], 9608720661 email: makhdoomejahan@gmail.com

فہرست

مقدمہ

حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الدین احمد یحیٰ منیریؒ المتوفی (۷۸۲ھ) کثیر التصانیف مصنف ہیں ان کی سب سے اہم کتاب "مطالب الطالب" بہ معروف شرح آداب المریدین جو خواجہ ضیاء الدین ابونجیب سہروردی قدس سرہٗ العزیز (المتوفی) ۵۶۳ھ کی معرکۃ الآرا تصنیف: آداب المریدین کا حسین ترجمہ، تحقیق اور بہترین شرح ہے۔ اس کتاب کی ابتدا ۷۶۵ھ کے ماہ ربیع الاوّل ہوئی تھی اور یہ کتاب ۷۶۶ھ کے ماہ ذی الحجہ کی ۲۱ تاریخ کو کتابت سے آراستہ ہو کر پایۂ تکمیل تک پہنچ گئی۔ اس کی کتابت کرنے کا شرف حضرت نے اپنے مرید قاضی اشرف بن رکن کو بخشا۔ اس کتاب کا غیر مکمل ترجمہ صرف سولہ باب تک ۱۳۸۶ھ میں خانقاہ معظم کے مکتبۂ شرف سے شائع ہوا جو مخدومیات کے ترجمان جناب سید شاہ قسیم الدین شرفی بلخی فردوسی نے کیا تھا۔ پھر اسی غیر مکمل ترجمہ کی تکمیل ان کے ہونہار صاحبزادے جناب سید شاہ مولانا ڈاکٹر علی ارشد صاحب فردوسی مدظلہ نے ۲۰۱۱ء میں کی۔ موصوف مترجم نے اپنی صحت کی بسیار خرابی اور ضعف کے باوجود اس کے ترجمہ میں بڑا مجاہدہ شاقہ فرمایا، اللہ ان کی صحت رفتہ کو واپس فرمائے اور زیادہ سے زیادہ کام ان سے لے۔ آمین ثم آمین۔

اس کتاب کے قارئین سے گذارش ہے کہ اگر اس کتاب میں کمی یا غلطی دکھائی دے تو مطبع کے ناشر سے رابطہ کر کے باخبر کرنے کی زحمت گوارہ فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ اس کا اجر عطا فرمائے گا۔ انشاء اللہ!

الحمد للہ مطالب الطالب بہ معروف، شرح آداب المریدین آپ کے ہاتھوں میں ہے جب آپ بغور مطالعہ کریں گے تو حضرت مخدوم جہاں کے وسیع و عمیق علم سے بھرپور

استفادہ کا موقع ملے گا۔ سب سے اہم اور بڑی بات یہ ہے کہ آداب المریدین کی مخدوم جہاںؒ نے ایسی تشریح فرمائی کہ محسوس ہوتا ہے کہ جو منشاء تھی حضرت مخدوم جہاںؒ کی تحریر آداب المریدین کے مصنف کے پاکیزہ خیال کی بہترین ترجمانی ہیں۔ وہ اگر خود شیخ ابونجیب سہروری کی زندگی میں اس کی شرح ہوتی اور ان کے مطالعہ سے گذرتی تو یقیناً فرط محبت سے اپنے نامور معنوی اولاد کی پیشانی کو ضرور چوم لیتے۔ شرح آداب المریدین علم کا ایک ایسا سمندر ہے جس کی موجوں میں کہیں علوم قرآن کے نکات و لطائف ہیں تو کہیں اسرار و رموز کی بلندیاں اور کہیں حدیث نبوی ﷺ کے علم و معرفت کی ایسی گہرائیاں ہیں جس کا اندازہ لگانا ممکن نہیں ہے۔

شرح آداب المریدین کا جب ہم غائرانہ جائزہ لیتے ہیں کہ تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مخدوم جہاںؒ نے علوم، فنون کے سمندر کو مختصر سی کتاب میں سمو دیا ہے۔ چنانچہ وہ جب توحید کے اسرار بیان کرتے ہیں تو ایک زبردست موّحد، عارف باللہ اور صاحب اسرار معلوم ہوتے ہیں، شریعت، طریقت، حقیقت و معرفت کے تمام معاملات میں فنا فی اللہ اور اسوۂ رسول اکرم ﷺ کے بحر بیکراں میں ڈوب کر عشق و عاشقی کے راز کے محرم دکھائی دیتے ہیں۔ قرآن کے متشابہات اور مشکل سے مشکل آیات کی ایسی تشریح کرتے ہیں کہ بے مثال مفسر نظر آتے ہیں۔ احادیث رسول اکرم ﷺ کی تشریح، تطبیق اور علوم حدیث کے بہت سارے محدثانہ نکات بیان کرتے ہیں تو وہ ایک عظیم محدث اور مایۂ ناز ماہر علوم حدیث محسوس ہوتے ہیں۔ اپنے مضامین کے مواد سے موافق جب وہ عربی اشعار، عربی محاورات اور بزرگ صوفی ادیب کے کلام کو پیش کرتے ہیں یا خود کسی عبارت کی تشریح عربی میں کرتے ہیں تو زبردست عربی کے معلم ہی نہیں بلکہ عربی ادیب نظر آتے ہیں، جب وہ ذات الٰہی کے وجہ، ید، نفس، ضد، ند، مثل، شبہ کی شرح کرتے ہیں تو وہ منطقی، فلسفی سے بڑھ کر متکلم کا وقار پیدا

کرتے ہیں، جب وہ حمد، شکر، مدح کے لغات کے فرق کو علیحدہ علیحدہ تحقیق سے بیان کرتے ہیں تو وہ زبردست لغوی نظر آتے ہیں، اس کے علاوہ فقہی اہم مسائل میں جب وہ اپنا فیصلہ ظاہر کرتے ہیں تو صرف مفتی ہی نہیں بلکہ قاضی القضاۃ اور مجتہد معلوم ہوتے ہیں۔

مختصر یہ کہ وہ علوم شریعت، طریقت، حقیقت اور معرفت کے بحر کے شناور ہیں اس کتاب میں وہ تمام ارباب طریقت کو توحید، معاد، آخرت اور بعثت بعد الموت کا درس دے کر عاشقان الٰہی کی صف میں کھڑے ہونے اور دربار رسالت ﷺ کے وفادار غلام بنے رہنے کی نصیحتیں کرتے نظر آتے ہیں۔

ہم دعاء گو ہیں بھائی احمد بدر شعبۂ اردو، کریم سٹی کالج، جمشید پور کے اور بھائی شہاب احمد منعمی (منعمی کمپیوٹر) کے اور اسی طرح ہم اپنے رفیق ڈاکٹر محمد کفیل احمد کے لئے بھی دعاء گو ہیں کہ ان کی اللہ حفاظت فرمائے کہ انہوں نے بھی اس محنت، خلوص اور محبت کے ساتھ پروف ریڈنگ کی اور دوسری کتاب سے اس کتاب کے عربی متن کا دیدہ ریزی کے ساتھ موازنہ و معادلہ کر کے کتابت کی غلطیوں کی تصحیح کرنے کی حتی الامکان کوشش کی۔

فقیر سید شاہ محمد سیف الدین فردوسی عفی عنہ

سجادہ نشیں حضرت مخدوم جہاں

شیخ شرف الدین احمد یحیٰی منیریؒ

خانقاہ معظم، بہار شریف، نالندا، بہار (انڈیا)

پیش لفظ

از سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب دارالمصنفین اعظم گڈھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت مخدوم الملک شیخ شرف الدین احمد یحیٰ منیری قدس سرہ العزیز کے فیوض و برکات کے سرچشمہ سے گذشتہ سات سو برس سے عوام وخواص دونوں سیراب ہورہے ہیں۔ عوام تو ان کے مزار اقدار کی خاک کو سرمۂ چشم بناتے ہیں لیکن خواص ان کی تصانیف کے ذریعہ ان کی تعلیمات سے مستفیض ہوتے ہیں۔

ان کی تعلیمات کی اہمیت ہر زمانہ میں رہی۔ حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ نے فرمایا کہ سبحان اللہ شیخ شرف الدین نے اپنے مکتوبات کے ذریعہ ہم لوگوں کے کفر صد سالہ کو روز روشن کی طرح آنکھوں کے سامنے کردیا (مناقب الاصفیا ص ۱۴۰)

حضرت جلال الدین بخاریؒ جہانیاں جہاں گشت ان کو اپنا سرتاج کہتے اور جب ان کے مکتوبات کا مطالعہ فرماتے تو خلوت میں بند ہوجاتے اور کسی سے نہ ملتے (مناقب الاصفیا ص ۱۴۰)

حضرت شیخ احمد سرہندی یعنی حضرت مجدد الف ثانیؒ نے ان کی بعض عارفانہ باتوں کو بہت ہی لطف ولذت کے ساتھ اپنے مکتوبات میں بیان کیا ہے (مثال کے لئے دیکھئے مکتوبات امام ربانی جلد سوم، مکتوب نمبر ۳۳)

ابوالفضل آئین اکبری میں رقم طراز ہے۔ ''وفراواں تصنیف از و یادگار ازاں میاں مکتوبات اور سرشکنی نفس ازموں دارد (ج ۳ ص ۱۷۲)

مولانا عبدالحق محدث دہلویؒ فرماتے ہیں:

اور التصانیف عالی است از جملہ تصنیف او مکتوبات مشہور و لطیف ترین تصانیف او است۔ بسیارے از آداب طریقت واسرار حقیقت آنجا اندراج یافتہ (اخبار الاخیار ص ۱۰۹)

حضرت مخدوم الملکؒ کی تمام تصانیف کا مطالعہ کیا جائے تو وہ مستقل اسلام کی ایک انسائیکلو پیڈیا نظر آئے گی۔ اس میں اسلام کی ہر قسم کی صوری اور معنوی تعلیمات موجود ہیں۔ ان کے خاندان والے تو اُن کی تصانیف کی تعداد سترہ سو بتاتے ہیں لیکن مکتوبات میں مکتوب صدی مکتوبات دو صدی، مکتوبات بست و ہشت اور ملفوظات میں معدن المعانی، مخ المعانی، راحت القلوب، خوان پر نعمت، کنز المعانی، مغز المعانی، گنج لایخفی، مونس المریدین، تحفہ غیبی، ملفوظ الصفر، مرات المحققین، اور پھر تصانیف میں فوائد رکنی، شرح آداب المریدین، عقائد شرفی، ارشاد السالکین، ارشاد الطالبین، اجوبہ، اور ادخرد، اور اداوسط، فوائد المریدین، اجوبہ زاہدہ، رسالہ اشارات، رسالہ مکیہ اور اوراد کلاں کا پتہ چلا ہے بقیہ اور تصانیف کا ذکر کہیں نہیں آتا۔ یہ فہرست اس لئے بھی دی گئی ہے کہ بڑے رنج کے ساتھ یہ بھی بتایا جائے کہ ان میں سے کچھ تو چھپ گئی ہیں اور کچھ ابھی تک قلمی نسخوں کی شکل میں مختلف کتب خانوں میں ہیں اور یہ ہماری دینی حمیت اور علمی غیرت کا بڑا ہی المناک پہلو ہے کہ ہم ان بیش بہا تصانیف سے ہر قسم کے فوائد کیا حاصل کرتے کہ گذشتہ سات سو سال سے ہم نے اپنی غفلت سے ان قیمتی دینی اور علمی ورثہ کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔

اب ہم اپنی غفلت اور کوتاہی کی تلافی اسی طرح کر سکتے ہیں کہ حضرت مخدوم الملک کی جو تصانیف اب تک شائع ہو کر منظر عام پر نہ آسکی ہیں۔ ان کو شائع کریں۔ ورنہ کہیں وہ بھی محو طاق نسیاں نہ ہو کر رہ جائیں۔ اور اب جبکہ ہماری بول چال اور لکھنے پڑھنے کی زبان بدل گئی ہے تو یہ بھی ضروری ہو گیا ہے کہ حضرت مخدوم الملک کی تصنیفات کے اردو ترجموں کی طباعت و اشاعت کا بھی پورا اہتمام ہو۔ کیونکہ ہماری موجودہ نسل فارسی زبان سے بالکل نابلد ہوتی جا رہی ہے۔

اگر اتنا سرمایہ اکٹھا ہو جائے کہ فارسی متن کے ساتھ اردو ترجمے بھی شائع کئے جائیں تو بہت بڑی دینی اور علمی خدمت ہوگی۔ لیکن اگر اتنا سرمایہ ممکن نہ ہو سکے، تو پھر ان کے مستند اردو ترجمے ہی شائع کرنے پر اکتفا کی جائے۔ ابھی تک ایسے اہل علم موجود ہیں جو نہ صرف فارسی میں صلاحیت و قابلیت رکھتے ہیں بلکہ وہ حضرت مخدوم الملک کی تعلیمات سے اچھی طرح واقف

ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی تحریروں کے اداشناس بھی ہیں۔ ایسے اہل علم کی استعداد سے پورا فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے۔ آگے چل کر حضرت مخدوم الملک کی تحریروں کے سمجھنے والے نہ رہے تو پھر ایک بہت ہی قیمتی وراثت سے ہماری آئندہ نسلیں بالکل محروم ہو جائیں گی۔

بزرگان چشت کی اکثر تصانیف نہ صرف چھپ کر شائع ہو چکی ہیں بلکہ ان کے اردو ترجمے بھی لوگوں کے ہاتھ پہنچ چکے ہیں۔ اسی طرح اور سلسلہ کے بزرگوں کی کتابیں اور ان کے ترجمے چھپ رہے ہیں ان کو دیکھ کر جہاں خوشی ہوتی ہے وہاں دل پر یہ چوٹ بھی لگتی ہے کہ ہمارے حضرت مخدوم الملک کی تصانیف اپنی نوعیت اور افادیت کے لحاظ سے ہر زمانہ میں قابل قدر سمجھی گئیں لیکن ابھی تک ان کی اور ان کے اردو ترجموں کی طباعت واشاعت کا خاطر خواہ انتظام نہیں ہو سکا ہے۔ یا تو یہ سمجھ رکھیں کہ حضرت مخدوم الملک کے عقیدت مندوں کے حلقہ میں ایسا جمود طاری ہو گیا ہے کہ اس کو حرکت میں لانا آسان نہیں، لیکن اس حلقہ کے جو اہل علم ہیں ان میں بفضلہ تعالیٰ ابھی یہ ذوق بلکہ لگن باقی ہے کہ حضرت مخدوم الملک کی کتابیں اور ان کے ترجمے لوگوں کے ہاتھوں تک پہنچ جائیں۔ البتہ ان کے پاس اتنا سرمایہ نہیں کہ وہ اپنے حوصلوں کے مطابق اپنی علمی کاوشوں کو جاری رکھیں۔ اگر صوبہ بہار کے چند کار خیر کرنے والے اصحاب ثروت اس طرف توجہ کریں تو پھر صدیوں کی کوتاہی کا دور ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں۔

اس کتاب کے مترجم جناب شاہ قسیم الدین صاحب ہیں۔ انہوں نے اپنی تمام مجبوریوں اور دشواریوں کے باوجود شرح آداب المریدین چھپوا کر لوگوں تک پہنچا دیا جو اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ صاحب ثروت عقیدت مندوں کی سرپرستی سے بے نیاز ہو کر حضرت مخدوم الملک کی تعلیمات کو لوگوں تک پہنچانے کے لئے بے چین و مضطرب ہیں اس سے پہلے وہ حضرت مخدوم الملک کی فوائد المریدین، مونس المریدین، اور ادشرفی، ارشاد السالکین، ارشاد الطالبین کے بھی ترجمے کر چکے ہیں۔ ان ترجموں سے عوام وخواص جو فوائد حاصل کر رہے ہیں ان سے کسی کو انکار نہیں۔

جناب شاہ قسیم الدین صاحب حضرت مخدوم الملک کی تحریروں کے بڑے اداشناس ہیں

ضرورت ہے کہ ان کی ہر قسم کی ہمت افزائی کر کے ان کو اس طرح کی علمی کاوشوں میں مشغول اور سرگرم رکھا جائے۔ اگر وہ اپنی مشکلوں سے گھبرا کر حضرت مخدوم کی مزید کتابوں کے اردو ترجے اور ان کو چھپوا کر شائع نہ کر سکے تو نہ صرف یہ ایک المناک علمی سانحہ ہوگا بلکہ ہماری موجودہ اور آئندہ نسلوں کے لئے بڑی دینی اور علمی محرومی بھی ہوگی۔

شرح آداب المریدین کی اہمیت اس کے پیش لفظ سے ظاہر ہوگی جس کے بعد کچھ اور لکھنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ ناظرین کو اس کے مطالعہ کے بعد اندازہ ہوگا کہ اس میں کیا کچھ نہیں ہے۔ خشیت الٰہی بھی ہے اور حب رسول بھی، سندان عشق بھی اور جام شریعت بھی، جلال کبریائی بھی اور جمال مصطفائی بھی، سوز و مستی بھی اور جذب و شوق بھی، دعوت فکر بھی اور عزیمت ذکر بھی، حقوق نفس بھی اور حظوظ نفس بھی، غضب الٰہی کا خوف بھی اور رحمت الٰہی کی بشارت بھی۔ پھر انداز تحریر کہیں تو مفسرانہ ہے، کہیں محدثانہ، کہیں متکلمانہ اور کہیں فقیہانہ ہے اور سب رنگوں میں ہم رنگ ہونے کے باوجود اس میں جو عارفانہ ترنگ ہے وہ اس کتاب کا خاص رنگ ہے جو کہیں اور نہیں پایا جاتا۔ اس لئے امید ہے کہ یہ کتاب ارباب ذوق کے حلقہ میں دلچسپی اور غور سے پڑھی جائے گی۔

شاہ قسیم الدین صاحب نے اس کتاب کا اردو ترجمہ جس محنت و لیاقت سے کیا ہے اس کے لئے وہ شکریہ اور مبارک باد کے مستحق ہیں، امید ہے کہ وہ حضرت مخدوم الملک کی مزید کتابوں کے اردو ترجے کر کے نہ صرف دنیاوی برکتوں کی سعادت حاصل کرتے رہیں گے بلکہ ان کے ذریعہ مسلمانوں میں مذہبی حمیت اور ایمانی حرارت پیدا کر کے احیائے دین اور تجدید یقین کی تبلیغ و اشاعت میں معاون ہونے کی کوششوں کو جاری رکھیں گے۔

سید صباح الدین عبدالرحمٰن
شریک ناظم دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی
اعظم گڑھ
۴؍اگست ۱۹۶۶ء

مقدمہ

از مترجم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ ھُوَ الْحَامِدُ وَالْمَحْمُوْدُ. وَالصَّلٰوۃُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مُحَمَّدٍ ھُوَ الْمَقْصُوْدُ وَالْمَوْدُوْدُ ؕ

کتاب ''مطالب الطالب'' آداب المریدین کی شرح ہے، آداب المریدین بزبان عربی خواجہ ضیاء الدین ابونجیب سہروردی قدس سرہٗ کی تصنیف ہے۔ مشہور ہے کہ خواجہ نے جب آداب المریدین لکھی تو ان سے اس کتاب کی شرح لکھنے کی درخواست کی گئی ''ارشاد ہوا۔ یہ خدمت میرے فرزندوں میں سے ایک انجام دے گا''۔ سبحان اللہ اولیاء اللہ کی نگاہیں مستقبل بعید کو ایسے دیکھتی ہیں جیسے ابھی کوئی بات ہونے والی ہو۔ اور فرزندانِ معنوی کو بھی اپنے فرزندوں میں شامل کرتے ہیں۔ خواجہ کا وصال ۶۳ھ میں ہوا اور اس کی شرح ۷۶۶ھ میں مخدومنا مخدوم جہاں شیخ شرف الملۃ والدین احمد یحییٰ منیری قدس سرہٗ نے مکمل کی جو خواجہ کے چھٹے زینے میں لباس فرزندیت سے مزین ہیں۔

کتاب مطالب الطالب کے جامع قاضی اشرف ابن رکن ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

''میں نے آداب المریدین کا ایک نسخہ دیکھا جو میرے برادر طریقت مولانا زاہد کا پڑھا ہوا تھا۔ انہوں نے پیر و مرشد شیخ طریقت مخدوم جہاں سے پڑھ کر عبارت کی تصحیح کردی تھی اور حاشیہ پر شیخ کے بتائے ہوئے مفید معلوماتی نوٹوں کا اضافہ کر دیا تھا۔ مجھے یہ نسخہ بہت پسند آیا۔ دل چاہا کہ اسے نقل کرلوں پھر خیال ہوا شیخ کی اجازت کے بغیر کوئی کام کرنا جائز نہیں۔ اسی بنا پر بذات خود شیخ کی خدمت میں حاضر ہوکر گذارش کی یہ کہ آداب المریدین کی شرح مکمل کر کے عنایت فرمائی جائے۔ عنایات دیرینہ کے مطابق عرضداشت کو شرف قبولیت حاصل ہوئی۔ اور پوری کتاب املا کرائی گئی (۷۶۵ھ سے اس کام کی ابتداء ہوئی اور ۷۶۶ھ میں کتاب مکمل ہوگئی''۔

شرح آداب المریدین کبھی بھی مکمل طبع ہو کر شائع نہ ہوئی جہاں کہیں بھی ہے قلمی ہے۔ میرے سامنے بھی مکمل قلمی نسخہ ہے۔ تاریخ اتمام کتابت ۱۲۷۹ھ مرقوم ہے۔ ۱۳۲۲ھ میں پٹنہ کے مطبع اپنچ نے اس کتاب کی طباعت کا اہتمام کیا تھا لیکن افسوس کہ محض ایک جلد میں کتاب کی چند فصلیں شائع ہوئیں۔ پھر یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ یہ مطبوعہ حصہ بھی میرے پیش نظر ہے۔ اس پر مولانا غلام یحیٰ بہاری کا حاشیہ بھی ہے۔ موصوف نے حاشیہ کا مواد یکجا کرنے میں بڑی محنت اور کاوش سے کام لیا ہے۔ افسوس کہ اہل زمانہ کی ناقدری کا یہ بھی شکار ہے۔

طبقہ صوفیا اسلام کی معنوی قدروں کا حامل ہوتا ہے۔ اسی مطابقت سے اس کی کچھ اپنی روش ہے، کچھ مصطلحات ہیں، کچھ محاورات ہیں، اور آداب ہیں، ان سب میں سنت نبوی ﷺ کو وہ مقصود بنا کر اول درجہ دیتے ہیں۔ ایک اجنبی جب تک اس کی تفصیل جان نہ لے اس طبقہ کے متعلق رائے قائم کرنے میں غلطی کرے گا۔ اسی طرح جو اس طبقہ کی غلامی میں شامل ہونا چاہتا ہے اسے بھی معلوم کرنا اور سمجھنا ہوگا کہ اب اسے کس پابندی میں زندگی گذارنا ہے۔

انہیں ضرورتوں کی بنا پر خواجہ ضیاء الدین ابو نجیب قدس سرہ نے کتاب آداب المریدین لکھی۔ کتاب میں سب سے پہلے معتقدات صوفیا بیان کئے۔ اس کے بعد فصل فصل کر کے تمام مسائل تصوف آ گئے ہیں۔

صوفی بننا تو بڑی بات ہے۔ صحیح اسلامی زندگی کیا ہے؟ اسے سمجھنے کے لئے میرا عقیدہ ہے کہ انہیں کتابوں کی ضرورت ہے۔

آداب المریدین یعنی متن کتاب سلیس اور سادہ عبارت ہونے کے باوجود غرائب الفاظ، لطائف اشارات، اور فنی مصطلحات کی بنا پر ایسی ہے کہ استاد کامل کے سامنے بغیر زانوئے ادب تہہ کئے سمجھی نہیں جا سکتی۔ شرح میں مخدوم جہاںؒ نے استاد مشفق کا پورا فیضان جاری کیا ہے۔ اس طرح کہ متن کی عبارت کا **قولہ** لکھ کر ایک حصہ نقل کیا اس کے بعد کبھی تو پوری عبارت کا لفظی ترجمہ لکھا ہے اور اس کے مالہا اور ماعلیہا کو سمجھا کر اگر ضرورت سمجھی ہے تو الفاظ غریب کی تحقیق کی ہے۔ اور کبھی نقل کی ہوئی عبارت کے ایک ایک حصہ کو اسی طرح سمجھایا ہے۔

صوفیا کے مشارب میں کبھی عنوان و بیان کا فرق بھی ہوتا ہے۔ آداب المریدین کے مصنف ایک جانب مخدوم جہاں (شارح کتاب) کے شیخ المشائخ ہیں۔ دوسری جانب خود مخدوم جہاں شرف الملۃ والدین محقق اور امام وقت ہیں۔ اسی بنا پر شرح کے مطالعہ میں خاص لطف آجاتا ہے۔ اس موقع پر جہاں کہیں ہر دو مشائخ کے عنوان میں فرق ہوتا ہے، ایک جانب مخدوم کے طریقہ استدلال کا حسن ہوتا ہے، دوسری جانب یہ کمال کہ ادب شیخ میں ذرا فرق نہ آنے پائے۔ ایسے موقع پر جہاں اگر شیخ کی روش کے علاوہ کوئی محاکمہ کا عنوان اختیار کرتے ہیں۔ تو دوسری جانب شیخ کے عنوان کی قبول فہم تاویل فرمادیتے ہیں۔

مثلاً معتقدات صوفیا کے سلسلہ میں ماتنؒ نے ذات واجب سے جسمیت اور جوہریت کی نفی کا عنوان اختیار کیا۔ تو شرح میں مخدوم جہان خواجہ عین القضاۃ رحمتہ اللہ علیہ کا قول نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا ''مرا ازیں شرم می آید کہ متکلمان تنزیہہ و تقدیس خداوند تعالیٰ بریں میکنند کہ خداوند تعالیٰ جسم نیست جوہر نیست و عرض نیست و میدانند کہ ایں کارے بزرگ است۔ این بداں ماند کہ کسے گوید سلطان ایں شہر سنگ نیست و کلوخ نیست چہ گوئی این او را مدح بود۔ بعزت خداوند جل علا کہ او ہژدہ ہزار علام آفریدہ است کمترین ہمہ عالمہا عالم اجسام است''۔

عین القضاۃ رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مجھے اس سے شرم آتی ہے کہ متکلمین خداوند تعالیٰ کی تنزیہہ و تقدیس اس طرح کرتے ہیں کہ خداوند جسم نہیں ہے، جوہر نہیں ہے، عرض نہیں ہے، اور اپنے خیال میں یہ سمجھتے ہیں کہ یہ بہت بڑا کام ہے، یہ ایسا ہی ہے کہ جیسے کوئی کہے کہ اس شہر کا بادشاہ اینٹ نہیں ہے پتھر نہیں ہے، کیا یہ اس کی مدح ہوگی؟ قسم ہے اس خداوند جل علا کی اس نے اٹھارہ ہزار عالم پیدا کئے ہیں۔ اور سارے عالموں سے کمترین عالم عالم اجسام ہے۔ (ص ۲۵)

اس قول کے نقل سے ذہن اس بات کی جانب مائل ہوسکتا ہے کہ ماتنؒ نے جو عنوان اختیار کیا ہے۔ اس کے مقابل میں اس عنوان کا درج کرنا کہیں اس بنا پر تو نہیں کہ شارح کو ماتنؒ کے عنوان ہی پر اعتراض ہے؟ لیکن سرسری فیصلہ نہ کیا جائے تو قول کی جتنی عبارت کتاب میں درج کی گئی ہے اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ یہ عنوان تو آداب صوفیا کے مطابق نہیں لیکن ماتن نے

دراصل متکلمین کے فکری انداز میں سوچنے والوں کی اصلاح کی ہے تاکہ کوئی شخص متکلمین کے انداز فکر پر غلطی میں نہ مبتلا ہو جائے۔

سبحان اللہ کیا کمال ہے محض قول کے نقل ہی میں بیک وقت دو باتیں کی جا رہی ہیں۔ ایک جانب تو یہ بتایا جا رہا ہے کہ بیان توحید کا یہ انداز ماتن اپنے تنزیہہ وادب کے مقام سے نہیں کر رہے ہیں۔ بلکہ ان کا اپنا مقام ادب تو بہت اونچا ہے۔ البتہ یہ عنوان مخاطب کی سطح کو ملحوظ رکھتے ہوئے کیا جا رہا ہے۔ اور یہ دونوں باتیں قول کی نقل اور اس کی عبارت کی مقدار سے حاصل کر لی گئی ہیں۔

پھر آخر میں اعتذار پیش کرتے ہوئے مفہوم کو ظاہر و مبین کر دیا گیا۔ اعتذار یہ ہے۔

''اکنوں چوں مبتلا گشته ام بصحبت ناجنساں از زبان ایشان حدیث باید کرد الخ''۔ اب جبکہ ہم لوگ ناجنسوں کی صحبت میں مبتلا ہو گئے ہیں تو ایسے لوگوں کی زبان میں ہی گفتگو کرنی چاہئے۔ تا آخر (ص ۲)

اب چاہیں تو آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ مخدوم جہاں کا عنوان بیان توحید کی تنزیہہ وادب میں یہ نہیں ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہنا ہوگا کہ خواجہ ضیاء الدین ابونجیب قدس سرہ کا یہ عنوان بھی اپنے مقام سے نہیں ہے بلکہ نزول فرما کر مخاطب کی فکری سطح کا خیال رکھتے ہوئے ہے۔ اور اس سطح میں شارح قدس سرہٗ خود فرماتے ہیں۔ اگر مجھے بھی بولنا ہو تو ایسا ہی بولنا پڑے گا۔

اسی طرح لباس صوفیا میں ماتن کتاب نے لکھا ''وَالمُرَقَّعات افضل'' (پیوند والے لباس یعنی گدڑی افضل ہے) تو مخدوم جہاں نے پہلے اس کی تمام توجہات اور استدلال کو کھول کر بتایا۔ پھر آخر میں محقق زمانہ ہونے کی حیثیت سے اپنا قول فیصل پیش کیا۔ ''پس اگر این لباس از برائے آنست کہ تا خداوند تعالیٰ ترا بشناسد کہ تو خاص اُوئی، وے ترا بے لباس می شناسد و اگر از بہر آنست کہ بخلق بنمائی کہ من از ان اویم، اگر ہستی ریا بود و اگر نیستی نفاق بود''۔ اگر یہ لباس اس لئے ہے کہ خدا تم کو پہچان لے کہ تم خاص اسی کے ہو تو خدا تم کو لباس کے بغیر بھی پہچانتا ہے اور اگر اس لئے ہے کہ مخلوق خدا میں تم خود کو دکھاؤ کہ تم اسی اللہ کے ہو، یہ بھی دو حال سے خالی نہیں یا تو مطلق

واقعہ ہوگا ایسی صورت میں ریا ہوگا یا خلاف واقعہ ہوگا ایسی صورت میں یہ عمل نفاق ہوگا۔

یہ دو مثالیں وہ ہیں جو ترجمہ میں آگئی ہیں، اس کے علاوہ بھی مقامات ہیں۔

خلاصہ یہ کہ شرح آداب المریدین حضرت مخدوم جہاں کی بڑی معرکہ آرا تالیف ہے۔ اور مخدوم نے بڑے ہی احتیاط واہتمام سے اس میں کام لیا ہے۔ اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ یہ کتاب خدمت مخدوم میں باضابطہ اسباق میں شامل تھی اور ابتدا اس کے شرح کی انہیں اسباق سے ہوئی ہے جس میں مخدوم خود درس دیا کرتے تھے۔ مخدوم جہاں کے بعد بھی کتاب کی اہمیت ہی تو ہے جس کی بنا پر تمام مشائخ اور خلفا زینہ بزینہ اپنے اپنے دور میں اپنے خلفاء اور مترشدین کو اس کتاب کا باضابطہ درس دیتے رہے ہیں اور مطالعہ فرماتے رہے ہیں۔ سب سے اول اور جلیل القدر خلیفہ اور جانشیں حضرت مخدوم مولانا مظفر شمس بلخی قدس سرہٗ ہیں، ان کو اس کتاب سے اتنا شغل تھا کہ مطالعہ چھوٹ جانے پر ایسا معلوم ہوتا ہے اپنی عدم مشغولیت کی شکایت مخدوم جہاں کی خدمت میں لکھ بھیجی ہے۔ اسی پر مخدوم جہاں اپنے اندازہ سے ان کی تسلی کرتے ہیں۔ چنانچہ مکتوبات بست وہشت کے سولہویں مکتوب میں ہے ''وانکہ نوشتہ بود این زماں مطالعہ شرح آداب المریدین طاقت ندارم الخ۔ اور معدن المعانی جلد دوم باب (۳۵) میں مرقوم ہے ''شمس الدین خوارزمی مسافر از خوارزم رسیدہ بود، بزمین بوس مشرف گشتہ آداب المریدین خواندن آغاز کرد، سبقش در فصل شطحات رسید الخ۔ اسی طرح بہت ہے۔

اور مخدوم جہاں کے بعد بھی خانقاہ معظم کے جملہ مشائخ کے ہر دور میں یہ کتاب درس میں رہی چنانچہ مخدوم احمد لنگر دریا بلخی قدس سرہٗ کے ملفوظ مونس القلوب کی مجلس اول میں مرقوم ہے ''سید بھیکن پیارا شرح آداب المریدین میگذشت سبق تابدیں جار سید'' پھر مجلس (۴۵) میں ہے ''قاصمہ صوفی آداب المریدین میگذشت، سبق درین محل رسیدہ بود الخ'' اسی سے اس کتاب کی عظمت کا پتہ چلتا ہے۔

اور یہ کہ شرح آداب المریدین کی تصنیف میں مخدوم جہاں کو کیا اہتمام تھا اس پر خاتمہ کی وہ تحریر بہت اہم ہے جس میں مخدوم جہاں خود کو مصنف کتاب کی حیثیت سے اعتذار کرتے

ہوئے پیش کرتے ہیں۔ مخدومنا کی کسی اور تصنیف میں یہ چیز نہیں ملتی۔

''خاتمہ میں ہے''

مخدوم جہاںؒ لکھتے ہیں:

متعلم درویش احمد یحیٰ منیری الملقب بشرف، اللہ اسے معاف کرے اس کے والدین کو اس کے اور ساتھیوں کو اور تمام مومنین اور مومنات کو، عرض حال کرتا ہے کہ اس فقیر کے دوستوں (مریدوں) میں سے ایک دوست جن کا نام قاضی اشرف ہے، اللہ تعالیٰ اس علم کے رکھنے والوں میں مشرف فرمائے وہ اس طائفہ صوفیا سے محبت رکھنے والے ہیں۔ اور صوفیا کے فنون پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ مجھ فقیر سے التماس کی کہ ''کتابیں علم سلوک میں ایسی جس کی محتاجی ہے اور دین کا طالب اس سے راہ راست پاتا ہے اور مطلوب تک پہنچتا ہے۔ اس قدر ہیں کہ ان سب کو پڑھا بھی نہیں جاسکتا ہے اور نہ لکھا جاسکتا ہے۔ ان میں کی ہر ایک اپنے اپنے مریدوں اور معتقدوں کے لئے مشائخ نے (چونکہ وہ تمام لوگوں میں مخلوق پر زیادہ شفیق ہوتے ہیں) مریدوں کی فہم کے مطابق لکھی ہیں۔ لیکن بعضے ان میں سے بہت اوق واقع ہوئی ہیں۔ اگر چہ یہ حضرات اپنے مقام سے نزول فرما کر لکھتے ہیں، تحریر میں لائے ہیں۔ پھر بھی مبتدیوں کے لئے اس کے معنی اور الفاظ انتہائی مغلق اور نا قابل فہم ہیں۔ اس سے فائدہ حاصل کرنے کے لئے علم لغت اور صرف ونحو کی ضرورت پڑتی ہے اور ان علوم کو جب تک آدمی حاصل کرے عمر کا کافی حصہ گذر جاتا ہے۔ پھر تحصیل علم کے بعد عمل کا معاملہ باقی رہ جاتا ہے۔

ان کتابوں میں خاص کر آداب المریدین جو کہ تصنیف شیخ المشائخ قطب الطریقین، امام الثقلین خواجہ ضیاء الدین ابو نجیب عبدالقادر محمد سہروردی کی ہے ''اللہ انہیں اپنے غفران سے نوازے اور جنت کی نسیم سے سکون عطا کرے'' اس کتاب میں خدمت شیخ نے آیات قرآنی، احادیث نبوی ﷺ سے دلائل لائے ہیں۔ اور محکم کلمات کی آمیزش کی ہے اور وہ مشائخ سلف رضوان اللہ علیہم میں سے ہیں۔

قاضی اشرف نے کہا میری یہ آرزو ہے کہ میں اسے اس طرح سبقاً پڑھوں کہ دوران

تعلیم اس کا ترجمہ بھی ہوتا جائے۔ اور اس شرح وبسط کے ساتھ ہو کہ یہی مجموعہ بمنزلہ شرح ہو جائے اس طرح مجھ کو فہم کے لئے اور دوسرے مسلمانوں کے لئے بھی اس کتاب کا سمجھنا آسان ہو جائے گا اور تمام خاص و عام کے لئے حصہ دار بننے کا سبب بنے گا۔ اور اسی سے لوگ حظ حاصل کریں گے۔

اللہ کے طالبان اور بے انتہا راہ رؤں کے لئے جو کہ نبی ﷺ کے پیرو اور مصطفیٰ علیہ السلام سے محبت کرنے والے ہیں، ان کے لئے ایک لائحہ عمل ہو جائے گا''۔

اسی بنا پر اور انہیں کے سبب سے اور انہیں حالات کی وجہ سے میں نے اپنے اوپر ترجمہ اور شرح کی خدمت لازم کر لی اس طرح کہ فہم میں آسکے۔ عزیز مذکور کو لکھنے کی اجازت دی تا کہ خود قاضی اشرف کے لئے اور دوسرے مسلمانوں کے لئے اس کے مطالعہ میں دینی منفعت حاصل ہو۔ ہوسکتا ہے کہ کسی کی نظر اس لکھے ہوئے پر پڑے اور اس سے کشائش حاصل ہو۔ اور ہوسکتا ہے کہ کسی کا وقت اس کے مطالعہ سے خوش ہو اور حق سبحانہ تعالیٰ اس درویش کو اجر میں شامل کر لے۔ جیسا کہ منقول ہے۔ یحییٰ عمار رحمۃ اللہ علیہ جو ہدایت کے امام اور عبداللہ انصاریؒ کے استاد تھے انہوں نے جب اس جہاں سے انتقال کیا لوگوں نے ان کو خواب میں دیکھا۔ پوچھا اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ انہوں نے فرمایا کہ اللہ نے کہا اے یحییٰ تیرے ساتھ میں بڑا سخت معاملہ کرتا لیکن ایک روز ایک جگہ تو نے میری تعریف بیان کی میرے دوستوں میں سے ایک دوست کا وہاں پر گذر ہوا، اس نے سنا، اس کا وقت خوش ہوا۔ تیرا معاملہ اس دوست کی خوشی کی وجہ سے میں نے درگذر میں ڈالا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ خواجہ عالم سردار بنی آدم حضرت رسالت پناہ محمد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عِندَ ذِکرِ الصالحین الخ (صالحین کے تذکرہ کے وقت رحمت نازل ہوتی ہے) اور یہ بھی تو دیکھتے ہیں کہ ایک شخص دستر خوان بچھاتا ہے اسی دستر خوان سے کسی ایک ٹکرہ رحمت کی بھی امید ہوتی ہے اور اسی ایک ٹکرہ کی امید رحمت کی بنا پر آدمی بہشت سے ناامید نہیں ہوتا اور یہ فکر نہیں ہوتی کہ اس میں بے ادبی بھی ہوئی ہوگی اور خیانت کا احتمال بھی ہے۔

ہاں ان تمام باتوں کے باوجود کسی طرح بھی میں خود کو اس لائق نہیں سمجھتا کہ کلمات رمزیہ اور مشائخ کے اشارات کو اپنی رکیک باتوں سے آلودہ کروں، اور اپنی سقیم عبارتوں میں لاؤں۔ بااین ہمہ اہل علم، اہل معرفت، دانشوران نحو وصرف، اور لغت سے مجھے یہ امید ہے کہ جب ان اوراق پر ان لوگوں کی نظر پڑے گی اور کسی جگہ پر کوئی غلطی دیکھیں گے تو مجھے مطلع کریں گے۔ مجھ درویش کو یا نسخہ کے تحریر کرنے والے کو۔ اس میں ان کی نوازش ہوگی، اور ان کا احسان۔ اس اصول پر کہ انسان نسیان سے مرکب ہے اور وہ حضرات اس طرح نسخہ کے تصحیح کی کوشش کریں گے تاکہ اس وعدہ کے تحت آجائیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے کسی مسلمان کے ساتھ ستر سے کام لیا اللہ اس کے ساتھ بھی دنیا وآخرت دونوں میں ستر سے کام لے گا۔

آخر میں ناظرین کتاب سے گذارش ہے کہ میں نے شرح آداب المریدین میں ایک عبارت پڑھی۔ قرآن حکیم اور احادیث نبوی ﷺ کے بعد کلمات مشائخ کو سب میں یہ اہمیت حاصل ہے کہ اس کا مطالعہ کیا جائے۔ جذبہ غلامی کے تقاضہ نے قلب میں ایک تہیج پیدا کیا۔ خیال آیا کہ ابتدا سے کتاب پھر مطالعہ کروں۔ مطالعہ میں یقیناً یہ بھی آقا کا فیضان ہی تھا کہ ایک دوسری تحریک پیدا ہوئی کہ جو پڑھوں اس کا اپنی زبان میں ترجمہ لکھتا جاؤں۔ اس طرح لکھتا گیا، جس کا ایک حصہ اب سامنے ہے۔ اور یہیں تک یہ کتاب طبع ہو کر شائع بھی ہوئی تھی۔

میری کیا ہمت کہ میں اسے ترجمہ کہہ دوں اپنے اوپر مجھے اتنی خوش گمانی بھی نہیں کہ یہ عبارتیں مفہوم کتاب کی پوری آئینہ دار ہوں گی۔ میں نے تو اپنی مشغولیت کے کچھ اوقات کی تصویر اپنے ہم جنسوں کی خدمت میں پیش کیا ہے کہ وقت مناسب ہو تو وہ بھی میرے اس تکیف میں شامل ہو جائیں۔

ہاں کسی کا دل چاہے تو وہ ترجمہ کہہ لے کیونکہ میں نے تو اپنے طور پر اپنی فہم کے مطابق اپنی زبان میں ترجمہ ہی کیا ہے۔ اہل فن کی خدمت میں جو تصوف اور زبان وادب سے دلچسپی رکھتے ہیں یہ التماس ضرور ہے کہ سوچنا کیا ہے؟ زبان وادب یا فن کے لحاظ سے غلطیوں کی نشاندہی ضرور ہو سکے گی۔ لیکن اسے وہ میرا اضطرار سمجھ کر ستر پوشی سے کام لیں گے اور اعتذار قبول فرمائیں

گے۔

الحمد للہ جو کچھ بھی ہوا مجھے اس کی اس نوعیت پر مسرت ہے کہ یہ اشارہ کی تکمیل تھی جو میرے آقا سیدی ومرشدی جناب حضور سید شاہ محمد سجاد صاحب، متع اللہ المسلمین بطول بقایہ موجود سجادۂ مخدوم جہاں کا منشا تھا اور واقعہ یہ ہے کہ اگر اشارہ نہ ہوتا تو مجھ جیسے بے عمل اور بے بضاعت سے اتنا بھر بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ اس کام میں یہ خادم، ارباب حلقہ، تصنیف، بیت الشرف، خانقاہ معظم، کا بیحد شکر گذار ہے کہ اپنی نگرانی، اپنا تعاون، اور اپنے ارشادات کے ذریعہ مجھ سے یہ کام لے لیا۔

صورت حال یہ نہیں ہے کہ کسی خادم نے آقا کی خدمت گذاری کی، بلکہ شکر گذاری خادم کو ہے کہ خدمت کی نعمت غیر مترقبہ اسے عطا کی گئی، اور خدمت لے لی گئی۔ ونشکرو نحمدہٗ اللہ تعالیٰ علیٰ نعماء توفیقہ و نصلی علیٰ رسولہٖ و أھل بیتہٖ و أصحابہٖ و أحبابہٖ و اولیائہٖ اجمعین۔

جاروب کش آستانہ
مخدوم حسین نوشہ توحید بلخی قدس سرہٗ
فقیر قسیم الدین احمد غفرلہٗ
۱۱؍ربیع الثانی ۱۳۸۶ ہجری
بیت الشرف، خانقاہ معظم، بہار شریف (پٹنہ)

عقیدت کی کلیاں ارادت کے پھول

یعنی

مختصر احوال حضرت مخدومنا شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری قدس سرہٗ

حضرت سلطان المحققین مخدوم جہاں شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری قدس سرہٗ ۲۶ر شعبان المعظم ۶۶۱ھ میں بمقام منیر شریف آپ کی پیدائش ہوئی۔ تاریخ ولادت ''شرف آگین'' ہے۔ آپ کے جد اعلیٰ حضرت امام تاج فقیہ قدس سرہٗ ہیں جن بزرگ نے بہ ارشاد حضور نبی کریم ﷺ قدس خلیل سے ہندوستان تشریف لاکر منیر کو فتح کیا تھا۔ حضرت مخدوم نے بمقام سنار گاؤں من مضافات ڈھاکہ تمام علوم وفنون میں واقف اسرار شریعت وطریقت حضرت مولانا شرف الدین ابو توامہ بخاریؒ سے تبحر حاصل کیا۔ اس کے بعد انتیس ۲۹ر برس کی عمر میں درد طلب نے آپ کو بے آرام و بے قرار کردیا۔ اہل خانہ سے حقوق معاف کرائے۔ فرزند دلبند حضرت مخدوم ذکی الدین کو والدہ ماجدہ کی خدمت میں سپرد کیا اور اجازت لے کر پیر کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ معلوم نہیں اس سلسلے میں کہاں کہاں جانا پڑا۔ افتاں خیزاں دلی پہنچے۔ بڑے بڑے نامی دربار میں حاضری دی مگر حاجت پوری نہ ہوئی آخر پانی پت کرنال گئے، وہاں سے بھی ۔ نیل ومرام واپس آئے۔ خوبی قسمت پھر دلی لائی حضرت پیر کبیر شیخ نجیب الدین فردوسی قدس سرہ سے ۶۹۱ھ میں بیعت طریقت بلکہ بیعت حقیقت ہوئی۔ بارہ سال قبل کا لکھا ہوا خلافت نامہ وصیت ... پ کو فوراً عنایت ہوا۔

حسب بشارت وارشاد شیخ چالیس برس تک بہیا اور راجگیر کے جنگلوں میں مشکوۃ نبوت سے آپ کی تعلیم قلبی اور روحانی ہوتی رہی۔ اس کے بعد باون برس تک اسی خانقاہ معظم میں مسندِ ارشاد پر آپ جلوہ افروز رہے۔ اس اثناء میں رشد وارشاد درس وتدریس تعلیم وتعلم تالیف و تصنیف، ملفوظ ومکتوب حقائق ومعارف کا دریا موجیں مارتا اور لہریں لیتا رہا۔

صاحب مناقب الاصفیا لکھتے ہیں کہ توحید خواص کے اسرار وعلم حقیقت کے رموز اس

ہندوستان میں فقط آپ کے حسن بیان نے ظاہر کئے۔ مؤخدان یکرنگ واہل حقیقت کے کلمات یعنی امام احمد غزالی ومحمد غزالی وعین القضاۃ ہمدانی ومحی الدین ابن عربی وخواجہ فرید الدین عطار وشیخ فرید الدین عراقی، مولانا جلال الدین رومی، ان کی وضاحت آپ نے فرمائی۔ آپ کے قبل ان بزرگوں کے کلام کو ہندوستان میں کوئی پڑھتا بھی نہ تھا اور اگر شاذ ونادر پڑھتا تھا تو اس کی تہہ کو نہیں پہنچتا تھا۔

حضرت مخدوم کے تبحر علمی کی کچھ انتہا نہ تھی، کہتے ہیں کہ آپ کے شروح وحواشی بزبان عربی بڑی کتابوں پر عرب وشام میں موجود ہیں اور ملفوظات بھی اس کی شہادت دیتے ہیں کہ آپ کے معلومات کی کوئی حد نہ تھی کیسے کیسے مشکل اور مختلف سوال ہوا کرتے تھے اور آپ برجستہ جواب شافی دیا کرتے تھے یہاں تک کہ تعبیر گوئی جو ایک جز ونبوت ہے اس میں آپ کو اس قدر دخل تھا کہ اپنے وقت کے ابن سیرین سمجھے جاتے تھے، ''معدن المعانی'' میں تعبیر خواب کا خاص ایک باب ہی ہے۔

حضرت عبدالقدوس گنگوہی قدس سرہ اپنے مکتوب (۱۱۷) میں تحریر فرماتے ہیں کہ میں نے قطب روزگار شیخ سدھوروی کی زبان مبارک سے سنا اور آپ نے شیخ المشائخ علامہ السوری قدوۃ التقی شیخ بڈھن کی زبان مبارک سے سنا اور آپ نے اپنے پیر قطب الاقطاب حجتہ الحق علی الخلق شیخ محمد عیسیٰ قدس سرہ کی زبان مبارک سے سنا کہ تعبیر گوئی مخدوم جہاں قطب زماں شیخ شرف الدین احمد منیری قدس سرہٗ پر ختم ہوگئی۔

حضرت شاہ عزیز اللہ بنارسی کبروی رحمتہ اللہ علیہ جو عہد شاہجہانی میں تشریف رکھتے تھے اپنی کتاب گوہرستان شاہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ فضائل حضرت مخدوم جہاں کے متعلق کس قدر جامع اور معنی خیز الفاظ میں حضرت عبداللہ شطار قدس سرہ نے بیان فرمایا ہے کہ آپ فرماتے ہیں کہ ہم پر ایک حالت میں عالم انکشاف کھلا اس معراج روحی میں عرش اعظم تک رسائی ہوئی۔ ساق عرش بریں پر میں نے اکابرین طریقت کے القاب لکھے دیکھے حضرت بایزید بسطامیؒ کا لقب سلطان العارفین مسطور تھا۔ اور حضرت مخدوم شیخ شرف الدین کا لقب سلطان المحققین درج لوح

تھا جسے ان آنکھوں نے دیکھا پھر آپ فرماتے ہیں کیوں نہ ہو حضرت مخدوم کی بزرگی پر اصحاب شریعت کا اتفاق ہے۔ آپ کے نزدیک اپنے نفس سے بڑھ کر کوئی شئے ذلیل تر و خوار تر نہ تھی۔ اس قدر آپ میں فراخ حوصلگی تھی کہ اللہ کے سوا مقصود ذہنی تھا ہی نہیں۔ دنیا اور دولت دنیا، حقیقی اور نعمت عقبی سب کی سب نظر میں ہیچ تھیں۔ نفس کشی کی حد یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ چالیس سال کامل بوئے طعام سے قوت شامہ تک مزانہ لے سکی اور بارہ برس تک آپ کو حوائج ضروری کی مطلق حاجت نہ پڑی جس زمانہ میں آپ اس ریاضت شاقہ میں سرگرم تھے سید العارفین سید علی ہمدانی سیر و سیاحت کرتے ہوئے آپ تک پہنچے۔ شرف زیارت سے مشرف ہوئے۔ عند التذکرہ سید العارفین نے سوال کیا کہ سالک کی رسائی مقام صمدیت تک ہو سکتی ہے یا نہیں؟ آپ نے فرمایا کچھ دنوں آپ یہاں تشریف رکھیں تو ممکن ہے کہ یہ راز منکشف ہو جائے، چنانچہ سید العارفین چھ ماہ تک آپ کی خدمت میں رہے خیال کرتے ہیں تو یہ دیکھتے ہیں کہ حاجت بشریٰ آپ میں بالکلیہ نہیں رہی ہے۔ یہ معاملہ دیکھ کر وہ عقدہ کھل گیا اور وہ مشکل حل ہوگئی۔ دل میں جو خدشہ تھا وہ بھی رفع ہو گیا۔ پھر تو اس قدر گرویدہ ہوئے کہ سند خرقہ خلافت آپ سے حاصل کی اور بے انتہا فیوض و برکات اس مرشد کامل کی صحبت سے جمع کئے۔ ان مرحلوں کے بعد اجازت ملی اور سید العارفین آپ سے رخصت ہو کر واپس ہوئے۔

پھر یہ بھی تحریر فرماتے ہیں کہ ہنگام ریاضت ایسا بھی ہوتا تھا کہ بیس بیس روز تک آپ کی روح مبارک کو معراج ہوا کرتی اور جسم شریف محض بے حس و حرکت پڑا رہتا۔ چنانچہ ایک دفعہ لوگوں نے جب اس طور پر آپ کو دیکھا تو یہ سمجھے کہ اس جہان سے تشریف لے گئے۔ خیر آپ کو اس مقام سے جب نزول ہوا تو بتقاضائے عجز و انکسار آپ نے ضعف پیری وغیرہ کی معذرت پیش کی۔

آپ کا وصال ۷۸۲ھ میں بمقام خانقاہ عالم پناہ ہوا۔ تاریخ وفات ''پُر شرف'' ہے مزار پُر انوار بہار شریف محلّہ بڑی درگاہ میں واقع ہے اور مرجع خلائق ہے۔

الٰہی بوسیلہ وقت پاک حضرت مخدوم جہانِ میرے اس حقیر ترجمہ کو شرف قبولیت عطا فرما

اور مفید خاص و عام بنا۔

مختصر احوال خواجہ ضیاء الدین ابو نجیب سہروردی قدس سرہٗ

آپ کا نام نامی ضیاء الدین عبد القادر ابن محمد عبد اللہ کنیت ابو نجیب لقب مفتی عراقین تھا آپ محققین میں معتمد علیہ تھے، علماء عرفا کے سربراہ تھے، علوم ظاہر کے ساتھ صاحب کشف و کرامات تھے، آپ سے ایسے افعال صادر ہوتے کہ عقل حیرت زدہ رہ جاتی، آپ کے رفیع مقامات اور نفیس احوال پرواز تخیل سے بلند تر ہیں انفاس صادقہ اور معارف سینہ میں آپ کی بلندی کا کوئی جواب نہیں، آپ بروایتے ۴۹۰ھ کو قصبہ سہرورد بغداد میں پیدا ہوئے۔ مرید و خلیفہ خواجہ قاضی وجہ الدین ابو حفص رحمتہ اللہ علیہ ہیں، صحبت و اخذ طریقت، خرقہ خلافت امام احمد غزالیؒ اور حضرت پیران سید نا محی الدین عبد القادر جیلانی قدس سرہٗ سے بھی ہے۔ چنانچہ امام غزالیؒ فخر کے طور پر فرمایا کرتے کہ ’’گو ابو نجیب بظاہر مجھ سے تصوف کمال حاصل کرتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ کمال میں ان سے حاصل کرتا ہوں‘‘۔

آپ کے مریدین اور خلفا کی فہرست طول وطویل ہے۔ سرخیل فردوسیاں و سہروردیاں حضرت شیخ الشیوخ شیخ شہاب الدین سہرورد یؒ خواجہ نجم الدین کبریؒ اور بعض روایت کے مطابق حضرت روز بہان کبیر مصریؒ حضرت علماء یاسرؒ اور شیخ اسماعیل قشیریؒ وغیرہ اکابر کا نام نامی کافی ہے۔

ذکر ہے کہ ایک وقت آپ حجرہ میں مشغول بحق تھے شیخ الشیوخ کو حجرہ کے در پر نگہبان مقرر فرمایا تھا کہ اندر کوئی نہ آئے۔ جناب خضر صلوٰۃ اللہ تشریف لائے اور کہا کہ اندر جاؤ، کہو کہ خضر ملاقات کو آئے ہیں۔ گئے، عرض کیا، آپ نے اشارہ سے منع فرمایا، شیخ پلٹ آئے لیکن ہیبت خضر سے کچھ کہہ نہ سکے، جناب خضر نے کہا اچھا ہم پھر آئیں گے۔ پھر جب آپ حجرہ سے فارغ ہو کر باہر تشریف لائے تو شیخ شہاب الدین کو گوشمالی دی اور فرمایا بات سمجھ میں نہیں آتی خضر سے تو پھر ملاقات ہو رہے گی، لیکن یہ وقت خاص جو محبوب حق نے عطا فرمایا یہ پھر کہاں ملے گا۔ سبحان اللہ حضور ﷺ کے غلاموں کو ان کی پیروی میں ان کے طفیل وہ مقام ملتا ہے کہ زبانِ حال سے اعلان کرتے ہیں لِی مَعَ اللّٰہِ وَقتٌ لَا یَسعنِی فِیهِ مَلَکٌ مُقَرَّبٌ وَلَا نَبِیٌّ مُرْسَلٌ (مجھے اللہ کی

محبت میں وہ وقت حاصل ہوتا ہے جس کے درمیان آنے کی نہ تو مقرب فرشوں کو وسعت ہوتی ہے اور نہ نبی مرسل کو)۔

حضرت شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردیؒ جو آپ کے معزز خلیفہ اور بھتیجہ بھی ہیں چشم دید کرامتیں بیان فرماتے ہیں کہ ایک دن حضرت شیخ بغداد کے بازار میں تشریف لے جارہے تھے ایک بکری پوست کشیدہ قصاب کی دکان میں لٹک رہی تھی آپ رک گئے قصاب سے فرمایا کہ یہ بکری شکایت کر رہی ہے کہ میں ذبیحہ نہیں ہوں مردار ہوں اپنی موت مری ہوں یہ سن کر قصاب کانپ گیا، اور فوراً قدم پر گر کر اس نے توبہ کی۔

ایک مرتبہ آپ بغداد کے پل سے گذر رہے تھے دیکھا کہ ایک شخص بار برداری کے ایک جانور پر بہت سارے میوے لئے جارہا ہے آپ نے کہا یہ میوہ سب میرے ہاتھ بیچ دو، اس نے کہا کیوں؟ فرمایا یہ میوے مجھ سے فریاد کر رہے ہیں کہ مجھے چھڑائیے کیونکہ یہ مجھے شراب کے ساتھ گزک کے طور پر استعمال کرائے گا، یہ سنتے ہی وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا اور ہوش آتے ہی اس نے توبہ کی اور مرید ہو گیا۔

ایک دن آپ کرخ کے ایک محلّہ سے گذرے، ایک مکان سے نشہ بازوں کے شور وغل کی آوازیں آرہی تھیں اور شراب کی بدبو سے دماغ پھٹ رہے تھے آپ نے اس مکان کی دہلیز پر دو رکعت نفل پڑھی آپ کی برکت سے مٹکے کی تمام شراب پانی بن گئی، جتنے شرابی تھے سب کے سب شراب خانہ سے باہر آئے اور ہمیشہ کیلئے تائب ہو گئے۔

ایک دفعہ حضرت کے پاس تین یہودی اور تین نصرانی آئے آپ نے فرمایا تم مسلمان ہو جاؤ انہوں نے سختی سے انکار کیا آپ نے دودھ سے ضیافت کی پیتے ہی سب کے سب مسلمان ہو گئے اور کہنے لگے آپ کی برکت سے نور اسلام کے سوا سب دین ہمارے سینوں سے مٹ گیا۔

بلندی اخلاق میں یہ ایک واقعہ حضرت شیخ نظام الدین اولیاء کے ملفوظ سے منقول ہے ایک وقت ایک امیر نے کھانے کے خوانچے قیدیوں کے سروں پر رکھوا کر آپ کی خدمت میں بھیجے جب دستر خوان چنا گیا، حضرت نے اسیروں کو ایک صف میں بٹھایا اور خود ان کے درمیان بیٹھ کر

کھانے میں مشغول ہو گئے اور یہ حدیث شریف تلاوت فرمائی اِنَّ مِنْ رَاسِ التَّوَاضِعِ اَنْ تَبْدَءَ بِالسَّلَامِ عَلٰی مَنْ لَقِيْتَ وَتُرَدَّ عَلٰی مَنْ سَلَّمَ عَلَيْکَ وَ اَنْ تَرْضٰی بِالدُّوْنِ مِنَ الْمَجْلِسِ وَاَنْ لَا تُحِبَّ الْمِدْحَةَ وَالتَّزْكِيَةَ وَالْبِرَّ. (تواضع یہ ہے کہ جس سے ملو سلام میں پہل کرو، جو بھی سلام کرے اس کا جواب دو، مجلس میں خفیف تر لوگوں کی جگہ بیٹھنے پر راضی ہو جاؤ، اپنی تعریف اور خوبیوں کا بیان پسند نہ کرو)

بارہویں جمادی الآخر ۵۶۳ھ جمعہ کے دن گذار کر سنیچر کی شب کو رفیق اعلیٰ کی بقاء کے لئے اس جہاں سے تشریف لے گئے۔ اور بغداد میں دجلہ کے کنارے آرام فرما ہیں۔

الٰہی بوسیلہ وقت پاک حضرت خواجہ خواجگان خواجہ ضیاء الدین ابو نجیب سہروردی قدس سرہٗ و جمیع پیران میرے اس ترجمے کی خدمت کو اپنے فضل و کرم سے قبول فرما اسے مفید اور مقبول خاص و عام بنا، اور اس عاصی کو بخش دے، بحرمت ﷺ النبی و اولادہ الأمجاد۔

ترجمہ دیباچہ کتاب ہٰذا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تمام صفات کمالیہ اللہ کے لئے ہے جس نے مشائخ کو مخلوق کی ہدایت کا سبب بنایا، اور ان کو توفیق دی مریدوں کے تعلقات کو قطع کرنے کی حلق اور مقراض کے ذریعہ۔ اور اس نے منور کیا اپنے معرفت کے نور سے مشائخ کے قلوب کو، اور ان کے اسرار کو مزین کیا اپنے محبت کے جذبات سے۔

پاک ہے اس پروردگار کی ذات جس نے اپنے ولیوں کو معرفت کے اعلیٰ درجوں تک پہنچنے کی شرافت بخشی۔ اور اپنی محبت رکھنے والوں کو اپنے تک پہنچنے کے راستوں کی معرفت بخشی، اپنی پھیلی ہوئی عطیات کے ذریعہ۔ اپنی محبت رکھنے والوں کے درجوں کو دنیا میں ظاہر فرمایا، اور عقبیٰ میں ان کے مقامات کو عیاں فرمایا۔ جادہ شریعت پر انہیں مستقیم کیا، اور سجادہ طریقت پر مداومت بخشی۔ لذت وشہوات سے ان کے نفسوں کو طاہر کیا۔ دنیا اور جنتوں کی جانب میلان سے ان کے قلوب کو خالی کیا۔

پاک ہے اس پروردگار کی ذات جس نے معرفت کے اعلیٰ درجوں پر پہنچا کر اپنے ولیوں کو شرافت بخشی اور اپنی محبت رکھنے والوں کو اپنے تک پہنچنے کی راہ کی معرفت بخشی، اپنی پھیلی ہوئی عطیات کے واسطہ سے اور ان سبھوں کو انبیاء کی زینتوں سے مزین کیا، ان سبھوں کو خرقہ کا لباس دیا۔ مختلف اطوار سے لوگوں کی نظروں سے چھپایا۔ ان کے قلوب کو اپنے شوق کی آگ سے گرمایا، اپنے ذوق اور اپنے رویت کے وعدے سے مکرم کیا۔

پاک ہے اس پروردگار کی ذات جس نے اپنے اولیا کو معرفت کے اعلیٰ درجوں پر پہنچا کر اپنے جانب پہنچنے کی راہ کی معرفت اپنی پھیلی ہوئی عطیات کے ذریعہ اپنے دوستوں کو دی۔ انہیں بصارت بخشی کہ حق ان کی نظر میں آجائے۔ انہیں بصیرت کی صلاحیت عطا کی تا کہ وہ مخلوق

میں فکر کرسکیں اللہ تعالیٰ کے ان دوستوں نے طالبین کے لئے وصول الی اللہ کے آداب بتائے، اور سلوک کے مقاصد ومطالب جو کچھ ہیں ظاہر کئے۔

پاک ہے اس اللہ کی ذات جس نے اپنے ولیوں کو معرفت کے اعلیٰ درجہ تک پہنچایا اور اپنے جانب پہنچنے کی راہ اپنی پھیلی ہوئی عطیات کے ذریعہ انہیں معلوم کرایا۔

اللہ کے رسول پر صلوٰۃ ہو جب تک زمین قائم رہے اور اونچے آسمان، جب تک اعلیٰ جنت الفردوس کی نعمت رہے اور صلوٰۃ ہو رسول کی آل کرام پر اور ان کے اصحاب پر جو بہت ہی عظیم بھلائیوں والے تھے اور ان پر جو زمانہ میں منفرد ہیں۔ امن وامان کے سبب ہیں، وہ جو خلق کے استاد ہیں علو ظاہر میں، اور شیخ ہیں باطنی معنیٰ کے بیان میں، جو شریعت کے دقیق نکتوں کو بتانے والے ہیں، طریقت کی حقیقتوں کو ظاہر کرنے والے ہیں، وہ جو دین کے طالبوں کے لئے علم سلوک کے اصول وقوانین کو ظاہر کرنے والے ہیں اہل دنیا میں، امراء اور ملوک کی مشغولیتوں میں نصیحت کرنے والے ہیں۔ وہ ذات گرامی جو تمام لوگوں میں دینی معاملات میں فضیلت رکھنے والے ہیں۔ دنیاوی ضرورتوں سے لوگوں کو اپنے انعام واکرام کے ذریعہ نجات دینے والے ہیں۔ ہاں وہ ذات گرامی کثیر العلم ہے، شیخ محقق ہیں، صاحب مقامات ہیں، احوال عالیہ رکھتے ہیں، فضائل عالیہ کی نگاہ رکھنے والے ہیں۔ ارباب طریقت میں صاحب اوصاف، اصحاب حقیقت میں سربراہ ہیں، اہل حق ویقین کے مقتدا ہیں۔

وہی ذات گرامی جو دین وملت کے شرف ہیں شرف الدین احمد ابن یحییٰ منیری اللہ ان کی بقا کو طول دے کر مسلمانوں کو یہ متاع عنایت کرے۔ ہمیشہ رکھے اللہ تمام مومنین کے لئے ان کی زیارت کی نعمت۔ اللہ رحم کرے ان تمام لوگوں پر جو میری ان دعاؤں میں آمین کہیں اور اللہ انہیں معاف کرے اپنے نبی اور ان کے جمیع آل کی حرمت کے واسطہ سے۔

حمد ونعت کے بعد یہ بندہ اللہ کی ذات غنی کی رحمتوں سے امید رکھتے ہوئے عرض کرتا ہے، یہ بندہ محمد ابن محمد عیسیٰ البلخی جسے پکارا جاتا ہے اشرف ابن رکن کے نام سے اور جو اس کتاب کا لکھنے والا ہے جس کا نام مطالب الطالب ہے۔ اللہ مجھے باطنی امراض اور علتوں سے شفا بخشے اور

زرہ برابر بھی شفقت شیخ سے محروم نہ رکھے۔ اپنے لطف کے خزانہ کے موتیوں سے مجھے حصہ دار بنائے۔

ایک روز میری نظر آداب المریدین کے ایک نسخہ پر پڑی جو تصحیح کردہ تھا اور قیمتی حواشی سے بھرا ہوا تھا۔ ایسے حواشی جو جنت کی جانب لے جانے والے تھے۔ ان کے لئے جو راہ میں چل رہے ہیں اور ان کے لئے بھی جو ابھی نہیں چلے ہیں۔ یہ وہ نسخہ تھا جو میرے بھائی زاہد، سب میں زیادہ زہد رکھنے والے نے اسے پڑھا تھا۔ جیسا ان کا نام ہے اللہ انہیں زاہد ہی رکھے۔ میں جب اس کے معنی پر مطلع ہوا اور مجھے اس کے بیان کے متانت کی واقفیت ہوئی تو میں نے ارادہ کیا کہ اس میں کا تھوڑا بہت جو کچھ ہے لکھ لوں تا کہ ہر چھوٹے اور بڑے کے لئے مفید ہو۔ اسی اثنا میں میرے دل میں یہ کھٹک ہوئی کہ جو مرید ہے اسے رخصت نہیں ہے اور جو غلام ہے اسے جائز نہیں ہے کہ کوئی کام بھی محض اپنی رائے سے کرے، یا کوئی بات اپنے نفس کی خواہش سے بولے۔ ہاں جبکہ اجازت لے لے پوری طرح اپنے شیخ سے، اس چیز کے متعلق جس کا ارادہ رکھتا ہے، یہ اس لئے کہ شیخ اپنے قوم میں وہ حیثیت رکھتا ہے جو نبی کی اپنی امت میں ہے۔ اس کے بعد میں خود سے چل کر شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا، انہوں نے میری طرف دیکھا، میں نے شیخ کی جناب میں اپنی عرضی پیش کی اور سوال کیا اپنے لئے اور اپنے دوستوں کے لئے یہ گذارش کی کہ اس کتاب پر مزید مرغوب حاشیہ کا اضافہ کیا جائے، اور علوم مطلوبہ کی باریکیوں کو ظاہر کیا جائے۔

بس نے جو سوال کیا حضرت شیخ نے اسے اپنے فضل سے منظور کیا، میں نے جو کہا اسے اپنے کرم سے قبول کیا۔ کتابت کتاب کی ابتدا یوں ہوئی ہے پہلے لفظی ترجمہ لکھایا گیا اس کے بعد دوسرے معنوی فائدے اور تشریحات پیش کی گئیں۔ اور یہ سب کچھ خود لکھوایا اس میں کسی غیر کی اعانت نہ لی گئی اول سے آخر تک املا کی یہی کیفیت رہی۔ ایک ایک کلمہ ایک ایک سطر، تمام صفحات، یکے بعد دیگرے اوراق، ایک جز کے بعد دوسرا جز، اور ان سبھوں میں سامع اور کاتب کے فہم کا خیال رکھا گیا۔ اپنے منور قلب کے اونچے مقام سے نہیں بلکہ نزول فرماتے ہوئے یہ مشغولیت مختلف اوقات میں رہی۔ دقیق معنوں کے بیان کا سلسلہ جاری رہا۔ کبھی تو ہر روز املا کا

سلسلہ جاری رہتا، کبھی ایسا بھی ہوتا کہ مہینوں خالی جاتے مخلوق کے اژدہام کی وجہ سے یا حق کی مشغولیت کی بناپر۔ اس کام کی ابتدا جمعہ کے روز، اشراق کے وقت، ربیع الاول کے مہینہ میں، پہلے عشرہ کے بعد ۶۵ے ہجری میں ہوئی اور اس نادر کتاب کی کتابت سے اللہ کی مدد سے وہ ذات جو صاحب عطاو مالک کل ہے منگل کے دن اول وقت، ماہ ذی الحجہ کی اکیسویں تاریخ ۶۶ے ہجری میں فراغت ہوئی۔

(حضرت قاضی اشرف کاتب کتاب ہٰذا)

قوله: بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تفسیر امام زاہد میں اس کا معنیٰ اس طرح مذکور ہے کہ شروع کرتا ہوں میں اللہ کے نام سے جو رحمت سے موصوف ہے۔ تمام ذکروں میں سب سے بڑا ذکر جو تبرکاً بیان کیا گیا ہے وہ یہی ہے۔ یہ اس لئے کہ پیغامبر ﷺ نے فرمادیا ہے اور تعین فرمادی ہے کہ کُلُّ اَمۡرٍ ذِی بَالٍ لَمۡ یُبۡدَاءُ بِسۡمِ اللّٰہِ فَهُوَ اَبۡتَرٌ ہر وہ کام جو لائق قدر کے ہے اگر اس کے شروع میں بسم اللہ نہ کہا جائے تو وہ کام ناقص اور ادھورا رہتا ہے تمام کاموں ہ سرانجام ہونا اور مبارک ہونا اس کے ذکر سے وابستہ ہے۔

امیر المومنین علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے منقول ہے فرمایا کہ کَلِمَةُ بِسۡمِ اللّٰهِ فَاتِقَةٌ لِلدَّنُوقِ، مُسَهِلَةٌ لِلۡعُسُوۡرِ، مُجۡنِبَةٌ لِلشُّرُوۡرِ شِفَآءٌ لِمَا فِی الصُّدُوۡرِ، اَمَانٌ یَوۡمُ النُّشُوۡرِ.

یعنی کلمہ بسم اللہ تمام تاریک نکات دقیق معانی و مفاہیم کا کھولنے والا، تمام مشکلوں کا آسان کرنے والا، تمام شر کا دور کرنے والا، دلوں کی تسکین آور اور شفا ہے، قیامت کے دن امان ہے۔

بسم اللہ لکھنے کی ترتیب امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کے وصیت نامہ میں ایسے مذکور ہے کہ یَاعَلِیُّ! رَیِّقِ الدَّاوَاتَ. وَحَرِّفِ الۡقَلَمَ. وَانۡصِبِ الۡبَاءَ وَفَرِّقِ السِّیۡنَ وَحَسِّنِ اللّٰهَ وَمَدِّ الرَّحۡمٰنَ وَلَا تُعَوِّرِ الۡمِیۡمَ وَجَرِّدِ الرَّحِیۡمَ

یعنی اے علی جب بسم اللہ لکھنا چاہو تو رواں کرو داوات کو اور قلم میں قط کو ٹیڑھا کرو اور نصب کرو۔ ب۔ کو یعنی حرف ب۔ کو کھڑا مثل الف کے لکھو اور سین کو متفرق لکھو یعنی سین کے

دندانے علیحدہ علیحدہ لکھو اور نہایت عمدگی سے کلمۂ اللہ لکھو اور کلمۂ رحمٰن کو کھینچ کر لکھو یعنی وہ تمام حروف جو کلمۂ رحمٰن میں ہیں ان کو کشش کے ساتھ لکھو اور میم کو بند نہ کرو یعنی میم کے بیچ کا حصہ خالی رکھو جیسے خالی صفر لکھتے ہو اور کلمہ رحیم کو علیحدہ کرو یعنی کلمۂ رحیم کو جداگانہ لکھو ایسے کہ درمیان کلمہ رحمٰن اور رحیم کے کچھ سفید حصہ رہے۔

کلمہ اللہ کی تحقیق اور تفسیر یوں ہے کہ بعض لوگ اس کلمہ کے مشتق کرنے میں مشغول ہوئے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کا اشتقاق اِلٰہ یا لَہٗ

سے ہے بمعنی فزع کہتے ہیں کہ اَلِہَ الرَّجُلُ نَزَعَ اِلَیۡہِ اور بعض کا قول ہے کہ وَلَہَ یُوۡلَہٗ سے مشتق ہے یہ بھی فَدَعُ اِلَیۡہِ کے معنی میں فَزَعَ اِلَیۡہِ معنیٰ اس کا پناہ ڈھونڈھنا اس سے۔ ایسا کہا سب کہ لوگوں کا خداوند عزّ وجل سے جس کا نام اِلٰہ آیا ہے، بہت زیادہ پناہ ڈھونڈھنا۔

اور بعض کہتے ہیں کہ اِلٰہ یالَہٗ سے مشتق ہے تحیُّر کے معنیٰ میں یُقَالُ اَلِہَ الرَّجُلُ اِذَا تَحَیَّرَ سُمِّیَ الرَّبُّ بِذالِکَ لِاَنَّ الۡعُقُوۡلَ تَتَحَیَّرُ فِیۡ اِدۡرَاکِ کُنۡہِ قُدۡرَتِہٖ وَقِیۡلَ ھُوَ مُشۡتَقٌّ مِنۡ لَاہَ یَلُوۡہُ اِذَا احۡتَجَبَ کَمَا قَالَ شَاعِرٌ ۔ لَاہَ رَبِّیۡ عَنِ الۡخَلَائِقِ طُرًّا۔ (الا الرجل کہا جاتا ہے جب آدمی حیرت میں ہوتا ہے، رب کا نام اس لئے رکھا گیا کہ عقول اس کی کہنہ اور قدرت کی ادراک سے متحیر رہتے ہیں اور ایسے بھی کہا گیا ہے کہ لَاہَ یَلُوۡہُ سے مشتق ہے جب کہ کوئی حجاب میں آجائے جیسا کہ شاعر کا قول ہے، حجاب میں آ گیا میرا رب مخلوقات سے۔)

امام خلیل احمد اور اکثر اہل تفسیر کی رائے یہ ہے کہ یہ نام مشتق نہیں ہے اور یہی قول محمد حسن رحمتہ اللہ علیہ کا ہے۔

لیکن الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم کی تفسیر میں بعض مفسرین کا قول ہے کہ یہ دو نام مشتق ہیں صفت سے مگر رحمٰن کا معنیٰ رحیم کے معنیٰ سے زیادہ بلیغ ہے کیونکہ نام رحمٰن خدا کے سوا کسی اور کے لئے بولنا نہیں چاہئے۔ یہ نہ کہیں کہ فلاح رحمٰن ہے پھر نام رحیم مخلوق کے لئے بولنا روا ہے جیسے کہ

کہتے ہیں کہ فلاں رحیم ہے خود خداوند عزوجل نے پیغامبر ﷺ کی صفت میں فرمایا ہے بالمومنین رؤفٌ رَّحیم رحمٰن کا معنیٰ دوسرے طریقہ پر یوں بیان کیا ہے کہ خلق دنیا پر روزی دینے میں رحمت کرنے والا ہے اور رحیم کا معنیٰ ایسے بیان کیا ہے کہ مومنوں پر خاص رحمت فرمانے والا ہے عقبیٰ کے معاملے میں بخشائس اور عطا کے ذریعہ یہ بھی بیان کیا ہے کہ پورے قرآن میں جہاں جہاں رحمت فرمانے اور روزی دینے کا بیان ہے کلمہ رحمٰن کے معنیٰ کے تحت میں ہے اور پورے قرآن میں جتنا بھی مغفرت اور خفیف کا ذکر و بیان ہے وہ سب کا سب کلمہ رحیم کے معنیٰ کے تحت میں ہے۔ اور بعضوں نے کہا ہے رحمٰن کا معنیٰ یہ ہے کہ بندوں کو روزی دینے کا وعدہ کے خلاف نہیں کرتا اور رحیم کے معنیٰ وہ ہیں کہ بندوں کو ان کی طاقت سے کم کام کا حکم دیا اور ان کو نعمت ان کی حاجت سے زیادہ دی اسی کو مصطفیٰ ﷺ نے فرمایا ہے یَقُوْلُ اللّٰہُ سَبَقَتْ رَحْمَتِی عَلٰی غَضَبِی اللہ کہتا ہے میرے غضب پر میری رحمت سبقت لے گئی ہے۔ اور یہ سبقت رحمت کی تاثیر کی طرف لوٹے گی نہ عین رحمت پر کیونکہ رحمت خداوند عزوجل کی صفت ہے اور اس کے صفات کو کسی حیثیت سے بھی تقدم و تاخر نہیں ہے اور بعض کہتے ہیں کہ کلمہ رحمٰن اور کلمہ رحیم میں فرق نہیں ہے رحمٰن رحیم کے معنیٰ میں ہے اور رحیم رحمٰن کے معنیٰ میں لیکن عربوں کی عادت ہے کہ فصاحت کے خیال سے ایک معنیٰ کے لئے دو لفظ لاتے ہیں اور قرآن کا نزول عربوں کی لغت میں ہوا ہے جیسے استعمال کرنے کی ان کی عادت ہے۔

مفسرین رحمہم اللہ کا اس پر اتفاق ہے ''بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ'' قرآن کی ایک آیت ہے اُنْزِلَتْ لِلْفَصْلِ بَیْنَ السُّوَرِ دو سورتوں کے درمیان فصل کرنے کے لئے نازل ہوئی۔

قولہ: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مُحَمَّدٍ وَّ اٰلِہٖ اَجْمَعِیْنَ ط

تمام حمد و ثنا اللہ کے لئے ہے جو جہاں کا پروردگار ہے اور خدا کی رحمت اس کے پیغامبر

محمد ﷺ پراوران کے آل پراور جوان کے پیچھے چلیں تمام پر **اَلْحَمْدُ** اس کے معنیٰ اچھی تعریف کرنا فضیلت بیان کرنے کے طور پر الحمدللہ کا لفظ اس بات کو چاہتا ہے کہ اس سے قبل انعام ملا ہو کیوں کہ احسان کے بعد کی تعریف کو حمد کہتے ہیں۔ بخلاف اس کے مَدَح وہ ایک عام لفظ ہے احسان کے قبل بھی ہوتا ہے اور بعد بھی تو یہاں حمد کا لفظ اختیار کیا گیا مدح کا نہیں یہ اس لئے کہ جون سی تعریف متصور ہوسکتی ہے لوگوں سے، لامحالہ وہ احسان کے بعد ہی ہوگی۔ کیونکہ ہر تعریف توفیق کی محتاج ہوتی ہے اور توفیق بھی ایک نعمت ہے۔

پھر گفتگو حمد اور شکر کے مقابلہ میں آتی ہے شکر۔ حمد نہیں ہے اس لئے کہ حمد نعمت پر ہوتی ہے لیکن کبھی اس کے علاوہ پر بھی ہوتی ہے بخلاف اس کے شکر وہ نعمت کے لئے مخصوص ہے (دوسرا فرق) یہ ہے کہ شکر قلب، زبان، اعضا، جوارح اور مال کے ذریعہ بھی ہوتا ہے لیکن حمد زبان کے ساتھ مخصوص ہے۔

اور کہا گیا **اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ، الحمد للعالم** اور **الحمد للخالق** نہیں کہا گیا یہ اس لئے کہ جو اسم ذات کے لئے وہ تمام صفات کمالیہ پر بولے جانے کے مستحق ہے اب گویا اللہ کے ساتھ حمد کہنے میں ان تمام صفات کو شان ہوگا یہ حمد وثنا جس کا وہ ذات پاک مستحق ہے لیکن الحمد کے ساتھ عالم یا خلاق کہنے میں یہ بات پیدا ہوتی کیونکہ اس صورت میں حمد صرف اس کی خالقیت کی ہوتی یا عالمیت کی۔

لفظ اللہ، اس سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ وہ معبود ہے، حق ہے، اور ایسے بھی کہا گیا ہے کہ وہ ذات موصوف ہے تمام کمال والی صفت سے اور وہ پاک ہے زوال سے نقایص سے اور اس کی تحقیق ذکر کی جاچکی ہے۔

اور **رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ** اے **خَالِقُ الْخَلْقُ اَجْمَعِيْنَ وَمَا لكهم و مصلحهم** یعنی حمد اس خدا کو کہ جو مخلوق کا پیدا کرنے والا ہے، ان کا مالک ہے اور پالنے والا خلق کا ہے اور ان کے

کاموں کی اصلاح کرنے والا ہے رَبُ کی اصل یہ ہے کہ مراد اس سے رابُ ہے رَبَّ یَرُبُّ رَباً سے راب کی درمیانی الف کثرت استعمال سے چھوڑ دی گئی اَلرَّبُّ الف اور لام کے ساتھ تنہا غیر اللہ کیلئے بولنا جائز نہیں لیکن بغیر الف لام کے اور مقید کر کے مخلوق کی صفت میں بھی بولنا جائز ہے جیسے کہا جاتا ہے کہ رَبُّ الدَّارِ (گھر کا مالک) اور رَبُّ الْمَطَاعِ (سامانوں والا)۔

رب کی تفصیل اور طرح سے بھی آئی ہے ایک یہ کہ رب سید کے معنیٰ میں آیا ہے جسے جناب یوسف علیہ السلام کے قصہ میں یوسف علیہ السلام نے کہا وَاذْ كُرْنِىْ عِنْدَ رَبِّكَ (اور مجھے یاد رکھنا اپنے سردار کے پاس) یہاں عندربک کے معنیٰ عندسیدک ہے اور جناب موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں ہے فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ (تم جاؤ اور تمہارا سردار) یہاں پر ربک سے سیدک مراد ہے اور وہ جناب ہارون ہیں۔

رب کا دوسرا معنیٰ مصلح آتا ہے جیسا کہ قرآن میں ہے وَالرَّبَّانِيُّوْنَ بادشاہ عالم جل جلالہٗ نے عالم کو ربانی کہا ہے چونکہ وہ اصلاح کرنے والے ہیں اپنی اور دوسروں کے کام کی رب کا دوسرا معنیٰ پالنے والے کے آتا ہے جیسا کہ فرمایا اللہ نے اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا (کیا ہم لوگوں نے بچپنے سے تمہاری پرورش نہیں کی)

یہاں کلمہ رب تمام معنیٰ کو شامل ہے (یعنی رب کے مذکورہ بالا رب کے جتنے معنیٰ بیان کئے گئے اس موقع پر تمام معنیٰ کو یہ لفظ شامل ہے۔ مترجم) تو اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کا معنی ایسے کہا جائے گا کہ خاص اس خدا کی حمد ہے جو مخلوق کا سید ہے ان کے کاموں کی اصلاح کرنے والا ہے اور ان کی پرورش کرنے والا ہے۔

اَلْعٰلَمِيْنَ عالم ایک ایسا نام ہے جو اللہ کے سوا سب کو شامل ہے کائنات کا نام عالم اس لئے رکھا گیا کہ وہ اپنے بنانے والے کے وجود کا نشان ہے اور اس کے صفات کمالیہ کا نشان ہے عالمین کی تفسیر میں بہت زیادہ گفتگو کی گئی ہے مقاتل حیان رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ خداوند

عز و جل کے اسی ہزار عالم ہیں چالیس ہزار خشکی میں اور چالیس ہزار سمندر میں یہ دنیا پوری کی پوری ان عالموں میں سے ایک ہے۔

ابی ابن کعب کہتے ہیں اور یہی مصطفیٰ ﷺ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اٹھارہ ہزار عالم ہیں آسمان اور زمین کے رہنے والے فرشتگان اور عرش اٹھانے والے اور کرو بیان اور روحانیان اپنے کثیر اختلاف اور جنسوں کے ساتھ سب کے سب ایک عالم ہیں۔ اور ترک، ہند، روم، حبش، زنگی، یونانی، عرب اور عجم کے آدمی اپنے مختلف ہونے کے باوجود سب ایک عالم ہیں اور پریاں ایک عالم ہیں، دیو سب ایک عالم میں۔

حضور مصطفیٰ ﷺ نے فرمایا ہے ان عالموں کے بیان کرنے کا میرا دستور نہیں اگر دستور ہوتا اور بیان کرتا لَتَفَقَّأَتْ مِدَارَتُكُمْ (تمہارے زہرہ کو تاب نہ ہوتی) العالمین کی تفسیر معتمد یہ ہے جو ابن قیم رحمتہ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ عالمین جمع ہے واحد اس کا عالم ہے۔ عالم عَلم سے مشتق ہے علم لشکر میں نشان کے لئے ہوتا ہے تاکہ ہر شخص یہ سمجھے کہ لشکر کے ٹھہرنے کی جگہ کہاں ہے۔ معنیٰ یہ ہے کہ ہر پیدا کی ہوئی چیز اس کے وحدانیت کی نشانی ہے کیونکہ محدثات کو ہر ذرہ اس کی ہستی کا پتہ دیتا ہے۔ جیسا کہ شاعر کہتا ہے ؎

رو دیدہ بدست آر کہ ہر ذرۂ خاک جائے است جہاں نما کہ در وے نگری

(جاؤ نظر حاصل کرو کیونکہ خاک کا ہر ذرہ ایک جام جہاں نما ہے اگر تم غور کرو)

قولہ: وَالصَّلٰوۃ۔ صلوٰۃ اللہ کی جانب سے رحمت کے معنی میں ہے ملائکہ کی جانب سے استغفار کے معنی میں مومنین کی جانب سے دعا کے معنی میں ہے۔

صلوٰۃ غیر نبی کے لئے بھی جائز ہے جب کہ تابع ہو کر ضمناً لایا جائے منفرد نہیں۔ ایسا ہوتا ہے کہ ایک چیز ضمناً اور طبعاً ثابت ہوتی ہے قصداً نہیں تو صلواۃ بھیجنے والے کے لئے یہ جائز نہیں کہ کوئی وقت سبیت کی بنا پر صلوٰہ کے لئے مقرر کرلے ہاں اس کے لئے جائز ہے کہ شروع

میں رسول کا نام لے کر ضمنی بنا لے لیکن ایسا جو کرتے ہیں کہ نبی کے علاوہ اہل بیت پر منفرد سلام بھیجتے ہیں یہ مکروہ ہے کیونکہ یہ ادار افضیت کے اہتمام تک پہنچا دیتی ہے۔

اور رسول پر صلوٰۃ بھیجنا واجب ہے، وجوب کی کیا صورت ہے اس میں اختلاف ہے ابوالحسن کرخی رحمتہ اللہ علیہ نے کہا پوری عمر میں ایک مرتبہ صلوٰۃ بھیجنا واجب ہے امام طحاوی رحمتہ اللہ علیہ نے کہا ہر مرتبہ جب رسول کا تذکرہ کیا جاوے صلوٰۃ واجب ہے اور یہی اخوط ہے۔ نبی کا اپنی امت کے لئے صلوٰۃ بھیجنا ان کی مغفرت کے لئے دعا کرنا ہے اور امت کا رسول پر صلوٰۃ بھیجنا ان کی ثنا کرنا ہے اور اللہ سے ان کی قربت میں زیادتی ہو اس کی دعا کرنا ہے۔

عَلٰی رَسُوْلِہٖ: اس موقع پر یہ سمجھ لو کہ نبی اور رسول میں فرق ہے رسول ان کو کہتے ہیں جن کو شریعت بھی ملی ہے اور نبی شریعت کے پہنچانے والے اور شریعت کو تقویت دینے والے کو کہتے ہیں۔ اسی لئے نبی ﷺ نے فرمایا عُلَمَاءُ اُمَّتِی کَاَنْبِیَاءِ بَنِی اِسْرَائِیْلَ (میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے نبی کی طرح ہیں) یہ اس لئے کہ بنی اسرائیل کے نبی شریعت کی تبلیغ کرتے تھے جیسے علماء شریعت کی تبلیغ کرتے ہیں اس تشریح کی بنا پر نبوت رسالت کے لئے لازمی چیز ہے اور رسالت سے نبوت لازم آجاتی ہے لیکن نبوت کے لئے رسالت لازمی نہیں صاحب کشاف نے لکھا ہے کہ رسول وہ ہیں جنہیں کتاب بھی ملی ہو اور نبی وہ جو اللہ کے وحی کی خبر دیں اگر کے ساتھ کتاب نہ ہو۔

لفظ نبی کی تحقیق یوں کی گئی ہے کہ نبأ سے ہے جس کے معنیٰ خبر کے ہیں یا نبوت سے ہے جس کے معنیٰ رفعت کے ہیں اول تشریح لی جائے تو نبیٌ فَعِیْلٌ کے وزن پر مفعل منبیٌ کے معنیٰ ہوگا۔ یعنی منبی الاخبار الغیوب (غیب کی خبر دینے والے) اور اگر دوسری تشریح نبوت کی لی جائے تو رفعت کے معنیٰ میں ہوگا جیسا گذرا۔

محمد، رسولوں کے سردار نبیوں کے ختم کرنے والے ﷺ کا نام ہے۔

وَالِهٖ -آل اصل میں اہل کے معنیٰ میں ہے اسی لئے اس کی تصغیر اہیل آتی ہے لیکن یہ ہے کہ اہل، جواشراف ہیں ان کے لئے بولا جاتا ہے مثلاً الُ عــمــرالُ علی یہ تو کہتے ہیں الُ ھَائک، الُ حجام نہیں کہتے اور یہ کہا گیا الُ فِرعون یہ خود اس کے اپنے تصور کے بناپر کہ وہ اپنے کو اشراف کی صورت میں سمجھتا تھا۔

رسول اللہ ﷺ کی آل نسبــی حیثیت سے اولاد علی، اولاد جعفر، عقیل، عباس حارث ابن عبدالمطلب سب ہیں اور دین کے سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا تو ارشاد ہوا کُلُّ تَقِیّ اٰلِی یعنی تمام متقی لوگ میری آل ہیں۔قَالَ الشَّیْخُ الْاِمَامُ الْاَجَلُّ السَّیِّدُ الزَّاھِدُ الْعَارِفُ الْوَرِعُ ضِیَاءُ الدِّیْنِ حُجَّۃُ الْاِسْلَامِ قُدْوَۃُ الْفَرِیْقَیْنِ اِمَامُ الطَّائِفَتَیْنِ اَبُو النَّجِیْبِ عَبْدُالْقَاھِرِبْنُ مُحَمَّدِ نَ السَّھْرَوَرْدِیْ تَغَمَّدَہُ اللّٰہُ بِغُفْرَانِہٖ وَ اَسْکَنَہٗ بِحَبُوْحَۃِ جِنَانِہٖ۔

فرمایا شیخ نے جو بڑے پیشوا ہیں اور سردار ہیں مارک ماسوا اللہ ہیں عارف خدائے عزو جل ہیں اور پرہیز گار ہیں یعنی ضیاء الدین حجۃ الاسلام ان کا قول فعل دین واسلام میں دلیل ہے ہر دو طایفہ اور ہر دو فریق کے مقتدا ہیں ہر در سے مراد دونوں فریق دونوں طایفہ یعنی انسانُ واجنا ہیں ابو نجیب عبدالقاہر محمد سہروردی، سہرورد بغداد کے قریوں میں سے ایک قریہ ہے اور شیخ وہیں کے رہنے والے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو اپنے رحمت کی چادر میں چھپالے اور ڈھانک لے۔تـغـمـدہ کا معنی اس کو چھپانا اور اس کو داخل کرنا ہے۔الـغـمـدُ کا اصل لغوی معنی تلوار نیام میں کرنا اور ساکن کرنا ہے اللہ تعالیٰ ان کو اپنے درمیان بہشت میں جگہ دے۔

الـحـبـوحـۃ الـوسـطُ اس سے مراد جنت میں داخل ہونا ہے اور وہ جو کہا قَالَ الشَّیْخُ الْاِمَامُ الْاَجَلُّ الی آخرہ وہ مقولہ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کا نہیں ہے۔

قـولـہ: اِعْلَمْ اَرْشَدَکَ اللّٰہُ تَعَالٰی اَنَّ کُلَّ طَالِبٍ لِشَیْءٍ لَابُدَّلَہٗ اَنْ یَّعْلَمَ مَاھِیَتَہٗ وَحَقِیْقَتَہٗ حَتّٰی یَتَکَامَلَ لَہُ الرَّغْبَۃُ فِیْہِ

(ارشاد شیخ ہے) تو جان خدائے عز و جل سیدھی راہ دکھائے یہ بات محقق ہے کہ جو شخص کسی چیز کا طالب ہے اس کو اس چیز کی حقیت اور ماہیت کا جاننا ضروری ہے تا کہ اس چیز میں اس کو کامل رغبت حاصل ہو۔

طالب تین ہیں۔ طالب دنیا، طالب عقبیٰ، طالب مولیٰ، طالب مولیٰ وہ ہیں کہ جن کو سلطان ہمت کہتے ہیں وہ ایسے ہیں کہ نہ دنیا میں قدم رکھتے ہیں نہ آخرت کی طرف خیال کرتے ہیں جیسا کہ کہا ہے لَیْسَ لَهُ هِمَّةٌ سِوَاهُ (ان کی ہمت خدا کے سوا کسی اور طرف نہیں جاتی)۔مثنوی۔

این طایفہ راچنیں شرشتند — نے در غم دوزخ و بہشتند
ہر چہ آں نیست پشت پائے زدہ — چنگ در حضرت خدائے زدہ

(ان کو نہ دوزخ کا غم ہے نہ بہشت کا ان حضرات کی یہی سرشت ہے انہوں نے آستانہ (الٰہی پر ہاتھ مارا ہے اس ذات کے سوا جو کچھ ہے اسے لات مارا ہے) اس موقع پر خدا بہتر جانتا ہے کہ حضرت شیخ رحمتہ اللہ علیہ کی طالب سے مراد طالب مولیٰ ہے۔

(تو مطلب یہ ہوا کہ) طالب کو اس کے سوا چارہ نہیں ہے کہ وہ مولیٰ کو جانے اور پہچانے جہاں تک کہ خلیق کے حق میں اسکی معرفت حاصل کرنا ممکن ہے تا کہ اس طلب میں اس کو کامل رغبت حاصل ہو۔اور حضرت شیخ نے وہ جو کہا ہے اَنْ یَّعْلَمَ مَاهِیَتَهٗ وَحَقِیْقَتَهٗ (کہ اس چیز کی ماہیت و حقیقت جاننا ضروری ہے) یہ اس لئے کہ ہر چیز کی معرفت اس چیز کی ماہیت اور حقیقت کی معرفت "حاصل کرنے سے مکمل ہوتی" ہے جب تک اس کو نہ جانے گا اس کے طلب میں کامل رغبت نہیں ہوسکتی لیکن یہاں یہ راہ بند ہے۔اس لئے کہ یہ محال ہے کہ کوئی شخص خداوند تعالیٰ کو بہ اعتبار معرفت حقیقی کے پہچانے جو کہ اپنی صفات ربوبیت کی کنہہ سے، عالم کو محیط ہے۔ اَلّا اللّٰهُ سُبْحَانَهٗ وَتَعَالیٰ (الآیہ کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ ہی اللہ کو جانتا ہے) اسی حقیقت کو کسی نے کہا ہے۔

مثنوی۔

ہیچ دل رایکنہِ او رہ نیست　　　جان وعقل ازکمانش آگہ نیست

انچہ نزدتو پیش ازاں رہ نیست　　　غایت وہم تست اللہ نیست

(اللہ کی کنہ تک کسی دل کوراہ نہیں، جان وعقل اس کے کمال سے آگاہ نہیں فکر کی وہ منزل جس سے آگے تجھے راہ نہیں ملتی تیرے وہم کی انتہا ہے اللہ نہیں) تو طالب کے لئے معرفت ماہیت وحقیقت الٰہی حاصل کرنا اسی قدر ضروری ہوگا جس قدر کہ خلق کے لئے ممکن ہے اور لازمی طور پر یہی مقدار معرفت کی معرفت ذات کے جگہ پر ہوتی۔ بیت۔

این چہ درگاہ است قفلش بے کلید　　　دیں چہ دریائیست تعرش ناپدید

(یہ کون سادربار ہے جس کے قفل کی کنجی نہیں، یہ کیسا دریا ہے جس کی تہہ معلوم نہیں)

قولہ: وَلَا يَصِحُّ لِاَحَدٍ اَنْ يَّسْلُكَ طَرِيْقَ الصَّوْ فِيَةِ اِلَّا بَعْدَ اَنْ يَّعْرِفَ عَقَائِدَهُمْ وَاٰدَابَهُم فِي ظَاهِرِهِم وَبَاطِنِهِمْ وَيَفْهَمَ اِطْلَاقَاتِهُمْ فِيْ مُحَاوَرَاتِهِمْ وَيَعْلَمَ اِصْلَاحَاتِهِمْ فِي كَلِمَاتِهِمْ.

(ارشاد شیخ ہے) کسی شخص کے لئے یہ درست نہیں ہے کہ صوفیوں کی راہ میں داخل ہو مگر اس کے کہ وہ جان لے ان کے عقیدتوں کو اور ان کے آداب ظاہری کو یعنی جو.......

نقل ہے کہ بعض متکلموں نے خواجہ ابن عطار رحمتہ اللہ علیہ سے کہا کہ اے اہل تصوف تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اپنے درمیان تم لوگوں نے کچھ الفاظ مقرر کر لئے ہیں اور الفاظ مروجہ کو چھوڑ بیٹھے ہو کہیں ایسا تو نہیں کہ تمہارے مذہب میں کوئی عیب ہے کہ جس کی پردہ پوشی ہے خواجہ ابن عطار رحمتہ اللہ علیہ نے جواب دیا بات ایسی نہیں ہے اصل میں مجھے اپنا مذہب، اپنی روش، بہت پیاری ہے غیرت کی بنا پر میں یہ نہیں چاہتا کہ میرے ہم مشربوں کے علاوہ دوسرے لوگ ان رموز سے بہرہ ور ہوں۔

اور ایک دوسری بات یہ ہے کہ چونکہ حق تعالیٰ نے اپنے ولیوں کو خلق کے درمیان چھپا

رکھا ہے تو اولیا کے لئے یہ جائز ہوا کہ وہ اپنے رموز کو چھپا رکھیں اگر ولیوں کے اسرار ظاہر ہو جائیں تو اولیاء بھی ظاہر ہو جائیں گے جب اولیا خود راز ہیں تو یہ اولیٰ تر ہے کہ ان کا راز بھی راز سربستہ ہی رہے۔

یہ تمام بیان صوفیا کی اصلاح کے رمز ہونے کی معذرت میں گذرے تو جو شخص رمز د اشاروں سے ان کے واقف ہوگا وہی ان کے مذہب سے بھی واقفیت حاصل کرے گا۔ بیت۔

سلیمانی ہمیں باید کہ مرغاں راز بان داند　　　　سلیماں نیستی آخر زبانِ مرغ کے دانی

(سلیمانی ایسی چاہئے کہ پرندوں کی زبان کو سمجھے جب تو سلیمان نہیں ہے تو پرندوں کی زبان کب سمجھ سکتا ہے۔

قولہ:　حَتّٰی یَصِحَّ لَهُ اَنْ یَّحْذُوَ حَذْوَ هُمْ وَیَقْفُوَ اٰثَرَ هُمْ فِی اَقْوَالِهِمْ وَاَفْعَالِهِمْ فَاِنَّهُ مِنْ کَثْرَةِ الْمُدَّعِیْنَ جُهِلَ حَالُ الْمُحَقِّقِیْنَ وَفَسَادُ الْفَاسِدِیْنَ اِلَیْهِمْ یَعُوْدُ وَلَا یَقْدَحُ فِی صَلَاحِ الصَّالِحِیْنَ.

(ارشادِ شیخ ہے) یہ اس لئے کہ طالب کے لئے پیروی سنت میں خود کو ان کے برابر کرنا درست ہو اور طالب ان لوگوں کے اقوال وافعال اور معاملات میں ان کی پیروی کر سکے کیونکہ یہ بالکل درست اور سچ ہے کہ جھوٹے مدعیوں کی نقص کی وجہ سے محققین کا حال مخفی اور پوشیدہ ہو گیا ہے اور مفسدوں کا فساد انہیں کی طرف لوٹے گا۔ صالحین نیکو کاروں کی صلاح نیکوں میں کوئی عیب ونقصان نہیں پیدا کرے گا۔ یَحْذُوْا، یُقَابِلُ کے معنیٰ ہیں اَلْحَذْوُ تَقْدِیْرُ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ (کسی کے قدم بقدم چلنا) یعنی جیسے خود یہ صوفیائے محققین قولاً فعلاً اعتقاداً خود کو سنت کے برابر بنائے ہیں طالب بھی اپنے کو اعتقاداً قولاً فعلاً ان کے برابر بنائے گا۔ یَقْفُوَ یعنی یَتْبَعُ (اتباع کرے گا) جُهِلَ یعنی اِخْتَفٰی (پردہ میں ہوگا) یعنی جب جھوٹے مدعیوں کے نقائص سے محققین کا حال خلق کی نگاہوں سے مخفی اور پوشیدہ ہو گیا تو ایسا گمان کرنے لگے کہ اس مذہب صوفیہ کی کوئی اصل

نہیں ہے ہرگز ایسی بات نہیں بلکہ یہ مذہب سچا اور حق ہے نقص جو ہے وہ مدعیوں کے مذہب میں ہے نہ کہ اصل مذہب میں اسی بنا پر اگر کسی نے طعن کیا ہے تو وہ مدعیوں کے نقص پر ہے نہ کہ اصل مذہب پر اور مفسدوں کا فساد بھی انہیں کی طرف لوٹے گا نہ صلحا کی درستگی پر اس کی مثال یوں ہے کہ اگر کوئی شخص علماء میں عیب دیکھے تو وہ اس عیب والے کی عیب جوئی ہوگی اور عیب جوئی عیب رکھنے والے کی جانب لوٹے گی تمام شریعت کا علم رکھنے والوں کی جانب نہیں لوٹے گی کیونکہ ظاہر ہے کہ اسلام شریعت کے علم ہی پر قائم ہے

پھر شیخ رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں چونکہ مدعیوں کی تعداد بہت ہے محققین اور مقتدا کے احوال خلق پر پوشیدہ ہیں محقق کو مدعی سے علیحدہ کر کے پہچانا مشکل ہوگیا ہے اسی بنا پر میں نے یہ کتاب تصنیف کی تاکہ محقق اور مدعی میں تمیز ہو سکے اور محققین کی اقتدا کر کے آدمی راہ پائے اور مدعی کی اقتدا سے بچے اور آدمی گمراہ نہ ہو۔

اور حضرت شیخ کا یہ جملہ وَيَقْفُوْ اٰثَرَهُمْ فِي اَقْوَالِهِمْ وَ اَفْعَالِهِمْ اس معنی کی جانب اشارہ کرتا ہے کہ بیان عذر کیا گیا ہے یعنی ایسے حال میں جب کہ کوئی چاہے کہ صوفیائے حق کی راہ چلے اور کوئی ایسا شخص نہ ملے جو اس کی رہبری کرے تو اسی لئے یہ کتاب تصنیف کی تاکہ اس کتاب کے مطابق عمل کرے تو امید ہے کہ مقصود کو پہنچے۔

قولہ: فَنَبْدَأُ بِذِكْرِ عَقَائِدِهِمْ وَمَذَاهِبِهِمْ فِي اَصْلِ الْاِعْتِقَادِ.

(ارشاد شیخ ہے) تو اب ہم پہلے ان حضرات کے اصل اعتقاد میں ان کے عقیدے اور ان کے مذہبوں کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ کوئی جماعت ایسی نہیں ہے جس پر کہ اتنا زیادہ جھوٹ باندھا گیا ہو جتنا کہ اس جماعت پر، اور کسی جماعت پر اتنا زیادہ بہتان نہیں رکھا ہے جتنا کہ اس گروہ پر حالانکہ اس جماعت کے اصحاب تمام خلق سے برتر بزرگ ہیں اس کا سبب یہ ہے کہ ہر ایک گروہ کے لوگ کسی نہ کسی چیز سے آسودہ ہیں اور اس گروہ کو دونوں جہاں آسودہ و سیر نہیں

کر سکتے جب تک کہ وہ خدا تک نہیں پہنچ جائیں۔ جب ان کی دولت ونعمت عالی ہے تو یقیناً لوگ ان سے حسد کریں گے اور یہ محسود ہوں گے یہاں تک کہ اس حسد میں لوگوں نے ان پر جھوٹ اور بہتان بھی باندھا۔ یہی وہ مقام ہے کہ حضرت رسالت پناہ ﷺ نے یہ دعاء کی ہے اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ مَحْسُوْدًا و لا تجْعَلْنِیْ حَاسِدًا (اے اللہ تو مجھے محسود بنانا حاسد نہ بنا۔)"سبحانہ اللہ" کیسے اور کس درجہ کے لوگ ہیں کہ حضرت رسالت علیہ السلام نے دعا وزاری کے ذریعہ خداوند تعالیٰ سے یہ درخواست کی ہے اَللّٰھُمَّ اَحْیِنِیْ مِسْکِیْنًا وَّاَمِتْنِیْ مِسْکِیْنًا وَاحْشُرْنِیْ مَعَ الْمَسَاکِیْنَ خداوندا حیات وممات میں مجھے مسکینوں کے ساتھ رکھ اور میرا حشر مسکینوں کے ساتھ فرما۔ (اگر فرماتے کہ ان مسکینوں کو زندگی اور ممات میں میرے ساتھ رکھ اور ان کا حشر میرے ساتھ فرما تو دولت کی کمی نہ ہوتی پھر یہ کیوں فرمایا کہ حیات وموت میں مجھے ان کے ساتھ رکھ اور میرا حشر ان کے ساتھ فرما تو ان مسکینوں کے دولت ونعمت کی توصیف کون کرسکتا ہے۔ اور یہ کہ اپنے ارشاد کو رمزواشارات ہی میں فرمایا۔ یہ اس لئے کہ حاسدان کے اندرون احوال کو سمجھ نہ سکیں اور یہ لوگ مَسکَنت کے پردہ میں جیسے مستور ہیں ویسے ہی ان کا حال بھی مستور رہے۔

نقل ہے کہ ایک رات خواجہ جنید بغدادی رحمۃ اللہ اٹھے یہاں تک کہ مسجد شونیزؒ جو اولیاء کی جگہ ہے اس کے حد تک پہنچے ایک ہولناک اور ناگوار صورت والے کو مسجد کے در پر کھڑا دیکھا فرمایا تو کون ہے کہ تیری جانب سے میرے دل کو انکار ہے کہا میں ابلیس ہوں کہ جناب کو میرے دیکھنے کی آرزو تھی فرمایا کہ ہاں تجھ سے ایک مسئلہ دریافت طلب ہے اس نے کہا کہیے ارشاد ہوا کہ کیا تیری پہنچ تیرا دست رس فقیروں تک ہے؟ اس نے کہا نہیں پوچھا کہ اس کا سبب کیا ہے اس نے جواب دیا کہ جب چاہتا ہوں کہ ان کو دنیا میں گرفتار کروں (یعنی دنیاوی ساز وسامان میں پھنساؤں) تو یہ عقبیٰ کی طرف بھاگ جاتے ہیں اور جب چاہتا ہوں کہ عقبیٰ میں پکڑوں (یعنی عقبیٰ کی آرائش زیبائش میں مبتلا کروں) تو یہ مولیٰ کی بارگاہ میں پہنچ جاتے ہیں اور وہاں میری رسائی نہیں۔

پھر پوچھا کہ تجھے ان کے احوال کی خبر ہوتی ہے کہا نہیں مگر سماع میں جس وقت ان کو وجد ہوتا ہے تو اس وقت میں جانتا ہوں کہ ان کو کیا حال پیدا ہوا ہے۔ یہ کہا اور غائب ہو گیا۔ خواجہ جنید مسجد میں متفکر داخل ہوئے مسجد کے ایک گوشہ سے آواز آئی اے پسر دیکھ اس دشمنِ دین کی بات میں نہ آنا کیوں کہ اللہ کے فقرا اس سے کہیں زیادہ عزیز ہیں کہ جبرئیل و میکائیل کو ان کے حال کی اطلاع دی جائے اس دشمن کو کہاں دیں گے جب خواجہ جنید نے آواز کی جانب نظر اٹھائی تو دیکھا کہ ان کے پیر خواجہ سری سقطی رحمتہ اللہ علیہ تھے اس سے ان کا وقت خوش ہوا۔

بندگی شیخ رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی کتاب میں ابتدا ان حضرات کے اعتقاد سے کی ہے تا کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ ان پر جو تہمت والزام رکھتے ہیں وہ بیجا ہے اور جو کچھ ان کے بارے میں لوگ کہتے ہیں یہ حضرات اس سے پاک ہیں اور سبھوں پر خدا تعالیٰ کی ذات وصفات میں ان کے اعتقاد کی پاکی روشن ہو جائے سبھوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ لوگوں کے درمیان یہ حضرات مظلوم ہیں اس سبب سے کہ خلق نے جو ان کے حق میں طعن کیا ہے یا ان کے ساتھ جو سختیاں کی ہیں ان کی طرف سے سبھوں کو یہ جواب دیا گیا ہے۔ بیت۔

نہ ہمرے تو مرا راہ خویش گیر و برو　　　ترا سلامت باده مرا نگو نساری

(تو برا ساتھی نہیں اپنی راہ لے اور جا، تو سلامت رہ مجھے سرنگوں رہنے دے) اور ہر قوم کے مذہب کو ان کے بیان سے واضح طور پر سمجھا جا سکتا ہے یا ان کی کتاب سے جب ایسی جماعت نہ پائیں کہ ان کے مشرب کی بات ان سے دریافت کریں تو ان کی کتابوں کی جانب لوٹنا چاہئے تا کہ ان کا مذہب جان سکیں کیوں کہ ہر آدمی اپنی کتاب اپنے مذہب کے اصول و قوانین پر تصنیف کرتا ہے۔

شرح آداب المریدین

فصل-۱

صوفیوں کے معتقدات میں

قولہ: وَاجْمَعُوا عَلیٰ اَنَّ اللّٰہَ تَعَالیٰ وَاحِدٌ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَلَا ضِدَّلَہٗ وَلَا نِدَّلَہٗ وَلَا شَبِیْہَ لَہٗ مَوْصُوْفٌ بِمَا وَصَفَ بِہٖ نَفْسَہٗ وَمُسَمّیٰ بِمَا سَمّیٰ بِہٖ نَفْسَہٗ. (ارشاد شیخ ہے) اس گروہ صوفیہ کا اس پر اجماع ہے یہ درست ہے. ور سچ ہے کہ خدائے عزوجل ایک ہے اس کا کوئی شریک نہیں اس کا کوئی مقابل نہیں اس جیسا کوئی نہیں اس کے مشابہ کوئی نہیں۔

اللّٰہ- یہ اسم اسم ذات خداوند تعالیٰ ہے۔ جملہ صفات ربوبیت کا یہ جامع ہے اور اپنے اس معنی کے دلالت میں پورا ہے ان ناموں کی طرح جو نام رکھے جانے والی ذات کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔ اس اسم کے مشتق ہونے میں جس قدر گفتگو کی گئی ہے اس میں بہت تکلف کیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ اسم اللہ تعالیٰ کے اسم ہونے کے لئے مخصوص ہے اس حد تک کہ اس کا اطلاق اس کے سوا پر درست نہیں نہ حقیقتاً نہ مجازاً بخلاف اس کے دوسرے اسماء کو کہ ان کا اطلاق اس کے سوا پر مجازاً جائز ہے جیسے کریم ورحیم۔ دوسرے ناموں کے متعلق یہ تصور کیا جاسکتا ہے کہ بندوں میں سے کوئی اس صفت سے متصف ہو مجازاً ہاں اسی حد تک جتنا کہ بندہ کے حق میں سوچا جاسکتا ہے بخلاف اس کے نام اللہ وہ مخصوص ہے خداوند عزوجل کی ذات پاک کے لئے اس میں کسی کا حقیقتاً یا مجازاً شریک ہونا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ اسم رحمٰن بھی اسی طرح ہے باوجود یہ کہ وہ اسمائے صفات میں سے ہے پھر بھی یہ درست نہیں ہے کہ اس نام کو اس کے سوا کے لئے بولا جائے کیونکہ

اسم رحمٰن بھی اپنی خصوصیت میں بمنزلہ اسم اللہ کے ہے۔ اسی بنا پر حق تعالیٰ نے کلام مجید میں دونوں ناموں کو یکجا لایا ہے اور ارشاد ہوا قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَيًّا مَّا تَدْعُوا ۔ (آپ کہہ دیجئے کسی دن جب پکارنا چاہو اللہ نام سے پکارو یا رحمٰن نام سے پکارو برابر ہے) سوال- جب واحد فرمایا شریک کی نفی کی پھر فائدہ لاشریک لہ کا کیا ہے؟ جواب- اس نفی سے ان لوگوں کے قول کی نفی مراد ہے کہ جو واحد کہتے ہیں اور اس کے ساتھ شریک کے بھی قائل ہیں۔ اور شرح مشارق میں مولانا شمس الدین یحییٰ نے ''لاشریک لہ'' کے متعلق لکھا ہے کہ یہ تاکید کے لئے آیا ہے اور اہل معرفت اس مقام میں کہتے ہیں کہ توحید میں عاشقوں کی خوشی کا راز یہ ہے کہ وہ ایک ہے۔ اس بنا پر اس کی پوری خدمت کر سکیں گے جب دو کا تصور ہوگا محبت بھی منقسم ہو جائے گی محبت میں تقسیم کا ہونا محبت نہ ہونے کی دلیل ہے یعنی کمال محبت نہیں ہے اور یہ بھی کہ جب دو ہوگا تو ان میں کا ایک دوسرے کا بدل ہوگا۔ (یعنی دوسرے کا عوض) ہو سکے گا اور ایسا محبوب جس کا عوض دوسرا ہو سکے محبت کے لائق نہیں۔

اس بات کی دلیل کہ وہ ایک ہی ہے یہ ہے کہ اگر دو ہوتا آپس میں ان کے اختلاف بھی ہوتا بایں طور کہ ایک حیات چاہتا اور دوسرا موت اگر دونوں کی مراد پوری ہوتی تو تصادم لازم آتا اس طرح کہ ایک ذات ایک ہی آن میں زندہ بھی رہے اور مردہ بھی اور یہ محال ہے اور اگر ان دونوں کی مرادوں میں دونوں کی مراد پوری نہ ہوتی تو دونوں کا عاجز ہونا لازم آتا اور خدائی کے لئے عاجز ہونا لائق نہیں اور اگر دو میں ایک کی مراد بر آتی اور دوسرے کی نہ بر آتی تو وہ دوسرا عاجز ہوتا اور عجز الوہیت کے لائق نہیں۔

تو سمجھ لو کہ الوہیت میں شرکت کی گنجائش نہیں جیسے کہ وحدت میں دوئی کی گنجائش نہیں۔ اہل وحدت کے نزدیک دو موجود کا اثبات شرک ہے جیسے شرع میں دو معبود کا ہونا شرک ہے۔ کیونکہ اہل وحدت کہتے ہیں کہ وجود کی دو قسم ہے۔ وجود حقیقی و وجود خیالی وجود حقیقی وجود خدا ہے اور وجود خیالی وجود عالم۔ عالم خیال و نمائش ہے۔ بہ اعتبار حقیقت وجود نہیں رکھتا۔ ہاں وجود حقیقی ہی کی جو وجود خدا ہے کی یہ خاصیت ہے کہ یہ خیالی وجودات موجود دکھائی دیتے ہیں جیسے کہ کوئی موجود پانی

میں یا آئینہ میں یا خواب میں نظر آتے ہیں لیکن حقیقت میں اس کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔

اور اہل تصوف کہتے ہیں کہ عالم اور اہل عالم سب کے سب ایک وجود حقیقی رکھتے ہیں مگر وجود خدائے تعالیٰ قدیم ہے اور وجود عالم حادث ہے اور جب اہل وحدت پر اعتراض کرتے ہیں کہ ہم لوگ کس طرح خیال ونمائش ہیں کیونکہ ہم میں سے بعضے وہ ہیں جو عالم خوشی میں ہیں اور بعضے ناخوشی میں اور بعضے رنج میں اور بعضے راحت میں اور اسی طرح دوسرے مختلف احوال۔ تو اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ تم نے کبھی خواب نہیں دیکھا ہے؟ کہ جب کسی کو کوئی خواب میں ڈراتا ہے تو وہ شخص رنج میں ہوتا ہے اور کسی کو نوازتا ہے تو وہ آرام میں ہوتا ہے۔ لیکن اس میں شبہہ نہیں ہے کہ دونوں خیال ونمائش ہیں۔ ہاں خیال ونمائش تو ہے لیکن اس خیال ونمائش کا تعلق ایک حقیقت سے ہے۔ جب اس خیال ونمائش سے گذر کر آدمی حقیقت تک پہنچ جاتا ہے تو اسی کو معبر کی تعبیر کہتے ہیں کیونکہ معبر خواب کے اس خیال سے گذار کر حقیقت تک پہنچاتا ہے۔ (صوفیہ کہتے ہیں کہ یہ عالم اور اہل عالم) اسی طرح خیال ونمائش ہوتے ہوئے ایک حقیقت کو بتاتے ہیں اور وہ حقیقت خداوند عز وجل کا وجود ہے اور جو لوگ کاملانِ راہ ہیں ان کی حیثیت معبر کی ہے اس طور سے لوگوں کو اس خیال و نمائش سے گذار کر خدائے تعالیٰ کے وجود کی حقیقت کی خبر دیتے ہیں۔

یہی وحدت ہے جو طالبان راہ کا مطلوب سالکان طریقت کا مقصود ہے ایک سالک پورے طور پر جب وحدت کو پہنچتا ہے تو دیکھ لیتا ہے اور جان لیتا ہے کہ ہستی صرف خدائے تعالیٰ کو ہے۔ تو کثرت اٹھ جاتی ہے شرکت ختم ہو جاتی ہے حلول واتحاد کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ قرب و بعد باقی نہیں رہتا فراق ووصال بھی جدا ہو جاتا ہے بس صرف خدا رہتا ہے جل جلالہ اور خدا ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا لیکن یہ سب کچھ تو سالک کا جال و پندار تھا اس نے سمجھا تھا کہ خدا کا بھی وجود ہے اور اس کا غیر بھی ایک وجود رکھتا ہے۔ اب اس خیال و پندار سے باہر آیا یقین کے علم سے گذر کر عین الیقین کو دیکھا اور اس نے جانا کہ وجود ایک سے زیادہ نہیں اور وہ وجود صرف وجود خدا ہے عز وجل۔ اسی موقع پر کہا گیا ہے کہ۔ مثنوی۔

دوئی رانیست رہ در حضرت تو　　ہمہ عالم توئی و قدرت تو

وجود کون وظل حضرتِ تست ہمہ آثار صنع حضرتِ تست

(تیری جناب میں دوئی کو راہ نہیں سارا عالم تو ہے اور تیری قدرت ہے کائنات کا وجود تیری حضوری کا ظل ہے، یہ تمام آثار وجود تیری قدرت اور صنعت کاری ہے۔ (ارشاد شیخ ہے) کہ اس کا ضد نہیں۔ کیونکہ ضد میں ایک دوسرے کا مثل ہوتا ہے اپنی ضدیت میں۔ تو جیسے اس کا کوئی ضد نہیں ہے اس کا کوئی نِد (شریک) بھی نہیں ہے ضدیت کی ایک دوسری حقیقت یہ ہے کہ دونوں ضد آپس میں ایک دوسرے کی نفی کرتے ہوں اور دو ایسے جو آپس میں ایک دوسرے کی نفی کرتے ہوں ایک ہی محل میں اور ایک ہی زمانہ میں یکجا نہیں ہو سکتے۔ جیسے حرکت وسکون تو خلق اگر خدا کا ضد ہوتے تو خلق کا وجود ایک ہی وقت میں خالق کے موجد رہتے ہوئے نہ ہوتا اب جبکہ خلق بھی موجود ہے اور خالق بھی تو یہ صحیح ہے کہ خلق حق کا ضد نہیں ہے۔ (اور ارشاد شیخ ہے) اس کا نِـد نہیں یعنی اس کی مانند نہیں ہے کیونکہ خداوند تعالیٰ کی صفات کے لئے یہ بات منع ہے کہ مخلوق میں سے کوئی اس کا مانند ہو کیونکہ جو صفت اللہ کی ذات کو ہے مخلوق کو نہیں ہے اور جو مخلوق کو ہے اس سے اللہ پاک ہے اس عبارت سے یہ بات ظاہر ہوگئی کہ اس کے مانند کوئی نہیں۔ اب رہی یہ بات کہ ایک نام جو خدا کو ہے اور بندہ کے لئے بھی بولا جاتا ہے جیسے رحیم وکریم۔ اس سے وہم پیدا ہوتا ہے کہ مخلوق کو خالق سے تشبیہ ہے اور یہی وہم مخلوق کے تشبیہ کی اول وآخر ظاہر وباطن، قریب وبعید وغیرہ سب میں ہوتا ہے۔ لیکن یہ تشبیہ اُٹھ جاتی ہے اس طرح کہ مخلوقات میں ایک ہی وقت ان چیزوں میں سے ایک ہی ایک چیز کا اطلاق ہوتا ہے ایسا نہیں ہوتا کہ اول بھی ہو اور آخر بھی ظاہر بھی ہو باطن بھی قریب بھی ہو بعید بھی بلکہ جب تم مخلوق کے لئے اول کہو تو آخر کی نفی ہوتی ہے اور آخر کہو تو اول کی نفی ہوتی ہے بخلاف اس کے اللہ جل شانہ اول بھی ہے اور آخر بھی اور ایسا کہنا ایک ہی وقت میں جائز ہوتا ہے اور کوئی تصادم لازم نہیں آتا۔ اسی طرح ''مخلوق کے لئے'' جب ظاہر کہو تو باطن کی نفی ہوتی ہے اور جب باطن کہو ظاہر کی نفی ہوتی ہے لیکن ذات خدا کے لئے ایک ہی وقت میں ظاہر وباطن کہنا لائق ہوتا ہے اور یقیناً تضاد لازم نہیں آتا۔ اسی طرح مخلوق کے لئے جب تم نے قریب کہا تو بعید کی نفی ہوئی اور جب بعید کہا تو قریب کی نفی ہوئی لیکن خدا کے لئے ایک ہی

وقت میں قریب بعید کہنا لائق ہوتا ہے اور کوئی تضاد لازم نہیں آتا۔ ہاں اس تقریر سے، ثابت ہوا کہ خدا کا ظاہر میرے ظاہر کی طرح نہیں۔ اس کا باطن میرے باطن سے مشابہت نہیں رکھتا اول و آخر قریب و بعید ایسے تمام اسماء وصفات الٰہی کا یہی حال ہے یعنی جب علم مذکورہ اسماء وصفات سے تشبیہ اٹھ گئی تو اللہ کے تمام اسماء وصفات سے باقی نہیں رہی اس لئے کہ خدائے تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ ایک ہی وقت مخلوق میں تم ایسا نہیں پاؤ گے کہ وہ ظاہر بھی ہو اور باطن بھی قریب بھی اور بعید بھی اول بھی ہو اور آخر بھی۔ "خدا کے یہ کہنے کا مطلب" کہ میں ہی اول ہوں اور میں ہی آخر" میں ہی ظاہر ہوں اور میں ہی باطن میں ہی قریب ہوں اور میں ہی بعید۔" خدا کے اسی اعلان کی جانب اشارہ ہے کہ (اس طرح تم سمجھو کہ میرا ظاہر تمہارے ظاہر کی طرح نہیں اور میرا باطن تمہارے باطن کے مانند نہیں میری اولیت تمہاری اولیت کے مانند نہیں اور میری آخریت تمہاری آخریت کے مانند نہیں میر قربیت تمہاری قربیت کی طرح نہیں اور میری بُعدیت تمہاری بعدیت کے مانند نہیں۔ (ارشاد شیخ ہے) اور اس کا کوئی شبہ نہیں (اس کی مشابہت بھی نہیں) یہ اس لئے کہ دو چیزیں آپس میں مشابہ ہوتی ہیں تو اس چیز میں جس میں مشابہت ہے باہم شریک ہوتی ہیں اور شریک ہونے کا حکم لگایا جاتا ہے تو اگر اس کے لئے کوئی مشابہ ہوتا "مشابہت کی دو شکل ہوگی" باہر حیثیت سے مشابہہ ہوگا یا کسی بعض حیثیت سے اگر حیثیت سے مشابہت ہوگی تو اس کو بھی ہر حیثیت سے اللہ کہنا لائق ہوگا ایسی صورت میں دو اللہ کا ہونا لازم آئے گا۔ اور دو اللہ کا ہونا محال ہے یا اگر بعض حیثیت سے مشابہت ہوگی اس میں بھی جس حیثیت سے مشابہت رکھنے والے کو الوہیت لازم آئے گی اور یہ بھی محال ہے یہ محال اس لئے کہ جب اس کے سوا کسی دوسرے کو ہر حیثیت الوہیت درست نہیں ایسی طرح بعض حیثیت سے بھی درست نہیں کیونکہ دو الٰہ میں جو فساد لازم آتا ہے ہر حیثیت سے اللہ ہونے میں، وہی فساد بعض حیثیت سے بھی ہونے میں لازم آتا ہے۔ یہ اسی طرح ہے جیسے اہل وحدت کی نظر میں واجب الوجود بذاتہ اگر ایک ہے تو دوسرا کوئی موجود نہیں بلکہ دو موجود ماننا شرک ہے مثال اور شبہ ماننے میں بھی وہی سوال وارد ہوتا ہے کیونکہ ان دونوں میں بھی دو ماننا پڑے گا۔ مثال بھی دو کے درمیان ہوتی ہے اور مشابہت بھی۔ جیسا کہ

کسی نے کہا ہے۔بیت

چون ہر چہ ہست در ہمہ عالم ہمیں منم　　　　مانند در دو عالم آز آنم پدید نیست

(جب سارے عالم میں جو کچھ ہے مین ہی ہوں، تو دونوں عالم میں میرا مانند نہیں میری مثال نہیں)۔سوال-نام اور صفت دونوں ایک ہی ہیں یا نام اور ہے اور صفت اور؟ جواب-لفظ کے لحاظ سے اسم اور صفت اور ہے...... (لفظ کے لحاظ سے تعریف کی جائے گی) کہ اسم ایک ایسا لفظ ہے جو اس ذات کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کا وہ نام ہے اور صفت موصوف کے متعلق کچھ زیادہ معنوں کو بتاتا ہے لیکن از روئے شرع کوئی فرق نہیں کیونکہ حدیث شریف میں آیا ہے اِنَّ اللّٰہِ تَعَالیٰ تِسْعَةٌ وَّتِسْعِیْنَ اَسْمَاء (بیشک اللہ تعالیٰ کے لئے ننانوے اسماء ہیں) اور یہ معلوم ہے کہ یہی ننانوے صفت بھی ہیں اس کے باوجود نہیں کو شریعت میں نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اور یہ جو کہا گیا ہے مَوْصُوْفٌ بِمَا وَصَفَ بِہٖ نَفْسَہٗ کہ وہ موصوف ہے اپنی ان صفات سے (جس کے ذریعہ اپنی صفات کے معلق وصف کرتا ہے) باوجود یہ کہ مخلوق اس کی ان صفات سے توصیف کرے یا نہ کرے۔اس موقع میں وصف کرنے سے مراد بیان میں لانے کے ہیں ان صفات کو جس میں وہ اپنی ذات میں قائم ہے (یہاں وصف سے) یہ مطلب نہیں ہے کہ وصف کرنے والے جو توصیف بیان کرتے ہیں اس کا لگاؤ الگ سے اس کی ذات کے ساتھ ہے۔

اور معتزلین نے تو یہ کہہ دیا کہ اس کے صفات ہی نہیں وہ کہتے ہیں کہ اس کی صفت اس کے بندوں کا اس کی وصف کرنا ہے (یعنی اس کے صفات کہنے سے تو یہ نوعیت ہو جائے گی کہ وہ وصف اس میں ہے جس سے بندے اس کی توصیف کرتے ہیں) مثلاً اسے عالم کہتے ہیں اور قادر کہتے ہیں وہ صرف اپنے اسماء سے مسمیٰ ہے، مزین کہ مخلوق اسے اس نام سے پکارے یا نہ پکارے۔

اہل سنت وجماعت کے یہاں حق تعالیٰ اپنے اسماء سے مسمّٰی ہے کیونکہ اس نے خود مجھ کو حکم دیا ہے اپنی وحدانیت پر ایمان لانے کے لئے اور اس کی ذات کی وحدانیت پر ایمان لانا واجب (اسی لئے) ہم ایمان لاتے ہیں اور اس موقع پر اس کا نام لیتے ہیں۔اگر اس کی ذات کسی خاص نام

سے مسمّٰی نہ ہوتی تو اس عالم میں کسی کا ایمان لانا درست نہ ہوتا۔'' اس پر مزید بیان یوں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے ذات کی پہچان کرائی اپنے صفات اور اپنے نام کہہ کر۔ اور اس نے چاہا کہ اسی طرح ہم لوگ اس کو پہچانیں اب اگر وہ اپنے صفات سے موصوف نہ تھا اور اپنے اسماء سے مسمّٰی نہ تھا تو اس موقع پر اپنے ذات کی پہچان کرانا اس کا اپنے وصف اور اسم کے ذریعہ کیسے درست ہوتا حاصل یہ کہ جب ہم نے اس کو پہچانا اس سے کہ اس نے اپنے وصف کا تذکرہ کیا یہی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ایک اسم سے مسمّٰی ہے اور صفات سے موصوف ہے۔ اور اسم اور مسمّٰی (میں کوئی الگ قید لگانا یہ بھی درست نہیں) دونوں ایک ہی ہیں جیسا کہ عقائد میں مذکور ہے۔

لیکن تمہیدات (عین القضاۃ ہمدانی) میں یہ ذکر آ گیا ہے کہ اسم نہ عین مسمّٰی ہے نہ غیر مسمّٰی ویسے ہی جیسے صفت اور مجموع السائریں میں یہ ذکر آیا ہے کہ اسماء دو قسم کے ہیں ایک حقیقی اور ایک مجازی، اسم حقیقی تو وہ ہے جو اس چیز کے لئے نشان بنا اور وہ اس چیز کے ساتھ ہوتا ہے اور وہ اس چیز کو دوسری چیز سے الگ شناخت کراتا ہے اور اسم مجازی وہ ہے جو محض نشان بنتا ہے اس کے سوا اس چیز سے معیت کا لگاؤ نہیں (اسم اور مسمّٰی ایک ہے اس سلسلہ میں) جو دوسری رائے ہے وہ اسی اسم مجازی کی جانب گئے ہیں اور اسی اسم کو عَلَم کہتے ہیں۔

حاصل یہ کہ علماء کے درمیان جو یہ اختلاف ہے کہ اسم عین مسمّٰی ہے یا غیر مسمّٰی اس کی شکل یہ ہوگئی ہے کہ جو عین مسمّٰی کہتے ہیں وہ اسم حقیقی مراد لیتے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ اسم حقیقی عین مسمّٰی ہے اور دوسرے وہ لوگ جو اسم کو غیر مسمّٰی کہتے ہیں ان کی مراد اسم مجازی ہے اور اس مین شبہ نہیں کہ اسم مجازی غیر مسمّٰی ہے۔ اس بنا پر اس طائفہ کا اجماع ہے کہ خداوند تعالیٰ کے لئے حقیقی صفات ہیں وہ اپنے ان صفات سے موصوف ہے مثلاً علم، قدرت اور دوسرے صفات۔

معتزلیاں صفات کے منکر ہیں حَی کہتے ہیں مگر حیات نہیں عَالِم کہتے ہیں اور علم نہیں قَدِر کہتے ہیں قدرت نہیں اور دوسرے صفات میں بھی ایسا ہی کہتے ہیں اور خداوند تعالیٰ کے مسمّٰی ہونے میں بھی وہ کہتے ہیں کہ وہ مسمّٰی ہے اسم کے ساتھ لیکن اس کی تسمیہ نہیں۔ اور اس مسئلہ میں ہمارے اور معتزلیوں کے درمیان اختلاف ہے، ہم لوگوں کے نزدیک خداوند تعالیٰ اپنی صفتوں سے

موصوف ہے خواہ خلق اس صفت سے توصیف کرے یا نہ کرے معتزلیوں کے نزدیک خداوند عز و جل کے صفات نہیں ہیں اس کی صفت بندوں کا اس کی وصف کرنا ہے جیسے اس کو عالم کہتے ہیں قادر کہتے ہیں۔

اور نزدیک اہل سنت و جماعت کے عالم ہے اپنے علم سے اور قادر ہے اپنی قدرت سے اگرچہ خلق اس کو قدر کہے یا نہ کہے۔

بندوں کا عالمیت اور قادریت کے ساتھ اس کی وصف کرنا حکایت کرنا ہے اس وصف سے کہ جو صفت اس کی ذات کے ساتھ قائم ہے اور اس قول پر دلیل ہے کہ جس نے اس کی بیان کی ہوئی صفت سے توصیف کی وہ صادق ہوا اور جس نے اس کے بیان کی ہوئی صفت کے خلاف توصیف کی وہ کاذب ہوا۔ اگر وہ اپنی صفت سے موصوف نہ ہوتا صادق و کاذب کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ وہ گروہ جو صادق ہوئی وہ اس سبب سے ہوئی کہ انہوں نے وہی کہا جیسا کہ وہ ہے۔ اور وہ گروہ جو کاذب ہوئی اس سبب سے ہوئی کہ اس نے وہ بات کہی جیسا کہ وہ نہیں ہے تو یہ درست ہوا کہ وہ اپنی صفات سے موصوف ہے نہ وصف کرنے والوں کی وصف ہے۔ اور یہ بھی اس پر دلیل ہے کہ خلق نے جو اس کے وصف کی راہ پائی وہ اس سے پائی کہ اس نے اپنی وصف آپ فرمائی، اگر وہ اپنی وصف نہ بیان فرماتا تو کوئی اس کے وصف کی راہ نہ پاتا۔ اور اسی اصل کی بنا پر اہل سنت و جماعت کہتے ہیں کہ ہم تو اسی وصف سے اس کی توصیف کرتے ہیں جس سے اس نے اپنی توصیف آپ کی ہے اور اسی نام سے ہم اس کو پکارتے ہیں جو نام کہ اس نے اپنے لئے بیان کیا ہے۔ اگر وہ اپنا نام نہ بیان فرماتا اور اپنی توصیف نہ کرتا تو کوئی اس دو جہاں میں اس کا نام زبان پر نہ لاتا اور کوئی کسی چیز سے اس کی وصف نہیں کرتا تو جب اس نے اپنے لئے نام ذکر فرمایا اور اپنی توصیف فرمائی خلق اس کے کہے کو دہراتے ہیں اور اس کے کہے ہوئے پر نہ زیادتی کرتے ہیں اور نہ کمی کرتے ہیں تو یہی بات سمجھنے کی ہے کہ خلق حقیقتاً اس کی وصف کرنے والے نہیں ہیں بلکہ اسی کے بیان کئے ہوئے کو دہرانے والے یا حکایت کرنے والے ہیں اور یہ ایسا ہے کہ اس نے خود اپنا نام رکھا نہ یہ کہ کسی اور نے اس کا نام رکھا۔

اصل یوں ہے کہ اسماء کے تین درجے ہیں ایک اسمائے ذات، دوسرے اسمائے صفات، تیسرے اسمائے افعال۔ اسماء ذات جیسے حَیٌّ وقَدِیم اسمائے صفات جیسے قَادِرٌ وحَکِیم اسمائے افعال جیسے خَالِقٌ و رَازِقٌ، اس گروہ کا اس پر اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء نہ تو محدود ہیں نہ معدود نہ متناہی ہیں۔ لیکن ہم جو اس کا ذکر کرتے ہیں یا اس کے لئے جو الفاظ لاتے ہیں یہ اسماء محدود ہیں معدود ہیں اور متناہی ہیں۔ اہل معرفت کا کہنا ہے کہ خداوند تعالیٰ نے اپنے صفات کے سلسلے میں مخلوق پر اسی قدر ظاہر کیا جتنا ان میں سننے کی طاقت تھی لیکن اس کے وصف کا کمال وہی جانتا ہے اور بس۔ اور اگر وہ جانتا ہے اپنے عظمت وجلال کے سلسلے میں اور دوسری صفات کے سلسلے میں مخلوق پر اگر ظاہر کرے تو تمام اولین وآخرین نیست ہو جائیں کیا دیکھا نہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ جو کچھ جانتے تھے ظاہر نہیں کیا اور فرمایا لَوْ تَعْلَمُوْنَ مَا اَعْلَمُ لَضَحِکْتُمْ قَلِیْلاً وَّ لَبَکَیْتُمْ کَثِیْراً (اگر تم جان لیتے جو میں جانتا ہوں تو تم بہت کم ہنستے اور بہت زیادہ روتے رہتے) صحیح ہے کہ آپؐ جتنا جانتے تھے وہ ایسا تھا کہ امت کو اس کے کہنے کا موقع نہ تھا اگر کہنے کی راہ ہوتی تو آپؐ نہ رکتے اور جب ایسا ہو سکتا ہے کہ رسول اللہ صفات الٰہی سے اتنا جانیں کہ مخلوق کو کہنے کی راہ نہ ہو، حق تعالیٰ کے لئے تو اس کا حق زیادہ ہے کہ وہ اپنے صفات کو اتنا جانے کہ مخلوق کو کہنے کا موقع نہ ہو اس سے بات سمجھ میں آگئی ہو گی کہ مخلوق کے لئے اللہ کے صفات کی معرفت کی راہ اسی قدر ہے جتنا کہ بندوں کی قدرت میں ہے نہ اتنا جتنا کہ اسماء وصفات، الٰہی کے لائق ہے اسی پر نگاہ تھی کہ ایک عارف نے کہا وَاللّٰهِ مَا عَرَفَ اللّٰهَ غیرہ (خدا کی قسم اللہ کی معرفت کسی کو نہ ملی جتنا کہ خود اسکو ہے) اور اس موقع کے لئے کہنے والے نے کتنا اچھا کہا ہے۔ بیت

ہیچ دل را بکنہ او رہ نیست — جان وعقل از کمالش آگہ نیست

(اللہ کی کنہ میں کسی دل کو راہ نہیں، جان وعقل کو اس کے کمال سے آگاہی نہیں)

قولہ: "وَلَیْسَ بِجِسْمٍ فَاِنَّ الْجِسْمَ مَا کَانَ مُؤلَّفاً وَالْمُؤلَّفُ یَحْتَاجُ اِلیٰ مُؤلِّفٍ وَلَا هُوَ بجَوْهَرٍ فَاِنَّ الْجَوْهَرَ مَا کَانَ مُتَحَیِّزاً وَالرَّبُّ لَیْسَ بِمُتَحَیِّزٍ لِاَنَّهٗ مُنَزَّهٌ عَنِ الْمَکَانِ فَلَا یَکُوْنُ مُتَحَیِّراً اَوْ جَوْهَراً بَلْ هُوَ خَالِقُ کُلِّ مُتَحَیِّرٍ وَحَیِّزٍ. وَلَا هُوَ

بِعَرُضٍ فَانَّ الْعَرَضَ لَایَبْقیٰ زَمَانَیْنِ وَالرَّبُّ وَاجِبُ الْبَقَاءِ۔''

(ارشاد شیخ ہے اور وہ جسم نہیں ہے یہ حقیقت ہے کہ جسم وہ ہے جو مرکب ہوتا ہے اور مرکب ترکیب دینے والے کا محتاج ہوتا ہے۔ تو یہ بھی درست نہیں ہے کیونکہ خداوند تعالیٰ کی ذات پاک واجب الوجود ہے اور واجب الوجود غیر کا محتاج نہیں ہوتا۔ تو ''نتیجہ کے طور پر'' وہ مرکب نہیں ہوا'' دوسری وجہ یہ ہے'' کہ ترکیب میں کم از کم دو چیزیں چاہئے تاکہ ترکیب کو قبول کرے۔ اللہ کی ذات احد حقیقی ہے ایک ہی ہے مرکب ہونا اس کے لئے محال ہے۔

(ارشاد شیخ ہے) اور وہ جوہر نہیں ہے۔'' یہ حقیقت ہے کہ جوہر وہ ہوتا ہے جو مکان قبول کرتا ہے یعنی اس کی جانب اشارہ کیا جا سکے کہ یہاں ہے یا وہاں اور پروردگار مکان گیر نہیں بلکہ وہ ہر ایک صاحب مکان اور مکان کا خالق ہے تو جوہر کہنا بھی درست نہیں کیونکہ خداوند تعالیٰ کی ذات پاک مکان سے منزہ ہے تو وہ کسی مکان میں محدود نہیں ہوگا اور جب مکان میں محدود نہیں ہوگا تو جوہر نہیں ہوگا۔

(ارشاد شیخ نے فرمایا) اور وہ عرض نہیں ہے یہ حقیقت ہے کہ عرض کو دو زمانوں میں بقا و دوام نہیں، اور پروردگار واجب البقاء ہے یہ تو عرض کہنا بھی درست نہیں ہے کیونکہ عرض کی تعریف یہ ہے کہ وہ زمانہ بدلنے کے بعد باقی نہ رہے عرض ماننے پر یہ لازم آئے گا کہ ذات پاک خداوند تعالیٰ کبھی موجود ہوگا اور کبھی معدوم باوجود یہ کہ خداوند تعالیٰ ہمیشہ تھا ہمیشہ ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ عرض یا تو اجسام کی صفت ہے یا جوہر کی اور خداوند تعالیٰ دونوں سے منزہ ہے جیسا کہ قبل کہہ چکے۔

عین القضاۃ رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مجھے اس سے شرم آتی ہے............ کہ متکلمین خداوند تعالیٰ کی تنزیہہ و تقدیس اس طرح کرتے ہیں کہ خداوند جسم نہیں ہے جوہر نہیں ہے عرض نہیں ہے، اور اپنے خیال میں یہ سمجھتے ہیں کہ یہ بہت بڑا کام ہے یہ ایسا ہی ہے کہ جیسے کوئی کہے کہ اس شہر کا بادشاہ اینٹ نہیں ہے پتھر نہیں ہے کیا یہ اس کی مدح ہوگی؟ قسم ہے اس خداوند جل علا کے عزت کی کہ اس نے اٹھارہ ہزار عالم پیدا کئے ہیں اور سارے عالموں سے کمترین عالم، عالم

اجسام ہے۔ اَخَسُّ اَنْوَاعِ الْمَوْجُوْدَاتِ الصُّوَرُ (یعنی عالم صورت موجودات کی ساری قسموں میں خسیس ترین قسم ہے) اب جبکہ ہم لوگ ناجنسوں کی صحبت میں مبتلا ہو گئے ہیں تو ایسے لوگوں کی زبان میں گفتگو کرنا چاہئے تا کہ سرکار مصطفیٰ ﷺ کی خدمت حدیث (ارشاد) پر عمل بھی ہو جائے جیسا کہ فرمایا ہے۔ مَنْ کَانَ لَهٗ فَلْیَتَعَابْ لَهٗ (جس کے پاس لڑکا ہو اسے چاہئے کہ اس بچہ کے لئے خود کو بچہ جیسا بنا لے) خدا شاہد ہے، مجھ پر یہ کام اس سے زیادہ مشکل ہے کہ میرے آگے ایک بچہ کو بٹھائیں اور مجھے کہا جائے کہ اس بچہ کو حروف ہجا الف ب پڑھاؤ ایسا اس لئے کہ اس میں کسی بے ادبی کا خطرہ نہیں رہتا ہے بخلاف اس کے جب مجھ کو کہنا پڑتا ہے کہ اس کائنات کا بنانے والا جسم نہیں ہے، جوہر نہیں ہے، عرض نہیں ہے۔ اس موقع پر تمام دیگر مواقع سے مجھے زیادہ شرم آتی ہے (پھر بھی کیا کیا جائے انسان کیلئے مالا گزیر ہے) ضرورت کے وقت حرام چیزیں بھی مباح کر دی جاتی ہیں۔

قولہ: وَلَا اِجْتِمَاعَ لَهٗ وَلَا اِفْتِرَاقَ لَهٗ وَلَا اَبْعَاضَ لَهٗ.

(ارشاد شیخ ہے) ''اس کو اجتماع نہیں اس کو افتراق نہیں اس کو ابعاض نہیں''۔ کیونکہ اجتماع میں دو جمع ہونے والا چاہیئے اور افتراق کے لئے دو متفرق ہونے والا اجتماع اور افتراق کہنا درست نہیں ہوگا جب تک دو چیز نہ ہو، اور ہم نے ثابت کر دیا کہ ذات پاک خداوند تعالیٰ اور احد حقیقی ہے، جب احد حقیقی ہوا تو نہ اجتماع رہے گا نہ افتراق اور ایسا ہی ابعاض کیونکہ بعضیت رکھنے والے دو حصے باوجود یہ کہ ظاہر میں ایک دکھائی دیتے ہیں لیکن حقیقت میں ایک نہیں ہوتے اور ذات پاک خداوند تعالیٰ حقیقت میں ایک ہے تو اس کو ابعاض نہیں ہوگا کیونکہ احد حقیقی ہے۔

قولہ: وَلَا یُزْعِجُهٗ ذِکْرٌ. (ارشاد شیخ ہے) اسے کوئی ذکر برانگیختہ نہیں کرتا''۔ یعنی اس پر کوئی ذکر اثر نہیں ڈالتے کیونکہ جو چیز متاثر ہوگی وہ محدث ہوگی نہ قدیم، الازعاج (اکسانا)

قولہ: وَلَا یَلْحَقُهٗ فِکْرٌ (ارشاد شیخ ہے اس کو کوئی فکر لاحق نہیں ہوتی کیونکہ فکر کا اثر کسی کیفیت یا کسی محدود چیز میں یا کسی احاطہ کی ہوئی چیز میں ہوا کرتی ہے اور خداوند تعالیٰ کی ذات پاک ان تمام چیزوں سے منزہ ہے۔ تو فکر کی اس تک راہ نہیں۔ فکر کا معاملہ تو اس کی ذات سے ایسا

ہی ہے جیسے چیونٹی جو چاہے کہ اپنے کمزور پاؤں سے چل کر ہندوستان سے مکہ کی راہ طے کرے، محال ہے محال بلکہ ضلال ہے ضلال۔ بیت

راہے کہ فرشتگاں دراو پر نہ نہند آں راہ بپائے خود بریدن نتواں

(وہ راہ جہاں فرشتے پر نہ لگائیں اس راہ کو اپنے پاؤں سے طئے کرنا کس طرح ہوسکتا ہے)

قولہ: "وَلَا یَلْحَقُهُ الْعِبَارَات" اور نہ کوئی عبارت اس کو لاحق ہوسکتی ہے" یعنی ذات پاک خداوند تعالیٰ کو کسی عبارت سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا لیکن یہ کہ اس کو بے چوں و بے چگوں بے مثال و بے شبہ کہا جائے ظاہر ہے بے مثالی و بے شبہ ہونے کے لئے کیا عبارت لائی جاسکتی ہے۔

قولہ: "وَلَا تُعَیِّنُهُ الْاِشَارَاتُ" اور کوئی اشارہ اس کو معین نہیں کرتا۔ کہ اس جگہ ہے یا اس جگہ ہے کیونکہ اینجا و آنجا مکان اور صاحب مکان کے لئے آتا ہے اور خداوند تعالیٰ کی ذات پاک مکاں گیر نہیں تو اینجا و آنجا کہنا یہ بھی درست نہیں جیسا کہ جوہریت کی نفی میں گذرا تو جب اینجا و آنجا کی گنجائش نہیں اشارہ کو بھی وہاں دخل نہیں جو چیز اشارات کی تحت میں آتی ہے وہ اشارہ کے تحت ہوتی ہے اور خداوند تعالیٰ سب میں بالا ہے تحت نہیں۔ اور جو چیز عبارت میں آتی ہے عبارت سے مغلوب ہوتی ہے اور خداوند تعالیٰ غالب ہے نہ مغلوب۔

قولہ: "وَلَا یُحِیْطُ بِهِ الْاَفْکَارُ اور اسے افکار نہیں گھیر سکتے کیونکہ احاطت اس چیز میں ہوگی کہ جو چیز محصور و محدود ہو اور خداوند تعالیٰ کی ذات پاک محصور و محدود نہیں تو احاطت بھی اس کیلئے درست نہیں۔

عجب تماشہ ہے کہ جب جان آدمی میں شامل ہے (اور آدمی کی یہ کیفیت ہے) کہ آدمی نہ اس کا محل جانتا ہے اور نہ اس کی کیفیت اور نہ اس کی ماہیت کا علم رکھتا ہے پھر جب انسان خود اپنی ذات کی کیفیت و ماہیت و محل سمجھنے میں ایسا تحیّر ہے تو اس کی فکر خدا کے معاملہ میں کہاں راہ پائے گی۔

ایک بزرگ نے اسی موقع پر کہا ہے کہ مبرا در دابدی ہے اور اسی تحیر کے عجز میں نہ تنہا آدمی ہی مخصوص ہے بلکہ ملک فلک عرش و کرسی، لوح و قلم اور اٹھارہ ہزار عالم اس معاملہ میں عاجز ہیں۔ سبحان اللہ کیا عزت ہے کیا عظمت ہے اور کیا جلالت ہے کیا قدرت ہے اور کیسی کبریائی

ہے۔ یہی حقیقت ہے اس جملہ کی جو خواجہ جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ سب سے بڑا جملہ توحید میں وہ ہے جو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ سُبْحَانَ مَنْ لَمْ يَجْعَلْ لِخَلْقِهِ سَبِيلاً اِلیٰ مَعْرِفَتِهٖ اِلَّا بِالْعِجْزِ عَنْ مَعْرِفَتِهٖ (پاک ہے اس پروردگار کی ذات جس نے اپنے مخلوق کے لئے اپنی معرفت کے معاملہ میں کوئی راہ نہیں رکھی۔ بجز اس کے کہ اس کی معرفت میں عجز کا اظہار کریں)۔

قولہ: وَلَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ اور نہ آنکھیں اس تک پہنچ سکتی ہیں۔ یعنی کوئی آنکھ اسے ادراک نہیں کر سکتی کیونکہ ادراک کیفیت پر پڑتی ہے اور خداوند تعالیٰ کے لئے کیفیت نہیں، قیامت میں آنکھیں دیکھیں گی مگر بلا کیفیت، جیسے کہ آج پہچانتے ہیں مگر بلا کیفیت کے بخلاف رویت (دیدار) کے کہ رویت موجود پر ہوتی ہے خداوند تعالیٰ موجود ہے تو رویت کے متعلق قول درست ہوگا۔ یہاں میرے لئے ایک اصل کی تشریح ملتی ہے اوو وہ یہ ہے کہ ہر چیز جو شناخت میں آتی ہے اس کی شناخت اس طرح ہوتی ہے جیسے وہ چیز ہے۔ اگر بے کیف و بے جہت ہے تو اس کی شناخت بھی ویسے ہی ہوگی اور اگر وہ چیز کیفیت و جہت کے ساتھ ہے تو اس کی شناخت بھی کیف و جہت کے ساتھ ہوگی یہی حال رویت کا ہے کوئی چیز جو دیکھی جاتی ہے اس کا دیکھنا اس طرح ہوتا ہے جیسے وہ ہے اگر وہ چیز کیف و جہت کے ساتھ ہے تو اس کے دیکھنے میں کیفیت و جہت بھی آئے گی اور اگر وہ چیز کیف و جہت والی نہیں ہے تو اس کے دیکھنے میں کیف و جہت کا کیا سوال۔

قولہ: وَكُلُّ مَاتَصَوَّرَهُ الْوَهْمُ اَوْحَوَاهُ الْفَهْمُ فَاللّٰهُ بِخِلَافِهٖ". (ارشاد شیخ ہے) اور ہر وہ چیز جس کو وہم تصور کرتا ہے یا فہم جس کو پاتا ہے خدائے تعالیٰ اس کے علاوہ ہے۔ اسی کو کسی نے کہا ہے۔ بیت۔

انچہ نزد تو پیش ازاں راہ نیست　　　غایت وہم تست اللہ نیست

(جس سے آگے تیرا ذہن نہیں جاتا وہ تیرے فہم کی انتہا ہے اللہ کی نہیں)

کیونکہ وہم وفہم کی محسوسات ومثلیات میں پہنچ ہے اور ذات پاک خداوند تعالیٰ ان سب سے منزہ ہے تو وہ نہ وہم میں آ سکتا ہے اور نہ فہم میں سما سکتا ہے۔ اَلْوَهْمُ الذِّهْنُ وہم ذہن

ہے حواہ کے معنی اس کو جمع کرنا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ وہم میں جس کی تصویر آتی ہے یا فہم جس کو اپنے گھیرے میں لیتا ہے یا تو وہ جوہر ہوتا ہے یا جسم ہوتا ہے یا عرض اور ذات پاک خداوند تعالیٰ ان سب سے منزہ و مقدس ہے۔اور یہی ہے حضرت امیر المومنین علی کرم اللہ وجہ کے اس قول کے معنیٰ جب کہ ان سے پوچھا گیا کہ توحید کیا ہے فرمایا تو جانتا ہے اور جہاں تک تیرے خیال کی پرواز ہوتی ہے خدا اس کے سوا ہے۔اسی کو کسی نے کہا ہے۔مثنویات۔

چون بروں از کجاو کئے بود او گوشۂ خاطر تو کے بود او

وصف او زیر علم نیر و نیست ہر چہ در چشمت آید آن او نیست

(کہاں اور کب کے سوال سے جب وہ باہر ہے تو تیرے گوشۂ دل میں کیسے سما سکتا ہے اس کی تعریف علم کی طاقت سے باہر ہے جو کچھ نظر آتا ہے یا آئے وہ اس کے علاوہ ہے وہ (وہ نہیں ہے)

صوفیان طریقت کا شرب یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ کو پوری طرح کوئی نہیں جانتا بس اس کو اتنا ہی جانتے ہیں کہ ''ہے'' اور یہہ جاننا اسی قدر ہے کہ اس کو نجات مل جائے گی لیکن اس کے جاننے میں دعویٰ کمال کا نہیں کرتے طریق معرفت میں جتنا بھر کہا گیا ہے اور جتنے کی خبر دی گئی ہے یا دی جاتی ہے قبول کر لیتے ہیں اور اقرار کرتے ہیں کہ جتنا بھر اس نے فرمایا ہے اتنا ہی ہم جانتے ہیں لیکن خود اس کی ذات عظیم اس سے بہت بالا ہے کہ ہم اس کے کمال تک پہنچیں۔

پاک ہے اس پروردگار کی ذات جس نے اپنے اولیا کو معرفت کے اعلیٰ درجوں پر پہنچا کر اپنے جانب پہنچنے کی راہ معرفت اپنی پھیلی ہوئی عطیات کے ذریعہ اپنے دوستوں کو دی انہیں بصارت بخشی کہ حق ان کی نظر میں آجائے۔انہیں بصیرت موہبت کی تا کہ وہ مخلوق میں فکر کر سکیں اللہ تعالیٰ کے ان دوستوں نے طالبین کے لئے وصول الی اللہ کے آداب بتائے،اور سلوک کے مقاصد ومطالب جو کچھ ہیں ظاہر کئے۔

پاک ہے اس اللہ کی ذات جس نے اپنے دلیوں کو معرفت کے اعلیٰ درجہ تک پہنچایا اور اپنے جانب پہنچنے کی راہ اپنی پھیلی ہوئی عطیات کے ذریعہ انہیں معلوم کرایا۔

اللہ کے رسول پر صلواۃ ہو جب تک زمین قایم رہے اور اونچے آسمان، جب تک اعلیٰ جنت الفردوس کی نعمت رہے اور صلواہ ہو رسول کی آل کرام پر اور ان کے اصحاب پر جو بہت ہی عظیم بھلائیوں والے تھے اور اُن پر جو زمانہ میں منفرد ہیں۔ امن امان کے سبب ہین۔ وہ جو خلق کے استاد ہیں۔ علوم ظاہر میں، اور شیخ ہیں باطنی معنیٰ کے بیان میں، جو شریعت کے دقیق نکتوں کو بتانے والے ہیں، طریقت کی حقیقتوں کو ظاہر کرنے والے ہیں، وہ جو دین کے طالب علموں کے لئے علم سلوک کے اصول وقوانین کو ظاہر کرنے والے ہیں اہل دنیا میں، امراء اور ملوک کی مشغولیتوں میں نصیحت کرنے والے ہیں۔ وہ ذات گرامی جو تمام لوگوں میں دینی معاملات میں فضیلت رکھنے والے ہیں۔ دنیاوی ضرورتوں سے لوگوں کو اپنے انعام واکرام کے ذریعہ نجات دینے والے ہیں۔ ہاں وہ ذات گرامی کثیر العلم ہے، شیخ محقق ہیں، صاحب مقامات ہیں، احوال عالیہ رکھتے ہیں، فضائل عالیہ کی نگاہ رکھنے والے ہیں۔ ارباب طریقت میں صاحب اوصاف، اصحاب حقیقت میں سربراہ ہیں، اہل حق ویقین کے مقتدا ہیں۔

وہی ذات گرامی جو دین وملت کے شرف ہیں شرف الدین احمد ابن یحیٰ منیری اللہ ان کی بقا کو طول دیکر مسلمانوں کو یہ متاع عنایت کرے۔ ہمیشہ رکھے اللہ تمام مومنین کے لئے ان کی زیارت کی نعمت۔ اللہ رحم کرے ان تمام لوگوں پر جو میری ان دعاؤں میں آمین کہیں اور اللہ انہیں معاف کرے اپنے نبی اور ان کے جمیع آل کی حرمت کے واسطہ سے۔

حمد ونعت کے بعد یہ بندہ اللہ کی ذات غنی کی رحمتوں سے امید رکھتے ہوئے کئے گئے ہیں لیکن اس کو وہی جانتا ہے اور بس۔ جیسا کہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں وَاللّٰہِ مَا عَرَفَ اللّٰہَ سِوَاہُ (خدا کی قسم اللہ کو کسی نے نہیں پہچانا بس یہ کہ وہ خود کو خود جانتا ہے) یہی بات کہی گئی ہے کیونکہ ہر چیز کی معرفت اس کی ہیئت اور ماہیت کی معرفت کے بعد حاصل ہوتی ہے اور اس ذات پاک کو نہ ماہیت ہے نہ ہیئت تمہیدات (عین القضاۃ ہمدانی) میں یہ تذکرہ آگیا ہے کہ جب تو چاہے کہ کسی چیز کو پہچانے تو اس کے لئے تجھے اس کی ہیئت جاننے کی ضرورت ہوتی یا محتاجی ہوتی ہے اس کے بعد اس کی ماہیت پھر اس کی کمیت پھر کیفیت پھر اس کی ملیت لیکن صانع

رب العزت کی معرفت اس کو حاصل ہے ان تمام چیزوں کے بغیر بلکہ وہ مبرّا ہے ھَل (کب) مَا (کیا) ولَم (کتنا) کَیف (کیسا) لِمَا (کس لئے) (وغیرہ کے سوال سے جو محسوسات میں ہر چیز کے ساتھ پیدا ہوتا ہے)۔

قولہ: وَاِنْ قُلْتَ اَیْنَ؟ فَقَدْ تَقَدَّمَ ھُوَ عَلَی الْمَکَانِ "۔

(ارشاد شیخ ہے) اور اگر تم سوال کرو کہ وہ کہاں ہے تو یہ حقیقت ہے کہ وہ مکان سے پہلے ہے۔ یعنی وہ تھا جب کہ مکان نہ تھا اب بھی وہ ویسے ہی ہے جیسے کہ تھا تغیر و تبدل اس کے لئے درست نہیں۔ اس موقع پر ایک عزیز نے کہا ہے محبّ مکانی و محبوب لا مکانی (محبت کرنے والا ایک مکان رکھتا ہے اور محبوب لا مکان ہے) عجب معاملہ ہے محبت کرنے والا اپنا مکان نہیں چھوڑ سکتا اور محبوب کسی مکان میں جا گزیں نہیں ہوسکتا تو یہ درد ابدی ہے۔ امیر المومنین علی ؓ سے پوچھا گیا کہ اَیْنَ کَانَ رَبُّنَا قَبْلُ عَنْ خَلْقَ الْعُرْشَ (عرش کے پیدا کرنے کے قبل ہمارا رب کہاں تھا؟) علی ؓ نے فرمایا یہ سوال مکان سے متعلق ہے خداوند تعالٰی تھا جب کہ مکان نہ تھا وہ اب بھی ویسے ہی ہے جیسے تھا۔

قولہ: عِلَّۃُ کُلِّ شَیْءٍ صُنْعُہٗ وَلَا عِلَّۃَ لِصُنْعِہٖ"۔

(ارشاد شیخ ہے) ہر چیز کی علت اس کی کاریگری ہے اور اس کے کاریگری کی کوئی علت نہیں۔ یعنی جملہ مصنوعات اور موجودات اس کی کاریگری سے موجود ہیں اور اس کے صفت کی کوئی علت نہیں کیونکہ وہ قدیم ہے اور قدیم علت سے پاک ہوتا ہے اگر ایسا نہ ہو تو محدث ہوگا اور جو محدث ہوگا وہ خدائی کے لائق نہیں یہ ہے۔ جس کو کہا ہے وَجُوْدُنَا مِنْہُ وَقِیَامُنَا بِہٖ (میرا وجود اس سے ہے اور میرا قائم رہنا اسی کے ذریعہ ہے)۔ بیت

من او نہ شوم ولیک بے او   واللہ کہ نہ ام یقینم این است

(میں وہ نہیں ہوں لیکن قسم اس کی کہ بے اس کے نہیں ہوں اور اس پر مجھ کو یقین ہے۔)

اسی موقع سے کہا ہے۔ چوں آمدنِ ما از دست رفتن با ہم بدوست (چونکہ ہم اسی سے ہوئے ہیں ہمارا لوٹنا بھی اسی کی طرف ہوگا) مِنْہُ بَدَاَ وَاِلَیْہِ یَعُوْدُ میں یہی راز ہے ایک بزرگ

نے کہا ہے لَاۤ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ ذات قدیم سے کوئی چیز جدا بھی نہیں اور اس سے متصل بھی نہیں تو یہ آنا اور جانا مجازی ہے اور یہ لمبی داستان ہے۔

قولہ: لَیْسَ لِذَاتِہٖ تَکَیُّفٌ وَلَا لِفِعْلِہٖ تَکْلِیْفٌ اِحْتَجَبَ عَنِ الْعُقُوْلِ کَمَا اِحْتَجَبَ عَنِ الْاَبْصَارِ.

(ارشادِ شیخ ہے) اس کی ذات کے لئے کیفیت نہیں اس کے فعل کے لئے تکلیف نہیں (اس کی ذات متکیف نہیں ہوتی اور وہ اپنے کسی فعل کے لئے مکلّف نہیں۔ مترجم) یعنی ذات پاک خداوند تعالیٰ کے لئے کیفیت نہیں کیونکہ کیفیت چگونی پر ہوتی ہے (کیفیت کا لفظ مثل رکھنے والے پر بولا جاتا ہے۔ مترجم) اور اس کی ذات پاک چگونی (مماثلت) سے پاک ہے وہ بے مثال بے کیف ہے جب حق تعالیٰ کا مثل نہیں شِبـــہ نہیں تو مجھ کو اس کی جانب اشارہ کا حق نہیں۔ جتنی شکلیں ہمارے تصور میں آتی ہیں حق تعالیٰ ویسا نہیں اور جہاں تک تیرے وہم کی رسائی ہے حق تعالیٰ وہاں نہیں وہ مثل کا مثل کرنے والا ہے مثل پیدا کرنے والے کا مثل محال ہے وہ تمام کیفیتوں کی کیف کا خالق ہے کیف سے مکیف کرنے والے کے لئے محال ہے۔ وہ تمام جنسوں کو جنس بنانے والا ہے جنس کو جنس بنانے والے کے لئے جنس محال ہے، وہ تمام مکانوں کو مکانیت دینے والا ہے اور مکان بنانے والے کے لئے مکان محال ہے۔ وہ اوقات کو وقت کی حالت بخشنے والا ہے اور وقت کو وقت بنانے والے کا خود وقت میں ہونا محال ہے، جس چیز سے اس کی طرف اشارہ کرو وہ اس کے سوا ہے اور جس عبارت سے اس کی تعبیر کرو وہ اس کے سوا ہے اور وہ جو کہا وَلَا لِفِعْلِہٖ تَکْلِیْفٌ (وہ اپنے فعل کے لئے مکلّف نہیں) یعنی مکلّف بنانا خداوند تعالیٰ کی صفت ہے کہ حکم دینے والا اور منع فرمانے والا وہ ہی ہے اور مکلّف ہونا یہ بندہ کی صفت ہے کیونکہ حکم پر چلنا اور نہی سے رکنا یہ بندہ کی صفت ہے اگر بندہ کو مکلّف بنانے والا مان لیا جائے تو صفات بندگی اس سے ختم ہو جائے گی اور اگر خداوند تعالیٰ مکلّف ہو جائے تو صفات خداوندی اس سے ختم ہو جائے گی اور یہ دونوں باتیں محال ہیں تو اللہ کا مکلّف ہونا بھی محال ہے۔ اور وہ جو متن میں فرمایا گیا اِحْتَجَبَ عَنِ الْعُقُوْلِ تا آخر کہ وہ پردہ میں ہے عقول سے جیسے کہ پردہ میں ہے آنکھوں سے، تو

پردہ میں وہ ہوتا ہے جو خود کو کسی پر ظاہر نہ کرے۔

محجب (پردہ میں ہونا) تو وہ محجب ہے'' یہ تو کہا جائے گا۔ مجوب ہے یہ نہیں کہنا چاہئے کیونکہ اس کے خلق نے اس کو مجوب نہیں کیا ہے (یعنی پردہ میں نہیں ڈالا ہے) بلکہ مخلوق خود اس سے پردہ میں آگئی ہے (خلق مجوب ہے) یہی بات ہے جو کہا ہے۔

مصرعہ- خورشید نہ مجرم است گر کسے بینا نیست۔ (آفتاب کا قصور نہیں اگر خود کوئی بینا نہیں) اور اہل معرفت کا اس پر اجماع ہے کہ اللہ کی جانب رہنمائی بھی خود اللہ کی طرف سے ہے جسے کہا گیا ہے۔ بیت۔

نیست از راہ وہم وعقل وحواس   بے خدا ہیچ کس خدائے شناس

(وہم وعقل وحواس کے ذریعہ جب تک خدا کی مدد نہ ہو کوئی راہ نہیں ہے اور نہ کوئی خداشناس ہو سکتا ہے)

نقل ہے کہ امام ثوری رحمتہ اللہ سے پوچھا کہ خداوند تعالیٰ پر کیا دلیل ہے؟ فرمایا کہ خدا کے لئے دلیل خود خدا ہے۔ کہا کہ پھر عقل کا کیا کام ہے؟ فرمایا عقل عاجز ہے۔ اور عاجز زیادہ سے زیادہ اپنے جیسے عاجز ہی کی رہنمائی کر سکتا ہے۔ اسی حقیقت کو کہا ہے عَرَفْتُ رَبِّی بِرَبِّیْ (مجھے رب کی پہچان رب کی جانب سے ہوئی) اور عقل کا کام بس اتنا ہی ہے کہ یا جسم دیکھے، یا جوہر سمجھے یا عرض کی شناخت کرے تو دو حال سے خالی نہیں یا یہ چیزیں ہونا خدا کے لئے جائز سمجھے۔ اس شکل میں (سمجھنے والا) کافر ہوگا یا جبکہ ان چیزوں میں اس کی مثال اس کا مشابہہ نہ پائے گا تو سرگرداں ہوگا۔ بول اٹھے گا میں تو انہیں چیزوں کے علاوہ کسی اور کو موجود نہیں پاتا اور جب خدا ان چیزوں جیسا نہیں ہے۔ تو نہیں ہے''

اس طرح سوچنے میں یا تو اس کی تشبیہ ٹھہرانے میں مبتلا ہوگا یا اس کا دین معطل ہو جائے گا۔

بات معلوم ہوئی کہ جب تک اپنی معرفت وہ خود نہ دے اس کو پہچانا نہیں جا سکتا ان تمام باتوں کا نچوڑ یہ ہے کہ حق کا پالینا طلب پر موقوف نہیں بلکہ اس کی عنایت پر ہے کہ وہ خود دے۔ یہ ضرور نہیں ہے کہ جو ڈھونڈے وہ پالے۔ ہاں جیسے وہ طالب نایافت میں رہے اور ایسے بھی ہیں جنہوں نے

تلاش نہیں کیا اور پالیا طلب کرنے میں تو کبھی برابر ہوتے ہیں پانے والوں میں فرق ہوتا ہے۔

قولہ: لَیسَ ذَاتُهُ کَالذَّوَاتِ. وَلَا صِفَاتُهُ کَالصِّفَاتِ.

(ارشاد شیخ ہے) اوروں کی ذات کی طرح اس کی ذات نہیں اور دوسروں کی صفات کی طرح اس کی صفات نہیں۔ کیونکہ تمامی ہستیاں جسم ہیں یا جوہر ہیں۔ اور اسکی ہستی نہ جسم ہے نہ جوہر ہے، اور ساری ہستیاں مکان میں ہیں یا زمانہ میں۔ اس کی ہستی نہ مکان میں ہے نہ زمان میں۔ تو ثابت ہوا کہ خداوند تعالیٰ کی ذات پاک ان میں کسی ایک کی ذات کے مانند نہ ہوگی اور نہ اسکی صفات کسی ایک کی صفات کی طرح ہوگی۔ کیونکہ محدثات کی صفات عرض ہیں اور اس کی صفات عارضی نہیں اس کی صفات کو ہمیشہ کی بقاء ہے اور اس کو فنا نہیں۔ اور محدثات کی صفات کو فنا لازمی ہے بقا نہیں ہے تو ثابت ہوا کہ خداوند تعالیٰ کی ذات اور اس کے جملہ صفات محدثات کی کسی ذات وصفات کے مانند نہیں۔ تو خدائے تعالیٰ کو اسی پاک توحید کے ذریعہ پہچانتا ہوں جو بے تعطل ہے اور اس کا کوئی مشابہہ نہیں۔ اور اس نعمتِ توحید پاک اور اسکی معرفت کی یافت پر اس کا شکر ادا کرتا ہوں۔ اور اس نعمت کی بقا خداوند تعالیٰ سے چاہتا ہوں۔ ایک بزرگ کا مقولہ ہے کہ جس کو دن کا ناشتہ عنایت فرمایا ہے امید ہے کہ شام کا کھانا بھی وہ دے گا۔

سوال: تو پھر خدا کے متعلق عارفوں کے معرفت کی انتہا کیا ہے؟

جواب: عارفوں کے معرفت خداوندی کی انتہا یہ ہے کہ خود کو معرفت حقیقی سے عاجز سمجھتے ہیں۔ اور ان کا اس حقیقت کو سمجھ لینا کہ انہوں نے خدا کی حقیقی شناخت نہیں کی کیونکہ یہ محال ہے کہ کوئی اس کی معرفت حقیقی کو پہچان لے۔ جب کہ وہ محیط ہے اپنی ذات وصفات کے کنہ ربوبیت سے، مگر حق سبحانہ تعالیٰ ہی حق سبحانہ تعالیٰ کو پہچانتا ہے۔ جب یہ معنیٰ ان کو حاصل ہوگیا اور ان پر منکشف ہوگیا تو یقین ہے کہ انہوں نے اس کو پہچان لیا اور وہ معرفت کی انتہا کو پہنچ گئے۔ اس حد کو جو مخلوق کے لئے معرفت خداوندی میں ممکن ہے۔

سوال: جب کہ اس کی ذات وصفات جو کہ اپنی کنہ سے محیط ہے اس کی معرفتِ حقیقی کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا ہے تو پھر معرفت میں فرشتے، انبیاء، اولیاء صلوٰۃ اللہ کے درجہ میں فرق

مراتب کیسے پیدا ہوا؟

جواب: اس کی معرفت کے دو طریقے ہیں ایک تو وہی معرفتِ حقیقی جس میں ذات اپنی کنہ ربوبیت سے محیط ہے، اس معرفت کی راہ بند ہے، اس کا حق خداوند جل علا کو ہے۔ معرفت کی دوسری راہ، اسماء اور صفات کی معرفت ہے اور یہ راہ مخلوق پر کھول دی گئی ہے۔ درجہ کا فرق ان لوگوں میں اسی طریقہ میں ہے، اس معرفت میں سب برابر نہیں ہیں۔ ایک شخص اتنا جانتا ہے کہ خداوند عالم ہے اور سب پر قادر ہے۔ یہ شخص معرفت میں اس شخص کے برابر نہیں ہے۔ جو اللہ کے عجائبات و آیات کو اس کے ملکوت اور آسمان زمین اور اس کی آفرینش، ارواح و اجساد میں مشاہدہ کرتا ہے۔ اسے مملکت الٰہی کے کرشموں کی اور حکمتوں کے باریکیوں کی اطلاع ہوتی ہے۔ تو خدا کا علم اور اس کے عجائبات و مقدرات کا علم، اور اس کے دنیا و آخرت، ملک اور ملکوت کے آیات کے کرشموں کا علم، جس پر جس مقدار میں جتنا زیادہ منکشف ہوگا خدا کی معرفت بھی اس کو اتنا ہی زیادہ ہوگی، اور اتنا ہی زیادہ وہ معرفت خداوندی سے نزدیک ہوگا۔

سوال: جب ذات کی حقیقت لوگ نہیں پہچانتے ہیں اور پہچاننا محال ہے تو اسماء اور صفات کی معرفت تمام و کمال حاصل کی جاسکتی ہے؟

جواب: آہ افسوس، تمام و کمال اسے بھی کوئی نہیں جان سکتا سوائے خدا کے اسی لئے تو کہا گیا ہے فَلَا یَعْرِفُهٗ سِوَاهُ (اس کو کوئی نہیں پہچانتا بس وہ خود اپنے کو جانتا ہے۔) اور یہ تمام بیان حضرت امام غزالی کی تقریر سے لیا گیا ہے اللہ ان پر رحمتوں کو وسیع کرے۔

وَلَيْسَ مَعْنَى الْعِلْمِ فِيْ وَصْفِهٖ نَفْيَ الْجِهْلِ وَلَا الْقُدْرَةِ نَفْيَ الْعِجْزِ (ارشاد شیخ ہے) خدا کی صفت میں، علم کے معنی جہل کی نفی کے نہیں ہیں۔ اور نہ قدرت کے معنی، عجز کی نفی کے ہیں۔ یعنی اہل سنت و جماعت کا اجتماع ہے کہ خدا تعالیٰ کے حقیقی صفات ہیں کہ وہ ان صفات سے موصوف ہے۔ جیسے علم، قدرت، معتزلیاں صفات الٰہی سے انکار کرتے ہیں وہ کہتے ہیں خداوند تعالیٰ عالم ہے اور اس سے ان کی مراد بس اس قدر ہوتی ہے کہ جہل کی نفی ہوجائے۔ ''ذات الٰہی میں'' علم کا اثبات نہیں کرتے۔ ایسے ہی جب قادر کہتے ہیں تو یہ مراد لیتے ہیں کہ وہ

عاجز نہیں ہے" قادر کہہ کے" قدرت کی اثبات نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں اگر خدا کے لئے میں صفات مان لوں تو اس طرح میں نے اسے ان صفات کا محتاج بنایا ہے اور گویا ہم نے یہ کہا ہے کہ وہ جو کچھ کرتا ہے بذاتِ خود نہیں کرتا بلکہ صفات کے ذریعہ کرتا ہے۔ اور وہ ذات جسے کسی کام کو انجام دینے کے لئے کسی چیز کی ضرورت پڑے وہ اس چیز کا محتاج کہا جائے گا اور کہا جائے گا کہ وہ غیر کی مدد سے کام کرتا ہے اور خدا کو کوئی دوسرا کام میں نہیں لگاتا۔ (بخلاف اس کے) اہل سنت و جماعت علم سے جہل کی نفی بھی کرتے ہیں اور علم کا اثبات بھی (اسی طرح) قدرت سے عجزُ کی نفی بھی کرتے ہیں اور قدرت کو ثابت بھی مانتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ اگر عالم کہہ کے محض جہل کی نفی کرنا ہے تو تمام جمادات بھی عالم عالم کہے جاسکتے ہیں کیوں کہ جمادات میں بھی جہل کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اس کے باوجود جمادات کو کوئی عالم نہیں کہتا یہ اس لئے کہ جمادات میں جیسے جہل نہیں ہے علم بھی نہیں ہے اور اگر عجز کی نفی کے لئے قادر کہا جاسکتا ہے تو جمادات کو بھی قادر کہنا چاہئے کیونکہ جمادات میں عجز بھی نہیں ہے باوجود اس کے جمادات کو قادر نہیں کہتے کیونکہ ان میں قدرت نہیں ہے ویسے ہی جیسے عجز نہیں ہے تو یہ حقیقت ثابت ہوئی کہ کسی ایک صفت کی نفی سے اس کے ضد کی نفی لازم نہیں آتی جب تک کہ وہ دوسری صفت جو اس کی ضد ہے وہ موجود نہ ہو۔

اس بیان سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ خداوند عزوجل کو محض جہل کی نفی کے لئے عالم نہیں کہتے بلکہ جہل کی نفی اور علم کے ثبوت کے لئے کہتے ہیں۔ (اسی طرح) محض عجز کی نفی کے لئے قادر نہیں کہتے یقیناً ہم عجز کی نفی اور قدرت کے ثبوت کے لئے کہتے ہیں۔ اللہ کی دوسری صفات میں بھی ہمیں یہی اصول سامنے رکھنا چاہئے۔

معتزلیوں کا جواب یہ ہے کہ کسی چیز کا محتاج اس وقت کہا جاتا ہے جبکہ اس چیز کے اس میں ہونے نہ ہونے دونوں کا امکان ہو۔ اس شکل میں جب وہ چیز ہوگی تو وہ مستغنی ہوگا اور جب نہیں ہوگا تو وہ محتاج ہوگا۔ صفات خداوندی ہم لوگوں کے یہاں واجبات میں سے ہے" جس میں صرف ہونے کا شائبہ ہو اور نہ ہونے کا نہیں" اب ایسی شکل میں احتیاج کا شبہ ہی باطل ہے۔

دوسری چیز یہ ہے کہ جب ایک ذات کسی چیز کی محتاج ہوتی ہے تو وہ چیز اس کے وجود پر

زاید ہوتی ہے اور جب وہ نہیں ہوتی ہے تو جو محتاج ہے وہ ناقص ہوتا ہے اور یہ خدا کے لئے جائز نہیں اور نہ جائز ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا بھی قدیم ہے اور اس کے صفات بھی قدیم۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ صفات کبھی نہ تھے اور ایسا ہرگز نہیں ہے کہ یہ صفات کبھی نہ ہوں۔ صفات جب قدیم ہوئے تو احتیاج کا سوال ہی محال ہے۔

قولہ: وَاجْمَعُوا علیٰ اِثْبَاتِ مَاذَکَرَہُ اللّٰہُ تَعَالیٰ فِی کِتَابِہٖ وَصَحَّ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ فِی اَخْبَارِہٖ مِنْ ذِکْرِ الْوَجْہِ وَالْیَدِ وَالنَّفْسِ وَالسَّمْعِ وَالْبَصَرِ مِنْ غَیْرِ تَمْثِیْلٍ وَّاتَعْطِیْلٍ کَمَا قَالَ عَزَّ اِسْمُہٗ لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ وَھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ.

(ارشاد شیخ ہے) اس بات پر لوگوں کا اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں جن باتوں کا تذکرہ کیا ہے وہ ثابت اور درست ہے۔ اور حضور نبی ﷺ سے اللہ تعالیٰ کے لئے وجہ (رُخ) ید (ہاتھ) نفس، سمع اور بصر کا جو تذکرہ آیا ہے وہ بھی درست ہے بغیر اس کے کہ اس کی کوئی مثال دی جائے (یا اس کی فکر) میں تعطل پیدا کیا جائے جیسا کہ خداوند تعالیٰ نے کہا ہے لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ وَھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ. اس کے مانند کوئی چیز نہیں وہ سننے والا دیکھنے والا ہے۔

سوال: کیا یہ جائز ہے کہ کتاب الٰہی میں کچھ چیزیں ایسی ہوں کہ جس کے جاننے کی بندوں کے لئے کوئی راہ نہ ہو؟

جواب: کثیر فقہا اور محدثین اور صوفیا کے نزدیک یہ جائز ہے کہ کتاب الٰہی میں کچھ ایسی چیز ہو جسے ہم لوگ نہ جانیں کیونکہ حق تعالیٰ نے متشابہات میں کہا ہے (اس کے متعلق ہے) وَمَایَعْلَم تَاوِیْلَہٗ اِلَّااللّٰہُ (اس کی تاویل اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا) یہاں پر وقف لازم ہے۔ تفسیر اس کی یہ ہے کہ جن افعال کے ہم مکلف ہیں وہ دو قسم کے ہیں اول وہ جس کے حکمت کی راہ اجمالی طور پر پہنچانی جاتی ہے عقلوں کے ذریعہ جیسے نماز، روزہ، زکوٰۃ۔ دوسرے اس قسم کی چیز ہے کہ اس کے حکمت کی بنیاد پہچان میں نہیں آتی ہے جیسے افعال حج، جب افعال میں اس طرح کی بات ہو سکتی ہے تو اقوال میں کیوں روا نہ ہوگی۔ طائفہ صوفیہ کے تمام لوگوں نے ایسا ہی کہا ہے کہ یہ

تمام چیزیں جس کا تذکرہ کیا گیا۔ یہ خداوند تعالیٰ کے صفات ہیں اپنے اس نوع میں جیسا کہ ذات الٰہی کے لائق ہے۔ ہم اس سے زیادہ عبارت میں نہیں لا سکتے اور اس سے زیادہ بیان نہیں کر سکتے۔ بس اتنا ہی بھر ہم کہیں گے جتنا کہ خداوند تعالیٰ کی کتاب میں ہم نے پڑھا۔ یا پیغامبر ﷺ کی حدیث میں ہم نے معلوم کیا اسی قدر پر ایمان لانا اجمالی طور پر واجب ہے۔ لیکن اس پر بحث کرنا یہ واجب نہیں یہی وہ راز ہے جو سلامتی کی راہ ہے۔ یہ اس لئے کہ جب ہم نے کہہ دیا اٰمَنَّا بِمَا قَالَ اللّٰهُ وَعَلٰى مَا اَرَادَ اللّٰهُ وَاٰمَنَّا بِمَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَعَلٰى مَا اَرَادَ رَسُوْلُ اللّٰهِ (یعنی ہم نے ایمان لایا ان تمام باتوں پر جسے اللہ تعالیٰ نے کہا اور اس حقیقت پر جس کا ارادہ اللہ نے کیا اور ہم ایمان لائے ان چیزوں پر جسے اللہ کے رسول نے فرمایا اور اس حقیقت پر جس پر اللہ کے رسول نے ارادہ کیا۔ تو اتنا کہہ دینے کے بعد میرا ایمان لانا درست ہو گیا۔ اس کے بعد مجھ پر یہ واجب نہیں کہ ان تمام کے معنیٰ کو بھی جانوں کیا دیکھے نہیں کہ تم تمام انبیاء کو پہچانتے نہیں تمام ملائکہ کی پہچان بھی مجھ میں نہیں لیکن جب ہم نے ان تمام پر ایمان لایا تو میرا ایمان لانا درست ہے۔ صفات متشابہات جس کا ذکر کیا گیا اس کا جواب بھی یہی ہے۔ ہم اس پر ایمان لاتے ہیں، ہم اسے جانتے ہیں اور بحث کرنے میں مشغول نہیں ہوتے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ہو سکتا ہے کہ (متشابہات) کی ایک تاویل پر اعتقاد رکھا جائے اور وہ تاویل، وہ معنی خدا کی مراد میں نہ ہو نتیجہ یہ ہوگا کہ میرا ایمان تباہ ہوگا، تقلیدی ایمان ایسی چیز کے علم کی طلب سے بہتر ہے۔ جس میں ایمان کے زوال کا خطرہ ہو۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر متشابہات کی تاویل واجب ہوتی یقیناً پہلے پیغامبر علیہ السلام پر واجب ہوتی کیونکہ آپ ﷺ بیان کرنے کے لئے مبعوث ہی ہوئے۔ جب آپ ﷺ نے بیان نہیں کیا اور تاویل نہیں بتایا یہی اس بات کی دلیل ہے کہ تاویل واجب نہیں۔

جب امام محمد رحمتہ اللہ علیہ سے سوال کیا گیا اسی طرح کی آیات واحادیث کے متعلق تو آپ نے فرمایا اِقْرَءُوْهَا كَمَا جَاءَتْ عَلٰى مَا اَرَادَ اللّٰهُ (اسے تلاوت میں شامل رکھو اور پڑھتے رہو اس نیت سے کہ یہ ویسے ہی ہے جیسے اللہ نے ارادہ کیا)

امام ثوری رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا قرآن کا علم چار طرح ہے۔ کچھ علم ایسے ہیں کہ ان سے جاہل رہنا جائز نہیں اور وہ حلال وحرام کا علم ہے اور جو کچھ علم ایسے ہیں جسے عرب جانتے ہیں وہ اسماء کا علم ہے اور کچھ علم ایسے ہیں جس میں نادانستگی مشہور ہے وہ قصص اور تفسیر اور شان نزول کا علم ہے (اسے کم لوگ جانتے ہیں) اور کچھ علم ایسے ہیں جسے کوئی نہیں جانتا جیسے خود اس نے اپنے قول میں فرمایا ہے وَمَا یَعْلَمُ تَاوِیْلَهٗ اِلَّا اللّٰہ (اس کی تاویل کا علم اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا)۔

سوال: خدا تعالیٰ کی جانب سے کیا یہ جائز ہے کہ پیغامبر بھیجے ان کے ساتھ کتاب بھیجے پھر بھی ان سے کوئی چیز پوشیدہ رکھے؟

جواب: یہ تو اس کی حکمت کا تقاضہ ہے یہ اس لئے کہ کوئی اللہ تعالیٰ کے پورے کے پورے علم سے واقف نہ ہو علم کلام کی بعض کتابوں میں جو اس کی دلیل دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے قلم کو حکم دیا کہ لوح محفوظ میں لکھے فَلَانٌ سَعِیْدٌ اِنْ شِئْتُ وَفُلَانٌ شَقِیٌّ اِنْ شِئْتُ وَفَلَانٌ کَذَا اِنْ شِئْتُ (فلاں سعید ہے میں اگر چاہوں، فلاح شقی ہے میں اگر چاہوں، فلاں ایسا ہے میں اگر چاہوں) یہ اس لئے کہ لوح وقلم اور وہ فرشتے جن کی نظر لوح پر ہے خدا کے پورے علم سے واقف نہ ہوں۔

قولہ: سُئِلَ بَعْضُهُمْ عِنِ اللّٰهِ تَعَالٰی فَقَالَ اِنْ سَئَالْتَ عَنْ ذَاتِهٖ فَلَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْئٌ. وَاِنْ سَئَالْتَ عَنْ صِفَاتِهٖ فَهُوَ اَحَدٌ صَمَدٌ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ وَلَمْ یَکُنْ لَّهٗ کُفُواً اَحَدٌ وَاِن سَئَالْتُ عَنِ اسْمِهٖ فَهُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۝ عَالِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ ۝هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمِ ۝ وَاِنْ سَئَالْتَ عَنْ فِعْلِهٖ فَکُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِیْ شَانٍ ط

(ارشاد شیخ ہے) بعضے صوفیوں سے خدا تعالیٰ کے متعلق سوال کیا گیا تو جواب میں فرما دیا اگر تم ذات خداوندی کے متعلق پوچھتے ہو یہ کہ خدا کس چیز کا نام ہے تو اس جیسی کوئی چیز نہیں۔ اس موقع پر سوال تو اس کی ماہیت کے متعلق کیا گیا جواب میں ہے کہ اس کے جیسی کوئی چیز نہیں، پھر اس کی وضاحت کی کہ ماہیت کا سوال اس موقع پر آتا ہے جب اس چیز کے جیسا کوئی اور ہو

چونکہ اس کے مانند کوئی اور نہیں ہے تو اس کی ماہیت کے متعلق سوال کرنا ہی فضول ہے اور صحیح نہیں ہے۔ جیسے موسیٰ علیہ السلام سے فرعون نے سوال کیا وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ جناب موسیٰ نے جواب دیا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ. الا یہ فرعون نے کہا دیوانہ ہیں، میں اس کے ذات کے متعلق سوال کرتا ہوں یہ صفات کے متعلق جواب دیتے ہیں۔

اور صوفیہ نے جواب دیا، اگر اللہ کے صفات کے متعلق پوچھتے ہو تو وہ ایک ہے اور صمد (پاک) ہے نہ تو اس کا کوئی ولد ہے اور نہ وہ کسی کا ولد ہے اس کے مانند نہ تو کوئی اور ہے اور نہ کوئی ہوگا۔

ایک عارف کہتے ہیں لَیْسَ فِی الْوُجُوْدِ اِلَّا اللّٰہُ کہ واجب الوجود کا وجود بالذات ضروری ہے اور ممکنات کو عدم بالذات ضروری ہے کیونکہ ممکنات خود اپنی ذات میں عدم ہیں اگر ممکنات کو وجود ہے تو وہ ان کی اپنی ذات سے نہیں ہے اور اسی سے اندازہ کرنا چاہئے ہر چیز کے متعلق جبکہ وہ اسی کی ذات سے ہے (یعنی اسی نظریہ کے تحت اس کی مثال اور مانندگی کس چیز سے ہوگی)۔

''اور صوفیہ نے جواب دیا'' اگر اس کے نام کے متعلق سوال کرتے ہو تو وہ اللہ ہے اس کے سوا دوسرا اللہ نہیں، غائب اور حاضر کا جاننے والا وہی ہے بخشنے والا اور مہربان وہی ہے۔

اور اس کے کاموں کے متعلق سوال کرتے ہو تو ہر روز اس کا ایک نیا کام ہے۔ ابن عباس ؓ فرماتے ہیں کہ اس کی شان تو یہ ہے کہ مارتا ہے اور زندہ کرتا ہے پیدا کرتا ہے اور روزی دیتا ہے اور عزت دیتا ہے ذلیل بھی کرتا ہے۔

امام بستی کی تفسیر میں آیا ہے کہ اسکی شان تو یہ ہے کہ ہر دن اور رات میں تین لشکر کو کام میں لاتا ہے اول یہ کہ صلب پدر سے رحم مادر میں لاتا ہے اور دوسرا لشکر یہ کہ رحم مادر سے دنیا میں لاتا ہے تیسرا لشکر یہ کہ دنیا سے قبرستان پہنچاتا ہے۔

صَمَد کے معنیٰ لوگوں نے یوں بیان کیا ہے کہ صمدیت اس کی یہ ہے کہ مخلوق کو اپنے صفات کی باریکیوں سے اور ذات کی لطافتوں سے اطلاع حاصل کرنے میں ناامید کر دیتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ جیسے وہ اپنے صفات کا تذکرہ احد ہونے میں کرتا ہے ویسے ہی صمد ہونے میں بھی کرتا ہے اس نے فرمایا قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ پھر کہا اَللّٰهُ الصَّمَدُ دونوں میں اسم اللہ کو

مکرر لایا اَللّٰہُ الصَّمَدُ کہا اپنی احدیت میں بھی اللہ لایا پھر دوسری بار صمدیت میں بھی اپنے کو اللہ کہا یہ اس لئے کہ مخلوق اس وہم میں نہ پڑیں کہ صمدیت اور احدیت کے ایک ہی معنی ہیں۔

احادیت کے ثابت ہونے سے شرک کی نفی ہوتی ہے۔ زن وفرزند، مثال وشبہ اور جو اس طرح کی چیزیں ہیں ان کی بھی نفی ہوتی ہے۔ پھر صمدیت کے معنی میں اکثر اہل تفسیر کے نزدیک کہ کسی کو اس پر راہ نہیں ہے اور نہ ہوگی۔ اس کے ہونے کو ثابت مانا جائے۔ اس کے علاوہ کوئی دوسری راہ نہیں ہے یعنی اگر اس کی ہستی کے ثبوت کے بعد اگر کوئی ہستی کے معنی سمجھنا چاہے تو ایسا نہیں ہوسکتا۔ اس سلسلہ میں دنیا اور آخرت دونوں میں راہ بند ہے۔ کیونکہ اس کی پاک ذات کیا ہے اور اس کی ماہیت کیا ہے ان سوالات سے پاک ہے۔

فرعون نے جو موسیٰ علیہ السلام سے سوال کیا کہ تمہارا خدا کیا ہے؟ جناب موسیٰ جانتے تھے کہ ذات کے متعلق سوال کر رہا ہے اور وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ ذات کے متعلق خبر نہیں دی جاسکتی کیونکہ اس میں راہ مسدود ہے جناب موسیٰ نے صفت کے متعلق خبر دی فرعون نے جو جماعت حاضر تھی اس سے کہا تمہارے پیغامبر دیوانہ ہیں۔ میں ذات کے متعلق سوال کرتا ہوں وہ صفت کے متعلق جواب دیتے ہیں (قرآن میں ہے) قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الیٰ آخرہ مختصر یہ کہ اس کی ذات اور اس کی صفات کی ہستی کے متعلق اس سے زیادہ کی مجھے طلب نہیں کہ اس میں راہ مسدود ہے۔

شیخ عبداللہ انصاری رحمتہ اللہ علیہ کی گفتگو کا یہی مطلب ہے۔ انہوں نے فرمایا ''یافت تو از روئے ماست اما دریافت تو نہ در بازوئے ماست۔ (تجھے پالینا تمنا ہے، مگر تیری تلاش مرے قوت بازو سے باہر ہے)۔ جیسے کل فرشتے کہیں گے مَاعَبَدْنَا حَقَّ عِبَادَتِکَ تمام اہل معرفت بھی کہیں گے مَاعَرَفْنَاکَ حَقَّ مَعْرِفَتِکَ (ہم نے تجھے کماحقہ نہیں پہچانا)۔

قولہ: وَقَوْلُهُمْ فِي الْاِسْتِوَاءِ مَا قَالَهُ مَالِکُ بْنُ اَنَسٍ رضی اللہ عنہ حِيْنَ سُئِلَ عَنْ ذَالِکَ فَقَالَ الْاِسْتَوَاءُ مَعْلُوْمٌ. وَالْکَيْفُ غير مَعْقُوْلٍ. وَالْاِيْمَانُ بِهٖ وَاجِبٌ. وَالسُّوَالُ عَنْهُ بِدْعَةٌ. وَكَذَالِکَ مَذْهَبُهُمْ فِي النُّزُوْلِ.

(ارشاد شیخ ہے) ان لوگوں کا قول استوا کی تشریح میں یہ ہے جیسا کہ مالک ابن انس ؓ نے فرمایا ہے استواء کے متعلق جب ان سے سوال کیا گیا۔انہوں نے کہا استوا معلوم ہے اس کی کیفیت کیا ہے یہ عقل سے باہر ہے۔استوا پر ایمان لانا واجب ہے استوا کے متعلق سوال کرنا بدعت ہے۔

سلطان العارفین (بایزید بسطامیؒ) سے منقول ہے اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوىٰ (اس کی ذات رحمٰن ہے وہ عرش پر مستوی ہے) عرش کی جانب میں بڑھا کہ دیکھوں وہ کس حال میں ہے جب میں اس تک پہنچا میں نے اس کو خود سے زیادہ تشنہ پایا۔زبان حال سے وہ کہہ رہا تھا۔بیت

در سر زنشِ خلق منم بیہودہ　　　چون گرگ شکم تہی دہن آلودہ

(اسی طرح ان لوگوں کا مذہب نزول کے متعلق ہے) نزول کا تذکرہ قرآن حکیم میں نہیں ہے لیکن حدیثوں میں آتا ہے فن حدیث میں درک رکھنے والے اس حدیث کے متعلق صحیح ہونے کی رائے رکھتے ہیں۔حدیث شریف یہ ہے سرکار دو جہاں ﷺ نے فرمایا اِذَا كَانَتْ لَيْلَةُ نِصْفِ مِنْ شَعْبَانَ يَنْزِلُ اللّٰهُ تَعَالىٰ اِلَى سَمَآءِ الدُّنْيَا فَيَقُوْلُ هَلْ مِنْ دَاعٍ فَيُسْتَجَابُ لَهٗ؟ هَلْ مِنْ سائِلٍ فَيُعْطىٰ سُوَالُهٗ؟ هَلْ مِنْ مُسْتَغْفِرٍ فَيُغْفَرُلَهٗ. ماہ شعبان کے (۱۴) کی آدھی رات جب گذرتی ہے اللہ تعالیٰ آسمان دنیا کی جانب نزول فرماتا ہے اور کہتا ہے کوئی ہے دعا کرنے والا کہ میں اسے قبول کروں، کوئی ہے سوال کرنے والا کہ اس کا سوال اس کو دیا جائے، ہے کوئی بخشائش مانگنے والا کہ اس کی بخشائش ہو۔اس طرح کی دوسری حدیث بھی آئی ہے۔ وَمُشَبِّه لَعَنَهُمُ اللّٰهُ (اور شبہ پیدا کرنے والے اللہ ان پر لعنت کرے)۔مشابہ آیات و احادیث میں گم کردہ راہ ہوئے ہیں اپنے نفس کی جانب سے طرح طرح کی باتیں کہی ہیں لیکن کتاب اللہ سے انکار کرنے کی کوئی راہ نہیں ہے، احادیث رسول سے منکر ہونے میں آدمی کہیں کا نہیں رہتا۔ایمان لانا چاہئے ان تمام صفات پر جو اللہ تعالیٰ کے لئے ہے تا کہ کتاب اللہ اور حدیث رسول کے منکر نہ ہوں۔اقرار کے بعد تاویل کی طلب کروں۔

اس گروہ کے زیادہ تر لوگ اس مسلک پر ہیں کہ یہ تمام صفات خداوند تعالیٰ کے ہیں اس طرح جیسے کہ وہ ہونے کے لائق ہے۔ اس سے زیادہ اس سلسلہ میں تلاوت و روایت کے علاوہ کوئی عبارت نہ پیش کی جائے۔ جیسا کہ امام محمد رحمتہ اللہ علیہ سے مروی ہے ان سے جب ان آیات واحادیث کے سلسلے میں سوال کیا گیا تو ان کا ارشاد ہوا اِقْرَئُو اَھَا کَمَا جَائَتْ عَلٰی مَا اَرَادَاللّٰہُ تَعَالیٰ (پڑھو اس کو جیسے وہ نازل ہوئی ہے اس نیت سے کہ اس کا مراد وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے لیا ہے)۔ یہ سمجھ لو کہ آیات متشابہات میں بہت سے شبہات گذرے ہیں خصوصاً اِلٰہیات، نبویات اور علم شریعت کے سلسلے میں۔

الٰہیات کے سلسلے میں یہ ایک حقیقت ہے کہ ایسے لوگ جو قرآن کی تصدیق کرنے والے ہیں، ان میں بھی کچھ لوگ ایسے باطل اعتقاد کے قائل ہیں جو ذات الٰہی کی الوہیت اور قِدم کے منافی ہے اور یہی نبوت پر بھی طعن کرتے ہیں کیونکہ ایسے عنوانات کا قائل ہونا جو صفات الٰہی پر تنزیہہ کے خلاف ہو ذات رسول پر طعن عائد کرنا ہے اور یہ کہنا ہے کہ اگر پیغامبر ہوتے اور اللہ کی جانب سے مرسل ہوتے تو سب سے کمتر درجہ ان کا یہ ہوتا کہ ذات الٰہی کے عارف ہوتے اور یہاں حال یہ ہے کہ ذات الٰہی کو محدثات کی صفتوں سے متصف کر رہے ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ در حقیقت پیغامبر نہیں ہیں۔ شریعت پر طعن کا یہ ذریعہ بنتا ہے کہ جب یہ صفات محدثات کے ہیں تو در حقیقت یہ قرآنی نہیں ہیں لامحالہ قرآن میں تبدیل کر دیا گیا ہے اور وہ قرآن جو محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا تھا اس سے خالی تھا۔

یہ اور اس طرح کے بہت سے فتنے متشابہ آیات واحادیث کے سلسلے میں ہوتے رہے ہیں ان فتنوں سے سلامتی کی راہ وہی ہے جو اہل سنت و جماعت کہتے ہیں یہ کہ جتنا بھر تلاوت قرآن اور روایت حدیث میں آیا ہے اس سے آگے بیان وتشریح میں نہ جائیں۔

اور یہ جو کہا گیا یَنْزِلُ اللّٰہُ اِلَی سَمَاءِ الدُّنْیَا اس کی تاویل کی گئی ہے کہ یہاں اترنے کا مطلب کسی چیز کا قبول ہونا ہے۔ خدا تعالیٰ کے قبول کرنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ کسی چیز کی طرف اپنا چہرہ کرے اسی طرح پیٹھ پھیرنے کا یہ مطلب کہ وہ کسی چیز سے چہرہ پھیر لے بس، اتنا بھر

مراد لیتے ہیں کہ رخ کرنے کے معنیٰ نیکی کرنا ہے اس چیز کے ساتھ اور پیٹھ پھیرنے کے معنی نیکی کرنے کے سلسلہ کو ترک کرنا ہے اور یہی معنی لوگوں میں متعارف ہے۔

نزول سے یہ بھی مراد لیا گیا ہے کہ اشرف فرشتوں کی جماعت اس وقت نازل ہوتی ہے۔اور نزول کی تاویل یہ بھی کی گئی ہے کہ زمین پر اس وقت اس کی رحمت نازل ہوتی ہے۔

قولہ: وَاجۡمَعُوۡا عَلٰی اَنَّ الۡقُرۡاٰنَ کَلَامُ اللّٰہِ وَاَنَّ کَلَامَہٗ غَیۡرُ مَخۡلُوۡقٍ

(ارشادِ شیخ ہے) ''گروہ صوفیہ کا'' اس پر اجماع ہے کہ یہ درست اور سچ ہے کہ قرآن خدا کا کلام ہے اور یہ حقیقت ہے کہ اس کا کلام غیر مخلوق ہے۔اس مسئلہ میں اہل سنت و جماعت اور معتزلیوں کے درمیان اختلاف ہے۔اہل سنت و جماعت کے نزدیک قرآن خدا کا کلام ہے۔ یہ ازلی ہے، قدیم ہے اور اس کی صفت ہے۔ ایسا ہرگز نہیں تھا کہ متکلم نہیں تھا اور ایسا ہرگز نہیں ہوگا کہ متکلم نہیں ہوگا۔

قرآن کی اضافت خدا تعالیٰ کے ساتھ صفت کی اضافت ہے۔ جیسے حیات، اور خدا کا کلام جو اس کی صفت ہے وہ کسی بھی حیثیت سے اور کسی بھی نوعیت سے مخلوق کے کلام کی طرح نہیں ہوگا۔اور اس کی مثال ایسے ہے کہ جیسے ہم اس کو حَـــیّ کہتے ہیں حیوات کے ساتھ، اور اس کی حیات میری حیات کی طرح نہیں کہ میری حیات جان سے وابستہ ہے اور اس کی حیات جان کے ذریعہ نہیں، میرا ارادہ میری طبیعت کے میلان کا نام ہے اس کے ارادہ میں طبیعت کے میلان کا سوال نہیں۔ میری سماعت میرے کان سے تعلق رکھتی ہے اس کی سماعت کا لگاؤ کان سے نہیں۔ میری بصارت میری پتلیوں سے ہے اس کی بصارت کا تعلق پتلی سے نہیں۔ میرا کلام حروف اور آواز ہیں اس کا کلام حروف اور آواز نہیں میرے کلام کلمات ہیں اس کا کلام کلمات سے نہیں۔ خداوند عز و جل تمام بولنے والوں کی باتوں کو یکبارگی سنتا ہے اور یکبارگی جواب دیتا ہے اور جواب بھی ایک دوسرے سے متضاد ہوتا ہے ایک کو نہیں کہتا ہے دوسرے کو ہاں ایک کو رحمت سے دوسرے کو لعنت سے ایک کو نزدیکی سے اور دوسرے کو دوری سے تو ایسا کلام مخلوقات کے کلام جیسا کیسے ہوسکتا ہے۔

اور اس کے لئے مائیت (کیا، کیسا) کا سوال نہیں ہے۔ یعنی اس کے کلام میں کیا کوئی چیز نہیں ہے جیسے اس کی ذات کے لئے کیا کوئی چیز نہیں ہے۔ جب ذات بے مائیت کے ہے تو صفات بھی بے مائیت کے ہوگی کیونکہ ہر ایک چیز کی صفات ویسے ہوتے ہیں جیسے اس کی ذات کے لئے ہونا چاہئے۔ کیا نہیں دیکھتے؟ کہ اس کے علم کو اس کی قدرت کو جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ''ہے'' تو دوسرے درجہ پر اس سے تجاوز نہیں کرتے بس اتنا ہی کہتے ہیں کہ علم ہے، قدرت ہے یہ نہیں کہتے علم کیسا ہے، قدرت کیسی ہے۔

اسی طرح جب ہم کہیں کہ کلام ہے تو ہمیں یہ نہیں کہنا ہے کلام کیسا ہے۔ پھر جب ہماری ذات کے لئے مَا (کیا اور کیسا) کی گنجائش ہے تو ہماری صفات کے لئے بھی مَا کا سوال باقی ہے کیونکہ ما کے جواب میں جنس آتا ہے اور جنس اپنے نوع کو جامع ہوتا ہے ایسے انواع جو خود جنس ہوتے ہیں، تو پہلے جنس ہونا چاہئے تاکہ مَا کے ذریعہ سوال کرنا درست ہو کہ کہنے والا کسی ایک کو لے کر مَاھُوَ کے ذریعہ سوال کرے تو جواب دیا جا سکے کہ وہ جسم ہے یا جوہر ہے یا عرش ہے یا جماد ہے۔

جب خداوند تعالیٰ ایک ہی ہے اس کا کوئی ثانی نہیں۔ شباہت اور مثال میں اس جیسا کوئی نہیں پھر مائیت کے متعلق سوال کرنا محال ہوگا اور جب اس کی ذات کے لئے یہ معنویت درست ہے تو صفات کے لئے بھی درست ہوگی یہ اس لئے کہ جیسے وہ اپنی ذات میں شِبہ نہیں رکھتا اس کی صفات میں بھی شِبہ نہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَیْءٍ اِذَا اَرَدْنَاهُ اَنْ نَقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (اِنَّمَا اَمْرُهٗ اِذَا اَرَادَ شَيْئًا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنَ.

سورہ یٰسین: اس کا حکم یہی ہے کہ جب کرنا چاہے کسی چیز کو تو کہے اس کو ہو وہ اسی وقت ہو جائے)

اس میں خبر کیا کہ میں ہر چیز کو جب ہستی میں لانا چاہتا ہوں تو قول میں لاتا ہوں یہ اس بات کی دلیل ہوئی کہ خدا کا کلام مخلوق نہیں ہے کیونکہ اگر کلام مخلوق ہوتا اللہ تعالیٰ (کلام کے بعد) محتاج ہوتا ایک مخلوق کا تاکہ وہ پیدا کرے اور یہ درست نہیں ہے کہ ذات قدیم کسی محدث

کی محتاج ہو۔

دوسری بات یہ ہے کہ کلام اگر پیدا کی ہوئی چیز ہوتی تو وہ چیز محتاج ہوتی ایک دوسرے کلام کی تا کہ وہ کلام اس کلام کو پیدا کرے اور پھر یہی سوال اس پہلے کلام کے متعلق ایک تیسرے کلام کے لئے پیدا ہوتا الیٰ غیر النہایت تو اس طرح تسلسل لازم آتا اور تسلسل لازم آنا محال ہے۔

قولہ: مَکْتُوبٌ فِی مَصَاحِفِنَا

(ارشاد شیخ ہے) لکھا ہوا ہے ہمارے مصحفوں میں۔ جیسا کہ پیغامبر علیہ السلام سے روایت ہے کہ فرمایا حضور ﷺ نے لَاتسَافِرہ بِالْقُرْاٰنِ اِلیٰ اَرْضِ الْعُدُوِّ. دشمن کی زمین کی طرف قرآن کے ساتھ سفر نہ کرو۔ یعنی جب دار حرب جاؤ تو مصحف لے کر نہ جاؤ کہیں ایسا نہ ہو کہ کافروں کے ہاتھ میں پڑ جائے اور وہ اس کی بے حرمتی کریں۔ پیغامبر علیہ السلام نے قرآن کہہ کے مصحف مراد لیا ہے۔ یہاں اگر قرآن سے قرآن پڑھنے والے مراد ہوتے تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ قرآن پڑھنے والوں کو جہاد میں جانا لائق نہ ہوتا اور اگر جاتے بھی تو دشمن کی زمین میں قرآن تلاوت نہ کرتے تو جب رسول ﷺ دشمن کی زمین میں جہاد کے لئے تشریف لے گئے اور آپ کے اصحاب بھی ساتھ گئے اور آپ کی امت آج تک ایسا ہی کر رہی ہے اور لوگ دار حرب میں جاتے ہیں قرآن بھی پڑھتے ہیں اور نماز بھی باوجود دیگر نماز بغیر قرآن کے درست نہیں ہوتی اس سے یہ حقیقت ثابت ہوئی کہ حدیث میں قرآن سے قرأت مراد نہیں ہے بلکہ مصحف مراد ہے اس سے معلوم ہوا کہ بغیر حلول کے اور بغیر ذات خداوندی سے انتقال اور انفکاک کے قرآن مصحف میں ہے، جیسے یہ معلوم ہے کہ خدا ہمارے دلوں میں ہے ہم لوگوں کی زبان پر اس کا ذکر بھی ہے ہماری مسجدوں میں وہ معبود ہے لیکن اس کے باوجود ان جگہوں میں وہ حلول نہیں کرتا۔

اگر کوئی مشکل محسوس کرے کہ ہم کیسے کہیں کہ قرآن مصحف میں لکھا ہوا ہے۔ زبانوں پر ہے جب ہم پڑھتے ہیں اور دلوں میں ہے جب ہم یاد کرتے ہیں باوجودیکہ وہ ان جگہوں میں رکھا ہوا نہیں ہے تو اس اشکال کا کیا حل ہوگا؟

جواب یہ ہے کہ یہ شبہ تو جو صفات کے سلسلے میں ہے ذات پر بھی عائد ہوتا ہے اور کہا

جاسکتا ہے کہ کلام خداوندی میرے دلوں میں محفوظ ہے اسی طرح جیسے ذات خداوندی میرے دلوں میں معلوم ہے اور حال یہ ہے کہ خدا تعالیٰ دل میں محل بنائے ہوئے نہیں ہے کلام خداوندی میری زبان پر قرأت میں شامل ہے اسی طرح جیسے خدا میری زبانوں کے ذکر میں ہے باوجود اس کے زبان خدا کا محل نہیں اور قرآن مصحفوں میں لکھا ہوا ہے ایسے ہی خدا تعالیٰ سجدہ گاہ میں معبود ہے اور مسجد خدا کا محل نہیں۔

اسی طرح جتنی دشواریاں صفات کے سلسلے میں آئیں اس کی ذات کی جانب دیکھنا چاہئے۔ تا کہ سمجھ میں آجائے کہ جیسے اس کی ذات قدیم ہے اس کی صفات بھی قدیم ہیں اور قدیم کے لئے کسی مکان میں حلول نہیں۔ یعنی ان میں سے دونوں کو کوئی ایسا مکان نہیں جس میں حلول کر سکے اور کلام کا ذات پاک سے منتقل ہونا یا جدا ہونا اس طرح نہیں جیسے کسی گھر کی بکری یا کسی باغ کا اجارہ دستاویز کے ذریعہ ہوتا ہے اس کی بکری اور اجارہ دستاویز میں کہا جاتا ہے لیکن بیع اور اجارہ بذاتہ دستاویز میں موجود نہیں ہوتا کیونکہ وہ تو بائع بیچنے والے کے کہنے اور خریدار کے خریداری سے تعلق رکھتا ہے۔

قولہ: مَتْلُوٌّ بِاَلْسِنَتِنَا.

(ارشاد شیخ ہے) تلاوت میں ہوتا ہے ہماری زبانوں پر۔ یعنی جیسا کہ خداوند تعالیٰ نے ہماری زبانوں سے ذکر کرایا ہے اسی طرح جیسے اس کی ذات پاک حال نہیں ہے اس کا کلام بھی ہے امیری زبانوں کے لئے حال نہیں ہوتا۔

اس طرح کہہ کر دلیل اختیار کی گئی ہے ذات سے صفات کے لئے یعنی جیسے اس کی ذات ہماری زبانوں پر مذکور ہے اس کے باوجود حال نہیں ہے اسی طرح اس کا کلام بھی ہماری زبانوں پر قرأت میں ہے اور حال نہیں۔

قولہ: مَحْفُوظٌ فِیْ صُدُوْرِنَا مِنْ غَیْرِ تَعَرُّضِ الْکِتَابَةُ وَلَا التِّلَاوَةُ.

(ارشاد شیخ ہے) محفوظ رکھا گیا ہے ہمارے سینوں میں بغیر اسکے کہ اس کے لئے معارضہ میں لائیں (مخالف دلیل بنائیں) کتاب اور تلاوت کو یعنی جیسے خدا کے لئے کلام ہونا

دلیل سے ثابت ہو اور کلام کا حادث نہ ہونا بھی دلیل سے ثابت ہوا اور اس پر ان دونوں کا اقرار کرنا واجب گردانا گیا.............. اسی طرح قرأت کرنے والے کی قرأت اور مصحف میں لکھا جانا (اس کو اس بیان و دلیل کے لئے) تعرض میں نہیں لائیں گے (بایں طور کہ ہم کہیں) کہ قرأت مخلوق ہے یا غیر مخلوق اور کتابتِ مصحف مخلوق ہے یا غیر مخلوق کیونکہ سنت اس میں وارد نہیں ہے (یعنی اس سلسلہ میں بھی ایسے سوال اٹھانا سنت کے مطابق نہیں ہے)۔

اسی طرح جب کلام خداوندی دلیل سے ثابت ہو چکا تو ہم یوں معارضہ نہ کریں کہ کلام حرف ہے یا نہیں صوت ہے یا نہیں کیونکہ ایسے سوال کے لئے سنت وارد نہیں فَوَجَدَ الْاِمْسَاکَ عَنْهُ تو واجب ہے ان باتوں سے رکنا اور ان مباحثوں میں نہ پڑنا۔

یہ ایسا ہی ہے کہ جب کہہ دیا کہ اس کو علم ہے اور قدرت ہے پھر دوسرے درجہ پر ہم اس سوال کی جانب آگے نہیں بڑھے کہ وہ علم کیا ہے اور وہ قدرت کیا ہے بس اسی قدر کہ ہم نے اقرار کیا کہ اس کو علم ہے بس اسی طرح ہم کہیں گے کہ اس کو کلام ہے اور وہ اس کلام کا متکلم ہے اب اس کے بعد دوسرے درجہ پر ہم تجاوز نہ کریں گے یہاں تک کہ کہنے لگیں کہ اس کے بھی صفات ویسے ہی ہیں جیسے مخلوقات کے۔ ویسے ہی ہم نے کہا کہ خدا ہے اور اس کی ہستی کے متعلق آگے کسی سوال کی جانب ہم نے سبقت نہیں کیا یہاں تک کہ ہم یہ کہیں کہ وہ بھی ویسے ہی ہے جیسے اور مخلوقات۔

خلاصہ یہ کہ اس کے کلام کے ہونے کا اور صفات کی طرح ہم اقرار کریں اور ہونے سے آگے کوئی دوسرا سوال پیدا نہ کریں اور اس کے ہونے سے آگے تجاوز نہ کریں تا کہ اس کے صفات کو مخلوقات کے صفات جیسے ہم نہ کہنے لگیں۔

متکلمین کے یہاں قاری کی قرأت مخلوق ہے باوجود یہ کہ اس کو قرآن کہتے ہیں اور کتابت و مصحف مخلوق ہے گرچہ اس کو قرآن کہتے ہیں اور یہ تو ظاہر ہے کہ ایک وقت تھا کہ کتاب و مصحف نہ تھی اور قاری کی قرأت ایک وقت تھا کہ نہ تھی لَمْ یَکُنْ ثُمَّ کَانَ (نہ تھی پھر ہوئی) تو محدث ہوئی۔ اور ایسے اقوال کے لئے بہت سی دلیلیں ہیں۔

قولہ: فَاِنَّ السُّنَّةَ لَمْ تَرِدْ بِذَالِکَ.

(ارشاد شیخ ہے) یہ درست ہے اور حقیقت ہے کہ اس پر (گفتگو کرنے کے سلسلے میں) سنت وارد نہیں ہے اور سنت کا یہ طریقہ کہ اس پر اعتقاد رکھا جائے اور اعتقاد رکھنا واجب ہے سنت متواترہ ہے یعنی (اس گفتگو کے سلسلے میں) کوئی حدیث متواتر وارد نہیں ہے کہ یہ کہا جائے کہ کتابتِ مصحف اور قرأتِ قاری مخلوق ہے یا غیر مخلوق ہے تو اس سلسلے میں کوئی مباحثہ یا تعرض کرنا نہیں چاہئے اور یہ قید جو شیخ رحمتہ اللہ علیہ نے تذکرہ میں لایا ہے ''کہ کوئی سنت وارد نہیں ہے'' در اصل حنابلہ کے قول سے پرہیز کیا گیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کتاب، قرأت، کلمہ، حروف، صوت قرآنی سب کے سب غیر مخلوق ہیں۔ یا ممکن ہے ان قیود کے لانے سے شیخ کی کچھ اور مراد ہو۔ واللہ اعلم۔

گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ وہ تمام چیزیں جو مجھ کو دلیل سے ثابت ہیں صفات خداوندی کے متعلق اس سے انکار کرنا ہم لوگوں کے لئے درست نہیں ہے یہ اس لئے کہ نافی مثبت یعنی جو ثابت ہے اس کو نفی کرنے والا ویسے ہی ہے جیسے مثبت منفی یعنی جس کی نفی ہو رہی ہے اس کو ثابت ماننے والا ہے۔

یعنی اگر کوئی خدا کے لئے ایسی صفت ثابت کرے جو صفت اس کی نہیں ہے تو اس کا ایمان لانا درست نہ ہوگا اسی طرح جو خدا کے لئے ایسے صفت کی نفی کرے جو صفت اس کی ہے تو اس کا ایمان بھی درست نہیں ہوگا تو کلام اس کے لئے ثابت ہوا اور کلام کا محدث نہ ہونا یہ بھی ثابت ہوا لہٰذا ان دونوں باتوں کا اقرار کرنا واجب ہے تا کہ شرائط ایمان حاصل ہو۔

قولہ: وَلَمْ يَثْبُتْ اَنَّهُ حَرْفٌ وَصَوْتٌ وَجَبَ الْاِمْسَاكُ عَنْهُ.

(ارشاد شیخ ہے) کسی دلیل سے مجھے یہ ثابت نہیں ہوا کہ کلام خداوندی حرف ہے یا صوت ہے لہٰذا یہ واجب ہوا کہ ہم رک جائیں اور کوئی گفتگو نہ کریں تا کہ تمام صفات اور ذات کے متعلق ہم ایک طرح کا عقیدہ رکھیں کیونکہ اگر ہم اس کے کلام حرف یا صوت کہتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہم ایسی گفتگو کر رہے ہیں جو ہم نے اس ذات کے دوسرے صفات کے متعلق نہ کی ہے اس شکل میں جو ہم نے اس ذات کے دوسرے صفات کے متعلق نہ کی ہے اس کی شکل میں

جو ہم نے بنیاد ٹھہرائی ہے وہ ٹوٹ جائے گی اور اصل بنیاد یہ رکھی ہے کہ ہم یہ کہیں کہ صفات اس کے ہیں، اور صفات ہونے سے آگے کیا اور کیسے کی جانب تجاوز نہ کریں تا کہ میری گفتگو صفات مخلوقات کی مشابہت کی جانب نہ چل پڑے۔

قولہ: وَاجۡمَعُوا عَلیٰ جَوَازِ رُؤۡیَةِ اللّٰہِ تَعَالیٰ بِالۡاَبۡصَارِ فِی الۡجَنَّةِ.

(ارشاد شیخ ہے) اور اس بات پر اجماع کیا گیا ہے کہ بہشت میں اللہ تعالیٰ کا ان آنکھوں سے دیکھا جانا صحیح اور درست ہے۔ یعنی یہ دیدار بہشتی دیدار سے ہے (متن میں) اس موقع پر فی، من کے معنی میں ہے اور حروف جارہ میں سے ایک کو دوسرے کی جگہ پر لانا درست ہے۔ اسے ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ دیکھنے والا بہشت میں خدا تعالیٰ کو دیکھے گا، مطلب یہ ہوا کہ بہشت ہی میں دیکھے گا دوسری جگہ نہیں دیکھ سکتا (ترجمہ کی یہ دوسری شکل ہے) اس میں فِی اپنے معنی میں رہ کر مفہوم ادا کرتا ہے۔

مطلب یہ ہوا کہ دیکھا جائے گا خدا تعالیٰ بغیر مکان کے بغیر جہت کے اور بغیر اس کے کہ شعل بصری اس کو متصل ہو اور بغیر ثبوت مسافت کے جو بندہ اور خدا کے درمیان ہو اس کے علاوہ ان تمام چیزوں کے بغیر جو محدثات کے دیکھنے کے لئے سامان بنتی ہیں اور یہ اسی طرح ہوگا جیسے آج اس کی ذات پہچانی جاتی ہے۔ اور وہ ان سامانوں سے پاک ہے جو محدثات کے ساتھ مخصوص ہیں۔

بیان کیا گیا ہے کہ دیدار دو طرح کے ہیں ایک دنیاوی دیدار سِر کے ذریعہ اور ایک اُخروی دیدار سَر کے ذریعہ جب کہ حجابات اٹھا دیئے جائیں گے۔ جس کو اس سِر سے دیدار باطن حاصل ہے اس سَر سے دیدار ظاہر ہے اور جس کسی کو دیدار باطن اس سِر سے نہیں ہے اس سَر سے دیدار ظاہر بھی نہیں ہے۔

سوال: اگر کوئی کہے جب آخرت میں دیدار ظاہر ہے دنیا میں بھی جائز ہونا چاہئے کیونکہ جو چیز جائز ہے اس کی مکان سے کوئی خصوصیت نہیں۔

جواب یہ ہے کہ بات کچھ اسی طرح کی ہے لیکن وعدۂ دیدار آخرت میں کیا گیا ہے اور

رویت کے ثبوت میں یہ آیت پیش کی جاتی ہے لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنیٰ وَزِیَادَۃٌ. اس کی تفسیر بیان کی گئی ہے لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوا الْجَنَّۃُ وَزِیَادَۃٌ النَّظرِ اِلیٰ الرَّبِّ یعنی خصوصاً وہ لوگ جنہیں دولت ایمان حاصل ہے ان کا بدلہ بہشت ہے اور پروردگار کا دیدار یہ ان کے لئے مزید نعمت ہے سینتیس (۳۷) صحابہ رسول اللہ ﷺ ہیں جن میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ، جناب عمر رضی اللہ عنہ اور ایسے ہی حضرات ہیں اس آیت کریمہ کی یہی تفسیر بیان کئے ہیں اور سب میں زیادہ عالم جناب رسول ﷺ ہیں اور حضور کے صحابی تو اس آیت کی بنا پر یہ بات صحیح ثابت ہوئی کہ مومنوں کے لئے دیدار ہے کیونکہ لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنیٰ فرمایا گیا (ظاہر ہے) محسن مومن ہوگا نہ کافر سلطان العارفین، بایزد بسطانی رحمتہ اللہ علیہ سے منقول ہے فرمایا کہ اگر خدا تعالیٰ بہشت میں اپنا دیدار مجھ سے روکے رکھے تو میں اس قدر فریاد کروں کہ دوزخیوں کو مجھ پر رحم آجائے۔

اور خواجہ یحیٰ معاذ رازی رحمتہ اللہ علیہ اپنی مناجات میں فرمایا کرتے دنیا مجھے اچھی نہیں لگتی تیری یاد کے بغیر عقبیٰ مجھے اچھا نہیں لگتا تیرے دیدار کے بغیر اور یوں بھی کہا گیا ہے کہ اگر بہشت میں دیدار کا وعدہ نہ ہوتا اہل معرفت کی زبان پر بہشت کا تذکرہ نہ آتا۔

ایک دوسری دلیل جناب موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں ہے انہوں نے فرمایا رَبِّ اَرِنِیْ اَنْظُرْ اِلَیْکَ انہوں نے خدا سے درخواست کی اے میرے پروردگا تو مجھے ایسا دکھا کہ میں تیری طرف دیکھوں یعنی تجھے دیکھوں اگر دیکھنا درست نہ ہوتا جناب موسیٰ علیہ السلام کی جانب سے یہ سوال درست محال ہوتا یہ اس لئے کہ سوال ایسی چیزوں کے متعلق کیا جاتا ہے جو ہونے والی ہو نہ کہ محالات کے متعلق، باوجودیکہ تمام پیغامبر تمام مخلوق میں عارف تر ہیں ایک ایسی بات جو مطلقاً مخلوق کے حق میں عیب ونقصان کی سمجھی جاتی ہے ان گرامی قدر ہستیوں کے متعلق تو بدرجہ اولیٰ ہوگی تو معلوم ہوا کہ دیدار خداوندی درست ہے اگر کوئی کہے کہ دیدار جائز ہوتا تو جناب موسیٰ علیہ السلام کے اس سوال پر توبہ واجب نہیں ہوتی اس کا جواب یہ ہے کہ وہ توبہ طبعی تھی جب انہیں ہول وحراس کا سامنا ہوا تجدید توبہ کی جیسا کہ آدمی کی طبیعت ہے کہ ایسے احوال میں تجدید توبہ اور تجدید توحید کرتے ہیں لہٰذا یہ بات معلوم ہوئی کہ دیدار خداوندی درست ہے۔

سوال: اگر دیدار جائز ہوتا جناب موسیٰ علیہ السلام اس کے لئے اولیٰ تر تھے جب ان کو منع کیا گیا تو دوسروں کے لئے بھی ممانعت اولیٰ تر ہے؟

جواب: یہ ہے کہ سوال بے وقت تھا اس لئے کہ انہوں نے دنیا میں دیدار طلب کیا اور خدا نے دیدار کا حکم آخرت میں دیا تھا۔ جواب کی جو حقیقت ہے یہی ہے۔ واللہ اعلم۔ ''اللہ زیادہ جانتا ہے'' ۔ کہ دنیا ابتلا اور امتحان کی سرا ہے۔ جب دیدار ہو جائے تو ابتلا اور امتحان اٹھ جاتا ہے جبر لازم آتا ہے اور وہ جائز نہیں ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جناب موسیٰ کو منع کی حکمت یہ تھی کہ جناب رسول اللہ ﷺ کی دلداری کرنی تھی حدیثوں میں آتا ہے کہ جناب جبرئیل علیہ السلام آئے وحی لائے قَالَ رَبِّ اَرِنِیْ اَنْظُرْ اِلَیْکَ (موسیٰ نے کہا کہ اے میرے رب مجھے ایسا دکھا کہ میں تیری یعنی تجھے دیکھوں) تو رسول مقبول ﷺ قدموں پر اٹھ گئے اور ایک حد تک چہرۂ انور کا رنگ متغیر ہو گیا اور فرمایا اَرٰی رَبِّی اَحَدٌ قَبْلِیْ (کیا مجھ سے قبل بھی کسی نے میرے رب کو دیکھا ہے) جناب جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا قَالَ لَنْ تَرَانِیْ (رب نے فرمایا تم مجھے ہرگز نہ دیکھو گے) رسول علیہ السلام بیٹھ گئے اب چہرہ انور کا رنگ اپنے حال پر ہوا اور فرمایا اَلْاٰنَ طَابَ قَلْبِیْ (اب میرے دل کو سکون ہوا)۔ دیدار خداوندی فرشتے اور بہشت کے حور وغلمان کو ہوگا یا نہیں؟

اس میں اس طرح کہا گیا ہے کہ جبرئیل، اسرافیل، میکائیل، عزرائیل اور دوسرے فرشتے صلوٰۃ اللہ اجمعین کو دیدار خداوندی ہوگا۔ یہ اس لئے کہ یہ لوگ نبوت اور رسالت کے درجہ میں ہیں قول خداوندی ہے۔ اَللّٰہُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ ۝ اور مومنوں میں سے کوئی عاصی ہے تو کوئی کبیرہ کا مرتکب ہے کوئی ان میں سے قبل کافر رہ چکا ہے بعد میں مسلمان ہوا ان میں سے کوئی بدعت اختیار کرنے ولا ہے ان میں سے کوئی ایسا ہے جس کے ایمان کی مقدار محض ذرہ برابر ہے۔ جب یہ لوگ بہشت میں جائیں گے اور خداوند تعالیٰ کو دیکھیں گے تو ایسے لوگ جو وحی لاتے ہیں اور خدا کے رسول ہیں خدا تعالیٰ کی جانب سے خبر پہنچاتے ہیں خوش خبری دیتے ہیں یہ لوگ تو اولیٰ ہیں کہ دیکھیں اور ان کے لئے ممنوع نہ ہو۔ اور اگر ایسے لوگ نہ

دیکھیں گے تو خطا کار کو فضیلت دینا پاک رسولوں یعنی فرشتوں پر لازم آئے گا اور یہ جائز نہیں۔

اسی دلیل سے یہ بات ثابت ہوئی کہ تمام فرشتگان صلوٰۃ اللہ اجمعین کو دیدار خداوندی ہوگا۔

ابوشکور سالمی رحمتہ اللہ علیہ کی تمہیدات میں اسی قدر مذکور ہے جتنا کہ بیان کیا گیا لیکن بعضے فقہا رحمتہ اللہ علیہ اس مسئلہ میں رکے ہیں اور کہا ہے کہ فرشتوں کے حق میں رویت کے سلسلے میں نص نہیں ملتی اور منع کا جواز بھی نہیں کیونکہ منع پر کوئی دلیل نہیں۔

اجنوں کے دیدار کے سلسلے میں کہا گیا ہے کہ کوئی نص نہیں ہے لیکن دیدار کی عزت اگر کسی کو طاعت اور ایمان کی قبولیت کی بنا پر ملتی ہے تو ان لوگوں کو بھی ہوگی۔

حور و غلمان کے دیدار حق کے سلسلہ میں کیونکہ وہ بہشت میں ہیں بعضے کہتے ہیں کہ تمام بہشت والے دیکھیں گے یہ اس لئے کہ ہمارے مسلک میں دیدار عمل کے بدلہ میں نہیں ہے محض فضل کی بنا پر ہے ویسے ہی جیسے دنیا میں ایمان و معرفت کی توفیق یہ بھی مکافات عمل سے نہیں ہے بلکہ محض فضل ہے وَذَالِکَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَاءُ (اور وہ جس کو چاہتا ہے اپنے فضل سے نواز دیتا ہے) اور جب کہ یہ اللہ کا فضل ہے وہ جس کو چاہے دے۔

قولہ: وَاِنَّمَا نَفَى اللّٰهُ الْاِدْرَاکَ بِالْاَبْصَارِ لِاَنَّهٗ یُوْجِبُ کَیْفِیَّةً وَاِحَاطَةً وَلَیْسَ کَذَالِکَ الرُّؤْیَةُ.

(ارشاد شیخ ہے) یہ درست ہے اور سچ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے آنکھوں سے ادراک کی نفی کی ہے۔ یہ اس لئے کہ ادراک احاطت اور کیفیت کو موجب ہے اور روایت اس کے برعکس ہے ادراک اور رویت میں فرق یہ ہے کہ اَلْاِدْرَاکُ الْوُقُوْفُ عَلٰی جَوَانِبِ الْمَرْئِی وَالرُّؤْیَةُ تَحَقُّقُ الشَّیْءِ بِالْبَصَر ۔(ادراک دیکھے جانے والے پہلوؤں پر واقفیت حاصل کرنا اور رویت کسی شئے کا ثابت ہو جانا بصارت کے ذریعہ) یعنی خداوند تعالیٰ کا دیدار کیفیت اور احاطہ سے منزہ اور پاک ہے کیونکہ یہ حقیقت مخلوق اور محدث کی ہے۔ خداوند تعالیٰ کا دیدار مخلوق کے دیدار کی طرح نہیں ہے جس کے لئے کیفیت لازم ہے تو دیدار ہوگی ادراک نہیں جیسے کہ آج معرفت خداوندی حاصل مگر ادراک نہیں اس لئے کہ ادراک ماہیت کیفیت کمیت پر ہوتی ہے اور خداوند

تعالیٰ اس سے منزہ اور پاک ہے اِلّا یہ کہ جب وہ شئی ہے اور موجود ہے اپنی ذات سے قائم ہے اور اپنی صفات کے ساتھ قدیم ہے تو رویت درست ہوگی۔

قولہ: وَالنَّبِیُّ ﷺ شَبَّہَ النَّظَرَ بِالنَّظَرِ لَا الْمَنْظُوْرَ اِلَیْہِ بِالْمَنْظُوْرِ اِلَیْہِ فِیْ قَوْلِہٖ اِنَّکُمْ سَتَرَوْنَ رَبَّکُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ کَمَا تَرَوْنَ قَمَرَ لَیْلَۃِ الْبَدْرِ لَا تُضَامُّوْنَ فِیْ رُؤْیَتِہٖ۔

(ارشاد شیخ ہے) یہ جواب ایک شبہ کا ہے، جو شیخ رحمتہ اللہ علیہ نے دیا ہے کہ اگر کوئی کہے کہ حدیث پیغمبر ﷺ سے صحیح نہیں ہے یہ اس لئے کہ اس میں تشبیہ ہے۔ بندگی شیخ رحمتہ اللہ علیہ نے جواباً یہ کہا کہ حضرت رسالت پناہ ﷺ نے نظر کو نظر سے شِبہ دی ہے منظور کو منظور سے نہیں اپنے اس قول میں اِنَّکُمْ سَتَرَوْنَ رَبَّکُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَہ (بے شک تم اپنے رب کو دیکھو گے قیامت کے دن) الحدیث۔ یہ سچ ہے اور درست ہے کہ تم لوگ ضرور دیکھو گے پورے طور پر اپنے رب کو قیامت کے دن جیسے کہ دیکھتے ہو چاند کو چودھویں رات میں یعنی جیسے کہ چاند کو بے حجاب اور بلا شک وشبہ کے دیکھتے ہو ایسے ہی بے حجاب قیامت کے دن، بہشت سے اپنے پروردگار کو دیکھو گے۔

اور اگر منظور کو منظور کے مانند کر کے بیان کروں تو درست نہیں ہوگا یہ اس لئے کہ چاند مکان میں ہے اور خداوند تعالیٰ مکاں میں نہیں ہے۔ چاند جسم ہے خداوند تعالیٰ جسم نہیں چاند جہت میں ہے خداوند تعالیٰ جہت میں نہیں ہے تو معلوم ہوا تشبیہ دینے میں اس حدیث سے مراد نظر کا نظر سے تشبیہ دینا ہے نہ منظور کا منظور سے۔

اور چودھویں رات کی قید کرنا اس روایت کے تحت ہے جیسا کہ مروی ہے کہ ایک رات پیغامبر ﷺ اپنے اصحاب کے ساتھ تشریف فرماتھے اتفاق سے وہ رات اس مہینہ کی چودھویں تاریخ کی تھی، ماہ کامل پورا چاند نکلا ہوا تھا نظر مبارک چاند پر ڈالی اور یہ حدیث زبان مبارک سے ارشاد فرمائی۔ اِنَّکُمْ سَتَرَوْنَ رَبَّکُمْ الیٰ آخرہ۔ (بیشک تم لوگ دیکھو گے اپنے رب کو قیامت میں) اور یہ جو کہا لَا تُضَامُّوْنَ فِیْ رُؤْیَتِہٖ خداوند تعالیٰ کو دیکھنے میں ایک دوسرے کو مزاحم نہیں ہوگا۔

لَا تُضَامُّوْنَ میں دو روایت ہے ایک تشدد کے ساتھ دوسرے تخفیف میم کے ساتھ اگر یہ تخفیف میم یعنی بلا تشدید کے ہو معنی ایسے ہوگا کہ لاتضامون بمعنیٰ لَا تُشَکُّوْنَ یعنی خداوند تعالیٰ

کے دیدار میں شک نہ کرو کہ کل قیامت کے دن خداوند تعالیٰ کو تمام مومنین دیکھیں گے جیسے کہ آج دنیا میں چودھویں رات کے چاند کو دیکھتے ہیں کہ اس کے دیکھنے میں دیکھنے والے کو شک وشبہ نہیں ہے۔اور اگر تشدید میم کے ساتھ کہو تو معنی ایسے ہوگا کہ لا تضامون بمعنی لَا تُزَاحِمُوْنَ مِنَ الْمُضَامَّةِ وَهُوَ الْمُزَاحِمَةُ بمعنی لَایُزَاحِمُ بَعْضُكُمْ بَعْضاً یعنی خداوند تعالیٰ کے دیکھنے میں کوئی کسی کا مزاحم نہیں ہوگا کل قیامت کے دن تمام مومنین دیکھیں گے جیسے کہ آج دنیا میں چودھویں رات کے چاند کو دیکھتے ہیں لیکن اس دیکھنے میں ایک دوسرے کی مزاحمت نہیں کرتے ہر ایک شخص یہ سمجھتا ہے کہ دیکھنے والا میں ہی ہوں۔

یوں کہتے ہیں کہ کل قیامت کے دن اگر کوئی یہ جان لے کہ دوسرا بھی دیکھ رہا ہے تو لذتِ یافت اس کو حاصل نہ ہوگی۔ ہاں یہ تو ہے کہ بھائیوں کے ساتھ کھانے پینے میں خوشی ہوتی ہے لیکن محبوب کے دیدار میں شرکت گوارہ نہیں، عاشق اپنے دیدہ و دل کے ساتھ غیرت رکھتا ہے۔ بیت۔

از رشک تو برکشم دل و دیدہ خویش تا اینت نہ بیند و نہ آں وارد دوست

(رشک کی بنا پر دل و دیدہ کو تجھ سے ہٹا لیتا ہوں تا کہ دل چاہنے میں رقیب نہ بنے اور آنکھ دیکھنے میں شریک نہ ہو)۔

خواجہ ابوالحسن نوری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے لوگوں کا اس بات پر اختلاف کہ قیامت میں اس کا دیدار ہوگا یا نہیں، لیکن ابوالحسن نقد معاملہ کرتا ہے یہ مشکل ہے کہ ادھار کے معاملہ پر خود کو بیچے اَلْاِنْتِظَارُ مَوْتُ الْاَحْمَرُ (انتظار خونی موت ہے) بیت

ہر کرا ایں آفتاب ایجا بتافت انچہ آنجا وعدہ بود ایجا بیافت

(اس آفتاب کو جس نے یہاں دیکھا، جس چیز کا اسے وہاں وعدہ تھا اسے یہیں مل گیا)۔

سوال: دنیا میں خداوند تعالیٰ کا دیدار کسی کو کرامت کی وجہ سے دل اور آنکھ کے ذریعہ جائز ہے یا نہیں؟

جواب: اس پر اجماع ہے کہ خداوند عزوجل کو دنیا میں دیکھنا نہ صرف بصر سے روا ہے

نہ دل سے مگر یقین کی راہ سے۔ یعنی دیدار دنیا میں نہ آنکھ سے روا ہے نہ دل سے مگر یقین کی راہ سے مطلب یہ ہے کہ دل سے یقین کرے کہ ہے اور جب بندہ کا یقین بندہ کے لئے درست ہو گیا تو یہ ایسا ہوا کہ اس نے دیکھ لیا لیکن یہ دیدار نہیں ہوا۔

جو شخص اس کو جائز سمجھتا ہے کہ بندہ خداوند تعالیٰ کو اس جہان میں دیکھتا ہے آنکھ یا دل کے معائنہ کے ذریعہ گمراہ ہے، بدعتی ہے، جھوٹا ہے، مگر اس معنیٰ کر دل سے یقین کے ذریعہ یہ جانتا ہے کہ "ہے" یہ جائز ہے، اور یہ سب شرح تصرف میں مذکور ہے۔

قولہ: وَاَجْمَعُوْا عَلَى الْاِقْرَارِ وَالْاِیْمَانِ بِجُمْلَةِ مَا ذَكَرَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى فِى كِتَابِهٖ وَجَائَتْ بِهِ الرِّوَايَاتُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ مِنَ الْجَنَّةِ وَالنَّارِ وَاللَّوْحِ وَالْقَلَمِ وَالْحَوْضِ وَالصِّرَاطِ وَالشَّفَاعَةِ وَالْمِيْزَانِ وَالصُّوْرِ وَعَذَابِ الْقَبْرِ وَسُوَالِ مُنْكِرٍ وَنَكِيْرٍ وَاِخْرَاجِ قَوْمٍ مِنَ النَّارِ بِشِفَاعَةِ الشَّافِعِيْنَ وَالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ وَاَنَّ الْجَنَّةَ وَالنَّارَ خُلِقَتَا لِلْبَقَاءِ وَاَنَّ اَهْلَهُمَا فِيْهِمَا تَخَلَّدُوْنَ مُنَعَّمُوْنَ وَمُعَذَّبُوْنَ غَيْرَ اَهْلِ الْكَبَائِرِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فَاِنَّهُمْ فِى النَّارِ لَا يُخَلَّدُوْنَ.

(ارشاد شیخ ہے) اس گروہ صوفیہ کا اقرار پر، ایمان پر، اور ان سب پر جس کا خداوند تعالیٰ نے اپنی کتاب میں تذکرہ کیا ہے اور جو کچھ پیغامبر ﷺ سے روایت ہے بہشت اور دوزخ لوح وقلم، حوض وصراط، شفاعت، ترازو، صور، عذاب قبر، سوال منکر نکیر، اور ایک گروہ کا دوزخ سے نکلنا شفاعت کرنے والے کی شفاعت سے، اور زندہ ہونا مرنے کے بعد اور یہ درست ہے اور سچ ہے کہ بہشت اور دوزخ دونوں پیدا کئے جا چکے ہیں ہمیشہ کے لئے اور یہ بھی صحیح ہے کہ اہل بہشت اور اہل دوزخ ہمیشہ بہشت اور دوزخ میں رہیں گے۔ اہل بہشت ہمیشہ نعمت کے ساتھ رہیں گے اور اہل دوزخ ہمیشہ عذاب میں مبتلا رہیں گے۔ گنہگار مومنوں کو عذاب جائزات سے ہے اور کافروں کو عذاب واجبات سے اور ہم لوگوں کا یقین ہے کہ بہشت اور دوزخ دونوں پیدا کئے جا چکے ہیں کیونکہ خدا تعالیٰ نے دوزخ کے متعلق فرمایا ہے وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ٥ یعنی دوزخ پیدا کیا جا چکا ہے اور بنایا جا چکا ہے اُعِدَّتْ، خُلِقَتْ کے معنی ہیں اگر

پیدا کیا ہوا نہ ہوتا یا بنایا ہوا نہ ہوتا تو بہشت میں ہمیشہ رہنا اور دوزخ میں ہمیشہ رہنا اس سبب سے سختیوں کا منقطع ہونا تمام نعمتوں سے خوشتر ہے۔ اور نعمتوں کا منقطع ہونا تمام عذابوں سے سخت ہے۔ اگر کافروں سے عذاب منقطع کیا جاتا تو یہ ایک ایسی چیز ہوتی جو بہشتوں کی نعمت سے زیادہ اچھی ان کو معلوم ہوتی، اور اگر بہشتیوں سے نعمت منقطع کردی جاتی تو یہ ایک ایسی چیز ہوتی جو دوزخیوں کے عذاب سے ان کے لئے زیادہ سخت ہوتی۔

اور حکمت کی رو سے دوست کے ساتھ دشمن سے بدتر سلوک کرنا اور دشمن کے ساتھ دوست سے بہتر سلوک کرنا درست نہیں معلوم ہوتا جیسا کہ کہتے ہیں وصال کے بعد فراق تمام عذابوں سے زیادہ سخت ہے اور وصال فراق کے بعد تمام نعمتوں سے زیادہ پسند ہے۔ پھر وہ مومن کہ جو گنہگار ہوں ان پر حکم مشیت سے متعلق ہے کہ اگر وہ چاہے تو ان کو بخش دے اور یہ اس کا فضل ہوگا اور اگر چاہے تو عذاب کرے اور یہ عدل ہوگا۔ عذاب کرنے میں مومن کے لئے اگرچہ وہ گنہگار ہو کسی حال میں بھی خلود (ہمیشگی) کے قائل نہیں ہیں۔ یہ اس لئے کہ گناہ ایک گھڑی سرزد ہوا ہے اور برسوں با ایمان رہا ہے تو یہ محال ہے کہ ایک گھڑی کی معصیت سو سال کے ایمان پر غالب آجائے۔

عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا ہر وہ مومن جو اس جہاں سے گناہ لے کر جاتا ہے خداوند تعالیٰ ان تین کاموں میں سے ایک کام کرے گا۔ یا اپنی رحمت سے اس کو معاف کردے۔ یا پیغمبر کی شفاعت سے ان کو بخش دے یا بقدر گناہ عذاب کر کے آزاد کردے اور دوزخ سے باہر لے آئے۔

نقل ہے کہ خواجہ حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ کی مجلس میں لوگوں نے تذکرہ کیا کہ حدیث شریف میں ہے کہ آخری شخص کو جو دوزخ سے باہر لائیں گے وہ دوزخ سے رہائی سات ہزار سال کے بعد ہوگی۔ خواجہ حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا اے کاش کہ وہ حسن بصری ہوتا بزرگوں کی روش ایسی ہی رہی ہے کہ خداوند تعالیٰ سے ان کی تمام امیدیں دوسروں کے حصہ کی ہوتی ہیں اور ان کا تمام خوف ان کے اپنے حصہ کا ہوتا ہے ان کا حال دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وعدہ عذاب جس قدر بھی آیا ہے وہ انہیں کے لئے اور وعدۂ نعمت وہ سب دوسروں کے لئے۔

معافی کا تعلق اس کی مشیت سے ہے۔ جس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا قول ہے اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَادُوْنَ ذَالِکَ لِمَنْ یَّشَاءُ ط بے شک اللہ شرک کو نہیں بخشے گا اس کے علاوہ جتنی چیزیں ہیں جیسے چاہے بخش دے گا۔

شرک سے مغفرت کی نفی بلا شرط فرمادی اور جتنی چیزیں شرک کے علاوہ ہیں ان کی بخشائش شیت کے قید کے ساتھ معلق کردی، گناہ کبیرہ شرک نہیں شرک کے علاوہ ہیں جیسے صغیرہ تو ظاہر ہے کہ مغفرت میں مشیت سب پر واقع ہوگی تا کہ معلق کرنے کا فائدہ حاصل ہو۔

اس کے معنیٰ اہل اشارت ایسے کہتے ہیں کہ گویا خداوند تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب شریک لایا تو میرا عوض لایا اور دوستی میں عوض لانا دوستی کے خلاف ہے۔ جب شریک نہیں لایا تو عوض نہیں لایا، گناہ کیا، بے ادبی و گستاخی کی، بے ادبی گستاخی دوستی کے شرط کے خلاف نہیں۔ یعنی میرا عوض شریک نہ ٹھہراؤ کہ اس کو میں معاف نہیں کرسکتا ہاں گستاخیوں کو معاف کرتا ہوں۔

نقل ہے کہ ایک دن امام شبلی رحمتہ اللہ علیہ ایک جگہ سے گذر رہے تھے ایک کہنے والا کہہ رہا تھا کُلُّ ذَنْبٍ لَکَ مَغْفُوْرٌ سِوَی الْاَ عْرَاضَ عَنِیْ. (بڑے کل گناہ بخشے ہوئے ہیں سوائے مجھ سے منھ موڑنے کے) ایک نعرہ مارا اور بے ہوش ہوگئے جب ہوش میں آئے تو ان سے لوگوں نے پوچھا کہ آپ کو کیا ہوا؟ فرمایا کہ اس کہنے والے نے کہا کہ تمام گناہ بخشا ہوا ہے مگر وہ گناہ کہ مجھ سے روگردانی کرے اس مفہوم کو خداوند عز و جل کی طرف سے ہم نے سنا اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَادُوْنَ ذَالِکَ لِمَنْ یَّشَاءُ خداوند عز و جل فرماتا ہے کہ ہم نے منہ نہ موڑ اور میرا عوض (یعنی میرا شریک) نہ لا۔ اس کے علاوہ تو جو کچھ بھی کرے میں بخش دوں گا۔

وَالْلَّوْح: لوح ابن عباس ﷺ کی روایت کے مطابق ایک در (سفید تختہ) ہے اس کی لمبائی اتنا ہے جتنا آسمان اور زمین کا درمیانی حصہ ہے اور پہنائی اتنی ہے جتنا مشرق اور مغرب کا درمیانی حصہ ہے اس کے دونوں کنارے موتی اور یاقوت سے بنے ہوئے ہیں اور ساری چیزیں اس میں لکھی ہوئی ہیں۔

وَالْقَلَمْ:   تفسیر میں مذکور ہے کہ پہلی چیز جو خداوند تعالیٰ نے پیدا کی وہ قلم ہے پھر قلم کو حکم دیا کہ لکھ قلم نے عرض کیا کہ اے میرے رب کیا لکھوں فرمایا قدر یعنی تقدیر تو قلم نے قیامت تک جو کچھ ہوتا ہے اس کو لکھنا شروع کیا۔ بعض روایت کے مطابق قلم وہ چیز ہے کہ وہ واسطہ ہے اس واسطہ کو حکم ہوا کہ لکھے تو اس فرمان کے تحت وہ واسطہ تحریر میں مشغول ہوا۔

لیکن اس کی ماہیت کہ وہ کیا چیز ہے اس کو خدا ہی جانتا ہے کتابوں میں کہیں نظر نہیں آیا مگر عین القضاۃ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ خانہ مالک کا سامان مالکِ خانہ جیسا ہوتا ہے۔

وَالْحَوْضِ:   حوض ایک کشادہ جو ہے، عدن سے صنعا تک جتنی مسافت ہے اتنی اس کی فراخی ہے اس نہر کے کنارے سونے کے درخت ہیں جس کے پھل زبرجد کے ہیں۔ رسول ﷺ نے فرمایا کہ معراج میں میں نے اس نہر میں ہاتھ ڈالا مشک سے زیادہ خوشبو تھا ہر مومن کی تعداد میں اس کے کنارہ پر ایک جام رکھا ہوگا اور اس کا پانی شہد سے زیادہ مزیدار اور دودھ سے زیادہ سفید ہے۔ کوئی شخص بہشت کا کھانا نہیں کھائے گا جب تک کہ وہ آب کوثر نہ پی لے۔

اور بہشت میں ایک نہر ہے اس نہر سے پانی اس حوض میں آتا ہے اور حدیثوں میں یہ بھی آیا ہے کہ یہ حوض فرشتہ کے پیٹھ پر ہے میدان قیامت میں حضور ﷺ جہاں کہیں جائیں گے وہ فرشتہ اس حوض کو ساتھ لیتا چلے گا اور ہمیشہ آپ کے ساتھ رہے گا جب رسول اکرم ﷺ بہشت میں جائیں گے اس حوض کو آپ ﷺ کے ساتھ بہشت میں لے جائے گا اس حوض سے ایک مرتبہ بھی جو پی لے گا پھر پیاسا نہ ہوگا اور ملائکہ سے کسی تکلیف کی شکایت نہیں کرے گا۔

وَالصِّرَاطِ:   صراط ایک ایسا پل ہے جس کو دوزخ پر قائم کیا ہے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے حضرت رسالت پناہ ﷺ سے پوچھا کہ جب زمین بدل جائے گی تو اس وقت آدمی سب کہاں رہیں گے فرمایا کہ پل صراط پر اور پل صراط کا ایک کنارہ قیامت کے پیٹھ پر اور ایک کنارہ بہشت کے در پر جب مخلوق قیامت میں پل صراط پر گذرنے لگے گی اسی درمیان میں زمین کو بدل دیا جائے گا ایسا کہ ابھی وہ بہشت میں پہنچ بھی نہ پائے ہوں گے۔ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا یہ بھی فرماتی ہیں کہ ہم نے پوچھا کل قیامت کے دن آپ کو

کہاں تلاش کروں گی یا رسول اللہ ﷺ فرمایا کہ حوض کے نزدیک جبکہ ہم اپنے امتیوں کو پانی پلا رہے ہوں گے۔ پھر پوچھا اگر وہاں نہ پاؤں فرمایا میزان کے نزدیک تا کہ اپنی امت کے میزان کے پلہ کو وزنی بناؤں پھر پوچھا اگر وہاں نہ پاؤں فرمایا پل صراط کے قریب وہاں میں کہہ رہا ہوں گا یَا رَبِّ سَلِّمْ سَلِّمْ (اے رب بچا بچا)۔ پھر عرض کیا اگر وہاں نہ پاؤں فرمایا کہ ان تین جگہوں میں سے کوئی جگہ ایسی نہ ہوگی جہاں میں نہ ہونگا اس وقت تک جب تک میری امت میں سے ایک شخص بھی باقی رہے گا اور حدیث شریف میں ہے کہ پیغامبر ﷺ نے ایسا فرمایا ہے کہ پل صراط نصب کیا گیا ہے دوزخ پر اور یہ پل صراط تلوار سے زیادہ تیز اور بال سے زیادہ باریک ہے اور اس کے دونوں کنارہ پر کاٹنے کی جھاڑیاں سعداں کانٹے کی طرح یعنی لوہے کا ایسا کانٹا جس میں نوک لگی ہو جس کی طوالانی خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا اور اس کے دونوں کنارے پر کھڑے رہیں گے جو کہتے ہوں گے رَبِّ سَلِّمْ سَلِّمْ (اے رب بچا بچا)۔

لوگوں کے گذرنے کے انداز میں فرق ہوگا بعض تو بجلی کی طرح گذر جائیں گے اور بعض ہوا کے مانند اور بعض گھوڑوں کی رفتار سے اور بعض چینٹیوں کی طرح ہر شخص بقدر اپنے اعمال و درجات کے گذر جائے گا۔

مومنوں کے پل صراط پر گذرنے کی حکمت یہ ہے کہ یہ مخالفت سے خالی نہیں ہیں۔ ہاں مخالفت جفا نہیں ہے قصور ہے کیونکہ یہ وفا سے بھی خالی نہیں ہے۔ پلصراط پر گذرنے کے درمیان نعمتیں روک دی جائیں گی اور عذاب کے دیدار کا خوف ہوگا جس خوف میں مبتلا کئے جائیں گے یہ اس لئے ہوگا کہ مخالفت اور تقصیر کا اثر ان پر نہ رہے اور بہشت کے نعمتوں کی لذت پائیں۔

وَالشَّفَاعَة: اور شفاعت اس نص سے ثابت ہے قَالَ اللہ، وَلَسَوْفَ یُعْطِیْکَ رَبُّکَ فَتَرْضیٰ (اور آگے آپ کا رب آپ کو اتنا دے گا کہ آپ راضی خوش ہو جائیں گے)۔

جب یہ آیت کریمہ آئی تو پیغامبر ﷺ نے کہا کہ اے جبرئیل میرے پروردگار کو میری امت کے حق میں میری خوشی مطلوب ہے؟ جبرئیل نے کہا ہاں یا محمد ﷺ تو حضور نے کہا خدا کی قسم میں ہرگز راضی خوش نہ ہوں گا جب تک کہ میری امت کا ایک شخص بھی دوزخ میں باقی رہے گا۔

اور یہ نص ہے انکار درست نہیں جو اس نص کا منکر ہوگا کافر ہوگا۔

اشارت قرآن میں امام قشیری رحمتہ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ پیغامبروں کی شفاعت مطیعان کے حق میں ان کے درجات کی زیادتی کے لئے ہوگی اور عاصیوں کے حق میں ان کے گناہوں کی مغفرت کے لئے۔ اور ایسے ہی پیروں کی شفاعت مریدوں کے حق میں ہوگی۔

ان میں جو لوگ اہل سلوک ہیں تحقیق اور توفیق کی ان کو زیادتی ہوگی اور جو لوگ اہل فترت اور تخبط ہیں ان کے ساتھ درگذر ہوگا۔

تو ان لوگوں کے لئے شفاعت اس طرح ہوگی کہ خدا کی جانب سے ان کے باطن کی تعریف ہوگی اور یہی ان لوگوں کے لئے شفاعت کا اذن ہو۔ بزرگوں کی شفاعت سنی جائے گی اور مقبول ہوگی چھوٹوں کے حق میں جلد یا بہ دیر۔

پیغمبروں کی شفاعت کئی موقعوں سے ہوگی۔ ایک قوم کے لئے حساب سے قبل ایک کے لئے حساب کے بعد اور ایک گروہ کے لئے دوزخ میں لائے جانے کے بعد۔ احادیث میں آتا ہے کہ جس وقت پیغامبر علیہ السلام شفاعت کا تذکرہ فرما رہے تھے یہ بھی فرمایا اَتَـــرَوْنَهَـــا لِلْمُطِيْعِيْنَ لَا بَلْ هِيَ لِاَصْحَابِ الدِّمَاءِ وَالْعَظَائِمِ وَالْمتلوثِيْنَ بِالذُّنُوْبَ (کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ شفاعت اطاعت کرنے والوں کے لئے ہوگی؟ نہیں یہ تو خون کرنے والے گناہ عظیم کرنے والے اور گناہوں میں ملوث رہنے والوں کے لئے ہوگی۔ اور یہ بھی فرمایا شِفَاعَتِیْ لِاَهْلِ الْكَبَائِرِ مِنْ اُمَّتِیْ (میری شفاعت میری امت کے کبیرہ کرنے والوں کے لئے ہوگی)

سوال: اگر کوئی یہ کہے کہ حضور ﷺ کی حدیث ہے مُدْ مِنُ الْخَمْرِ لَايَدْخُلُ الْجَنَّةَ (دائم الخمر ہمیشہ نشہ میں رہنے والا بہشت میں داخل نہیں ہوگا۔)

جواب یہ ہے کہ مدمن الخمر بہشت میں عذاب یا معافی سے قبل نہیں آئے گا اور اگر کوئی ایسے کہے کہ روایات میں آتا ہے کہ مَنْ غَشَّنَا فَلَيْسَ مِنَّا (جس نے مجھ سے خیانت کی مجھ سے نہیں) جواب یہ ہے کہ اگر وہ اس کو حلال سمجھتا ہے، اور یہ معنیٰ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ میری سنت سے نہیں ہے۔

وَالْمِیْزَانِ میزان یہ ہے جیسا کہ پیغامبر ﷺ نے فرمایا ہے کہ وہ ترازو ہے ایک زبان اور دو پلہ ہے کشادگی ہر پلہ کی مقدار پانچ سو سال کی راہ کے برابر ہے اگر کوئی سوال کرے کہ یہ ترازو کہاں لٹکایا جائے گا اور ترازو کس چیز کا ہوگا؟ جواب یہ ہے کہ اس مسئلہ کا تعلق خبر سے ہے میزان تو ہم نے خبر سے جانا اس کی کیفیت کی تشریح کے لئے بھی خبر ہی کی ضرورت ہے اور ایسے تمام مسائل جن کا تعلق عقل سے نہیں ہے اس کی کیفیت کے متعلق جب سوال ہو تو جواب یہی ہے کہ آمَنَّا بِمَا قَالَ اللّٰهُ وَعَلٰى مَا اَرَادَاللّٰهُ وَاٰمَنَّا بِمَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَعَلٰى مَا اَرَادَ رَسُوْلُ اللّٰهِ (میں تو ایمان لایا اس پر جو اللہ نے کہا اور جو اس نے ارادہ کیا اور اس پر ایمان لایا جو رسول اللہ نے کہا اور جو کچھ آپ نے ارادہ کیا) اور دوسری بات یہ ہے کہ اگر خداوند قدوس کی مشیت ہوتی کہ اس کی کیفیت بھی ہم جانیں جیسے اس چیز کا وجود ہم نے جانا کیونکہ اس نے بیان کر دیا تو وہ کیفیت بھی بیان کر دیتا۔ جب اس نے کیفیت بیان نہ کی اس نہ بیان کرنے میں اس کی میرے ساتھ کیا مصلحت ہے؟ وہ زیادہ بہتر جانتا ہے لہٰذا جو کچھ اس نے فرمایا اسے ہم بیان کرتے ہیں اور جس چیز کی جانب اس نے ابہام کرنے کا حکم دیا ہم مبہم رکھتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے لَا تَسْئَلُوْا عَنْ اَشْيَاءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ (ایسی چیزوں کے متعلق سوال نہ کرو کہ اگر وہ تم لوگوں کے لئے ظاہر کرو تو تم لوگوں کے لئے برا ہو۔)

بعضوں نے یوں بھی کہا ہے کہ عرش سے لٹکا ہوا ہے بعضوں نے کہا کہ ہم نہیں جانتے کہ کہاں ہے لیکن اتنا جانتے ہیں کہ ترازو ہے اور وہ خدا جو سات آسمان کو معلق رکھ سکتا ہے ترازو بھی معلق رکھ سکتا ہے۔

وَالصُّوْرِ "صور" قرنا کے جیسی ایک چیز ہے جس میں ہر ایک جاندار کے تعداد میں ایک سوراخ ہوگا جناب اسرافیل صلوٰۃ اللہ اس کو منہ میں لگائے منتظر فرمان کے ہیں کہ جیسے ہی حکم ہو صور میں پھونک ماریں پہلے ہی پھونک میں جملہ خلائق مر جائیں گے اور ہر شخص کو ایسا معلوم ہوگا کہ اُسی کے کان میں پھونکا گیا ہے اور جب دوسری مرتبہ صور پھونکیں گے تمام مخلوق زندہ ہو جائے گی۔

اور بعضوں نے کہا ہے کہ دونوں پھونک کے درمیان چالیس سال کا عرصہ گذرے گا۔

کتنی پاک ہے تیری ذات اے خدا کہ تو نے ایک آواز کو ایسی قوت دی کہ اس کے سنتے ہی یکبارگی تمام خلایق مرجائے گی اور پھر دوسری مرتبہ اس کے سننے کے ساتھ تمام خلائق زندہ ہوجائے گی۔

وَعَذَابِ الْقَبْرِ قبر کا عذاب کافروں کے لئے اور مومن میں کچھ گنہگاروں کے لئے حق ہے''۔ لیکن قبر کا عذاب مومنوں کے حق میں جائزات سے ہے اور کافروں کے لئے واجبات سے اور وہ ایک تکلیف ہے کہ جو مردہ کو اس کے دفن کے بعد ہوتی ہے۔

سوال: اگر کوئی یہ کہے کہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جو شخص مرجاتا ہے اس میں نہ کوئی جنبش ہوتی ہے نہ اضطراب اور عذاب کا کچھ اثر بھی اس پر ظاہر نہیں تو میت پر عذاب کا کیا مطلب؟

جواب: عذاب کے اثر کا ظاہر ہونا لازم نہیں ہے کہ جنبش ہو یا اضطراب ہو کیونکہ یہ سچ ہے اور درست ہے کہ خواب میں جب ایک شخص کو احتلام کے موقع پر لذت ملتی ہے اور مصیبت کے موقع پر تکلیف محسوس ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود اس کے ظاہر میں نہ تو کوئی حرکت ہوتی ہے نہ اضطراب۔

ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ حضرت رسالت پناہ ﷺ نے مجھ سے پوچھا کہ قبر کے ضغطہ سے اور منکر نکیر کے سوال سے تمہارا کیا حال ہوگا؟ تو ہم نے کہا یا رسول اللہ میں ضغطہ گور اور سوال منکر نکیر کے سوال سے بہت ڈرتی ہوں تو فرمایا حضور ﷺ نے کہ اے خُمیرَ الیقین کرو کہ مومنوں کے لئے ضغط گور ایسا ہوگا کہ جیسے ماں اپنے فرزند کے ہاتھ پاؤں سہلاتی ہے اور منکر نکیر کے سوال میں مومنوں کی یہ کیفیت ہوگی جیسے کہ آنکھ میں سرمہ لگانے میں جس قدر آنکھ دکھتی ہے۔

اور قبر میں منکر نکیر کا سوال تمام مرنے والوں کے ساتھ ہوگا خواہ وہ چھوٹے ہوں یا خواہ بڑے ہوں یہ سوال اس وقت ہوگا جب لوگ دفن کر کے ہٹ جائیں گے (یعنی جس وقت مردہ تنہا رہ جائے گا) کیونکہ اس سلسلے میں جو حدیث آئی ہے وہ مطلق ہے اَلْمُسْلِمُ اِذَا سُئِلَ فِی الْقَبْرِ يَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَيَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدً رَّسُوْلُ اللّٰهِ الحدیث۔ (مسلمان سے جب

سوال کیا جائے گا قبر میں وہ شہادت دے گا کہ اللہ کے سوا کوئی اللہ نہیں اور گواہی دے گا کہ جناب محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں)۔ سوال ضرور ہوگا خواہ پانی میں غرق ہو کر مرے یا اس کو درندہ کھا جائے یا اسی طرح اور کچھ ہو۔

نقل ہے کہ سلطان العارفین (بایزید بسطامیؒ) قدس سرہ کو لوگوں نے خواب میں دیکھا پوچھا کہ قبر میں کیا معاملہ ہوا فرمایا کہ منکر نکیر آئے مجھ سے سوال کیا کہ تمہارا خدا کون ہے میں نے کہا کہ جاؤ خود اس سے پوچھو کہ تیرا بندہ کون ہے کیونکہ اس طرح اچھا نہیں ہوگا کہ میں کہوں کہ وہ میرا ہے کتنا اچھا ہوتا کہ خدا کہے کہ وہ میرا بندہ ہے۔

اور یہ اَصَحّ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے حق میں جیسے کہ دوزخ نہیں ہے اسی طرح سوال گور حساب، نامۂ اعمال کا پڑھنا اور اعمال کا وزن ہونا بھی نہیں ہے۔ کیونکہ اس طرح کی چیزیں اس لئے ہیں کہ حسنات سیئات سے نتھر آئیں اور اس کے مطابق بدلہ کا معاملہ کیا جائے بخلاف اس کے انبیاء علیہم السلام معصوم ہیں محفوظ ہیں اور اس طرح کی تمام چیزوں سے پاک ہیں۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ اگر انبیاء علیہم السلام کو ان تمام چیزوں سے نجات نہ ہوتو دوسروں کو نجات کی طرف بلانا کیسے درست ہوتا کیونکہ جب وہ خود کو نجات کے حکم میں شامل نہیں کر سکتے اور خود خائف رہتے تو خائف رہ کر دوسروں کی نجات کیسے طلب کرتے اور طلب بھی کرتے تو پہلے اپنے لئے طلب کرنا اولیٰ ہوتا۔

وَالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ اور اٹھایا جانا موت کے بعد یعنی کل خدا تعالیٰ تمام بدن کو بعینہ اسی طرح اٹھائے گا خاک سے لوگوں کو پوست اور ہڈیوں کے ساتھ جیسے کہ وہ تھے۔ تو اپنے حیثیت میں عین ہوگا لیکن صفات کے لحاظ سے اس میں تغیر ہوگا۔ اور یہ صفت کا تغیر اس بات کو واجب نہیں کرتا کہ اسے دوسری مخلوق یا دوسرا شخص سمجھا جائے کیونکہ عمل جو کچھ اس سے ہوا ہے اس کے بدل سے ہوا ہے اگر اس بدن کے علاوہ جس سے عمل ہوا ہے دوسرے بدن پر عذاب کرنا جائز ہوتا تو در حقیقت یہ عدل نہ ہوتا باوجودیکہ خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی۔

ایسے ہی وہ بدن جو طاعت و عبادت کی تکلیف اٹھا چکا ہے وہ ثواب کا اثر حاصل کرے

گا۔ وَاَنَّ الْجَنَّةَ وَالنَّارَ خُلِقَتَا لِلْبَقَاءِ وَ اَنَّ اَهْلَهُمَا فِيْهِمَا مُخَلَّدُوْنَ مُنَعَّمُوْنَ وَ مُعَذَّبُوْنَ غَيْرَ اَهْلِ الْكَبَائِرِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فَاِنَّهُمْ فِي النَّارِ لَا يُخَلَّدُوْنَ. (اور جنت اور آگ باقی رہنے کے لئے پیدا کئے گئے ہیں اور جو اس کے اہل ہیں ہمیشہ رہیں گے، انعام پائے ہوئے لوگ اور عذاب دیئے جانے والے جو اہل کبائر مومنین کے علاوہ ہیں کیونکہ مومنین اہل کبائر جہنم میں ہمیشہ رہنے والے نہیں۔ (مترجم)۔ اس کی تشریح تفصیل جمع اقوال کے ساتھ فصل کی ابتدا میں گذر چکی اس بنا پر یہاں مزید اضافہ نہ کیا گیا۔

قوله: وَاَجْمَعُوْا عَلٰى اَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى خَالِقٌ لِاَفْعَالِ عِبَادِهٖ كَمَا اَنَّهٗ خَالِقٌ لِاَعْيَانِهِمْ. قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ.

(ارشاد شیخ ہے) اے وَعَمَلَكُمْ یہ تشریح اس لئے کہ آیت میں تَعْمَلُوْنَ پر مَا کا لایا جانا اس سے مراد یہ ہے کہ یہ مصدری معنی میں ہے بہ اتفاق تمام نحویان۔ جیسا کہ وہ لوگ کہتے ہیں کہ اَعْجَبَنِيْ مَا صَنَعْتَ اور مراد لیتے ہیں صَنْعُكَ (یعنی ما صَنَعْتُ میں معنی مصدری مراد لیتے ہیں)۔

تو اب آیت کریمہ سے مراد یہ ہوئی کہ اللہ نے تم لوگوں کو پیدا کیا اور تمہارے اعمال کو یعنی خَلَقَكُمْ وَعَمَلَكُمْ اور حدیث شریف میں وارد ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ كُلَّ صَانِعٍ وَصُنْعَتَهٗ (بیشک اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہر کام کے کرنے والے اور اس کے کام کو)۔

اور اس طائفہ کا اس بات پر اجماع ہے کہ خیر و شر، کفر و ایمان، طاعت و معصیت، بندہ جو کچھ بھی کرتا ہے سب کا خالق اللہ ہے جیسا کہ یہ کام کرنے والوں کی خود ذات کا خالق اللہ ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ تو ہر وہ چیز جسے چیز کہا جائے اور وہ چیز مخلوق ہو لازم ہے کہ خالق اس کا خدا ہی ہے یہ اس لئے کہ اگر جسموں کا خالق خدا ہوتا اور افعال کا وہ نہ ہوتا تو بعض اشیاء کا خالق خدا تو کہا جاتا خالق کل شی نہیں کہا جاتا اور ایسی شکل میں اللہ کا اپنے کو خالق کل شی کہنا خلاف واقعہ ہوتا جو ذات الٰہی کے لائق نہیں۔

ماحصل یہ کہ صحیح ہے کہ اللہ جیسے انسان کا خالق ہے افعال کا خالق بھی وہی ہے اللہ تعالیٰ کا

ارشاد ہے هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللهِ کہنا درست نہ ہوگا۔

لیکن اس بیان سے اللہ کی ذات وصفات پر لفظ شیٔ کا جھگڑا اور نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ قبل ہی میں کہہ چکا ہوں کہ وہ خالق ان تمام اشیاء کا ہے جس کو مخلوقی صفات ہیں اللہ اسی کا خالق ہے بخلاف اس کے خود اللہ کے ذات وصفات قدیم ہیں اور جو قدیم ہے اس کا مخلوق ہونا محال ہے۔

اس کو یوں سمجھنا چاہئے کہ ایک شخص سرا میں ہو اور وہ کہے کہ یہ سرا اور جو کچھ سرا میں ہے میرا کیا ہوا ہے ظاہر ہے اس گفتگو میں خود فاعل اور اس کے صفات اس حکم سے خارج ہوں گی اسی طرح اس نے کہا وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ ٥ یعنی اس نے کہا تم کو اور جو کچھ تم کرتے ہو اس کو خدا نے پیدا کیا اسی موقع پر اس نے اپنے کو ہمارے اعمال کا خالق بتایا ٹھیک اس طرح جیسے تمہاری ذات کا خالق اپنے کو بتایا۔

خلاصہ یہ کہ خود عمل کرنے والے کا خالق ہے اور اس کے اعمال کا۔ اعمال خیر ہوں یا اعمال شر جناب رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمر ابن خطاب رضی اللہ عنہ کو فرمایا اے عمر اگر خدا چاہتا کہ سرے سے کوئی معصیت کرے ہی نہیں تو ابلیس کو نہ پیدا کرتا، جناب عمر رضی اللہ عنہ نے کہا یا رسول اللہ ﷺ کیا خیال ہے ہمارے ان کاموں کے متعلق یہ اسی نقشہ پر رہے جیسے لکھ کر فارغ ہو چکے ہیں۔ یا اسے ہم اپنی جانب سے شروع کرتے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا یہ اسی پر ہے جس سے فارغ ہو چکے ہیں جناب عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا تو ہم اس پر بھروسہ کیوں نہ کرلیں اور جو ہو رہا ہے ہونے دیں۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہوا اچھے کام میں لگو کیونکہ ایسا بھی ہے کہ ہر آدمی پر وہی کام آسان ہوتا ہے کہ جس کے لئے اس کو پیدا کیا گیا ہے۔ ایسے ہی موقع پر کہا گیا ہے کہ بندوں کے افعال واعمال ابھی جیسے ہیں یہ اس کا پتہ دیتے ہیں کہ جو کچھ ان کے متعلق قبل میں لکھا جا چکا ہے اس کے باوجود سعادت وشقاوت نہ تو علت ہے نہ سبب کیونکہ بندوں کے اعمال وافعال تو آج ہو رہے ہیں اور سعادت وشقاوت کا حکم ازلی ہے۔ آج ہونے والی چیز اس کے لئے جو ازل سے ہے سبب کیسے بن سکتی ہے۔

ہاں پھر بھی ابھی کے اعمال وافعال خیر وشر کو سبب سے تعبیر کرتے ہیں یہ مجازاً ہے۔

دراصل اس مسئلہ میں دو باتیں ہیں اول اعتقاد کو درست کرنا دوسرے آداب کی نگہداشت اعتقاد کی درستگی اس طرح کہ خالق خیر وشر خدا ہے اس پر تو یقین رکھے تا کہ شرک میں مبتلا نہ ہو اور آداب کی نگہداشت یہ کہ نیکیوں کا لگاؤ اس اللہ کی جانب کیا جائے اور برائیوں کے متعلق کہو کہ یہ میری جانب سے ہے مطلب یہ کہ یوں کہو یَا فَاعِلُ الْخَیْرَاتِ وَیَا محسنُ وَیَا مجمل وَیَا مُفَصِّلُ ایسے ہرگز نہ کہو یَاشَرِیْرُ یَا سَیِّ الْاَفْعَالِ اورایسے یوں سمجھو کہ عرش سے تحت الثریٰ تک تمام چیزوں کا خالق تو وہی ہے لیکن جب نسبت کرنے لگو تو یوں کہو یَا رَبَّ الْعَرْشِ وَالْکُرْسِیِّ وَاللَّوْحِ یوں ہرگز نہ کہو یَا رَبَّ الْحَیَاتِ وَالْعَقَارِبِ وَالْفَارَاتِ وَالْمَزَابِلِ باوجودیکہ پیدا کرنے والا سب کا وہی ہے تو کفر وایمان طاعت ومعصیت سب میں جواب اسی طرح کا ہے کہ اسے خالق افعال کہو لیکن جب تخصیص اور اضافت کرنے لگو تو خیر کی اضافت اس کی طرف کرو اور شر کو اس کی جانب اضافت کرکے نہ بولو تا کہ بے ادبی نہ ہو جیسے جناب خلیل علیہ السلام نے کہا وَاِذَا مَرِضْتُ فَھُوَ یَشْفِین ط (جب میں بیمار ہو جاتا ہوں تو وہ شفا دیتا ہے) اس موقع پر مرض کا تذکرہ اپنی جانب کیا اور شفا کی نسبت خدا کی طرف باوجودیکہ مرض دینے والا اور شفا دینے والا وہی ہے یہ اس لئے کہ زبان میں مٹھاس رہے اور حرف شکایت زبان پر نہ آئے۔

حضور ﷺ سے منقول ہے لوگوں نے گذارش کی یا رسول اللہ ﷺ ہم لوگ جو یہ فسوں (جھاڑ پھونک) کیا کرتے ہیں یا دواجسے استعمال کرتے ہیں کیا یہ تقدیر خداوندی کو واپس کر دیتی ہے؟

جواب ملا جو کچھ ہوتا ہے یہ بھی تقدیر خداوندی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ سوال یہ ہوا کہ بیمار کو ہم جھاڑتے ہیں اور وہ اچھا ہو جاتا ہے یہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تقدیر الہٰی کو پلٹ دیتا ہے اسی کا جواب ملا کہ پلٹنا بھی تقدیر الہٰی ہے یعنی یہ بھی تقدیر میں شامل تھا کہ لوگ افسوں کریں گے اور بیماری کو میں افسوں کے ذریعہ ہٹاؤں گا جیسے شفا تقدیر میں ہے اور دوا و دعا بھی اسی طرح ہے اگر شفا اس دعاء و جھاڑ پھونک سے مقدور نہیں ہے تو وہ فائدہ نہ کرے گا اور دوا کا بھی یہی حال ہے اسی طرح کا دعاء کے معاملہ میں بھی ہے کہ دعاء جو قبول ہوتی ہے اس میں دعا اور اس کی

قبولیت دونوں تقدیر ہے اور یہی جواب صدقہ کے سلسلے میں بھی۔

قولہ: وَاَنَّ الْخَلْقَ کُلُّهُمْ یَمُوْتُوْنَ بِاٰجَالِهِمْ.

(ارشاد شیخ ہے) یہ درست ہے اور صحیح ہے کہ تمام مخلوق مرتے ہیں اپنے وقتوں میں۔ اس لئے کہ خداوند تعالیٰ نے اپنے بندوں کی موت کا حکم دیا ہے اسی کے مطابق جیسا کہ اس کو علم ہے اور جیسا کہ ان لوگوں کے متعلق اس نے چاہا ہے۔ اور اللہ کے علم وارادہ میں نہ تو کوئی تردد ہے اور نہ کوئی اللہ کے حکم وارادہ کو واپس پلٹانے والا ہے۔ اِذَا جَاءَ اَجَلُهُمْ لَا یَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا یَسْتَقْدِمُوْنَ ط (جب ان کی موت کی گھڑی آجائے گی نہ تو کوئی اس کو آگے کرنے والا ہے اور نہ پیچھے کرنے والا ہے) اور یہ مشہور حدیث ہے کہ جب بندہ کی صورت شکم مادر میں پوری ہو جاتی ہے اللہ کا حکم فرشتے کو پہنچتا ہے کہ اس کی پیشانی پر اس کی روزی، اس کی موت، اس کی نیک بختی اور بدبختی لکھ دو اور اس اجل معین کے علاوہ بندہ کے لئے کوئی دوسری اجل نہیں جیسا کہ معتزلین کہتے ہیں یہ اس لئے کہ حکمتِ خداوندی کے یہ خلاف ہے کہ بندہ کے لئے کوئی اجل معین رکھے اور خود اس کو اس کا علم نہ ہو کہ بندہ اس وقت تک زندہ رہے گا یا نہیں اور یہ بھی کہ بندہ کے لئے دو اجل معین کرے کیونکہ ایسا تو وہ کرتا ہے جو کاموں کے نتائج سے واقف نہیں ہوتا۔

سوال: جب مقتول کی موت اپنی اجل معین پر ہے تو قاتل سے مواخذہ کیسا؟

جواب: یہ اس لئے کہ اس نے فعل قتل کا ارتکاب کیوں کیا۔

قولہ: وَاَنَّ الشِّرْکَ وَالْمَعَاصِیْ کُلَّهَا بِقَضَائِهٖ وَقَدَرِهٖ مِنْ غَیْرِ اَ[illegible]وْنَ لِاَحَدٍ مِنَ الْخَلْقِ، عَلَی اللّٰهِ حُجَّةٌ بَلْ لِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ.

(ارشاد شیخ ہے) یہ صحیح اور درست ہے کہ شرک اور معصیت یہ سب تقدیر کی بنا پر ہے اس میں مخلوقات میں سے اللہ رب العزت پر کسی کو کسی دعویٰ کا حق نہیں ہے یہ اس لئے کہ وہ مالک مطلق ہے تو صرف مطلق کا بھی اسی کو حق حاصل ہے اور جب تصرف کا حق مطلقاً حاصل ہے تو اس سے کسی استدلال کی کہاں گنجائش ہے حجۃ بالغہ اسی کو حاصل ہے اور یہ جو کہا گیا بِقَضَائِهٖ وَقَدَرِهٖ قضا اس موقع پر تخلیق اور تکوین کے معنی میں ہے اور قدر کے معنی ہر مخلوق کی حد بندی ہے اس طور پر

جس پر کہ وہ موجود ہوتا ہے اپنے حسن وقبح خیر وشر کے پہلو میں۔

اور حجتہ بالغہ تو یہ ہے کہ خود خداوند قدوس کہے میں نے تمہیں پیدا کیا اور اختیار دیا یہ تمہیں تو اختیار کے باوجود تم نے گناہ کیا کیوں کہ مومن ایمان پر مجبور نہیں ہے باوجود اسکے اس نے پسند کیا اور ایمان اختیار کیا اور کفر کو ناپسند کیا اور کفر سے کراہت کی۔ اسی طرح کافر کفر پر مجبور نہیں ہے کافر اسی بنا پر تو ہوا کہ کفر کو اختیار کرنیوالا اور پسند کرنے والا ایمان سے کراہت کرنے والا اور عناد کرنے والا تو اس طرح دونوں کے دونوں صاحب اختیار دہیں ان پر جبر واکراہ نہیں۔

تم دیکھتے نہیں جب ایمان اختیار کرنے والا جبراً کفر اختیار کرتا ہے تو اس چیز کی بنا پر کفر کی وجہ سے کافر نہیں ہوتا بخلاف اسکے منافق کفر اختیار کرنیوالا سمجھا جاتا ہے چوں کہ تلوار کے جبر سے ایمان لاتا ہے۔

اسی طرح اللہ رب العزت کی جانب سے جبر اس وقت تسلیم کیا جائے گا جب کہ کافر اپنی جاانب سے ایمان اختیار کرے اور کفر سے کراہت کرے پھر بھی اسکو اللہ کافر بنادے ایسے ہی مومن کفر اختیار کرنے اور ایمان سے کراہت رکھے لیکن اللہ اسے جبراً مومن بنادے۔

امام مجاہد رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ حجتہ بالغہ خدا کو آدمی کے نفس پر یوں حاصل ہے کہ اس نے نفس میں عادت اختیار کرنے کی صلاحیت دی ہے اور اسیٰ پر وہ قیامت میں اپنے بندہ پر حجتہ لائیگا کہیگا اَلَمْ اَعْطِکَ نفساً حَمُوْ لَۃَ (کیا میں نے تمہیں بوجھ اٹھانے والا نفس نہیں دیا تھا۔)

اہل سنت وجماعت کا خصوصاً اجماع ہے کہ خداوند تعالیٰ بندوں کیساتھ وہ کرتا ہے جس میں بندوں کی بہتری ہو یہ اس لئے کہ اس نے اپنی صفت بتائی ہے یَفْعَلُ اللّٰہُ مَایَشَاءُ وَیَحْکُمُ مَایُرِیْدُ (خداوند قدوس اپنے بندوں کے ساتھ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جیسا چاہتا ہے حکم دیتا ہے) اگر ایسا ہوتا کہ بندوں کے حق میں وہی کرتا اپنے اوپر وہ واجب کرتا جو بہتر ہو تو اسکو اپنے ارادہ اور مشیت پر کاربند ہونا محال ہوجاتا اور وہ یوں کہتا یَفْعَلُ اللّٰہُ مَاھُوَ اَصْلَحُ لَھُمْ وَیَحْکُمُ مَاھُوَ خَیْرٌ لَھُمْ (اللہ کرتا ہے جو بندوں کیلئے بہتر ہو اور وہی حکم دیتا ہے جو بندوں کے لئے اچھا ہو)

چونکہ اس نے اپنی مشیت اور ارادہ پر کام کیا بندوں کی صلاح کار پر نہیں تو ان لوگوں کا قول باطل ہوا جو یہ کہتے ہیں کہ بندوں کے حق میں صلاح کاری کرنا خدائے تعالٰی کو واجب ہے خدا جو کچھ بھی کرتا وہ بندوں کے حق میں اصلح ہوتا ہے اس قول کی بنا پر اگر یوں کہا جائے کہ خداوند قدوس جانتا تھا کہ کافر سے اس طرح کفر کا ثبوت ہوگا تو پھر اس نے کافر کو پیدا ہی کیوں کیا نہ پیدا کرتا تا کہ یہ لوگ ہمیشگی کے عذاب میں مبتلا نہ ہوتے پیدا ہی نہ ہوتے تو کفر کیسے کرتے ان کے حق میں تو ان کا نہ پیدا کرنا ہی بہتر تھا پھر جب اس نے پیدا کیا اور ایک زمانہ تک مہلت دی کہ وہ بالغ ہو گئے اور کافر بھی ہو گئے اس سے تو یہ لازم آتا ہے کہ اس نے ان کے ساتھ وہ نہیں کیا جو ان کے حق میں بہتر تھا بلکہ وہ کیا جو بدتر تھا۔

دوسری بات یہ لازم آتی ہے کہ جب بندوں پر خدا کا حق واجب ہے اور کسی طرح اس قول کے مطابق بندوں کے حق میں اصلح کرنا واجب ہے تو وجوب میں دونوں برابر ہوں گے اب اس برابری کے بعد بندہ اور خدا کا کیا فرق رہے گا۔

دوسری بات یہ کہ جب کسی کو اس پر حق جتلانے کا حق نہیں ہے اور وہ اپنے ملک میں پوری طرح تصرف کرتا ہے اور اس سے کوئی اونچا نہیں ہے کہ اس کو کسی اصول کا پابند بنائے اور اس کی پابندی چاہے، تو اسی سے معلوم ہوا کہ وہ جو کچھ کرتا ہے عدل سے کرتا ہے ظلم سے نہیں کسی کو اس پر حجت کا موقع بھی حاصل نہیں اس نے خود فرمایا **لَا یُسْأَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَهُمْ یُسْأَلُوْنَ عَمَّا یَفْعَلُوْنَ** (وہ جو کچھ کرتا ہے اس کے متعلق سوال نہیں کیا جاتا، اور لوگ جو کچھ کرتے ہیں اس کے متعلق ان سے سوال کیا جائے گا) ظاہر ہے اس کے سوا جب سب اس کے غلام ہیں تو اس کے حکم بردار ہوئے حکم کے ترک پر ان سے سوال ہوگا لیکن جب خود اس سے اوپر کوئی حاکم نہیں ہے تو وہ جو کچھ کرتا ہے خود اس سے کوئی سوال نہیں ہوگا۔

گروہ صوفیہ کا اجماع ہے اس بات پر کہ خداوند تعالٰی اپنے بندوں کے ساتھ جو کچھ بھی نیکی کرتا ہے یہ اس کا فضل ہے اور فضل کرنے والے کا معاملہ یوں ہوتو ہے کہ اگر وہ کرے تو کرنا جائز نہ کرنے پر کوئی حجت نہ لائی جائے حدیث شریف میں آیا ہے **لَوْ اٰخَذَنِیَ اللّٰهُ وَابْنَ مَرْیَمَ**

بِعَدْلِهٖ وَعَذَّبَنَا فَهُوَ غَیْرُ ظَالِمٍ مجھ کو اور ابن مریم کو اگر وہ پکڑے اپنے عدل سے اور عذاب کرے تو اس عمل پر وہ ظالم نہ ہوگا۔ دوسری حدیث میں آیا ہے کہ سرور کائنات ﷺ جب نماز ادا کرتے تھے تو اس طرح کہ دونوں پائے مبارک آپ ﷺ کے سوج جاتے تھے جبرئیل علیہ السلام آئے کہ خداوند تعالیٰ فرماتا ہے اَلَیْسَ قَدْ غَفَرْنَاکَ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِکَ وَمَا تَاَخَّرَ (کیا ایسی بات نہیں ہے کہ میں معاف کر چکا ہوں آپ کو اس چیز سے جو گناہ آپ کی جانب سے پہلے گذر چکے ہیں اور جو بعد میں ہوں) آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا بَلٰی لٰکِنْ مَنْ یَّامَنُ مِنْ مَکْرِکَ. (جی ہاں لیکن کون ہے جو مامون ہو آپ کے خفیہ کرشموں سے)۔

قولہ: وَاِنَّهٗ لَایَرْضیٰ لِعِبَادِهِ الْکُفْرَ وَالْمَعَاصِیْ. وَالرِّضیٰ غَیْرُ الْاَرَادَةِ

(ارشاد شیخ ہے) یہ صحیح ہے اور درست ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے کفر و معصیت پر راضی نہیں ہے۔ یعنی جب ایک کافر بندہ سے فکر وجود میں آتا ہے یا کسی معصیت کار سے معصیت وجود میں آتی ہے اللہ رب العزت کی اس میں رضامندی نہیں ہے گرچہ اس کے حکم سے اور اس کی قضا سے ہوتا ہے۔

قضا سے اس موقع پر تخلیق کی نسبت مراد ہے اور جو کچھ ہوتا ہے اس کے ارادہ سے اور اسی کی تقدیر سے ہوتا ہے اللہ جل شانہ کا قول ہے اِنَّا کُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ ط اور مشہور حدیث ہے اَلْقَدَرُ خَیْرُهٗ وَشَرُّهٗ مِنَ اللّٰهِ (خیر وشر کی تقدیر اللہ کی جانب سے ہے)۔

رضا اور ارادہ میں فرض ہے یعنی رضا ارادہ نہیں ہے یعنی رضا کا اثر اور ہے ارادہ کا اثر اور ہے کسی اچھی شئے کے ارادہ کو رضا سے تعبیر کرتے ہیں اور یہ طاعت پر بولے جانے کے لائق ہے۔ معصیت پر نہیں۔ اور ارادہ، کی جانے والی چیزوں میں کسی کو مخصوص کر دیتا ہے بِوَجْهٍ دُوْنَ وَجْهٍ وَبِصِفَةٍ دُوْنَ صِفَةٍ (چند وجوہات میں سے کسی ایک کو یا چند صفتوں میں سے کسی ایک کو مخصوص کر دیتا ہے۔)

سوال: اگر کوئی یوں کہے کفر و معصیت اللہ کے حکم سے ہے۔ اللہ کے مقدر کرنے سے اور اس کے چاہنے سے ہوتا ہے پھر بھی اس پر بندہ کو عذاب اور سزا دیتا ہے یہ تو ظلم ہے باوجود یہ

کہ اس کی پاک ذات ظلم سے منزّہ ہے۔

جواب: میں یہ کہوں گا کہ کسی کا خدا پر کوئی حق واجب نہیں اس طرح کہ وہ حق نہ دینے پر حق کی ادائیگی ظلم ہو جائے۔

دوسری بات یہ کہ ظالم اس وقت ظالم کہا جاتا ہے جب وہ کسی دوسرے کی ملکیت میں مالک کی بغیر اجازت کے کچھ کرتا ہے اور جب یہ چیز ثابت ہو چکی کہ خداوند تعالیٰ پر کسی کا کوئی حق واجب ہی نہیں اور وہ جو کچھ کرتا ہے خالص اپنی ملکیت میں کرتا ہے اور جب یہ بھی ہو چکا کہ اس سے برتر کوئی نہیں ایسا جو اس سے کسی دستور و قانون کو طلب کرے تو اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ اس کا کوئی تصرف ظلم و جور نہیں اور وہ جو کچھ بھی کرے اس کا کرنا یا تو فضل ہو گا یا عدل۔

بزرگوں میں سے ایک کہتے ہیں مَنْ لَمْ یُؤْمِنْ بِالْقَدْرِ فَقَدْ کَفَرَ۔ تقدیر پر جس نے ایمان نہ لایا اس نے کفر کیا یہ قول اہل سنت و جماعت کے موافق ہے۔ مَنْ اَحَالَ الْمَعَاصِیْ عَلَی اللّٰہِ فَقَدْ فَجَرَ. جس نے معصیت کو اللہ رب العزت کے حوالہ کیا وہ فاجر ہے یعنی تقدیر کو خدا کی جانب سے سمجھو اور معصیت کو اپنی جانب سے۔

ظاہر ہے جب تقدیر مقرر کرنے کا حق اسکو ہے ایسا نہ سمجھو گے تو دوسری طرح سے گویا تم یوں کہہ رہے ہو کہ میں جو چاہوں کروں تم کون ہو، سوچو اس سے بڑا کفر اور کیا ہے۔ لہٰذا جب معصیت کرو تو کہو میں نے برا کیا اس کی طرف نسبت نہ کرو کیونکہ معصیت عیب ہے عیب کا لگاؤ اللہ کی طرف کرنا کفر ہے۔

کل کا خلاصہ یہ ہوا کہ جب تمہاری اپنی جانب نظر پڑے خود کو سراپا عیب و تقصیر دیکھو اور جب اس کی جانب نگاہ اٹھے تو کُل کا کُل پاکی اور فضل سمجھو تا کہ نگاہ کے دونوں رخ درست ہوں جب اپنے کو عیب دار پاؤ گے عاجزی اور عذر داری پیدا ہو گی نتیجہ میں پاکی آئیگی اور جب اس کو پاک و بے عیب سمجھو گے اور اس کے احسان کا مشاہدہ کرو گے تو شرافت و قرب کی بارآوری ہو گی۔

قولہ: وَیَرَوْنَ الصَّلٰوۃَ خَلْفَ کُلِّ بَرٍّ وَّفَاجِرٍ.

(ارشاد شیخ ہے) اور صوفیہ کا اعتقاد ہے کہ ہر فاسق و صالح کے پیچھے نماز جائز ہوتی

ہے یہ اس بات کی دلیل ہے کہ معصیت سے ایمان زائل نہیں ہوتا ہے اگر عاصی مومن نہیں رہتا تو غیر مومن کے پیچھے مومن کی نماز جائز نہیں ہوتی۔

قولہ: وَلَا يَشْهَدُوْنَ لِاَحَدٍ مِنْ اَهْلِ الْقِبْلَةِ بِالْجَنَّةِ لِخَيْرٍ اَتٰى بِهٖ وَلَا عَلٰى اَحَدٍ بِالنَّارِ لِكَبِيْرَةٍ اَتٰى بِهَا.

(ارشاد شیخ ہے اہل قبلہ میں سے کسی کو نیکوکاری کی بنا پر اس کے بہشتی ہونے کی گواہی نہیں دیتے اور کبائر کے ارتکاب کی بنا پر دوزخ کی گواہی نہیں دیتے بلکہ یوں کہتے ہیں کہ تمام مسلمان اہل بہشت ہیں اور تمام کافر اہل دوزخ ہیں مخصوص کر کے یہ نہیں کہتے کہ یہ مسلمان اہل بہشت ہے یا یہ کافر اہل دوزخ ہے۔ یہ اس لئے کہ ایسا حکم لگانا فیصلہ کن طریقہ ہوگا ایسی چیز کے متعلق جس کا علم نہیں ہے کیونکہ اس کا تعلق غیب سے ہے۔ (نتیجہ اللہ کو معلوم ہے کہ کیا ہوگا) اور اس بارے میں بندہ کو خود اپنے متعلق بھی معلوم نہیں ہے یہ صفت ذات پاک خداوند تعالیٰ ہی کی ہے۔

اور عشرہ مبشرہ رضوان اللہ کے متعلق یہ مخصوص کر کے کہنا کہ اہل بہشت سے ہیں ہم سے لازم نہیں آتا یہ اس لئے کہ اس کا ثبوت کہ یہ اہل بہشت میں پیغامبر علیہ السلام کے قول سے ہے اور حضور ﷺ کو اللہ جل شانہ نے خبر دی ہے۔

اس مسئلہ کی پوری تقریر یہ ہے کہ کفر محل عداوت ہے اور ایمان محل محبت ہے۔ لیکن کافر اپنے کفر میں عداوت خداوندی کی بنا پر ہے یہ اس سے صاف ظاہر نہیں ہوا ہے اس کے عدالت خداوندی کا حال مختلط ہے اور حکم لگانا اسی پر موقوف ہے ہاں اگر کفر ہی کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہوگیا تو اس کی عداوت خداوندی متعین ہو جائے گی یا اگر اس کا کفر زائل ہوگیا تو یہ ظاہر ہو جائے گا کہ خدا سے اس کو محبت ہے۔ اسی طرح مومن باوجود یہ کہ ایمان کی بنا پر خدا کا محب ہے لیکن یہ ظاہر نہیں ہوا ہے کہ خدا سے اس کو محبت ہی ہے کیونکہ اس کی حالت میں بھی التباس ہے اس کے زائل ہونے پر حکم لگانا موقوف ہے اگر یہ مومن دنیا سے ایمان کے ساتھ رخصت ہو تو محبت خداوندی اس کی متیقن ہو جائے گی اور اگر نعوذ باللہ اس کا ایمان ضائع ہوگیا تو یہی ظاہر ہو جائے گا کہ خدا کا دشمن ہے اس کی عداوت خداوندی ہی حقیقت بن جائے گی۔ مخلوقات کی صفات میں

تبدیلی واقع ہونا یہ ممکن ہے صفات خداوندی میں تبدیلی کا امکان نہیں وہ اللہ جس کا محب ہے عدو نہ ہوگا اور جس کا عدو ہے محب نہ ہوگا۔

ہاں ایسا ہوتا ہے کہ اللہ ایک شخص کا محب ہے لیکن خود وہ شخص ابھی اللہ کے عدو کی صف میں ہے جیسا کہ دربار فرعون کے ساحر۔ جب محبیت خداوندی غالب آئے گی اس کی صفات محبت سے بدل جائے گی بخلاف اس کے ایسا شخص کہ حق تعالیٰ اس کا عدو ہے وہ خود محبت الٰہی کی صفت ہی سے کیوں نہ متصف ہو جیسے ابلیس علیہ لعنت۔ جب اللہ کی عداوت زائل ہوگی اس کو محبیت کی صفت اسے عداوت میں بدل دے گی تو ظاہر ہے کہ اللہ کی محبت وعداوت کسی علت سے لگاؤ نہیں رکھتی۔

وہ صفت ازلی ہے صفت ازلی کے لئے کسی بندہ کی روزمرہ کی مخالفت وموافقت علت نہیں بن سکتی کیونکہ علت جس کے لئے علت بنتی ہے اس سے قبل اس کا وجود میں آنا ضروری ہے۔

بیت

همہ جانہائے صدیقان پُر از خون است   کہ میداند کہ سِرّ کار او چون است

(تمام صدیقوں کے پتے پانی ہیں وہ خون کے گھونٹ پی رہے ہیں کسے خبر ہے کہ نتیجۂ کار کارازان کے کیا ہے)۔

قولہ: وَيَرَوْنَ الْخِلَافَةَ فِي قُرَيْشٍ لَيْسَ لِاَحَدٍ مُنَازِعَتُهُمْ فِيهَا

(ارشاد شیخ ہے) صوفیہ کی نگاہ میں خلافت کا حق قریشی کو ہے وہ اس پر اعتقاد رکھتے ہیں خلافت کے معاملہ میں ان کا آپس میں کوئی اختلاف نہیں اس مسئلہ میں باہم بالکل صاف ہیں کہ قریش کے علاوہ کسی کو خلافت کا حق نہیں قریش کا لفظ قرش سے ہے اجتماع کے معنی میں آتا ہے اس کی تصغیر قریش ہے، قریش تھوڑے اجتماع کو کہا جائے گا۔

اس کا قصہ یوں ہے کہ جناب اسماعیل علیہ السلام کی اولاد باہم ایک دوسرے سے جدا ہوگئی تھی ایک ایک دو دو کر کے اطراف سے مکہ میں جمع ہونے لگی اس خیال سے کہ یہ میرے آباؤ اجداد کی جگہ ہے اس طرح ایک تھوڑی سی جگہ جماعت ہوگئی۔ اسی مختصری جماعت کو عرب نے قریش کہنا

شروع کیا یہی تحقیقی غزوات کے بیان کی کتابوں میں آتی ہے اور میں نے جو یہ کہا کہ کسی کو خلافت کے معاملہ میں اختلاف نہیں یہ پیغامبر ﷺ کی اس حدیث کی بنا پر ہے اَلْاَئِمَّۃُ مِنَ الْقُرَیْشِ (امام قریش سے ہوا کریں گے) خلافت کے لئے یہ شرط ہے کہ خلیفہ قریشی ہو۔ خواہ علوی خواہ عثمانی خواہ عمری خواہ بکری خواہ عباسی رضی اللہ عنہم اور جو بھی اس اصل ونسل سے ہے اس کی امامت وخلافت ہو سکتی ہے دوسرے کو نہیں۔

قولہ: وَلَا یَرَوْنَ الْخُرُوْجَ عَلَی الْوُلَاۃِ وَاِنْ کَانُوْا ظَلَمَۃً

(ارشاد شیخ ہے) امیر اگر چہ ظالم ہی کیوں نہ ہو اس کی اطاعت سے گردن ہٹانا مناسب نہیں سمجھتے یعنی ایسا اعتقاد نہیں رکھتے۔

اطاعت میں سلطان جابر اور سلطان عادل برابر ہے۔ یہ اس لئے کہ پیغامبر ﷺ نے فرمایا ہے نماز جمعہ کے تذکرہ میں آیا ہے مَنْ تَرَکَھَا جُحُوْداً لَھَا وَاِسْتِخْفَافاً بِھَا وَلَہٗ اِمَامٌ بَرٌّ وَفَاجِرٌ فَلَا بَارَکَ اللّٰہُ لَہٗ وَلَا جَمَعَ شَمْلَہٗ۔ آپ نے جمعہ کے متعلق فرمایا کہ جس نے نماز جمعہ ترک کی یہ سمجھ کر کہ اسے یہ جائز نہیں سمجھتا ہے یا ترک کی اس بنا پر کہ اس نے اس کو اہمیت نہ دی اس حال میں اس کا امام یعنی امیر اور بادشاہ نیک ہو یا برا ایسی شکل میں اللہ اسے برکت نصیب نہیں کرے گا اور اسے کامیابی نہ دے گا اس موقع پر فاجر اور نیک دونوں بادشاہوں کا ایک ساتھ تذکرہ کیا ہے فاجر اور خیر کرنے والے بادشاہ دونوں کے پیچھے ایک طرح سے نماز ادا کرنے کا حکم دیا ہے اس حدیث سے ثابت ہوا کہ ظالم بادشاہ کے حکم سے گردن موڑنا جائز نہیں۔

یہ تفصیل اس لئے کی گئی کہ معتزلین کا مذہب ہے کہ بادشاہ جب ظلم کرتا ہے طبعی طور پر وہ خود معزول ہو جاتا ہے اور جب وہ بادشاہت سے معزول ہو گیا اس کی اطاعت کا حکم بھی اٹھ گیا بخلاف اس کے اہل سنت و جماعت کے نزدیک سلطان اپنے ظلم کی وجہ سے معزول نہیں ہوتا تو جب اس کی سلطانی باقی ہے جون سی اطاعت بھی وہ ہم سے طلب کرے اس کی اطاعت ہم پر واجب ہے۔

قصہ بیان کیا گیا ہے کہ خواہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی ایک صحبت میں بادشاہ کے

مفسدہ کا تذکرہ کیا گیا آپ نے فرمایا اللہ رب العزت اس کے ہاتھوں سے جس قدر اصلاحات کرانا ہے وہ اس کے مقابلہ میں زیادہ ہے کہ جتنا یہ لوگ تباہی لاتے ہیں۔

محمد ابن شیرین فرماتے ہیں اگر آسمانوں سے مجھے آواز دی جائے کہ آج تیری ستر دعائیں قبول ہونے والی ہیں تو میں تمام دعائیں بادشاہ کے لئے کروں یہ اس لئے کہ ہر وہ دعا جو میں اپنے لئے کروں گا اس سے تنہا میری بھلائی ہوگی اور وہ دعا جو میں بادشاہ کے لئے کروں گا اس سے تمام مسلمانوں کی بھلائی ہوگی۔

پورے طور پر یہ جاننا چاہئے کہ بادشاہ کا فساد مخلوق ہی کی بنا پر ہوتا ہے مخلوق جب اصلاح پر ہوتی ہے تو بادشاہ عادل ہوتا ہے اور مخلوق جب تباہ حال ہوتی ہے بادشاہ ظالم ہوتا ہے حدیث شریف میں وارد ہے كَمَا تَكُونُونَ يُوَلّىٰ عَلَيْكُمْ (تم جیسے ہوگے تمہارا حاکم بھی ویسا ہی ہوگا)۔

قولہ: وَيُؤْمِنُونَ بِالْكُتُبِ الْمُنَزَّلَةِ

(ارشاد شیخ ہے) اور ان تمام کتابوں پر ایمان لاتے ہیں جو اللہ کی جانب سے اتاری گئی ہے یہ سمجھ لو کہ کتب ہائے خداوندی اللہ کا ایک ہی کلام ہے اس کی کتاب کے کسی ایک حصہ یا ایک کلمہ کا جب کوئی منکر ہوگا کافر ہوگا۔ کتب ہائے خداوندی میں باہم کلام ہونے کی حیثیت سے کوئی فرق نہیں ہے اور کلام ہونے کی حیثیت سے باہم ایک دوسرے کو کوئی فضیلت نہیں ہے اس کا کلام ایک ہی ہے مگر ہاں یہ جائز ہے کہ کتابت و تلاوت کی جہت سے ایک کو دوسرے پر فضیلت ہو جیسے حدیث میں آیا ہے کہ سورۂ تبت یدا جو پڑھے گا اس کو ثواب ملے گا ایسا ویسا، اور جو سورہ اخلاص پڑھے گا اس کو بھی ثواب ملے گا اس اس طرح کا اور بھی اسی طرح اور سورتوں کے متعلق آیا ہے۔

قرآن سے قبل کی کتب ہائے منزلہ کے نہ پڑھنے پر تمام امت کا اجماع ہے کیونکہ اس کی قرأت منسوخ ہو چکی ہے قرآن کے نازل ہونے کے بعد تلاوت قرآن کے عوض۔ یہ بات کہ اس کے احکام بھی احکام قرآنی کے عوض منسوخ ہو گئے ہیں یا نہیں اس سلسلہ میں امام اعظم ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا مسلک یہ ہے کہ گذشتہ کتابوں کے احکام جس کا نسخ احکام قرآنی سے ہے یا حدیث

رسول ﷺ سے یا اجماع امت سے یا اس قیاس جلی سے جو بذریعہ نص اس کے نسخ پر دلالت کرتا ہے ایسے احکام منسوخ سمجھے جائیں گے بقیہ جو اس کے علاوہ ہے وہ حکم باقی اور مشروع ہے۔

قوله: وَالْاَنْبِيَاءُ وَالْمُرْسَلِيْنَ.

(ارشاد شیخ ہے) تمام انبیاء ورسولوں پر ایمان لانا فرض ہے اس پر اجماع ہے کہ اللہ کے تمام پیغامبر اللہ کے بندے ہیں اور سب جناب آدم علیہ السلام کے بیٹے ہیں سب اللہ کے پیدا کئے ہوئے ہیں سب معصوم ہیں سب عقل میں مکمل اور عبادت میں مکمل ہیں ان کے کسی عمل میں نقص سمجھنا درست نہیں ہے ان کا عمل تھوڑا ہو یا بہت مکمل اور منقول ہے کہ سب ایک ہی دین پر ہوئے ہیں اور وہ دین اسلام ہے ان سب پر ایمان لانا واجب ہے باوجودیکہ میں ان میں سب کو نہیں جانتا ہوں اور نہ ان کی گنتی معلوم ہے ان میں سے کسی ایک کا بھی کوئی منکر ہوگا تو وہ کافر ہوگا۔

ان کی گنتی کا مسئلہ یہ ہے کہ درحقیقت کیا ہے ہمارے لئے لامعلوم ہے اور یہ جو روایت آتی ہے کہ پیغامبروں کے متعلق جب سوال کیا گیا کہ تعداد ان کی کتنی ہے تو ایک لاکھ چوبیس ہزار بتایا گیا۔ یہ حدیث از قسم احاد ہے اور یہ علم قطعی کا سبب نہیں ہوتا تو یہ بہتر ہے کہ ہم یوں کہیں کہ تمام پیغامبروں پر ہم ایمان لاتے ہیں ان کی تعداد کا تعین کئے بغیر۔

یہ سوال کہ عورت میں کوئی پیغامبر ہوئی ہے یا نہیں بعض فقہا اس مسلک پر نہیں کہ کوئی عورت پیغمبر نہیں ہوئی ہے اور بعض کا یہ مسلک ہے کہ چار عورتیں پیغامبر ہوئی ہیں ان میں ایک جناب موسیٰ علیہ السلام کی والدہ ہیں دوسری جناب عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ حضرت مریم تیسری حضرت ابراہیم صلوٰۃ اللہ کی حرم جنابہ سارہ چوتھے حضرت آدم علیہ السلام کی حرم جنابہ حوا۔ لیکن اس کا جوب یوں کہا گیا ہے کہ یہ صحیح نہیں ہے اور اگر یہ صحیح بھی ہو تو ہم یوں کہیں گے کہ میں تمام انبیاء ورسل پر ایمان لا چکا ہوں خواہ وہ مرد ہوں یا عورت اس طرح کہنا بہتر ہے۔

قوله: وَاَنَّهُم اَفْضَلُ الْبَشَرِ.

(ارشاد شیخ ہے) یہ صحیح اور درست ہے کہ تمام پیغامبر علیہم السلام تمام خلق سے افضل ہیں بشر میں کوئی شخص نہ ان کے برابر فضل میں ہے نہ صدیقیت میں نہ ولایت میں گرچہ بہت زیادہ اس

کے قدر و مراتب ہوں یہ اس لئے کہ انبیاء لامحالہ محبوب ہیں اور خاصوں میں خاص ہیں۔

اور نبوت کے مقام سے کوئی مقام برتر نہیں خصوصیت میں۔ لہٰذا تمام دوستوں میں مخصوص یہی لوگ ہیں جب تک یہ مقام حاصل نہیں نبوت کے لائق نہیں۔ تو محبت خداوندی انبیاء ہی پر پوری طرح صادق آتی ہے۔ کفر سے مامون ہو گئے ہیں۔

مجموعی طور پر یہ سمجھ لو کہ اگر زمانہ کے تمام اولیاء کے احوال وانفاس نبی کے ایک قدم کے کنارہ میں رکھ دیئے جائیں تو ان کا پتہ بھی نہ چلے۔ اولیاء کا گروہ جو کچھ حاصل کرتا ہے اور جس منزل تک پہنچتا ہے انبیاء ہی کے ذریعہ اور جو کچھ پاتا ہے انہیں کے ذریعہ انہیں کی دعوت سے فرمان الٰہی کی اطاعت میں آئے ہیں اور قوم کی رہنمائی کرتے ہیں۔

تو انبیاء کی ایک سانس اولیاء کے جملہ کاروبار سے افضل تر ہے چنانچہ اولیاء جب انتہا کو پہنچتے ہیں تب مشاہدات سے مطلع ہوتے ہیں اور حجاب بشریت سے باہر آتے ہیں اگرچہ عین بشر ہوتے ہیں۔ لیکن پیغامبر کا پہلا ہی قدم مشاہدہ میں ہوتا ہے تو جب ابتداء انبیاء کی، اولیا کی انتہا ہوتی ہے تو اولیاء کو انبیاء پر قیاس نہیں کرنا چاہئے۔

سلطان العارفین (بایزید بسطامی) رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے فرمایا صِدِّیقوں کی آخر وانتہا انبیاء علیہم السلام کے احوال کی شروعات ہے اور انبیاء علیہم السلام کے انتہا کی کوئی ایسی حد نہیں جس کا پتہ کوئی پاسکے، یعنی مقام نبوت کے سوا کوئی مقام صدیقیت کے مقام سے برتر نہیں جس طرح اولیاء کا مرتبہ خلق کی ادراک سے پوشیدہ ہے انبیاء کا مرتبہ اولیاء کے ادراک سے ویسے ہی نہاں ہے۔ اولیاء انبیاء کے سایہ میں سیر کرتے ہیں اور انبیاء اولیاء کو پہلو میں لے کر پرواز کرتے ہیں تو یہ سیر کرنے والے ''پہلو میں لے کر پرواز کرنے والے کو'' اپنے محیط کے اندر نہیں لے سکتے۔

سلطان العارفین قدس سرہٗ سے لوگوں نے پوچھا کہ انبیاء کے احوال کے متعلق کیا فرماتے ہیں؟ فرمایا کہ افسوس ہم لوگوں کو ان کے اندر ذرا تصرف نہیں جتنا ان کے اندر تلاش کرتا ہوں اپنی حد سے آگے نہیں بڑھتا۔

دوسری بات یہ ہے کہ سفیر ہیں یعنی خداوند تعالیٰ اور مخلوق کے درمیان مبلغ ہیں سفیر ہمیشہ بادشاہ سے زیادہ قریب ہوتا ہے اور جو بادشاہ سے زیادہ قریب ہوتا ہے اسرار سلطنت کو زیادہ جانتا ہے تو یہ کیوں کر درست ہوسکتا ہے کہ جو نبی نہیں ہے وہ نبی سے بڑھ جائے یا اس کے برابر ہو جائے۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ جو نبی نہیں ہے اس کو نبی پر ایمان لانا ہوگا اگر نہیں لائے گا کافر ہوگا اور خداوند تعالیٰ پر جو اس کا ایمان ہے وہ بھی برباد ہوگا۔

اور یہ بات بھی ہے کہ پیغامبران لوگوں کی اصلاح کے لئے ہیں جب کہ کوئی ایسا شخص جو پیغامبر نہیں ہے وہ پیغامبر سے بڑھ کر ہو اور وہ، وہ راز جانے کہ جس کا علم پیغامبر کو نہ ہو تو پھر پیغامبر کی کیا ضرورت ہے؟ اور پیغامبر کس کام کے لئے ہیں؟ اور وہ شخص جو راز بہتر جانے وہ بہتر طریقہ سے آراستہ ہوگا تو اسے چاہئے کہ پیغامبر کو آراستہ کرے اور ایسی صورت میں نبوت معطل، اور شریعت رخصت، جو شخص ایسے اعتقاد کا حامل ہے وہ کافر ہے۔ **نعوذ باللہ من ذالک۔**

خلاصہ یہ کہ ملحدوں کی ایک جماعت کہتی ہے کہ اولیاء انبیاء سے **افضل** ہیں وہ اپنے دعویٰ کی دلیل میں یہ کہتے ہیں کہ اولیاء ہمہ وقت خدا کے ساتھ مشغول ہیں اور انبیاء اکثر اوقات خلق کی دعوت میں مصروف ہیں تو ایسا شخص جو ہمہ وقت بحق ہو وہ اس شخص سے **افضل** تر ہوگا جو کچھ وقت مشغول ہو۔

اور جاہلوں کی ایک ایسی جماعت جو اس گروہ اولیاء سے محبت کا دعویٰ کرتی ہے ان سے نیک گمان رکھتی ہے ان کی متابعت کرتی ہے اس کا قول ہے کہ مقام ولایت مقام نبوت سے برتر ہے وہ کہتے ہیں کہ نبی کا علم وحی کے علم سے ہوتا ہے اور ولی کا علم سری ہے ولی اس سر سے وہ چیزیں جانتا ہے جو پیغامبر نہیں جانتے ہیں اور اس علم کو علم لدنی کہتے ہیں اور اس لقب کو جناب موسیٰ اور خضر علیہم السلام کے قصہ سے مشتق کیا گیا ہے وہ کہتے ہیں کہ خضر ولی تھے اور موسیٰ نبی جناب موسیٰ کو وحی ہوا کرتی تھی جب تک ان کو وحی نہیں ہوتی نہیں جانتے۔ خضر کو علم لدنی تھا وہ بلا وحی کے غیب جانتے تھے یہاں تک کہ جناب موسیٰ کو ان کے شاگردی کی حاجت ہوئی، استاد شاگرد سے

افضل تر ہوا۔

لیکن وہ جو اس مذہب صوفیہ کے شیوخ ہیں اور وہ ایسے ہیں کہ ان کے دین پر سبھوں کو اعتماد ہے ان باتوں سے بیزار ہیں کہ وہ جائز نہیں رکھتے کہ کسی کا مقام نبی کے مقام سے بلند ہو یا برابر ہو۔ ہاں اس شبہ کا جواب جو ان لوگوں نے وارد کیا ہے یہ ہے کہ خضر کو یہ فضل مقید تھا اور وہ علم من لدنی کا بعض حصہ ہے۔ بخلاف اس کے موسیٰ علیہ السلام کو فضل مطلق تھا۔ فضل مقید فضل مطلق کو باطل نہیں کرتا۔ مثلاً مریم پارسا کا فرزند پانا کسی بشر کے بغیر مساس کے۔ یہ ایسا فضل نہیں ہے جو فضل عائشہ صدیقہ و فاطمہ الزہرا رضی اللہ عنہا کو باطل کرے کیونکہ ان لوگوں کو عالم کی تمام عورتوں پر فضل مطلق حاصل ہے۔ اور جناب موسیٰ کا خضر کے پاس بھیجا جانا اس کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ موسیٰ علیہ السلام کی ابتلا تھی اور افضل کی ابتلا مفضول کے ذریعہ جائز ہے۔ گرچہ اہل کتاب کہتے ہیں کہ یہ موسیٰ ابن عمران نہ تھے بلکہ موسیٰ ابن مایان تھے۔ اور یہ قول ضعیف ہے۔

قولہ: وَاَنَّ مُحَمَّداً ﷺ اَفْضَلُهُمْ.

(ارشاد شیخ ہے) اور یہ حقیقت ہے کہ محمد ﷺ تمام پیغامبران علیہم السلام سے افضل ہیں۔ اسکی دلیل اس حدیث سے ہے کہ پیغام بر ﷺ نے فرمایا **اَنَا سَيِّدُ وُلْدِ آدَمَ وَلَا فَخْر.** میں تمام اولاد آدم کا سردار ہوں اور مجھے اس پر فخر نہیں اور ارشاد ہوا **آدَمُ وَمَنْ دُوْنَ تَحْتَ لِوَائِي وَلَا فَخْر.** آدم اور آدم کے سوا جتنے ہیں سب میرے جھنڈے کے نیچے ہیں اور اس سے میری مراد فخر نہیں یعنی میں جو یہ کہتا ہوں فخر کے لئے نہیں کہتا۔ بلکہ اس سبب سے کہتا ہوں کہ مجھے اس کا حکم ہے کہ میں ایسا کہوں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اپنے ذات کی پاکی لازم آتی اور اپنی تقدیس حرام ہے۔

قولہ: وَاَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى خَتَمَ بِهِ الْاَنْبِيَاءَ.

(ارشاد شیخ ہے) اور یہ حقیقت ہے کہ خداوند تعالیٰ نے آپ ﷺ پر پیغامبری ختم کر دی۔ یعنی حضور ﷺ کے بعد کوئی نہ آئے گا۔ نبوت آپ پر ختم ہوگئی۔ اور کسی بڑے کام کا خاتمہ نہیں ہوتا مگر کسی بڑی چیز پر۔ کیا یہ نہیں دیکھتے کہ فرمان شاہی کی قدر و قیمت مہر سے ہوتی ہے۔

تم سوال کر سکتے ہو کہ جناب عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے اتریں گے یہ تو حق ہے۔ اس طرح

نبیوں میں آخری تو وہی ہوئے؟ جواباً میں کہوں گا کہ جناب عیسیٰ علیہ السلام جب کبھی بھی نزول فرمائیں گے وہ مستقل نبی نہیں ہوں گے بلکہ محمد ﷺ کے نائب ہوں گے اور انہیں کی شریعت پر عمل کریں گے جیسے آج علمائے امت میں کسی ایک کی حیثیت ہے ان کی حیثیت اس سے زیادہ نہ ہوگی۔

دوسری بات یہ ہے کہ جناب عیسیٰ علیہ السلام کا ظہور اور ان کی نبوت محمد رسول اللہ ﷺ سے قبل ہو چکی ہے، اب بعد میں ان کا کوئی تذکرہ نہیں۔ اور میری گفتگو اس پر ہو رہی ہے کہ آپ کے بعد کسی کی نبوت ظاہر نہیں ہوگی۔

یہاں ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے کہ اگر کوئی کہے حدیث جو پیغامبر ﷺ کی ہے کہ لَاتُفَضِّلُوْنِی عَلٰی اَخِی یُوْنُس مجھے میرے بھائی یونس پر فضیلت نہ دو۔ یہ اس حدیث کے منافی ہے جو پہلے گذری یعنی اَنَا سید ولدِ آدم و آدمُ مَن دُونَ تحتَ لِوائی وَلَافخر کے۔

میں جواب میں کہوں گا کہ یہ جو کہا گیا مجھے فضیلت نہ دو میرے بھائی یونس کے مقابلہ میں اس سے مراد یہ ہے کہ اپنی جانب سے مجھ سے فضیلت دین کی مقابلہ بازی نہ کرو۔ اور اس کا حق تمہیں نہیں پہنچتا ہے کہ نبیوں میں سے ایک کو دوسرے پر تم فضیلت دو۔ اَلْفَضْلُ لِمَنْ فَضَّلَهُ اللّٰـهُ تَعَالیٰ (فضل اس شخص کے لئے ہے جسے اللہ نے فضیلت دی) اور اس تاویل کی تائید تِلْکَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ ط (یہ رسولوں کے نام ہیں جن میں بعض کو بعض پر فضیلت ہم نے دی) دیکھئے اس آیت کریمہ میں فضیلت دینے کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی جانب کی ہے تو دوسرے کو اس میں کیا حق پہنچتا ہے۔

قوله: وَاَفْضَلُ الْبَشَرِ بَعْدَهٗ اَبُوْبَکْرٍ.

(ارشاد شیخ ہے) پیغامبر ﷺ کے بعد آدمیوں میں افضل ترین ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں۔ یہ اس لئے کہ پیغامبر ﷺ نے فرمایا ہے مَاطَلَعَتِ الشَّمْسُ وَلَا رَیْبَ بَعْدَ النَّبِیِّیْنَ وَالْمُرْسَلِیْنَ عَلٰی ذِیْ الصُّبْحَةِ بِخَیْرٍ مِنْ اَبِیْ بَکْرٍ. جملہ پیغامبران علیہم السلام کے بعد کسی ایسی ذات پر آفتاب طلوع وغروب نہیں ہوا جو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے بہتر ہو۔ اور حدیث میں یہ بھی آیا ہے لَمْ یَفْضُلْکُمْ اَبُوْ بَکْرٍ بِکَثْرَةِ صِیَامٍ وَّلَا صَلٰوةٍ وَاِنَّمَا فَضَّلَکُمْ بِشَیْءٍ وُّقِرَ فِی صَدْرِهٖ ابو

بکر کو فضیلت بخشنے والی وہ چیز ہے جو ان کے سینہ میں ہے اور وہ عظمت خداوندی ہے اس سے یہ روایت سمجھ میں آتی ہے جیسا کہ کہا گیا ہے کہ پیغامبر ﷺ کی جس نے سب سے پہلے تصدیق کی اور ان پر ایمان لائے وہ ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے تو یہ بہترین سنت کی راہ دنیا میں انہیں نے کھولی۔ مطلب یہ کہ اب جو شخص یہ تصدیق کرتا ہے پیغامبر ﷺ کی، اور ان پر ایمان لاتا ہے، صدیقی سنت پر گامزن ہوتا ہے۔ لہٰذا کل قیامت کے دن اس تصدیق اور ایمان کی بنا پر تمام مومنین کو جتنا ملے گا اتنا تنہا صدیق اکبر کو ملے گا۔ کیونکہ یہ سنت انہیں کی شروع کی ہوئی ہے تو اس سے یہ ثابت ہوا کہ بعد انبیاء و رسل کے تمام امت پر انہیں کو فضیلت حاصل ہے۔

قولہ: ثُمَّ عُمَرُ: پھر تمام آدمیوں میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بعد افضل حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہیں۔ یہ اس لئے کہ حدیث شریف میں آیا ہے، ایک دن جناب جبرئیل علیہ السلام پیغامبر ﷺ کی خدمت میں موجود تھے، جناب عمر سامنے آئے، جناب جبرئیل نے پوچھا یا محمد ﷺ یہ جو سامنے آئے یہی عمرؓ ہیں؟ حضور ﷺ نے فرمایا اے جبرئیل آسمانوں والے عمر کو جانتے ہیں؟ انہوں نے کہا اس پرور دگار کی قسم جس نے آپ کو مرسل بنایا عمر تو آسمانوں میں اس سے زیادہ مشہور ہیں جتنا زمین میں۔ پیغامبر ﷺ نے فرمایا اے جبرئیل کچھ عمر کے فضائل میرے سامنے کہو۔ جبرئیل نے کہا اے محمد ﷺ اگر میں آپ کی صحبت میں اتنی دیر بیٹھوں جتنی عمر نوح علیہ السلام نے اپنی امت کے درمیان گذاری یعنی ساڑھے نو سو برس اور عمرؓ کے فضائل بیان کرتا رہوں تو بھی عمرؓ کے فضائل ختم نہ ہوں گے۔

یوں بھی کہا گیا ہے کہ جناب عمر کو کوئی دوسری اور فضیلت نہ ہوتی سوائے ان آیات کے جنہیں اللہ نے ان کی رائے کی موافقت میں نازل فرمایا جس پر خود جناب عمر فخر کیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے وافقنی ربی میرے رب نے میری تائید کی تو محض ان آیات کا نزول ہی دوسروں کے مقابلہ میں بڑی فضیلت تھی۔ اور یوں بھی کہا گیا ہے کہ جناب ابوبکر کے حسنات میں سے عمر ایک حسنہ ہیں۔

قولہ: ثُمَّ عُثْمَانُ. پھر ابوبکر صدیق اور عمر خطاب رضی اللہ عنہما کے بعد حضرت عثمان تمام آدمیوں سے افضل ہیں۔ یہ اس لئے کہ آپ سے پیغامبر ﷺ کی دو صاحبزادیاں بیاہی ہوئی

تھیں۔ آدمؑ کے زمانہ سے ہمارے پیغامبر ﷺ کے عہد مبارک تک یہ فضل کسی شخص کو حاصل نہ تھا کہ جس سے کسی پیغامبر کی دو صاحبزادی بیاہی گئی ہوں۔ بعضوں کا قول ہے کہ اسی وجہ سے آپ کو ذوالنورین کہتے ہیں اور بعضوں کا قول ہے کہ اس سبب سے ذوالنورین کہا جاتا ہے کہ آپ نے قرآن کو جمع فرمایا اور جب تک ایک ختم نہ فرمالیتے آپ نہ سوتے۔ قرآن جمع کرنا ایک نور اور ختم فرمانا بھی ایک نور ہے۔

قولہ: ثُمَّ عَلِیٌّ پھر ابوبکر صدیق، عمر خطاب، عثمان ذوالنورینؓ کے بعد تمام آدمیوں میں افضل ترین حضرت علیؓ ہیں۔ یہ اس لئے کہ پیغامبر ﷺ نے فرمایا ہے اَنْتَ مِنِّی بِمَنْزِلَةِ هَارُونَ مِنْ مُوسیٰ اِلَّا اَنَّهٗ لَانَبِیَّ بَعْدِیْ تم میرے لئے بمنزلہ ہارون کے ہو، جیسے موسیٰ کے لئے ہارون تھے مگر یہ کہ میرے بعد کوئی پیغمبر نہ ہوگا نقل ہے کہ جب پیغامبر ﷺ نے تمام اصحاب کو ایک دوسرے کا بھائی بنایا یعنی یہ فرمایا کہ تمہارے بھائی یہ ہیں اور تمہارے بھائی وہ، تو حضرت علی ؓ روتے ہوئے آئے اور کہا یارسول اللہ سبھوں کے لئے ایک ایک بھائی مخصوص فرمادیا گیا۔ میرا بھائی کون ہے؟ ارشاد ہوا اے علی تم کو اپنے لئے رکھا ہے کہ تم میرے بھائی بنو اور ہم تمہارے بھائی بنیں۔ پھر فرمایا کہ اے علی کیا تم اس بات سے خوش نہیں ہو کہ ہم آخرت اور دنیا میں تمہارے بھائی ہوں، حضرت علی نے کہا میں خوش ہوں یارسول اللہ۔

اور ان چاروں اصحاب کی فضیلت میں بہت سی آیتیں ہیں۔ ایک ان میں سے یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے فرمایا مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ط وَالَّذِیْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَی الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا (جناب محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور وہ لوگ جن کو ان کی معیت حاصل ہے، جو کفر کے معاملہ میں سخت ہیں، باہم رحم وشفقت کا جذبہ ان کے اندر ہے، جنہیں تم رکوع اور سجدہ میں دیکھتے ہو) معهٗ ابوبکر۔ اشداء علی الکفار، عمرؓ رحماء بینھم، عثمان غنیؓ، تراھم رکعاً سجداً، علیؓ۔ (آیت کریمہ میں معیت کی صفت امتیازی جناب ابوبکر کو حاصل ہے۔ شدت علی الکفر جناب عمر کو۔ رحمت علی المومنین جناب عثمان کو۔ بارگاہ الٰہی میں رکوع اور سجود کی مشغولیت جناب علی کو) ان آیات کے بیان ہی میں ایک کی فضیلت دوسرے پر ظاہر ہے۔ یہ اس

طرح کہ رکوع اور سجود میں خاص حصہ رکوع کرنے والے اور سجدہ کرنے والے کو ملتا ہے۔ رحمت کی صفت اس میں بس اس طرح ہوگی کہ بغیر مشقت اٹھائے کرے۔ چونکہ ایسی طاعت جس میں مخلوق کا حصہ نہ ہو صرف طاعت کرنے والے کو ہو اس پر اس طاعت کو فضیلت حاصل ہے جس میں مخلوق کو حصہ ہو۔ یہ ترتیبی دلیل بن گئی اس بات پر کہ حضرت عثمان کو حضرت علی پر فضیلت حاصل ہے۔

حضرت عثمان کو رحمت کی صفت میں سراہا گیا اور حضرت عمر کو اعدائے دین پر شدت کے معاملہ میں۔ محض رحمت کے لئے شدت لازمی نہیں۔ شدت تو اسی میں ہوگی جو اللہ کے دوستوں پر بہت زیادہ رحمت رکھتا ہو۔ اسی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دشمنوں کے معاملہ میں شدت برتے گا۔ اس بیان سے ظاہر ہو گیا کہ حضرت عمر کو جناب عثمان پر فضیلت ہے کیونکہ جناب عثمان میں رحمت ہے اور بس لیکن جناب عمر میں اعداء الٰہی کے معاملہ میں شدت ہے ظاہر ہے کہ رحمت کا جذبہ بھی بہت زیادہ ہے جب ہی تو عدو کی عدالت میں شدت ہوئی۔

ان تینوں مذکورہ حضرات کا ایک ایک مقام بتایا گیا۔ جناب ابو بکر کی خصوصیت کہ ان کے کسی مقام کو ظاہر نہ کیا گیا۔ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ اس اشارہ سے معلوم ہوا کہ نبوت کی خصوصیت کے علاوہ حضرت ابو بکر کو حضور رسول مقبول ﷺ کی معیت حاصل ہے یعنی وہ سب میں شامل ہیں اس سے یہ نتیجہ سامنے آیا کہ حضرت ابو بکر کو مذکورہ تین حضرات پر فضیلت حاصل ہے۔ چنانچہ خلافت کی ترتیب بھی ان لوگوں کے درمیان اسی طرح ہے۔ اور یہ چاروں امام برحق ہوئے ہیں، اور خلفائے راشدین ہیں۔ ان میں سب سے پہلے امام برحق حضرت ابو بکر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ تھے اور جب تک ان کا وصال نہ ہوا عمرؓ امام نہ ہوئے۔ ان کے بعد عمرؓ امام برحق تھے۔ جب تک ان کا وصال نہ ہوا عثمان رضی اللہ عنہ امام نہ ہوئے پھر ان کے بعد امام برحق عثمان رضی اللہ عنہ تھے جب تک ان کا وصال نہ ہوا حضرت علی رضی اللہ عنہ امام نہ ہوئے۔

اور امامت حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صحابہ کرام کے اجماع سے ہوئی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی امامت حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے خلافت سپرد کرنے سے ہوئی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی امامت اس

شوریٰ سے ہوئی جس کی ترتیب جناب عمرؓ نے دے دی تھی۔ اور علیؓ کی امامت برحق ہے۔ اس لئے کہ مشورہ کے وقت صحابہ کا اتفاق حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ دونوں پر تھا۔ جب عثمانؓ کو اولیت دی تو وہ امامت کے لئے معین ہوئے اور جب عثمانؓ کو شہادت نصیب ہوئی تو علیؓ اس پہلی مشورت سے بھی امامت کے لئے معین ہوئے۔

• اور حضور ﷺ کے نام متعین نہ کرنے کے معنی لوگوں نے یہ بیان کئے ہیں کہ جب پیغامبر ﷺ اس جہان سے رحلت فرما ہوئے خلافت کسی کے سپرد نہ فرمائی۔ اس میں یہ حکمت تھی کہ اگر اہل بیت کے سپرد فرماتے تو دشمنوں کو تہمت کا موقع ملتا اور اگر غیروں کے حوالہ کرتے تو اہل بیت کو غم ہوتا اس کام کو مطلقاً چھوڑ دیا تاکہ صحابہ خود انتخاب کرلیں کہ اہل بیت کو اس سے دکھ نہ ہو اور نہ دشمن کو طعن کا موقع ملے۔ اور روایات واحادیث امامت کی ترتیب میں بہت زیادہ آئی ہیں۔

ایک ان میں سے یہ ہے کہ امیر المومنین علیؓ نے ایک شخص کو پیغامبر ﷺ کے پاس بھیجا اس نے پیغامبر ﷺ سے پوچھا کہ یارسول اللہ ﷺ اگر کسی وقت میں حضور ﷺ کے پاس آؤں اور حضور ﷺ کو نہ پاؤں تو کس کے پاس جاؤں ارشاد ہوا ابو بکرؓ کے پاس وہ شخص واپس آیا جناب علیؓ کو خبر دی۔ حضرت علیؓ نے کہا پھر جاؤ اور پوچھا اگر ابو بکرؓ کو نہ پاؤں کس کے پاس جاؤں حضور ﷺ کا ارشاد ہوا عمرؓ کے پاس وہ شخص واپس آیا اور حضرت علیؓ کو خبر دی، جناب علیؓ نے کہا پھر جاؤ اور پوچھو کہ اگر اگر عمرؓ کو نہ پاؤں کس کے پاس جاؤں حضور کا ارشاد ہوا عثمان کی جانب، وہ شخص جناب علیؓ کے پاس واپس آیا حضور ﷺ کا جو ارشاد ہوا اس کی اطلاع دی، جناب علیؓ نے اس شخص سے کہا پھر جاؤ اور پوچھو کہ اگر جناب عثمان کو بھی نہ پاؤں تو کس کی طرف لوٹوں، سرور کائنات ﷺ کا ارشاد ہوا اس شخص کی طرف لوٹنا جو تجھے ابھی بھیج رہا ہے۔ تو خلافت کی ترتیب اسی طرح سمجھنا چاہئے۔

اور حدیث شریف میں آیا ہے کہ قیامت کے دن پیغامبر علیہ السلام بہشت کی کنجی ابو بکرؓ کو دیں گے اور ترازو عمرؓ کو حوض عثمانؓ کو۔ اور لواء (جھنڈا) علیؓ کو اس کی وجہ یہ کہ ابو بکر سخی ہیں اور سخی کسی کو دروازہ سے نہیں لوٹاتا اور بہشت کی کنجی اسی کو دی جاتی ہے جو سب کو باریابی

دے۔ اور پھر عمرؓ عادل تھے ترازو عدل کا آلہ ہے تا کہ کسی پر کسی سے ظلم نہ ہو اس لئے ترازو عمرؓ کو دی گئی تا کہ خلق کے ساتھ عدل کریں پھر عثمانؓ شرم والے ہیں حوض ان کے سپرد فرمایا تا کہ گنہگاروں کو اپنے شرم و مروت کے سبب پانی پینے سے نہ روکیں پھر لواء علیؓ کو اس لئے دیا کہ وہ غازی بہادر لڑنے والے ہیں علَم غازیوں کے شایان شان ہے۔

قوله: ثُمَّ تَمَامُ الْعَشَرَةِ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ.

(ارشاد شیخ ہے) پھر ان کے بعد ان دس حضرات کو فضیلت حاصل ہے۔ ان دس میں چار خلفائے راشدین ہیں جن کا تذکرہ پہلے کیا گیا۔ بقیہ چھ میں حضرت طلحہؓ، زبیرؓ، سعد ابن ابی وقاص، سعید بن زید، عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور ابو عبیدہ بن جراحؓ ہیں اس حدیث کی بنا پر جو حضور ﷺ سے روایت کی گئی ہے۔ جس کے سعید ابن زیدؓ راوی ہیں یہ خود عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔ حدیث یہ ہے کہ حضور نے فرمایا عَشَرَۃٌ فِی الْجَنَّةِ اَبُوْ بَكْرٍ فِی الْجَنَّةِ وَعُمَرُ فِی الْجَنَّةِ وَعَلِیٌّ فِی الْجَنَّةِ وَطَلْحَةُ فِی الْجَنَّةِ وَزُبَیْرُ فِی الْجَنَّةِ وَسَعْدُ ابْنُ اَبِیْ وَقَاصٍ فِی الْجَنَّةِ وَسَعِیْدُ فِی الْجَنَّةِ وَعَبْدُالرَّحْمٰنِ بن عَوْفٍ فِی الْجَنَّةِ وَاَبُوْ عُبَیْدِ بنُ الْجَرَّاحِ فِی الْجَنَّةِ رسول کی اس شہادت نے تغیر دین کے خطرہ سے بھی مطمئن کر دیا۔ کیونکہ ایسے حال میں بہشت نہیں ملے گی۔ اور زوال دین کے خوف سے بھی مطمئن کر دیا کیونکہ زوال کے بعد بہشت کی بشارت بے کار ہو جاتی ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ ان لوگوں کے متعلق زوال دین یا تغیر دین کے شائبہ کا تصور خود حضور ﷺ کی شہادت پر شک کرنا ہے، اور حضور کی گواہی پر شک کرنا کفر ہے۔

عاقبت کے خوف کا اٹھ جانا منع نہیں ہے بلکہ جائز ہے کہ بندہ خوف عاقبت سے بے خوف ہو جائے یہ اس لئے کہ پیغامبر ﷺ نے اپنے اصحاب میں سے ان دس حضرات کو بہشت کی بشارت دی ان لوگوں کے لئے اس بشارت پر ایمان لانا واجب ہوا۔ اور جب بشارت پر ایمان لائیں گے لازماً خوف عاقبت سے مطمئن ہو جائیں گے اسی میں تمام اولیاء شامل ہیں۔ اور خوف خاتمت سے ان لوگوں کا بے خوف ہونا ان کے دین میں نقصان کا کوئی سبب نہیں کہا جائے گا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ روایتیں جو عشرہ مبشرہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے خوف

کے بارہ میں آتی ہیں ان کو کس پر محمول کیا جائے گا؟ مثلاً امیر المومنین ابوبکر صدیق ﷛ سے روایت ہے وہ فرمایا کرتے لَیْتَنِی کُنْتُ تَمْرَۃً یَنْقُرُھَا الطَّیْرُ یعنی اے کاش میں خرما ہوتا کہ اس کو پرندے چن لیتے اور امیر المومنین عمر ﷛ کے متعلق روایت ہے کہ وہ کہا کرتے لَیْتَنِیْ لَمْ اَکُنْ شَیْئاً اے کاش میں ہوتا ہی نہیں۔ اور اسی طرح دوسروں کے متعلق بھی منقول ہے۔

اس سلسلہ میں جواب یہ ہے کہ ان لوگوں کا خوف اس بنا پر نہ تھا کہ خاتمہ سے ڈرتے تھے۔ ان لوگوں کو حضور ﷺ کی اپنے متعلق گواہی پر بھی شک نہ تھا۔ ہاں ان کو اس کا خوف تھا کہ ان تمام عنایات کے باوجود بھی کوئی بات ہم سے ایسی نہ ہو جو رضائے حق کے خلاف ہو۔ باوجودیکہ وہ جانتے تھے آمرزش ہوگی۔ پھر اس خوف کو کس چیز پر محمول کیا جائے، لازماً یہ خوف احساس شرمندگی اور ندامت کا خوف تھا اور یہ خدائے تعالیٰ کی بزرگی کا خیال کرکے ہوتا ہے۔ اسے سوئے خاتمہ کا خوف نہ کہا جائے گا کیونکہ اس میں پیغامبر ﷵ کی شہادت پر شک لانا صادق آتا ہے مثلاً امیر المومنین عمر ﷛ نے فرمایا ہے نِعْمَ الْمَرْءُ صُھَیْبٌ لَوْلَمْ یَخَفِ اللّٰہَ لَمْ یَعْصِہٖ صہیب نیک مرد ہیں اگر خداوند عزوجل سے نہ ڈرتے جب بھی معصیب نہ کرتے یعنی یہ صہیب کہ جنہوں نے ترک معصیت کی ہے، عذاب کے خوف سے نہیں کی ہے۔ بلکہ خداوند تعالیٰ کی عظمت جوان کے دل میں ہے اور اس سے جوان کو شرم ہے۔ یہ وجہ معصیت نہ کرنے کی ہے۔

اور ابوسلیمان درانی رحمتہ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ حق سبحانہ تعالیٰ کہتا ہے کہ اے میرے بندے جب تو مجھ سے شرم رکھتا ہے تو میں نے تیرے عیبوں کو لوگوں سے بھلا دیا اور زمینوں کو تیرے گناہوں سے اور تیری لغزشوں کو ام الکتاب سے مٹادیا۔ اور قیامت کے دن تجھ سے باز پرس نہ ہوگی۔ نقل ہے کہ ایک شخص ایسے تھے جو مسجد سے باہر نماز ادا کرتے ایک دن لوگوں نے ان سے پوچھا مسجد کے اندر نماز کے لئے کیوں نہیں آتے۔ انہوں نے جواب دیا مجھے شرم آتی ہے اس سے کہ اس کے گھر میں داخل ہوں اس حال میں کہ میں نے اس کی نافرمانی کی ہے۔

اور خواجہ ابودرّاق سے منقول ہے کہ وہ فرمایا کرتے ایسا بھی ہوتا ہے کہ دو رکعت نماز ادا کرتا ہوں اور جب اس سے فارغ ہوتا ہوں اور واپس پلٹتا ہوں میرا حال ایسا ہوتا ہے کہ تم دیکھ کر

کہو کہ میں نے چوری کی ہے اور چوری کر کے آیا ہوں مجھ کو خداوند عز وجل سے ایسی شرم ہوتی ہے اہل معرفت آیت کریمہ اَلَمْ یَعْلَمُوْا بِاَنَّ اللّٰہَ یَرٰی. (کیا وہ جانتا نہیں کہ خدائے تعالیٰ اسے دیکھ رہا ہے) کو یاد کر کے شرم خداوندی سے گھلے جا رہے ہیں۔

قولہ: ثُمَّ اَفْضَلُهُمُ الَّذِیْنَ شَهِدَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِالْجَنَّةِ،

(ارشاد شیخ ہے) پھر عشرہ مبشرہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بعد افضل ترین وہ لوگ ہیں جن کے متعلق پیغامبر ﷺ نے بہشت کی بشارت دی ہے چنانچہ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا سَیَدْخُلُوْنَ مِنْ اُمَّتِیْ سَبْعُوْنَ اَلْفاً بِغَیْرِ حِسَابٍ. آخر کار میری امت کے ستر ہزار آدمی جنت میں بغیر حساب کے داخل ہونگے فَقَامَ عُکَّاشَةُ وَقَالَ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ اجْعَلْنِیْ مِنْهُمْ فَقَالَ قَدْ جَعَلْتُکَ مِنْهُمْ تو عکاشہ رضی اللہ عنہ اٹھے عرض کیا یا حضور مجھے بھی ان لوگوں میں شمار فرمائیں، ارشاد ہوا تم کو بھی ان لوگوں میں شامل کیا۔ فَقَامَ اٰخَرُ وَقَالَ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ اجْعَلْنِیْ مِنْهُمْ. فَقَالَ قَدْ سَبَقَکَ بِهَا عُکَّاشَةُ پھر ایک دوسرے صحابی کھڑے ہوئے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ مجھے ان لوگوں میں شمار کیا جائے۔ ارشاد ہوا عکاشہ نے تم سے جنت کی طرف سبقت کی۔

قولہ: ثُمَّ قَرْنُ الَّذِیْنَ بُعِثَ فِیْهِمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ.

(ارشاد شیخ ہے) پھر اہل زمانہ میں اس زمانہ کے لوگ ہیں جس قرن میں خود حضور اکرم ﷺ تھے اور اس میں عام صحابہ رضی اللہ عنہم شامل ہیں۔ یہ اس لئے کہ خود ارشاد رسول ہے خَیْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِیْ زمانوں میں بہترین زمانہ میرا زمانہ ہے۔ اس موقع پر زمانہ سے محض زمانہ مراد نہیں ہے بلکہ زمانہ کے لوگ مراد ہیں اس لئے کہ زمانہ دن و رات سے عبارت ہے اور اس وقت کے دن و رات اور آج کے دن و رات میں کوئی فرق نہیں۔

اور وہ اختلاف جو ان صحابہ کے درمیان تھا اس کی بنا پر ان نیکیوں میں قدح نہیں وارد ہوگا جو ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے اول ہی میں دیا ہے۔ یہ نشاندہی اس بنا پر ہے کہ خداوند عز وجل نے فرمایا وَکُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰی (یہ سب کے سب وہ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے نیکیوں کا وعدہ کیا ہے) تو لازماً اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ ان تمام باتوں کو جانتے ہوئے کیا جو ان لوگوں سے

صادر ہوئیں۔ اور لازماً بعد کے ان احوال وواقعات کے باوجود ان اصحاب کو بہشت کا وعدہ ہے۔ اور بہشت ان لوگوں کے لئے یقیناً ہے۔ اور بعضے علماء کا قول ہے کہ وہ اختلاف جو ان صحابہ کے درمیان پیدا ہوا خداوند عزوجل کی جانب سے اس امت کے حق میں رحمت تھا۔ تاکہ اہل قبلہ احکام سے واقف ہوں اسی لئے حضرت ابو حنیفہ ؒ کا قول ہے کہ اگر صحابہ کے درمیان اختلاف نہ ہوتا تو ہم لوگ نہیں جانتے کہ ہم لوگوں کو اہل قبلہ کے اندر (احکام دین کے متعلق) کیا کرنا ہے۔ تو ایک تہائی یا ایک چوتھائی احکام ہم پر ان لوگوں کے اختلاف سے ظاہر ہوا۔ اور اسلام کے احکام کا ظاہر ہونا رحمت تھا۔

قولہ: ثُمَّ الْعُلَمَاءُ الْعَامِلُونَ.

(ارشاد شیخ ہے) پھر ان لوگوں کے بعد افضل عالمان باعمل ہیں یعنی ایسے علماء جنہوں نے دنیا سے منہ موڑ لئے ہوں اور علم کے ساتھ ساتھ عمل کئے ہوں ایسوں کو علمائے آخرت کہتے ہیں۔

نقل ہے کہ ایک شخص نے پیغامبر ﷺ سے شر کے متعلق پوچھا، ارشاد ہوا مجھ سے شر کے متعلق نہ پوچھو، خیر کے متعلق سوال کرو۔ اسی طرح تین بار حضور ﷺ نے فرمایا اور سائل بار بار سوال کرتا رہا تو آپ نے فرمایا اِنَّ شَرَّ الشر شِرَارُ الْعُلَمَاءَ وَ اَنَّ اخیَرَ الْخَیرِ خِیَارُ الْعُلَمَاء یہ درست ہے کہ بروں میں سب سے برے علماء سو ہیں اور نیکوں میں سب سے نیک علماء خیر ہیں۔ یہ علماء علمائے آخرت ہیں، اور وہ علمائے دنیا ہیں۔ کیونکہ انہوں نے حصول علم رضائے الٰہی کے لئے کیا ہے اور انہوں نے دنیا اور جاہ مرتبہ پر پہنچنے کے لئے اور اس لئے کہ اہل دنیا میں شہرت پائیں اور اس کے ذریعہ دنیاوی نعمتیں دنیا والوں نے حاصل کریں۔ ہاں اس قسم کے عالم شیطان کے قیدی ہیں۔ ان کے شہوات نفس نے انہیں ہلاک کر دیا ہے۔ ان کے دل کی شقادت ان پر غالب آچکی ہے۔ حقیقی معنوں میں انہیں تو علما میں شمار بھی نہیں کیا جا سکتا ہے۔

خواجہ یحییٰ معاذ رازی رحمتہ اللہ علیہ علمائے دنیا سے فرمایا کرتے کہ اے اصحاب علم تمہارے قصر ومحل، قیصریہ ہیں تمہارے مکانات کسرویہ ہیں، تمہارے عبے چغے ظاہریہ ہیں تمہارے موزے جالوتیہ اور تمہارے گھوڑے اور سواریاں قارونیہ اور تمہارے ظروف اسباب

فرعونیہ ہیں تمہارے ماتم جاہلیہ اور تمہارا مذہب شیطانیہ ہے (جب یہ حال ہے) تو پھر محمدی کیسے؟

نقل ہے کہ ایک بزرگ سے لوگوں نے ان علما کے متعلق پوچھا جن کا اختلاف رحمت ہے وہ کون علما ہیں؟ جواب دیا کہ جو قرآنی احکام پر جمے ہوئے ہیں اور جہد میں لگے ہوئے ہیں کہ پیغامبر ﷺ کی سنت کی پیروی میں چلیں۔ اور اس سلسلہ میں پیغیامبر ﷺ کے اصحاب کی اقتدا کر رکھی ہے ایسے علما تین گردہ میں ہیں۔ ایک اصحاب حدیث دوسرے فقہا، تیسرے صوفیاں۔

قولہ: ثُمَّ اَنْفَعُهُمْ لِلنَّاسِ.

(ارشاد شیخ ہے) پھر افضل ترین آدمیوں میں وہ ہیں جو لوگوں کو نفع پہنچانے والے ہیں یہ اس لئے کہ پیغامبر ﷺ نے فرمایا ہے **اَلْخَلْقُ كُلُّهُمْ عِيَالُ اللّٰهِ فَاَحَبُّهُمْ اِلَيْهِ اَنْفَعُهُمْ لِعِيَالِهٖ** تمام لوگ خداوند تعالیٰ کے عیال ہیں تو ان میں اللہ رب العزت کو سب سے پیارے وہ لوگ ہین جو اس کے عیال یعنی بندہ کو نفع پہنچاتے ہیں۔

اور یہ جو میں نے کہا کہ تمام لوگ اللہ کے عیال ہیں اس کا سبب یہ ہے کہ سب اسی کی روزی کھاتے ہیں تو یہ ایسا ہوا کہ جیسے عیال۔ عیال اسی معنی کے اعتبار سے فرمایا گیا خلق میں خداوند تعالیٰ کو سب سے پیارا وہ شخص ہے جو اس کے نبدہ کے لئے سب سے زیادہ نفع رساں ہے۔ اور یہ گفتگو خلق کی اصطلاح میں کی گئی ہے۔ جس طرح مخلوق کو بولنے کی عادت ہے۔ اس سبب سے کہ کہ لوگوں کے نزدیک دوست سب سے زیادہ وہ شخص ہے جو اس کے عیال کو نفع پہنچاتا ہے۔

قولہ: وَاجْمَعُوا عَلٰى تَفْضِيلِ الرُّسُلِ عَلَى الْمَلَائِكَةِ.

(ارشاد شیخ ہے) گردہ صوفیہ کا اس پر اجماع ہے کہ تمام پیغامبران فرشتوں پر فضیلت رکھتے ہیں۔ یعنی تمام پیغامبران علیہم السلام تمام فرشتگان صلواۃ اللہ علیہم سے افضل ہیں۔

یہ سوال کہ ملائکہ پر انبیاء کی یہ فضیلت بہ اعتبار جوہر کے ہے یا بہ اعتبار عمل کے؟۔

جواب: اس گردہ صوفیہ کے بزرگان اس پر کہ یہ فضیلت بہ اعتبار جوہر کے ہے یا اعتبار عمل کے خواہ فرشتوں کو پیغامبروں پر ہو، یا پیغامبروں کو فرشتوں پر، خاموش ہیں ان کا قول ہے کہ کسی کو جو فضیلت حاصل ہے وہ فضیلت محض خداوند تعالیٰ کی عطا کردہ ہے اس کا تعلق نہ جوہر سے ہوتا

ہے نہ عمل سے۔ دلیل یہ ہے کہ اگر فضل کا تعلق جوہر سے ہوتا تو شیطان کو آدم علیہ السلام پر فضیلت ہوتی، کہ وہ نورانی آگ سے ہے اور جناب آدم علیہ السلام خاک ظلمانی سے۔

اور فضل کا تعلق عمل سے بھی نہیں ہے۔ اگر فضل کا تعلق عمل ہوتا تو اگلی امتوں کو اس امت پر فضیلت ہوتی کیونکہ انکی عمریں پانچسو سال اور ہزار سال ہوتی تھیں اور اس امت کی عمر جیسا کہ معلوم ہے چالیس، پچاس، ساٹھ، ستر، اسی، سال سے تجاوز نہیں کرتی۔ تو ثابت ہوا کہ فضل نہ تو جوہر سے متعلق ہے نہ عمل سے۔

اس بارے میں تفصیل یہ ہے کہ بندگی قرب الٰہی کا سبب نہیں، تو قرب الٰہی طاعت کی علت کیسے ہے؟ اس سبب سے کہ قرب دینا اللہ کی صفت ہے اور بندگی کرنا بندہ کی صفت ہے خدائی بندگی کی معلول نہیں بندگی خدائی کی معلول ہے۔ یہ خدا ہی کو حق پہنچتا ہے کہ ایک بندہ کو بہت تھوڑی طاعت پر نوازے اور قربت عطا فرمائے دوسرے کو بہت زیادہ طاعت کے باوجود مقرب نہ بنائے۔ کیا نہیں دیکھتے محمد رسول ﷺ کی عمر شریف ترسٹھ سال ہوئی اور نوح پیغامبر علیہ السلام کی عمر ساڑھے نوسو سال، اور اس میں شک نہیں کہ ساڑھے نوسو سال میں بندگی زیادہ ہوگی نہ کہ ترسٹھ سال میں۔ اس کے باوجود محمد ﷺ نوح علیہ السلام سے افضل تر ہیں۔ اگر اصل طاعت ہی قربت اور بزرگی کا سبب ہوتی تو طاعت کی زیادتی قربت اور بزرگی کی زیادتی کا سبب ہوتی۔ اور نوح علیہ السلام حضور اکرم ﷺ سے افضل تر ہوتے۔ تو جب کہ ہم تک کوئی حدیث یا کوئی نص قرانی کسی پر کسی کی فضیلت کے متعلق نہیں پہنچی فضیلت پر محض عقل سے دلیل قاطع نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا ہم نے یہ جان لیا کہ فضل اللہ رب العزت کے فضل عطا کرنے سے ہے۔ نہ جوہر سے نہ عمل سے ہے۔

اور ہاں ہم گردہ صوفیہ کے اجماع سے انکار نہیں کرتے ہیں۔ اور اجمالی طور پر سب پر ایمان لاتے ہیں۔ اور اقرار کرتے ہیں کہ افضل تر وہی ہے جسے خدا فضل دے۔ بس اتنا ہی صحت ایمان کیلئے کافی ہے۔

اور وہ لوگ جو فرشتوں پر پیغامبراں علیہم السلام کو فضیلت دیتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ آدم علیہ السلام کو فرشتوں نے سجدہ کیا ہے اور لامحالہ جس کو سجدہ کیا گیا وہ سجدہ کرنیوالوں سے افضل

ہوگا۔اور یہ کہتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ نے فرشتوں کو آدمیوں کی خدمت میں مشغول کیا ہے۔اور کسی آدمی کو کسی فرشتہ کی خدمت میں نہیں لگایا۔لامحالہ مخدوم خادم سے افضل ہوگا۔اور یہ کہتے کہ خداوند تعالیٰ نے فرشتوں کو دمیوں کی خدمت میں مشغول کیا ہے۔اور کسی آدمی کو کسی فرشتہ کی خدمت میں نہیں لگایا۔لامحالہ مخدوم خادم سے افضل ہوگا۔اور ملایکہ کو بندگی کے حدود سے باہر نہیں کیا اور کبھی کسی فرشتہ کو لفظ دوست سے یاد نہیں کیا۔پھر آدمیوں کو بھی ویسے ہی لفظ بندہ سے یاد کیا جیسے ملائکہ کو۔اور اس بندگی کے ساتھ ساتھ مقام دوستی کی بزرگی بھی عطا کی یہاں تک کہ ابراہیم خلیل علیہ السلام کے قصہ میں فرمایا وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرَاهِيْمَ خَلِيْلًا ۔ اللہ تعالیٰ نے ابرہیم کو دوستی کے لئے منتخب فرمالیا۔حضور مصطفیٰ علیہ السلام کے قصہ میں فرمایا مَاوَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰی (نہ رخصت کیا تجھ کو تیرے رب نے اور نہ بیزار ہوا) قصہ یہی ہے کہ جب پیغامبر ﷺ نے کافروں کے سوال کے جواب دینے کا وعدہ فرمایا اور انشاء اللہ نہ کہا اس پر وحی رک گئی تو کافروں نے زبان درازی شروع کی کہنے لگے کہ رخصت کر دیا محمد کو اس کے پروردگار نے اور ان سے بیزار ہو گیا خداوند تعالیٰ نے ان کافروں کے اقوال کے رد میں یہ سورہ والضحیٰ اور جواب قسم کے ساتھ بھیجی کہ مَاوَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰی ۔ نہ تو خداوند تولیٰ نے آپ کو رخصت کیا اور نہ آپ کو دشمن بنایا دشمنی یعنی بیزاری کی نفی، اثباب محبت کی قسم کے ساتھ ہوئی۔

دوسری بات یہ کہتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ اپنی محبت کا وعدہ حضور کی پیروی کرنے والوں سے حضور کی پیروی کے طفیل میں کرتا ہے جیسا کہ فرمایا قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِىْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ. جب آپ کے کمترین غلام اللہ کے دوست ہوئے تو یہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے کہ حضور خود اس کے دوست ہوں، جب تک وہ دوست نہ ہوں گے دوسرے انکی متابعت کر کے اس کی محل دوستی میں داخل نہیں ہو سکتے۔اور حضور کی امت کی صفت میں اللہ نے فرمایا يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ کہ یہ لوگ خدا کو دوست رکھتے ہیں اللہ ان لوگوں کو دوست رکھتا ہے۔اور بندگی ہرگز دوستی کے مقابلہ میں نہیں ہو سکتی۔اس لئے کہ مقام بندگی مقام ذُل ہے اور مقام دوستی مقام عز ہے بندہ ذلیل کے سوا کچھ نہیں اور دوست عزیز کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ذلیل ہرگز عزیز کے مقابل نہیں

ہو سکتا۔

ایک بزرگ کا قول ہے کہ اگر خداوند تعالیٰ نے ابراہیم خلیل اللہ کو اِتَّخَذَ اللّٰہُ اِبْرَاھِیْمَ خَلِیْلًا کہا جناب موسیٰ علیہ السلام کو وَ کَلَّمَ اللّٰہُ مُوْسٰی تَکْلِیْمًا اور ہم امتیوں کو یُحِبُّھُمْ وَیُحِبُّوْنَہٗ کہا تو یُحِبُّھُمْ میں محبّ قدیم اور محبت قدیم ومحبوب محدث تھا اور یُحِبُّوْنَہٗ میں محبّ محدث اور محبوب قدیم ہے۔ تو محدث اور قدیم کے درمیان ایسا معاملہ ایک بہت بڑا راز ہے۔ ہر شخص کی اس سِرّ عظیم تک پہنچ نہیں۔

قولہ: وَاخْتَلَفُوْا فِی تَفْضِیْلِ الْمَلَائِکَۃِ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ.

(ارشاد شیخ ہے) سوائے پیغامبران علیہم السلام کے مومنوں پر فرشتوں کی فضیلت میں اختلاف ہے۔ بعض لوگ فرشتوں کو فضیلت دیتے ہیں اور یہ اس سے کہتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ نے فرمایا بَلْ عِبَادٌ مُّکْرَمُوْنَ فرشتون کو مکرمان اور مقربان کہا گیا اور دوسری جگہ فرمایا ہے۔ لَا یَعْصُوْنَ اللّٰہَ مَا اَمَرَھُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ ط فرشتے گنہگار نہیں ہوتے یعنی خداوند تعالیٰ نے جوانکو حکم دیا اسکی نافرمانی نہیں کرتے اور جس بات کا ان کو حکم دیا جاتا ہے اس کو بجالاتے ہیں تو اس دلیل سے کہتے ہیں جو زیادہ مطع ہے وہ زیادہ افضل ہے۔

اور وہ لوگ جو آدمیوں کو فرشتوں پر فضیلت دیتے ہیں ان کی دلیل یہ ہے۔ بعضوں نے تفصیلاً گفتگو کی ہے کہتے ہیں کہ مطلقاً جواب نہیں دیتا ہوں بلکہ بالتفصیل کہتا ہوں کہ خداوند تعالیٰ نے ملایکہ کو عقل دیا ہے شہوت خواہشات نفسانی نہیں دی، بہایم کو شہوت دی عقل نہیں دیا۔ آدمیوں کو دونوں دیا عقل بھی اور شہوت بھی جبکہ عقل شہوت نفسانی پر غالب آئے وہ فرشتوں سے بڑھا ہوا ہے اس لئے کہ اس نے شہوت کو مغلوب ومقہور کیا ہے۔ اور جس کی شہوت عقل پر غلبہ حاصل کرلے وہ جانور سے بدتر ہے۔ کیونکہ آدمی صاحب عقل ہے، عقل مانع ہے۔ بہایم کو عقل نہیں ؎

آدمی زادہ طرفہ معجون است — از فرشتہ سرشتہ واز حیوان

گر کند میل این شود کم ازیں — در کند قصد آن شود بہ ازان

(آدمی زادہ عجیب معجون مرکب ہے۔ یہ فرشتہ خصلت اور حیوان صفت ہے۔ حیوانیت کے جانب جھکتا ہے تو بہایم سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ ملوکیت، فرشتہ صفتی کی طرف بڑھتا ہے تو اس سے بھی کہیں بہتر ہو جاتا ہے)

قولہ: وَبَیْنَ الْمَلَائِکَۃِ تَفَاضُلٌ کَمَا بَیْنَ الْمُؤْمِنِیْنَ. (ارشاد شیخ ہے) فرشتگان صلواۃ اللہ علیہم کے درمیان ایک دوسرے پر فضل ہے۔ جیسے کہ مومنوں کے درمیان ایک دوسرے پر فضل ہے۔ اسی طرح فرشتوں میں بھی ایک دوسرے پر آپس میں فضیلت ہے۔ اگرچہ ملکیت کی اصل میں برابر ہیں۔ بعض کو بعض پر فضل ہے جیسے عامتہ المومنین از روئے ایمان سب برابر ہیں۔ لیکن بعض کو بعض پر فضل ہے۔

اور جیسے تمام پیغامبران نفس نبوت میں برابر ہیں۔ لیکن بعض کو بعض پر فضیلت ہے۔

قولہ: وَاجْمَعُوْا عَلیٰ اَنَّ طَلَبَ الْحَلَالَ فَرِیْضَۃٌ.

(ارشاد شیخ ہے) اس گردہ صوفیہ کا اس پر اجماع ہے اور یہ حقیقت ہے کہ حلال روزی کے لئے کسب کرنا فرض ہے۔ یہ اسلئے کہ خداوند تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوۃُ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ. جب نماز جمعہ ادا کر چکو تو پھیل جاؤ زمین پر اور خدا تعالیٰ کے فضل کے طلب میں لگ جاؤ۔ مفسروں کے درمیان اسپر اتفاق ہے کہ اس فضل سے مراد کسب کرنا ہے اور یہ فرض ہے اس لئے کہ حکم فرمایا اور خدا تعالیٰ کا حکم وجوب کا متقاضی ہے اور حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ طَلَبُ الْحَلَالِ فَرِیْضَۃٌ عَلیٰ کُلِّ مُسْلِمٍ (حلال روزی کیلئے کسب کنا تمام مسلمانوں پر فرض ہے)

اور ابن عباس رضی اللہ عنہ کی اس حدیث میں اِنَّ لِلّٰہِ مَلَکاً عَلیٰ بَیْتِ الْمُقَدَّسِ یُنَادِیْ کُلَّ لَیْلَۃٍ مَنْ اَکَلَ حَرَاماً لَمْ یُقْبَلُ مِنْہُ صَرَفٌ وَلَا عَدْلٌ. (بیشک اللہ کے فرشتے ہیں بیت المقدس پر جو ہر رات ندا دیتے ہیں کہ جس نے حرام کھایا اس کے نہ تو نفل قبولیت کے درجہ کو پہنچیں گے نہ فرائض) یہاں پر لفظ صرف سے مراد نفل ہے اور عدل فریضہ ہے۔

مذکورہ بالا دلیلوں کے علاوہ یہ بھی واقعہ ہے کہ انبیاء واولیاء کسب میں مشغول ہوئے ہیں

باوجودیکہ ان لوگوں کی مشغولیت مباحات میں بہت کم ہوتی ہے ان کی زیادہ تر مشغولی فرائض میں ہوتی ہے مباحات میں نہیں۔

اور اس کے علاوہ ایسا بھی ہے کہ آدمی اگر کسب حلال کی کچھ مشغولیت نہ کرے گا نفس کو طاعت میں قائم نہ رکھ سکے گا۔ نفس کو قوت لایموت سے بھی اگر روک دیا جائے تو آدمی طاعت سے عاجز رہے گا۔

قولہ: وَاَنَّ الْاَرْضَ لَا تَخْلُوْا مِنَ الْحَلَالِ لِاَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى طَالَبَ الْعِبَادَ بِطَلَبِ الْحَلَالِ وَلَمْ يُطَالِبْهُمْ اِلَّا بِمَا يُمْكِنُ. اِلَّا اَنَّهُ يَقِلُّ فِي مَوْضِعٍ وَيَكْثُرُ فِي مَوْضِعٍ.

(ارشاد شیخ ہے) یہ سب ہے اور درست ہے کہ زمین حلال سے خالی نہیں۔ یہ اس لئے کہ خدا تعالیٰ نے اپنے بندوں سے حلال روزی طلب کرنے کا مطالبہ فرمایا ہے اور ایسا مطالبہ خدا تعالیٰ نہیں کرتا جس کا امکان نہ ہو ہاں یہ درست ہے اور سچ ہے کہ حلال روزی بعض جگہ کم ملتی ہے اور بعض جگہ زیادہ لیکن ایسی بات نہیں کہ زمین سے کلیۃً اٹھ گئی ہو۔

خواجہ بشر حافی رحمۃ اللہ علیہ پرہیز گاروں میں سے تھے ایک مرتبہ کسی نے ان سے سوال کیا آپ کہاں سے کھاتے ہیں جواب میں ارشاد ہوا وہاں سے جہاں سے تم کھاتے ہو لیکن وہ شخص جو کھاتا ہے اور روتا ہے اس کے برابر نہیں ہو سکتا جو کھاتا ہے اور ہنستا ہے۔

قولہ: فَمَنْ كَانَ ظَاهِرُهُ جَمِيْلًا لَا يُتَّهَمُ فِيْ مَالِهٖ وَكَسْبِهٖ ط

(ارشاد شیخ ہے) جس شخص کا ظاہر صلاح وتقویٰ سے آراستہ ہو اس کے مال اور اس کے کسب وروزی میں بدگمانی نہیں کرنا چاہئے مومن کے حق میں بدگمانی کرنا جب کہ اس کا ظاہر شریعت سے آراستہ ہو جائز نہیں کہ اس کی روزی اور اس کے لقمہ کی جانب حرام کا گمان کیا جائے۔

روایت ہے کہ اگلے لوگوں میں ایک شخص ایسے تھے کہ تین سو ساٹھ دوست ان کے تھے ہر رات وہ ایک دوست کے یہاں افطار کرتے سال بھر کے بعد ہر ایک کے یہاں افطار کی باری آتی۔ اور ایک شخص ایسے تھے کہ ان کے تیس دوست تھے ہر رات ایک دوست کے گھر افطار کرتے

ایک مہینہ کے بعد ہر ایک کے یہاں افطار کی نوبت آتی۔

قولہ: وَاجْمَعُوا عَلیٰ اَنَّ کَمَالَ الْاِیْمَان. اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ وَتَصْدِیْقٌ بِالْقَلْب. وَعَمَلٌ بِالْاَرْکَان.

(ارشاد شیخ ہے) گروہ صوفیہ کا اس پر اجماع ہے یہ حقیقت ہے کہ ایمان کا کمال زبان سے اقرار کرنا دل سے تصدیق رکھنا اعضاء سے عمل کرنا ہے۔ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے یہ عنوان اس لئے اختیار کیا کہ زیادہ تر اس جماعت کے لوگ اصحاب حدیث کا مذہب رکھتے ہیں اور اصحاب حدیث کے مذہب بیان کرنے کا یہی عنوان ہے جو بیان کیا گیا اور اپنے اس قول کی صحت میں یہ دلیل لاتے ہیں کہ حضرت رسالت پناہ ﷺ نے فرمایا **اَلْاِیْمَانُ اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ وَتَصْدِیْقٌ بِالْقَلْبِ وَعَمَلٌ بِالْاَرْکَانِ.** ہمارے علماء کے نزدیک اعمال داخل ایمان نہیں یہ اس لئے کہ ایمان ضد کفر ہے اور کفر ایمان کا ضد ہے اگر طاعت ایمان ہوتی تو معاصی کو کفر ہونا چاہئے تھا جب اس پر اتفاق ہے کہ معاصی کفر نہیں ہے تو یہ لازم آتا ہے کہ طاعت ایمان نہیں اور جب ہر دو فریق کا اس پر اتفاق ہے کہ ترک طاعت سے آدمی کافر نہیں ہوتا تو یہ درست ہے کہ طاعت ایمان نہیں۔

اور وہ کہ اصحاب ظواہر نے روایت کی ہے تاویل اس کی یہ ہے کہ طاعت ایمان کا فروع ہے اس معنی کر کہ بغیر تقدیم ایمان کے طاعت طاعت نہیں ہوتی تو لازماً بغیر طاعت کے ایمان، ایمان ہے اور فروع کے معنی یہ ہیں کہ کسی چیز کو کسی چیز کا مجازاً نام دیا جائے اصطلاح شرع میں ایسا ہوتا ہے اور اس کے بہت سے نظائر ہیں۔

قولہ: فَمَنْ تَرَکَ الْاِقْرَارَ فَھُوَ کَافِرٌ. وَمَنْ تَرَکَ التَّصْدِیْقَ فَھُوَ مُنَافِقٌ وَمَنْ تَرَکَ الْعَمَلَ فَھُوَ فَاسِقٌ وَمَنْ تَرَکَ الْاِتِّبَاعَ فَھُوَ مُبْتَدِعٌ.

(ارشاد شیخ ہے) جس نے اقرار ترک کیا وہ کافر ہے اور جس نے تصدیق ترک کی وہ منافق ہے۔ اور جس نے عمل ترک کیا وہ فاسق ہے اور جس نے سنت کی پیروی ترک کی وہ مبتدع ہے۔

امام اعظم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ لوگ ایمان میں تین درجہ کے ہیں ان میں سے ایک

خداوند تعالیٰ کے نزدیک مومن ہے اور لوگوں کے نزدیک کافر ہے اور وہ، وہ ہے کہ حق تعالیٰ کو جیسا پہچاننے کا حق ہے وہ پہچانتا ہے اور توحید پر اعتقاد رکھتا ہے کفر سے بیزار ہے لیکن اس کا اقرار ظاہر نہیں ہوا ہے تو وہ مومن ہے خدا کے نزدیک اور کافر ہے لوگوں کے نزدیک تو جو یہ چاہے کہ کفر کے حکم سے ایمان کے حکم میں داخل ہوا سے اقرار ظاہر کئے بغیر چارہ نہیں جیسے کہ بغیر تصدیق کے چارہ نہیں۔ دوسرے وہ کہ کافر ہے خداوند تعالیٰ کے نزدیک اور مومن ہے لوگوں کے نزدیک اور وہ، وہ ہے کہ اقرار زبان سے کرتا ہے مگر دل سے اعتقاد نہیں رکھتا۔ بہ اعتبار ظاہر اس کو مسلمان کہتے ہیں وہ مومن ہے لوگوں کے نزدیک اور کافر ہے خداوند تعالیٰ کے نزدیک۔ تیسرے وہ کہ اقرار کرتا ہے زبان سے اور اعتقاد رکھتا ہے دل سے تو وہ مومن ہے خداوند تعالیٰ کے نزدیک فرشتوں کے نزدیک اور تمام لوگوں کے نزدیک۔

اور اہل سنت و جماعت کے نزدیک بدعت حرام ہے اور اس پر قائم رہنا فسق پر قائم رہنے سے زیادہ برا ہے اور بدعتی پر لعنت کرنا جائز ہے لیکن ان کے کافر ہونے میں کلام ہے۔ بعضے فقہا رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ بدعت کفر ہے اور بدعتی کافر ہے اس لئے کہ بدعت حرام ہے اور جس نے اس کے حلال ہونے کا اعتقاد کیا اس نے حرام کو حلال قرار دیا اور جس نے حرام کو حلال جانا وہ کافر ہوا۔

اور بعض فقہاء کہتے ہیں کہ بدعتی کافر نہیں ہے یہ اس لئے کہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ اہل بدعت کی گواہی مقبول ہے اور جب اہل بدعت کی گواہی مقبول ہوئی دلیل یہ ہے کہ وہ مسلمان ہے۔ اور امام محمد رحمتہ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ بدعتی کے پیچھے نماز پڑھنی جائز ہے مگر مکروہ ہے اور کافر نہ ہونے کی یہ بھی ایک دلیل ہے۔

قولہ: وَاَنَّ النَّاسَ یَتَفَاضَلُوْنَ فِی الْاِیْمَانِ.

(ارشاد شیخ ہے) یہ صحیح اور درست ہے کہ لوگ ایمان میں ایک دوسرے پر فضیلت رکھتے ہیں یعنی ایک پر دوسرے کو نفس ایمان میں فضیلت ہے یہ اس بنا پر بھی کہ اصحاب حدیث ایمان میں کمی و بیشی کو جائز سمجھتے ہیں اور ان کے مسلک کی بنا پر جب کہ عمل ارکان ایمان سے ہے۔ جس کسی کا عمل زیادہ ہوگا اس کے ایمان کی زیادتی ہوگی جس کا عمل ناقص ہوگا اس کے ایمان میں نقص ہوگا۔

لیکن ہم لوگوں کے مذہب میں ایمان کے اندر زیادتی جائز نہیں کیونکہ جب ایمان تصدیق ہے تو تصدیق میں زیادتی اس وقت ہوگی جب جس کی تصدیق کی جارہی ہے اس میں زیادتی ہواور تصدیق میں نقص اس وقت ہوگا جب کہ جس کی تصدیق کی جارہی ہے اس میں نقص ہولیکن جب ذات پاک خداوندی پر زیادتی اور نقصان کا اطلاق درست نہیں تو اس کی تصدیق میں زیادتی اور نقصان کا کیا سوال اور اسے میں قبل بیان کرچکا ہوں۔

ہاں اگر ایمان کے اس باہمی تفاضل کو ہم یوں کہیں کہ فضیلت ایمان کی اپنے اوصاف کی بنا پر ہے کیونکہ ایمان تو تصدیق کا نام ہے لیکن تصدیق کی بھی صفتیں ہیں اس تصدیق کی بقا ان صفتوں کے ساتھ رہتی ہے جیسے خوف ورجا شوق ومحبت اور اس کے علاوہ تو مناسب ہوگا۔

قولہ: وَاَنَّ الْمَعْرِفَةَ بِالْقلبِ لَایَنْفَعُ مَالَمْ یَتَکَلَّمْ بِکَلِمَةِ الشَّهَادَةِ.

(ارشاد شیخ ہے) یہ درست اور سچ ہے کہ خداوند تعالیٰ کا دل سے پہچاننا اس وقت تک جب تک اقرار نہ کرے یعنی کلمہ شہادت زبان سے نہ پڑھے نفع بخش نہیں۔ کیونکہ ابلیس علیہ اللعنۃ اللہ تعالیٰ کو پہچانتا ہے چونکہ کفر اس کی زبان پر موجود ہے لہٰذا کافر ہے۔

اور دوسرے حق تعالیٰ نے فرمایا اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْکِتَابَ یَعْرِفُوْنَهٗ کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآئَهُمْ اہل کتاب کے حق میں فرمایا وہ لوگ جنہیں میں نے کتاب دی یعنی ان کے لئے میں نے توریت بھیجی وہ اس کو ایسا پہچانتے ہیں جیسے اپنے فرزند کو۔ اس کے باوجود انکار کرتے ہیں تو ان کا انکار کے ساتھ پہچاننا بلا اقرار کے سودمند نہیں۔ یہ دلیل ہے کہ بغیر اقرار کے محض پہچان ایمان نہیں۔

قولہ: اِلَّا اَنْ یَکُوْنَ لَهٗ عُذْرٌ ثَبَتَ بِالشَّرْعِ.

(ارشاد شیخ ہے) مگر یہ کہ اسے ایسا عذر ہو جو شرع سے ثابت ہوا ہو یعنی ایسا عذر شرعی چاہئے کہ زبان سے اقرار کرنے میں معذور ہو۔ مثلاً کوئی گنگ ہو، یا ایسا شخص ہو کہ دل سے تصدیق کرتا ہو مگر اقرار اس خوف سے نہیں کرتا کہ کفار اسے مار ڈالیں گے، اتنا کہ یہ بات اس کو صحیح طور سے معلوم ہونا چاہئے کہ اگر ایمان لانے کا اظہار کرتا ہے یا کرے گا تو قتل کردیا جائے گا یہ بھی معذورین میں سے ہے۔

قولہ: وَيَرَوْنَ الْاِسْتِثْنَاءَ فِى الْاِيْمَانِ مِنْ غَيْرِ شَكٍّ بَلْ عَلٰى سَبِيْلِ التَّاكِيْدِ وَالْمُبَالِغَةِ وَلاَنَّ الْاَمْرَ مُغَيَّبٌ.

(ارشاد شیخ ہے) یہ لوگ ایمان میں بغیر شک کے استثناء کرنے پر اعتقاد رکھتے ہیں یعنی یہ لوگ جو استثنا کرتے ہیں یہ اس سبب سے استثنا نہیں کرتے کہ انہیں ایمان میں شک ہے ایسا گرگز نہیں ہے اور نہ ان لوگوں کے حال کے لائق ہے اور وہ جو بل علی سبیل التاکید فرمایا بل بر سبیل تاکید اور مبالغہ کے لئے بولتے ہیں کہ میں مومن ہوں انشاء اللہ تعالیٰ

سوال: یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر کلمہ انشاء اللہ سے ان کی مراد ایمان میں شک نہیں ہے بلکہ مبالغہ اور تاکید کے لئے ہے تو پھر شک کی شکل کیا ہوگی۔

جواب: جواباً کہتا ہوں سنو تمہیدات میں مذکور ہے ایمان میں شک اسے کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ اور پیغامبر اکو پہچانتا ہے اور لا الہ الا اللہ کہتا ہے اور اس کی تصدیق بھی رکھتا ہے۔ پھر اس مین شک کرتا ہے کہ اس پر ایمان لانے اور اقرار کرنے سے ایمان ہے اور یہ اقرار اور ایمان لانا ازالہ کفر کا سبب ہے یا نہیں۔ تو یہی صورت ایمان میں شک کی ہے اور ایمان شک کے ساتھ ثابت نہیں۔

اس مسئلہ میں اختلاف یوں ہوا ہے کہ ہر ایک نے ایک علیحدہ معنی بیان کیا ہے۔ بعض فقہا رحمہم اللہ کا قول ہے کہ ایمان میں استثنا کرنا شک ہے اور بعض کہتے ہیں کہ استثنا کرنا ایمان میں شک نہیں ہے اور اَنَا مُؤْمِنٌ اِنْشَاءَ اللّٰہ کہتے ہیں

اور یہ مذہب امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کا ہے کہ یہ تاکید و مبالغہ کے لئے ہے نہ کہ ایمان میں شک کے طور پر۔

اور وہ جو کہا وَاَنَّ لاَمْرَ مُغَيَّبٌ حضرت شیخ رحمتہ اللہ علیہ دوسری دلیل فرماتے ہیں کہ اَنَا مُؤمِنٌ انشاءَ اللّٰہُ اس لئے کہ معاملہ غیب کا ہے قرآن میں اسکی دلیلیں بہت ہیں کہ جو مومن ہوگا قطعی اہل بہشت سے ہوگا تو کسی ایک کے متعلق حکم قطعی لگانا کہ یہ قطعی اور یقیناً مومن ہے یہ اس بات کو بھی واجب کرے گا کہ یہ اہل بہشت سے ہے اور جایز نہیں کہ کسی کے متعلق تعین کر کے

قطعیت کے ساتھ کہا جائے کہ یہ اہل بہشت سے ہے تو اس بنا پر یہ معاملہ یقیناً غیب میں ہیں ایسے حال میں اس دوسری شکل کا لحاظ رکھتے ہوئے بہتر یہی ہے کہ کہا جائے انا مومنٌ انشاء اللّٰہُ۔

قوله: سُئِلَ الْحَسَنُ الْبَصْرِیُ ﷺ مُؤ مِنٌ اَنتَ حَقاً. فَقَالَ اِنْ اَرَدْتَ مَایُحقَنُ بِہٖ دِمِیُ وَیُحِلُّ بِہٖ ذَبِیْحَتِیُ وَمُنَاکِحَتِی فَاَنَا مُؤمِنٌ حَقاً وَاِنْ اَرَدْتَ مَا اُدْخُلُ بِہِ الْجِنَانَ وَاَنجُو بِہٖ مِنَ النِّیْرَانِ وَیَرْضیٰ بِہٖ عَنِی الرَّحْمٰنُ فَاَنَا مُؤمِنٌ اِنْشَاءَ اللّٰہ.

(ارشاد شیخ ہے) حسن بصری رضی اللہ عنہ سے سوال کیا گیا کہ آیا آپ حقیقتاً مومن ہیں؟ تو ارشاد ہوا کہ اگر تمہارا مقصود اس سوال سے یہ ہے کہ اس ایمان کے سبب میرا خون محفوظ ہے۔ یعنی میں قتل نہیں کیا جاؤں اور میرا ذبح کیا ہوا جانور حلال ہو اور میرا نکاح کرنا حلال ہو تو میں حقیقتاً مومن ہوں کیوں کہ ایمان قطعی کے ساتھ یہ احکام مذکورہ ثابت ہیں۔ اور اگر اس سوال سے تمہارا مقصود یہ کہ اس ایمان کی بدولت میں بہشت میں داخل ہوں اور اس ایمان کے طفیل دوزخ سے رہائی پاؤں اور اس ایمان کے صدقہ میں رحمٰن مجھ سے راضی و خوشنود ہو تو میں انشاء اللہ مومن ہوں۔ یہ اس لئے کہ بہشت کا اور دوزخ سے نجات کا معاملہ پردہ میں ہے اور کوئی کسی شخص کے متعلق جنتی ہونے کا حکم قطعاً نہیں لگا سکتا سوائے ان لوگوں کے جن کے متعلق شارع علیہ السلام کی حدیث شریف موجود ہے۔

قوله: وَاللّٰہُ تَعَالیٰ اِسْتِثْنیٰ فِی قَوْلِہٖ لَتَدْ خُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَاءَ اللّٰہَ اٰمِنِیْنَ ط وَلَیْسَ ھُنَاکَ شَکٌّ. وَسُئِلَ بَعْضُھُمْ عَنْ ھٰذَاالْاِسْتِثْنَاءِ مِنَ اللّٰہِ تَعَالیٰ فَقَالَ اَرَادَ بِذٰلِکَ تَادِیْباً لِعِبَادِہٖ وَتَنْبِیھاً لَھُمْ عَلیٰ اَنَّ الْحَقَّ اِذَا اِسْتِثْنیٰ مَعَ کَمَالِ عِلْمِہٖ لَا یَجُوْزُ لِاَحَدِ الْحُکْمُ مِنْ غَیْرِ اِسْتِثْنَاءِ لِقُصُوْرِ عِلْمِہٖ.

(ارشاد شیخ ہے) خدائے تعالیٰ نے اپنے کلام میں بحق پیغامبر علیہ السلام وصحابہ کرام استثنا فرمایا بے شک تم آرام سے داخل ہو رہو گے اپنے اصحاب کے ساتھ مسجد حرام میں اگر خدانے

چاہا۔ اور یہاں یعنی کلام خدائے تعالیٰ میں شک نہیں۔

اس گروہ صوفیہ کے بعض لوگوں سے خداوند تعالیٰ کے اس استثناء کرنے کے متعلق پوچھا گیا جواب میں انہوں نے کہا اس استثناء کرنے سے بندوں کو ادب سکھانا متنبہ کرنا اور آگاہ کرنا ہے کہ جب خداوند تعالیٰ اپنے کمال علم کے باوجود استثنا کرتا ہے تو بندہ کے لئے اپنی کم علمی کے باوجود یہ خلاف ادب ہے کہ وہ بغیر استثنا کئے یعنی بغیر انشاء اللہ حکم لگائے۔

دوسرے خداوند تعالیٰ خود کلام مجید میں فرماتا ہے اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ٥ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ٥ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا.

(بیشک مومن وہی ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے قلوب کانپ جاتے ہیں ان جب ان کے سامنے اللہ کی آیتیں تلاوت کی جاتی ہیں تو ان کے ایمانی صفات میں زیادتی ہوتی ہے اور ان مومنین کا حال یہ ہوتا ہے کہ اپنے رب ہی پر بھروسہ رکھتے ہیں یہی وہ لوگ ہیں جو نمازیں قائم کرتے ہیں اور اللہ کی جانب سے جو انہیں رزق ملتی ہے اسے صرف کرتے ہیں وہی لوگ حقیقی معنوں میں مومن ہیں) اس آیت میں دلیل ہے کہ آدمی جب تک ان پانچ صفتوں سے موصوف نہ ہو مومن نہیں ہوتا۔ ایک خوف خدا دوسرے اللہ کے دین میں اخلاص تیسرے خدا پر توکل چوتھے نماز پر قائم رہنا پانچویں مال کا زکوٰۃ دینا اس لئے کہ پہلی آیت میں کلمہ اِنَّمَا کا ذکر کیا اور کلمۂ انما حصر کے لئے ہے اور آخر آیت میں فرمایا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا اور یہ بھی معنی حصر کا فائدہ دیتا ہے اور آدمی کے لئے اپنی ذات پر ان پانچ صفتوں کے حصول کا حصر کرنا ممکن نہیں ہے۔ آخر کار بہتر یہی ہے کہ انشاء اللہ کہا کرے۔

دوسری بات یہ کہ پیغامبر ﷺ نے فتح مکہ کے قبل خواب دیکھا تھا کہ میں مسجد مکہ میں داخل ہوا ہوں پیغامبر کا خواب وحی ہوتا ہے جس طرح وحی میں شک جائز نہیں ہے پیغامبروں کے خواب میں بھی شک درست نہیں ہے اس کے باوجود خداوند تعالیٰ نے اپنے کلام میں انشاء اللہ کہہ کے استثناء فرمایا۔

امام زاہد کی تفسیر میں آیا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی بات کا وعدہ کرے اور وقت وعدہ انشاء اللہ کہنا بھول جائے اور بعد اس کے اسے یاد آئے تو اسے چاہئے کہ انشاء اللہ کہہ لے اب اگر اس سے ایفائے عہد نہ ہوا تو وہ وعدہ خلافی کا مرتکب نہ ہوگا۔

اور ایک بزرگ سے روایت کرتے ہیں کہ استثنا کرنے کی مدت چھ ماہ تک ہے یعنی اگر اس نے کسی سے وعدہ کیا ہو اور وعدہ کے بعد انشاء اللہ نہ کہا ہو تو چھ ماہ کے اندر انشاء اللہ کہہ لے ایسی صورت میں اگر وعدہ پورا نہ ہو سکے تو وہ وعدہ خلافی کی وعید کے تحت میں نہیں آئے گا۔

قولہ: وَكَذٰلِكَ قَالَ النَّبِيُّ ﷺ فِي أَهْلِ الْمَقَابِرِ وَإِنَّا انشاء اللّٰهُ عَنْ قَرِيْبٍ بِكُمْ لَاحِقُوْنَ ۝ وَلَمْ يَكُنْ شَاكًّا فِي الْمَوْتِ وَاللُّحُوْقِ بِهِمْ.

(ارشاد شیخ ہے) اور پیغامبر ﷺ نے اہل گورستان کے حق میں اس طرح فرمایا کہ بلا شبہ ہم تمہارے پاس پہنچتے ہیں انشاء اللہ تو اس عالم سے حضور ﷺ تشریف لے جانے میں شک نہیں، اس جملہ سے اپنے وصال کے متعلق اور دوسرے عالم میں مومنین سے ملاقات کے متعلق یہ نہیں کہا جائے گا کہ حضور کو شک تھا تو اس سے معلوم ہوا اگرچہ کسی چیز کے ہونے میں شک نہ ہو تو بھی اس کام میں انشاء اللہ کہنا ادباً آیا ہے۔

اور دوسری بات یہ کہتے ہیں کہ جس وقت بندہ نے یہ کہا کہ اَنَا مُؤْمِنٌ (میں مومن ہوں) گویا اس نے اپنی بہت بڑی مدح کے ساتھ تعریف کی اس لئے بندہ کے لئے صفت ایمانی سے بڑھ کر اشرف کوئی صفت نہیں تو ایسے حال میں انشاء اللہ کہنا اور ضروری ہے تا کہ یہ کلمہ حصول شکستگی دل اور عجب کے زوال کا سبب بنے۔

قولہ: وَاجْمَعُوْا عَلٰى اِبَاحَةِ الْكَسْبِ وَالتِّجَارَاتِ وَالصِّنَاعَاتِ عَلٰى سَبِيْلِ التَّعَاوُنِ عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى مِنْ غَيْرِ اَنْ يُّرٰى ذٰلِكَ سَبَبًا لِاسْتِجْلَابِ الرِّزْقِ.

(ارشاد شیخ ہے) صوفیہ کا اجماع ہے کسب و تجارت اور صنعت کے مباح ہونے پر اگر یہ اس طرح ہو کہ اس سے نیکی اور پرہیز گاری کی جائے ہاں اس میں یہ نہ ہونا چاہئے کہ کسب ہی کو روزی کا سبب سمجھ لے۔

اگلے لوگوں میں جس روزگار کا غلبہ رہا ہے وہ دس ہیں چمڑے سینے کا کام، بڑھئی کا کام بار برداری، درزی، جھول سینے کا کام، دھوبی کا پیشہ، موزے سینے کا کام، لوہاری کا پیشہ، تکوتراشی، کتاب و مصحف کے اجزا نویسی۔

کسب کے لئے مباح کا لفظ آیا فریضہ کا لفظ نہیں آیا یہ اس لئے کہ **اجمعو** کے ساتھ ہے اور کلام عرب کی یہ خاص اصطلاح ہے جب کسی مسلک کو اجماع کے ساتھ بولتے ہیں تو عام فقہا کا مسلک نہیں بیان کرتے بلکہ خواص فقہا کی روش بتاتے ہیں مثلاً جب یوں کہیں کہ فقہا کا اجماع اس پر ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اکابر فقہا کی روش ایسی ہے۔تو خلاصہ یوں ہوا کہ اکابر صوفیہ اپنے حق میں کسب کو فریضہ کی کیفیت میں نہیں سمجھتے ہیں یہ اس لئے کہ اپنے اندر توکل کی قوت کچھ ایسی پاتے ہیں کہ بھوکے مر بھی جائیں تو بھی توجہ الی اللہ سے غائب نہ ہو اور اس موت کو اجل مقدر تصور کریں اور مخلوق کے سامنے ان سے کسی گلہ کا اظہار نہ ہو ہاں جو اس مقام میں ہوں ان پر فریضہ کی کیفیت نہیں سمجھی جائے گی۔ بخلاف اس کے اگر کوئی شخص صبر کی طاقت نہیں رکھتا ہے ایسے حال میں اسے اپنے خدا سے اعراض کا خطرہ ہے یا یہ کہ وہ دست سوال دراز کرے گا تو کسب فرض کی حیثیت سے اس پر طاری ہے۔

اور وہ جو کہا **عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوىٰ** (نیکوکاری اور پرہیز گاری پر معاونت کے لئے) یعنی جب یہ سمجھے کہ اس کے ذریعہ مجھ سے خیر ہوگا تو خیر کے حصول کے لئے کسب کرے نہ خواہشات کی مراد کے لئے اس پر دلیل یہ کہ خداوند تعالیٰ نے فرمایا **تَعَاوَنُوْ عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوىٰ وَلَا تَعَاوَنُوْ عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ** (تقویٰ اور خیر کی باتوں میں معاونت کیا کرو گناہ اور خدا کے دشمنی کے معاملہ میں مدد کرنے سے پرہیز کیا کرو) تو کسب روزی میں بھی مباح کی وہی کیفیت ہے جیسے نماز روزہ کے نوافل میں جتنا زیادہ کرے بہتر ہے۔لیکن اس کسب میں نفع اندوزی مدنظر نہ ہو اور اس کو اپنی نجات کا باعث نہیں جاننا چاہئے یہ اس لئے کہ بندہ بجز فضل خدا کے جس کسی چیز میں بھی اپنی نجات جانے وہ شرک ہے اور کسب بس ایسا ہی ہے کہ کرنے کی چیز ہے روزی کا مدار کسب پر ہے ایسا نہیں سمجھنا چاہئے بلکہ جاننا چاہئے کہ یہ بھی فضل خداوندی سے ہے کہ

اس نے اسی میں اس کے لئے روزی کا دروازہ کھولا اور کسب کو اس کے لئے روزی کا سبب بنا دیا یہ ایسے ہی کہ اس نے اپنی عبادت کا دروازہ کھول دیا تا کہ وہی اس کے نجات کا سبب ہو۔

اور کسب کرنے کی اصل جناب آدم علیہ السلام سے ہے کہ وہ کھیتی کرتے خداوند تعالیٰ نے ان کو کاشتکاری کرنا اور اس کے آلات کے نام سکھائے اور فرمایا کہ اپنے فرزندوں کو سکھاؤ۔ اور دیگر انبیاء علیہم السلام کو بھی اور دوسرے روزگار تھے۔

اور کسب میں بھی آداب بتائے گئے ہیں کہ کسب، کسب کرنے والے کو دوسرے فرائض سے روک کر اپنے میں مشغول نہ کرے جیسا کہ اس آیت کی تفسیر میں آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا قول یہ ہے لَاتُلْهِهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۝ (ان کی تجارت اور بکری وخریداری اللہ کی یاد سے ہٹا کر اپنے میں مشغول نہیں کرتے) یہ اس وقت کے ان مومنین کے حال کا ذکر ہے کہ اس میں لوہار تھے چرم دوزی کا کام کرنے والے تھے لوہار ہتھوڑا اٹھائے ہوتا چرم دوز ٹکوا پروئے ہوتا اسی حال میں جیسے ہی اذان کی آواز سنتا، ہتھوڑا بغیر لگائے اور ٹکوا بلا پروئے ویسے ہی چھوڑ کر نماز میں حاضر ہو جاتا۔

کسب کو روزی کا سبب نہ سمجھے بلکہ اسی قدر سمجھے کہ اس سے مسلمانوں کے حق میں ایک طرح کی اعانت ہوتی ہے اس طرح کہ ایسا کرنے سے مسلمانوں کی میری جانب سے مشغولی ختم ہو جائے گی۔ کسب کا دوسرا ادب یہ ہے کہ اس میں اپنی مشغولیت بہت زیادہ نہ رکھے بلکہ اس کا اہتمام کرے کہ اس کے کسب کے مشاغل وقت چاشت سے ظہر کے اندر اندر ختم ہو جائیں پھر کسب سے فارغ ہو کر دوستوں سے ملے جلے پھر ان کے ساتھ فرائض کی ادائیگی میں لگ جائے اور یہ سلسلہ دوسرے وقت چاشت تک رکھے ایسا اس لئے کہ حدیث میں وارد ہے کہ فرشتے جب نامۂ اعمال کے صحیفہ کے ساتھ دن کے اول حصہ میں اور آخر حصہ میں آتے ہیں اور بندہ کو ذکر خیر میں پاتے ہیں تو یہ خبر اللہ تعالیٰ کی جانب میں اس بندہ کے ان برائیوں کا بھی کفارہ بنتا ہے جو اس درمیان میں اس سے کچھ ہو گیا۔

اکابرین صوفیہ کے نزدیک کسب سرے سے فریضہ ہی نہیں اور بعض صوفیہ اس قول کے موافق ہیں ان کا کہنا یہ ہے کہ کسب کرنا تجارت یا صنعت پر اعتماد کرنا ہے، اور سوائے خدا کے کسی

چیز پر بھروسہ توکل میں نقصان کا سبب ہے اور وہ لوگ اصحاب صفہ کے قصہ سے دلیل قائم کرتے ہیں کہ اصحاب صفہ توکل پر جیتے تھے اور کوئی کسب نہیں کرتے تھے پیغامبر ﷺ نے ان کو منع نہیں فرمایا اور یہ روا نہیں ہے کہ ایک جماعت فرض کو ترک کرے اور پیغامبر ﷺ اس کو منع نہ کریں۔

قولہ: وَاَنَّ السَّوَالَ اٰخِرُ کَسْبِ الْمَرْءِ. وَلَا یُحِلُّ الْمَسْاَلَةُ لِغَنِیٍّ وَلَا لِذِیْ مِرَّةٍ سَوِیٍّ.

(ارشاد شیخ ہے) یہ درست ہے اور سچ ہے کہ کسب کی سب سے آخر نوعیت سوال ہے یعنی کسب کی کوئی راہ نہ ہو تب سوال ہے اور کسی تونگر اور صاحب قوت یعنی جس کے اعضا صحیح و سالم اور تندرست ہوں اس کے لئے سوال حلال نہیں ہے متن میں مِـرَّة سے قوت مراد ہے یعنی ذی مِرَّة سوی کا مطلب یہ ہے کہ صاحب عقل وقوت ہو۔ متن میں غنیٰ کا لفظ ہے اور اس کی دو قسم ہے ایک اتنی مقدار ہے کہ جس کے بعد سوال منع ہے اور اور وہ پچاس درم کا مالک ہونا ہے غنا یعنی تونگری کی دوسری قسم وہ ہے کہ جس تونگر کے لئے صدقہ قبول کرنا منع ہے اور وہ اہل نصاب ہونا ہے اس موقع پر مراد غنا سے پہلی قسم ہے یعنی پچاس درم کا مالک ہونا ہے۔ یعنی یہ ہوئے کہ ان دونوں کے لئے اس حال میں بہتر نہیں ہے یعنی اس کے لئے بھی جو پچاس درم کا مالک ہو اور اس کے لئے بھی جو صاحب قوت ہے کہ اعتماد کرے لوگوں پر سوال کرنے میں، جبکہ پہلے شخص کو سامان دنیا میں سے کچھ موجود ہے اور دوسرے کو قدرت و طاقت کسب کرنے کی حاصل ہے تو ایسی شکل میں سوال کرنا ان دونوں کے لئے مکروہ ہوگا۔ ان اسباب و محرکات کی بنا پر جو سوال میں مضمر ہے کیونکہ ایسا کم ہوتا ہے کہ ایک شخص سے سوال کیا جائے اور وہ ان خطرات سے خالی ہو اس کو شکایت نہ پیدا ہو، سائل میں ذلت نفس نہ ہو، حصول ایذا نہ ہو کیونکہ یہ سب کے سب حرام ہیں اس بنا پر سوال اس وقت تک مباح نہیں ہے جب تک کہ ضرورت نہ آپڑے اور ضرورت یہ ہے کہ ہلاکت کا خطرہ ہو اور کوئی دوسری شکل اس کے دفعیہ کی سوال کے علاوہ نہ ہو جب ایسا ہو تو سوال کرنا مباح ہوگا۔ بالکل ویسے ہی جس طرح اضطرار کے حال میں مردار کھانا۔

سوال کے لئے کبھی دوسری شکل بھی ہوتی ہے ریاضت نفس کے لئے سوال کرتے ہیں تاکہ اس سلسلہ میں جو ذلت ہوتی ہے اسے نفس برداشت کرے اس کا رنج دل پر ڈالے اپنی

حقیقت کو خوب سمجھے کہ لوگوں کی نگاہ میں اس کی کیا قدر و قیمت ہے۔ جیسا کہ خواجہ جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ نے امام شبلی رحمتہ اللہ کے ساتھ کیا۔ مگر ایسے لوگوں کے یہاں ہے کہ جب کوئی شخص کوئی چیز بغیر سوال کے دے تو اس وقت اس کا لینا مباح ہوتا ہے اور اگر سوال کرنے پر دے تو مباح نہیں ان تمام شکلوں میں کسب کے بغیر جو کچھ بھی کھانا اور پینا ہے اس میں بہت سی دشواریاں ہیں عام ازیں کہ وہ مانگنے پر ملیں یا بے مانگے ملیں۔ کیونکہ جو کچھ بھی لوگوں کے ہاتھوں سے ملتا ہے جب اس کی تلاش کی جائے یا تو وہ کل کا کل حرام ہوتا ہے یا زیادہ حصہ اگر کوئی اس مسئلہ کی تفصیل دیکھنا چاہے تو احیاء العلوم میں دیکھے نہایت وضاحت سے بیان فرمایا ہے پوری تشریح معلوم ہو جائے گی۔ حاصل الامر یہ کہ درویشی کا خداوند تعالیٰ کی راہ میں بہت بڑا مرتبہ ہے اور ان درویشوں کو خطرہ بھی بہت ہے۔ نقل ہے کہ قیامت کے دن خداوند تعالیٰ یوں کہے گا۔ اُدْنُوا مِنِّی اَحِبَّائِی. فَیَقُوْلُ الْمَلَائِکَۃُ مَنْ اَحِبَّائُوکَ فَیَقُوْلُ فُقَرَاءُ الْمُسْلِمِیْنَ. (مجھ سے قریب کرو میرے محبوبوں کو فرشتے کہیں گے اے اللہ کون ہیں تیرے محبوبوں میں ارشاد ہوگا مسلمان فقرا) فقیر وہ ہے کہ اس تمام عالم کے مالک ہونے کے باوجود غنی نہیں ہوتا اس عالم میں۔ اور اس عالم میں اس پورے عالم کے مالک ہونے کے باوجود غنی نہیں ہوتا۔ کونین فقیر کے فقر کے ترازو کے پلہ میں ایک مچھر کے پر کے برابر بھی نہیں۔ ابن جلار رحمتہ اللہ علیہ سے منقول ہے وہ کہتے ہیں کہ فقر یہ ہے کہ تیرے پاس کچھ نہ ہو اور اگر تیرے پاس ہو بھی تو بھی نہ ہو۔ اللہ بہتر جانتا ہے مطلب یہ ہے کہ جب تک نہ ہو تو اس کی طرف تیرا میلان نہ ہو اور تجھے اس کی طلب نہ ہو اور مل جائے تو تجھے اس پر اعتماد و بھروسہ نہ ہو یہاں تک کہ اس کے ہونے اور نہ ہونے میں تیرا حال یکساں ہو فقیر کی یہی علامت ہے۔

اور سوال خود بنفسہ ذل و حقارت ہے اور حقارت کو حقیروں سے مانگنا حقارت پر حقارت ہے۔ اور اس گروہ صوفیہ کی ہمت ایسی بلند ہوتی ہے کہ اپنی ہمت کی بلندی کے باعث جب دنیا خداوند تعالیٰ سے نہیں مانگتے تو اپنے جیسی مخلوق سے کب طلب کریں گے۔

فصل-۲

فضیلت فقر میں

قوله: وَاجْمَعُوْا عَلیٰ اَنَّ الْفَقْرَ اَفْضَلُ مِنَ الْغِنیٰ اِذَا کَانَ مَقْرُوْناً بِالرِّضیٰ.

(ارشاد شیخ ہے) اس گروہ صوفیہ کا اجماع ہے کہ بیشک فقر غنیٰ سے بہتر ہے چونکہ فقر کو رضا سے قربت ہے اور اس کی علامت یہ ہے کہ فقیر فقر کے زوال سے ایسا ڈرتا ہے جیسے کہ تونگر تونگری کے زوال سے لیکن دلیل کہ غنی پر فقر کو فضیلت حاصل ہے اللہ تعالیٰ کی کتاب اور حضور ﷺ کی حدیث شریف اس بات میں ناطق ہے۔ امت کے زیادہ تر لوگ اس پر متفق ہیں کہ حضور ﷺ کی رحلت کے بعد حضور ﷺ کے افضل ترین امتیان (امتی لوگ) حضور ﷺ کے فقرا ہیں یہ اس لئے کہ فقرا ہر زمانہ میں اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ رہے ہیں۔ کیا یہ نہیں سمجھتے کہ اغنیا جب بلا میں مبتلا ہوتے ہیں تو فقیروں کے پاس جاتے ہیں اور کبھی کوئی فقیر تونگر کے پاس نہیں جاتا اور نہ ان سے پناہ ڈھونڈتا ہے لیکن یہ صفت فقیر کی ہے گداگر کی نہیں یہ اس کی شان ہے جو فقر میں صادق ہو جھوٹوں کی نہیں۔

اور فقیر کی حقیقت یہ ہے کہ فقیر دونوں جہاں میں کسی چیز پر بھروسہ نہیں کرتا اور نہ وہ کسی شخص سے کوئی طمع رکھتا ہے اور نہ خداوند تعالیٰ کا عوض ٹھہراتا ہے ایسا شخص البتہ فقیر ہے کہ اس کا فقر عین غنیٰ ہے۔

اور جملہ فقرا میں سے وہ لوگ جو خلق کے نزدیک مطعون ہیں حق تبارک وتعالیٰ کے نزدیک وہ اپنے زمانہ کے بہترین لوگ ہیں یہ اس لئے کہ جن اسباب میں دوسرے لوگ لت پت

ہیں وہ ان اسباب سے پاک ہیں ان لوگوں میں سے کوئی شخص ایسا نہیں جو سخت گیر ہو، ظالم ہو، خراب دل ہو، یہ کبھی کسی کی چغل خوری نہیں کرتے، وہ کسی سے دشمنی نہیں رکھتے، وہ حاکمیت نہیں رکھتے وقف نہیں وصیت نہیں رکھتے دنیاداری اور دکان داری کی پونجی جمع نہیں کرتے ان پر زکوٰۃ واجب نہیں آتا جیسے وہ جمع نہیں کرتے مانگتے بھی نہیں۔ طعنہ کرنے والوں کی نظر میں جب ایسے لوگ مطعون ہیں تو برگزیدہ کون لوگ ہوں گے۔

روایت حضرت انس ﷺ سے روایت ہے کہ ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے حضور میں بیٹھے تھے کہ جناب جبرئیل علیہ السلام حاضر ہوئے پھر انہوں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ آپ کو خوشخبری ہے کہ آپ کی امت کے فقرا، امراء سے پانچ سو سال قبل بہشت میں داخل ہوں گے یہ وقت دوپہر کا ہوگا۔

اس بشارت سے رسالت پناہ انہایت خوش ہوئے ارشاد ہوا م تم لوگوں میں کوئی ایسا شخص ہے جو کوئی شعر سنائے ایک بادیہ نشیں نے کہا کہ حاضر ہے یارسول اللہ فرمایا ھاتِ (بلاؤ بلاؤ) اس وقت اس بادیہ نشیں نے یہ شعر پڑھا۔ شعر ؎

لَقَدْ لَسَعَتْ حَیَّۃُ الْھَوٰی کَبِدِیْ + فَلَا طَبِیْبَ لَھَا وَلَا رَاقٍ + اِلَّا الْحَبِیْبُ الَّذِیْ شَغَفْتُ بِہٖ + فَعِنْدَہٗ رُقْیَتِیْ وَتِریَاقِیْ + رباعی۔

از مار غمت گزیدہ دارم جگرے — کو را نہ کند، ہیچ فسونے اثرے
جز دوست کہ من شیفتہ روئے ویم — افسوں و علاج من نہ داند دگرے

مار غم کا تیرے ڈسا ہے جگر — غیر کی جھاڑ کا نہ ہوگا اثر
شیفتہ تیرے رخ کا ہوں تو تو ہی — ہاں کرے گا میرا علاج مگر

تو رسول اللہ ﷺ نے تواجد فرمایا یہاں تک کہ اس تواجد میں چادر مبارک جسم اطہر سے گر گئی۔ حدیث شریف میں ہے کہ درویشوں کے ساتھ بہت زیادہ دوستی کرو ان کی قربت اختیار کرو ان کے ساتھ احسان کرو ان کی خدمت کرو یہ سب اس لئے کہ وہ صاحب دولت ہیں۔ لوگوں نے

پوچھا یا رسول اللہ ان کے پاس کون سی دولت ہے؟ ارشاد ہوا کہ جب قیامت قائم ہوگی تو ان درویشوں کو خداوند رب العزت کا حکم ہوگا کہ دیکھو ان کو جنھوں نے تمہیں ایک روٹی کا ٹکڑہ دیا ہے یا ایک گلاس پانی پلایا ہے یا کوئی کپڑا پہنایا ہے ان لوگوں کا ہاتھ پکڑو اور بہشت میں لے جاؤ۔

قولہ: وَلِذَالِکَ اخْتَارَهُ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ وَاَشَارَ اِلَيْهِ بِذَالِکَ جِبْرَئِيْلُ علیہ السلام حِيْنَ عُرِضَتْ عَلَيْهِ مَفَاتِيْحَ خَزَائِنِ الْاَرْضِ عَلٰى اَنَّهُ لَا يَنْقُصُ لَهُ مِمَّا عِنْدَ اللّٰهِ جَنَاحُ بَعُوْضَةٍ فَاَشَارَ اِلَيْهِ جِبْرَئِيْلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ اَنْ تَوَاضَعْ فَقَالَ اُرِيْدُ اَنْ اَجُوْعَ يَوْماً وَاَشْبَعَ يَوْماً فَاِذَا جُعْتُ تَضَرَّعْتُ اِلَيْکَ وَاِذَا شَبِعْتُ حَمِدْتُکَ وَذَكَرْتُکَ.

(ارشاد شیخ ہے) فقر کو پیغمبر ﷺ نے اس اعتبار سے قبول فرمایا کہ جبرئیل علیہ السلام نے پیغمبر ﷺ کو فقر قبول فرمانے کا مشورہ اس وقت دیا جس وقت کہ حضور ﷺ کو زمین کے تمام خزانوں کی کنجیاں اس شرط کے ساتھ حوالہ کی گئیں کہ اگر آپ اسے قبول فرمالیں تب بھی ان چیزوں میں سے ذرا کمی نہ ہو، جو ایک مچھر کے پر کے برابر ہے۔ یہاں پر کلمہ علیٰ بمعنی شرط کے ہے یعنی اگر قبول فرمائیں جب بھی اس قبول کرنے کی وجہ سے، وہ قربت اور منزل جو حضور ﷺ کو اللہ کے نزدیک حاصل ہے اس میں ایک مچھر کے پر کے برابر بھی کمی نہ ہوگی۔ تو پیغمبر ﷺ نے جبرئیل صلواۃ اللہ سے مشورہ کیا جناب جبرئیل نے کہا انکساری کیجئے یعنی اپنے خدا سے عاجزی کیجئے اور فقر کو قبول فرمائے غنیٰ یعنی تونگری سے دور رہیں تو رسول علیہ السلام نے کہا کہ میں چاہتا ہوں ایک دن بھوکا رہوں اور ایک دن سیر ہوں جب بھوکا رہونگا تجھ سے عاجزی اور زاری کروں گا اور جب سیر ہوں گا تو تیری حمد اور تیرا ذکر کروں گا۔ اسی موقع پر بزرگوں نے کہا ہے اگر پیغمبر علیہ السلام دنیا کی طرف سے آنکھ نہ بند کر لیتے تو اس عالم سے رحلت کے قبل عقبیٰ تک نہ پہنچتے اور اگر عقبیٰ کی طرف سے آنکھ نہ بند فرمالیتے قاب قوسین تک نہ پہنچتے جب ساری چیزوں کی طرف سے رخ پھر لیا تو ساری چیزیں قدموں میں ڈال دی گئیں یعنی ساری چیزیں حاصل ہوگئیں اسی کو اس جملہ میں کہا ہے لَنْ يَّصِلَ اِلَى الْكُلِّ اِلَّا مَنِ انْقَطَعَ عَنِ الْكُلِّ (جو سب کچھ ہے اس تک نہیں

پہنچ سکتا جب تک سب کچھ ترک نہ کردے) اور اسی بنا پر آیت میں بزرگوں نے تاویل کی ہے
مَازَاغَ الْبَصَرُ اِلَّا طَغٰی یعنی مَازَاغَ فِی الدُّنْیَا (آنکھوں نے خطا نہیں کی دنیا میں) وَمَا
طَغٰی فِی الْعُقْبٰی (مقصود حقیقی تک پہنچنے میں اٹکے نہیں عقبیٰ میں) دنیا اور عقبیٰ دونوں نفس کا حصہ
ہے جسے اپنے حصہ پر نظر ہے وہ خود میں ہے اور جو خود میں ہے وہ خدا سے محجوب ہے اور اس گروہ
کے لوگ وہ قوم ہیں کہ جب تک ایک حجاب بھی باقی ہے نہ ان کو قرار ہے نہ آرام چنانچہ خواجہ فضیل
یہ دعا کرتے تھے اِلٰهِی اِنْ عَذَّبْتَنِیْ فَلَا تُعَذِّبْنِیْ بِذُلِّ الْحِجَابِ (اے اللہ تجھے اگر مجھے
عذاب ہی دینا ہو تو حجاب کی ذلت سے عذاب نہ دے) یہ لوگ کشف ومشاہدہ والے ہیں حجاب
ان لوگوں کے لئے ایسا ہی ہے جیسے کہ کافروں کے لئے دوزخ۔ بیت

کنگر جنت چہ دوزخ بود   شیفتگان روئے تو گر ننگرند

(جنت کے کنگرے بھی قعر دوزخ بن جائیں گے اگر تیرے شیفتگان اس میں تجھے نہ
دیکھ پائیں)

قولہ: قَالَ النَّبِیُّ ﷺ اَللّٰهُمَّ اَحْیِنِیْ مِسْكِیْنًا وَّاَمِتْنِیْ مِسْكِیْنًا وَّاحْشُرْنِیْ فِیْ
زُمْرَةِ الْمَسَاكِیْنِ فَلَوْ سَاَلَ اللّٰهَ اَنْ یَّحْشُرَ الْمَسَاكِیْنَ فِیْ زُمْرَتِهٖ لَكَانَ
لَهُمُ الْفَخْرُ الْعَمِیْمُ وَالْفَضْلُ الْعَظِیْمُ فَكَیْفَ وَقَدْ سَاَلَهٗ اَنْ یَّحْشُرَهٗ فِیْ
زُمْرَتِهِمْ.

(ارشاد شیخ ہے) پیغامبر ﷺ نے دعاء کی مجھے اس عالم میں مسکینوں کے ساتھ رکھ اور
جب یہاں سے بلا تو مسکینوں کے ساتھ اور جب حشر میں بلائے تو مسکینوں ہی کے ساتھ اگر حضور
یہ دعاء کرتے کہ تو میرے ساتھ مسکینوں کو اٹھا تو بھی مسکینوں کے لئے یقیناً یہ بہت بڑا فخر اور فضل
ہوتا تو اس فخر وفضل سے بڑھ کر اور کون سا فخر وفضل ہوگا کہ خداوند تعالیٰ چاہے کہ آپ ﷺ اٹھائے
جائیں مسکینوں کے زمرہ میں۔ اسی بنا پر ایک جماعت کہتی ہے کہ مسکین فقیر سے افضل ہیں یہ اس
لئے کہ پیغامبر ﷺ نے جب مسکنت کا ذکر فرمایا تو دعاء کی کہ مجھے موت وحیات میں مسکینوں کے
ساتھ رکھ اور جب فقر کا تذکرہ فرمایا تو ارشاد ہوا كَادَ الْفَقْرُ اَنْ یَّكُوْنَ كُفْرًا (فقر (یعنی

افلاس) قریب کر دیتا ہے اس سے کہ کفر ہو جائے۔) اور ایک جماعت کا خیال ہے کہ فقیر مسکین سے افضل ہے یہ اس لئے کہ خداوند تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ (یہ ان فقرا کے لئے ہے جو اللہ کی راہ میں گھرے، ہوئے ہیں)

دوسری بات یہ کہ مسکین کسی چیز کا مالک نہیں ہوتا یہ معلوم ہے اور فقیر کچھ کا مالک ہوتا ہے لیکن ترک کرتا ہے یہ بھی معلوم۔ حضرت شیخ نے ایک اور دوسری دلیل دی اس بات پر کہ فقر غنی پر فضیلت زیادہ رکھتا ہے۔

قولہ: وَاَمَرَهُ اللّٰهُ تَعَالىٰ بِالصَّبْرِ مَعَهُمْ فَقَالَ وَالصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ الاٰيه.

(ارشاد شیخ ہے) خداوند تعالیٰ نے پیغامبر ﷺ کو حکم دیا کہ آپ ان لوگوں کے ساتھ صبر کریں یعنی فقراء کے ساتھ ارشاد ہوا آپ روکے رکھئے اپنے کو یعنی آپ خیال رکھئے ان لوگوں کا، صبر یہاں پر محصور ہونے کے معنیٰ میں ہے یعنی اے محمد ﷺ آپ خود کو نگہداری میں رکھئے ان لوگوں کے جو خدا کی یاد میں لگے ہوئے ہیں۔ ایسے لوگ مہاجرین فقرا تھے عبدیت کے حکم کی ادائیگی میں پیغامبر ﷺ کی صحیح معنوں میں اطاعت کی کوشش میں لگے بیٹھے تھے۔ خود رسول اکرم ﷺ کی مسجد میں۔ ان کا کوئی اور مشغلہ تھا نہ بلکہ تمام دوسرے مشاغل سے جدا تھے اور اپنی روزی کے معاملہ میں خداوند تعالیٰ پر یقین رکھتے اور خدا ہی پر ان کا توکل تھا۔ یہاں تک کہ رسول اکرم ﷺ کو ان کے متعلق خاص حکم تھا کہ ان کے پاس بیٹھا کریں اور ان کے حقوق کا خیال رکھیں یہ بھی ایک دلیل ہے کہ غنیٰ پر فقر کے فضیلت کی یہ اس لئے کہ اگر ان فقراء کو کہا جاتا کہ تم لوگ خود پیغامبر علیہ السلام کے ساتھ لگے رہو جب بھی ان کے حق میں ایک فضیلت ہوتی تو اب دوسری شکل میں ان کے لئے کیوں نہ فضیلت ہوگی جبکہ خود پیغامبر علیہ السلام کو ان کے متعلق حکم ہوا کہ آپ ان کا خیال رکھیں اور ان کے پاس رہیں۔

قصہ- اس آیت کریمہ کی شان نزول یہ ہے کہ بڑے بڑے مالدار کافروں نے ایک چال یہ چلی کہ پیغامبر ﷺ کے پاس آئے اور کہنے لگے یا رسول اللہ ﷺ ہم لوگ تو ایمان لائیں اگر

آپ اپنے امت کے فقیروں کو اپنے پاس آنے سے منع فرمادیں اور وہ آپ کے پاس نہ آیا کریں کیونکہ ان غریبوں فقیروں سے ہم لوگوں کو عار ہے اور ان کے کپڑوں کی بدبو سے ہمیں تکلیف پہنچتی ہے۔ حضور پیغامبر ﷺ جو کافروں کے ایمان لانے پر حریص تھے (یعنی آپ کی شفقت کا تقاضہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ کفار حلقہ بگوش اسلام ہوں) اس پر مصلحتاً غور کرنے لگے امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ کو درویشوں کی جانب بھیجا کہ چند روز وہ لوگ نہ آئیں تا کہ یہ لوگ ایمان لے آئیں ابھی امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ تین قدم بھی نہ گئے تھے کہ جبرئیل علیہ السلام آئے اور یہ آیت لائے وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ (مت ہٹائیے ان لوگوں کو جو اپنے پروردگار کے ذکر اور یاد میں صبح و شام لگے ہوئے ہیں اور جو اپنے خدا کی رضا کے طالب ہیں۔

جب ان مالدار کافروں نے یہ سمجھا کہ ان فقرا کو منع نہیں کریں گے تو دوسری چال چلی کہنے لگے کہ میرے اور ان کے درمیان باری مقرر کردیجئے ایک روز ہم لوگوں کو موقع دیجئے اور ایک روز ان لوگوں کو، اس پر بھی پیغامبر ﷺ نے امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ کو ان فقیروں کی جانب روانہ کیا تب جبرئیل علیہ السلام آئے اور آیت مذکورہ بالا وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ . الأیہ. نازل ہوئی جس کی شرح اوپر گذر چکی جب ان کافروں نے سمجھا کہ ایسا بھی نہ کریں تو دوسرا فریب کیا کہنے لگے اگر باری مقرر نہیں فرماتے تو ہم لوگ ان لوگوں کے ساتھ بیٹھیں گے لیکن ایسا کیجئے کہ توجہ میری طرف رہے یعنی روئے مبارک ہم لوگوں کی سمت رکھیں پھر حضور ﷺ نے امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ کو ان فقرا کے پاس روانہ کیا لیکن خداوند تعالیٰ نے اتنا بھی پسند نہ فرمایا پھر جبرئیل علیہ السلام یہ آیت کریمہ لے کر آئے وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ آپ ﷺ نے ان درویش صحابیوں کی طرف سے اپنی دونوں آنکھیں نہ ہٹائیں یعنی اپنی نگاہ شفقت ان لوگوں کی جانب سے نہ ہٹائیں انہیں کی طرف دیکھیں یعنی انہیں پر نظر شفقت رکھیں اس لئے کہ ہم بھی انہیں کی طرف نگاہ رکھتے ہیں ان آیات کریمہ کے نزول کے بعد حضور ﷺ جہاں کہیں ان درویشوں کو دیکھ لیتے فرماتے ہمارے ماں باپ تم پر قربان ہوں تم ایسے ہو کہ خداوند تعالیٰ نے تمہارے لئے مجھ پر کڑی نگاہ کی۔

قوله: فَاِنِ احْتَجَّ مُحْتَجٌّ بِقَوْلِهٖ عَلَيْهِ السَّلَامُ اَلْيَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِنَ الْيَدِ السُّفْلٰى.

وَقَالَ اَلْیَدُ الْعُلْیَا هِیَ الْمُعْطِیَةُ والسُّفلیٰ هِیَ السَّائِلَةُ.

(ارشادِ شیخ ہے) پھر اگر دلیل قائم کرنے والا حضور ﷺ کی حدیث سے دلیل قائم کرے جس حدیث کا مضمون ہے کہ وہ ہاتھ جو اوپر ہے وہ نیچے والے ہاتھ سے افضل ہے اور اس کی وضاحت خود بیان فرمائی کہ اوپر کا ہاتھ دینے والے کا ہاتھ ہے اور نچلا ہاتھ مانگنے والے کا ہے۔

حضرت شیخ رحمتہ اللہ علیہ نے ان لوگوں کی دلیل بیان کی کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ غنیٰ فقر سے افضل ہے اور اس پر اس حدیث کو دلیل لاتے ہیں پھر شیخ رحمتہ اللہ علیہ نے آگے اس کا جواب بیان فرمایا ہے جو یہ ہے۔

قولہ: قِیلَ لَهُ الْعُلْیَا تَنَالُ الْفَضِیلَةَ بِاِخْرَاجِ مَافِیهَا وَالْیَدُ السُّفلیٰ تَنَالُ الْمَنْقَصَةَ بِحُصُولِ الشَّیْئِ فِیهَا فَفِی تَفْضِیلِ السَّخَاءِ والعطاء دَلِیْلٌ عَلیٰ فَضْلِ الْفَقْرِ عَلَی الغَنَاء والعطاء. لِاَنَّهُ لَوْ کَانَ مِلْکَ الشَّیْئِ مَحْمُوْداً لَکَانَ بَذْلُهُ بِالْعَطَاءِ مَذْمُوْماً.

(ارشادِ شیخ ہے) اس حدیث کی تشریح یوں کی گئی ہے کہ اوپر والے ہاتھ کی فضیلت اس کے اس عمل کی بنا پر ہے جسے وہ انجام دیتا ہے یعنی جو اس کے ہاتھ میں ہے اس سے دست بردار ہوتا ہے اور نیچے والے ہاتھ کے متعلق جو کچھ کہا وہ اس کے نقصان کی وجہ سے جو اس نے اوپر والے ہاتھ کی چیز کا مالک بن کر کیا تو یہی حدیث جو کہ غنیٰ کے نہیں بلکہ سخا اور عطا کی فضیلت میں ہے دلیل ہو جائے گی غنیٰ پر فقر کی فضیلت کے لئے یہ فقر پر غنیٰ کے فضیلت کی دلیل نہ رہے گی کیونکہ اوپر والے ہاتھ نے دے کر فقر اختیار کیا اور نیچے والے ہاتھ نے لے کر فقر میں نقصان کیا جیسا کہ اوپر ثابت کیا گیا یہ اس لئے کہ کسی چیز کا مالک ہونا کوئی پسندیدہ چیز ہوتی تو اوپر والے ہاتھ کے خرچ کرنے میں یعنی عطا میں فضیلت نہیں بلکہ برائی ہوئی۔ ایک بزرگ کی نقل ہے انہوں نے فرمایا کہ اگر دولت مندان صاحب صدقہ ہیں تو فقرا صاحب صدق ہیں اور صدقہ صدق کے مقابل نہیں ہو سکتا۔

قولہ: فَمَنْ فَضَّلَ الْغِنیٰ وَالْاِنْفَاقِ وَالْعَطَا عَلَی الْفَقْرِ کَانَ کَمَنْ فَضَّلَ الْمَعْصِیَةَ

عَلَى الطَّاعَةِ لِفَضْلِ التَّوْبَةِ. وَاِنَّمَا فَضْلُ التَّوْبَةِ لِتَرْكِ الْمَعْصِيَةِ الْمَذْمُوْمَةِ. كَذَالِكَ فَضْلُ الْاِنْفَاقِ وَالْعَطَا اِنَّمَا هُوَ لِاِخْرَاجِ الْمَالِ الْمُلْهِيْ عَنِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ.

(ارشاد شیخ ہے) جو لوگ غنیٰ وانفاق وعطا کو فقر پر بسبب سخاوعطا کے فضیلت دیتے ہیں اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی شخص معصیت کو طاعت پر باعتبار فضل توبہ کے فضیلت دے، توبہ کو جو فضل ہے وہ ترک معصیت کے سبب سے ہے جو مذمومہ ہے نہ باعتبار نفس معصیت کے اسی طرح انفاق وعطا کو جو فضل ہے وہ مال کے نکالنے یعنی مال دور کرنے کے سبب سے ہے جو کہ بندہ کو خدا سے دور کرنے والی چیز ہے۔

دوسری دلیل یہ بیان کرتے ہیں کہ جو لوگ غنیٰ کو فقر پر اس سبب سے فضیلت دیتے ہیں کہ غنیٰ خدا کی صفت ہے اور فقر اس کے لئے جائز نہیں ہے تو دوستی میں ایسی صفت جو کہ بندہ اور خدا کے درمیان مشترک ہو اس صفت کے مقابلہ میں بہت مکمل ہے جو سرے سے خدا کے لئے جائز نہ ہو۔

جواب اس کا یہ ہے کہ یہ شرکت اسم میں ہے نہ کہ معنی میں شرکت معنی میں مماثلث چاہئے۔ جب اس کی صفات قدیم ہے اور خلق محدث تو یہ دلیل باطل ہوگی۔ اور دوسری بات یہ کہ غنیٰ خداوند تعالیٰ کا ایسا نام ہے جو اس کی شان کے لائق ہے اور مخلوق کو صحیح معنوں میں اس نام کا حق نہیں ہے اور فقیر مخلوق کا ایسا نام ہے جو مخلوق ہی کے لائق ہے اللہ کے لئے کسی طرح بھی یہ نام جائز نہیں اور اگر کسی کو مجازاً غنی کہتے ہیں ہر گز ایسا نہیں کہ وہ حقیقتاً غنی ہے۔

اور ایک دوسری دلیل جو سب سے واضح ہے وہ یہ ہے کہ ہماری تونگری (غنی) اسباب کے وجود سے ہے اور اس کا غنیٰ اسباب سے نہیں ''ذاتی'' ہے صفت کے اندر شرکت خود باطل ہوتی ہے تو اس موقع پر غنی نام رکھنا محض نام ہی نام ہے اور نام تو مخلوق میں محض ایک علامت ہے جس کے ذریعہ جس کا نام رکھا گیا وہ پہچانا جاتا ہے معنویت کا اس کے اندر پایا جانا اس کی کوئی قید نہیں۔

فصل-۳

فقر غیر تصوف ہے

قولہ: فصل – اَلْفَقْرُ غَیْرُ التَّصَوُّفِ بَلْ نَھَایَتُہٗ بِدَایَتُہٗ.

(ارشاد شیخ ہے) فقر تصوف نہیں ہے بلکہ فقر کی جہاں انتہا ہے تصوف کی وہاں سے ابتدا ہوتی ہے، (یعنی تصوف کی جو شروعات ہے وہ فقر کی انتہا ہے) صوفی ایک نام ہے...... اولیاء محققان اور کاملان ولایت کو اس نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اہل صفا کے درجوں کی تین تقسیم ہے ایک صوفی دوسرے متصوف تیسرے مستصوف۔

صوفی کی تعریف یہ ہے کہ وہ خود فانی ہوتا ہے اور حق کے ساتھ باقی طبعی تقاضوں سے چھٹکارا پاکر حق کی حقیقت سے مل جاتا ہے۔

متصوف اسے کہتے ہیں کہ جو مجاہدات کے ذریعہ اس درجہ کی طلب میں مشغول ہیں اور اسی طلب کے سلسلہ میں اپنے معاملات صوفیوں جیسے درست کئے ہوئے ہیں متصوف وہ ہیں کہ جو جاہ ولذات دنیاوی کے لئے اپنے کو ان لوگوں کے مانند بنائے ہوئے ہیں۔ اور صوفی و متصوف کے معنی اور اعمال سے خالی ہیں۔

مگر فقر کی حقیقت یہاں وہ ہے جو ابن جلا رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ تیرے پاس کچھ بھی نہ ہو اور اگر ہو تو بھی نہ ہو۔ اللہ بہتر جانتا ہے معنی یہ ہیں کہ اگر تیرے پاس کچھ نہ ہو تو اس کی

رغبت اور طلب نہ ہو اور اگر مل جائے تو وہ چیز جو تیرے پاس موجود ہے اس پر بھروسہ نہ ہو۔ ہونا اور نہ ہونا دونوں حال یکساں ہو۔ تو فقر نیستی کو کہتے ہیں جیسا کہ بزرگوں نے کہا ہے کہ ایک سر مو بھی دنیا کسی فقیر کی ملک میں ہو تو اس کا فقر کمال کو نہیں پہنچا ہے اس کے باوجود اس نے اختیار فقر اس کے فضل کی بنا پر کیا ہے اور غنی کو اسی لئے ترک کیا ہے اور امید لگا رکھی اس چیز کے لئے جو اس کے لئے تیار رکھی گئی ہے بدلہ میں خداوند تعالیٰ کی جانب سے اس بنا پر کہ پیغامبر ﷺ کا ارشاد ہے یَدْخُلُ فُقَرَاءُ اُمَّتِی الْجَنَّةَ قَبْلَ الْاَغْنِیَاءِ بِنِصْفِ یَوْمٍ وَهُوَ خَمْسُ مِائَةِ عَامٍ (داخل ہوں گے میری امت کے فقرا جنت میں مال داروں سے نصف روز قبل اور وہ نصف روز پانچ سو برس کے برابر ہوگا)۔ تو جب کہ اس کی نظر اس باقی رہنے والی نعمت پر ہے اسی لئے خود کو روک رکھا ہے دنیا کی فانی نعمتوں سے اور اسی لئے فقر و قلت احتیاج کو اس نے اپنایا ہے اور وہ ڈرتا رہتا ہے فقر کے زائل ہونے سے تاکہ اس کی فضیلت اور اس کے وعدے کئے ہوئے بدلے فوت نہ ہو جائیں۔

صوفیوں کی راہ میں ماسوا اللہ کا اتنا خیال بھی بیماری ہے کیونکہ یہ تو نظر رکھنا ہوا بدلہ پر اور یہ ترک بھی اسی لئے ہوا اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی عبادت کسی علت کی بنا پر کرے اس کا معبود ہی علت ہے اسی موقع پر لوگ کہتے ہیں جس کی جانب تیرا دل اٹکا ہوا ہے۔ وہی تیرا معبود ہے۔ لیکن صوفی کسی اشیاء کا ترک کسی موعودہ عوض کی بنا پر نہیں کرتا ہے کیونکہ وہ صاحب وقت ہوتا ہے (ابن وقت) اور وقت اس گروہ کی اصطلاح میں ایسی حالت کو کہتے ہیں جو بندہ کے سر میں ظاہر ہوتی ہے اور اس کو اپنے اس حال میں سکون ہوتا ہے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ عارف کی یہ حالت اس کے لئے سکون واجب کرتی ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ حرکت واجب کرتی ہے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ شکر واجب کرتی ہے کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ شکایت کی کیفیت ہوتی ہے کبھی یہ کیفیت صبر واجب کرتی ہے اور کسی وقت میں آہ و واویلا واجب کرتی ہے ایسا وقت بھی آتا ہے کہ گفتار کا وجوب ہوتا ہے اور ایک وقت ایسا بھی ہوتا ہے کہ خاموشی واجب ہوتی ہے کبھی صحبت خلق کا وجوب ہوتا ہے کبھی گوشۂ تنہائی واجب ہوتی ہے انہیں معنوں میں کہا گیا ہے کہ عارف خود اپنا ابن وقت ہے اور ابن لڑکے کو

کہتے ہیں یعنی جیسے لڑکا ماں باپ کا تابع ہوتا ہے ۔ عارف بھی ظاہر و باطن میں حق کا تابع ہوتا ہے اور وہ خود درمیان میں نہیں ہوتا ہے جو کچھ بھی اس سے پوچھا جائے اس سے بہتر کوئی جواب نہیں ہوتا کہ وہ کہے اللہ۔

دوسری بات یہ کہ فقیر، غنیٰ کا ترک اور فوری لذت کا اور اس کا خصوصاً فقر کو اختیار کرنا یہ اس کی جانب سے اختیار کا استعمال ہے اور اس میں اس کا ارادہ ہے اس کی اپنی جانب سے اور اختیار و ارادہ ہی صوفی کے حال میں ایک بیماری شمار کی جاتی ہے کیونکہ صوفی کا اشیاء میں قیام خالص خداوند تعالیٰ کے ارادہ سے ہوتا ہے اپنے ارادہ سے نہیں اس کی نگاہ فقر کی فضیلت اور غنیٰ کیا ہے اس کی جانب نہیں ہوتی بلکہ اس کی نگاہ اللہ کے اس فضل کی جانب ہوتی ہے کہ اس خداوند تعالیٰ نے اسے ایک حال میں رکھا اور ایک حال میں داخل کیا۔ صوفی کو اس کا پتہ کہ کسی حال میں خدا نے اسے لایا اور کسی حال سے خدا نے اسے نکالا اس کے نور باطن سے اسے معلوم ہوتا ہے تو اس بیان سے فقر و تصوف کا فرق ظاہر ہو گیا۔ یہ کہ فقر اشیاء میں خود سے قائم ہوتا ہے اور اپنے ارادہ کے ذریعہ واقف ہوتا ہے بخلاف صوفی کے اس کا قیام ارادہ خداوندی سے ہوتا ہے جیسا کہ ایک بزرگ سے پوچھا گیا آپ کیسے رہتے ہیں فرمایا جیسا وہ رکھتا ہے پھر پوچھا گیا کیسے رکھتا ہے فرمایا جیسا وہ چاہتا ہے سوال کیا گیا کیسا وہ چاہتا ہے فرمایا مجھے اس سے کیا مطلب وہ کیسا چاہتا ہے ہونا تو یہ چاہئے کہ بندہ عجز کی سطح میں امیدوار رہے بندہ کی اپنی چاہ سے کیا سروکار۔

خواجہ سلطان العارفین بایزید بسطامی قدس سرہ نے فرمایا کہ تیس سال تک میں یہ کہتا رہا کہ ایسا کر اور ویسا کر جب معرفت کے پہلے درجہ میں پہنچا تو میں نے کہا اے خدا تو میرا ہو جا اور جو چاہ وہی کر۔ اور انہیں بزرگ سے یہ بھی منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا خداوند تعالیٰ کو میں نے خواب میں دیکھا پوچھا کیا چاہتے ہو عرض کیا جو تیری خواہش ارشاد ہوا میں تیرا ہوں جیسے تو میرا ہے۔ یہ ایک بہت بڑا علم ہے یہ علم فقیر و زاہد کے پاس نہیں مل سکتا یہ اس لئے کہ زاہد ترک کو بڑی چیز جانتے ہیں اور لینے کو برا سمجھتے ہیں اور ایسا ہی فقیر بھی۔ کہتے ہیں کہ اگر صوفی کو دو بہترین حال یا دو بہترین صفت پیش آئے ان میں سے راہ محبت میں جو سب سے زیادہ بہتر ہو وہ اسی کو قبول کریں

اسی کے ساتھ رہیں چنانچہ امام شبلی رحمتہ اللہ سے منقول ہے انہوں نے فرمایا کہ اگر مجھ کو دوزخ و بہشت میں اختیار دیں تو میں دوزخ کو اختیار کروں اس لئے کہ بہشت نفس کی مراد ہے اور دوزخ دوست کی مراد ہے۔ بخلاف اس کے فقیر و زاہد دو صفتوں میں تمیز نہیں کرتے بلکہ اس کو اختیار کرتے ہیں جو ترک کی طرف زیادہ ترغیب دلانے والا ہو اور جو دنیا کے مشغلوں سے باہر لانے والا ہو اور اس میں وہ اپنے علم سے فیصلہ کرتے ہیں صوفی ان دو صفتوں میں جو احسن ہوتا ہے اسی کو اختیار کرتے ہیں اور اسے وہ اپنے اس مقام سے معلوم کرتے ہیں جو خداوند تعالیٰ کی جناب میں مقام صدق میں انہیں حاصل ہے اور اچھے سلیقہ سے ان کی بازگشت خداوند تعالیٰ کے حضور میں ہو جاتی ہے اس لذت و قرب کی بنا پر جو کہ انہیں عنایت رب ہے اور اس لطافت کی بنا پر جس کے ذریعہ ان کا آنا جانا ہے رب کریم کی جانب اس علم کی بنا پر جو کہ اپنے پروردگار سے انہیں ہے صوفی اپنے اسی اطوار سے اپنے رب سے کلام و سوال کرتے ہیں۔ لیکن شام کے لوگ فقر و تصوف میں فرق نہیں کرتے ہیں وہ اس آیت سے دلیل لیتے ہیں لِلْفُقَرَآءِ الَّذِينَ اُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ۝ لیکن اس موقع پر جن لوگوں کا تذکرہ ہے وہ سب اہل تصوف ہیں۔

قولہ: وَكَذَالِكَ الزُّهْدُ غَيْرُ الْفَقْرِ.

(ارشاد شیخ ہے) اور اسی طرح زہد فقر کے علاوہ ہے یعنی زہد دوسری چیز ہے اور فقر دوسری چیز ہے۔ پہلے یہ جاننا چاہئے کہ فقر کی حد کہاں تک ہے یوں کہئے کہ اگر ایک سرِ مُو یعنی بال کے برابر بھی دنیا کسی فقیر کی ملک میں ہو تو اس کا فقر کمال کو نہیں پہنچتا ہے اور اسباب دنیا میں سے کچھ بھی اس کے پاس نہ ہو لیکن اس کی نظر اپنی قوت و زندگی پر ہے اور اس کا گمان ہے کہ اس زندگی اور قوت کے واسطہ سے وہ کچھ حاصل کر سکتا ہے تو اس کا فقر مکمل نہیں ہے تو یہ تمام چیزیں جو کہی گئیں اگر ان میں سے ایک چیز بھی اس میں نہ پائی جائے پھر بھی اس سے یہ ندا آنی چاہئے کہ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ یعنی مجھے کوئی چارہ نہیں اور مجھ میں کوئی قوت نہیں۔ ہاں جب اس حد کو پہنچے تب اس کا فقر مکمل ہوگا۔ اور وہ جو کہتے ہیں اِذَا تَمَّ الْفَقْرُ (جب فقر مکمل ہوتا ہے) اس سے مراد یہی وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ (مجھے کوئی چارہ نہیں اور مجھے کوئی طاقت نہیں) کی کیفیت ہے اور وہ جو کہتے ہیں فَهُوَ اللّٰهُ (وہ ہے اللہ)

یعنی اِلَّا بِـاللّٰـه (مگر مدد سے اللہ کے) اس کے معنی یہ ہوئے کہ ان کی امیدیں اوران کا بھروسہ خداوندتعالیٰ پر ہوتا ہےاوران کی باتیں بھی اسی اللہ سے ہوتی ہیں فَهُوَ اللّٰه کے یہی معنی ہیں۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ مقام نبوت تمام صفات کمالیہ کی جامع ہے اسی بنا پر حضرت رسالت پناہ ﷺ نے فقر پر فخر فرمایا ہے ارشاد ہے اَلْـفَقْرُ فَخْرِیْ (فقر تو میرے لئے فخر ہے) تو اب معلوم ہوا کہ فقر زہد سے برتر ہے برخلاف اس کے کہ زہد محظوظ باقی اور نعمت کے یافت کی امید پر نصیب فانی اور حظوظ لذات کا مجرد ترک کرنا ہے۔اوراس کواہل معرفت خرید وفروخت اور دکان داری کہتے ہیں۔

قوله: وَلَـیْسَ الْـفَـقْـرُ عِنْدَهُمُ الْفَاقَةُ وَالْعَدَمُ فَحَسْبُ بَلِ الْفَقْرُ الْمَحْمُوْدُ الثِّقَةُ بِاللّٰهِ تعالیٰ وَالرِّضا بِمَا قَسَمَ.

(ارشاد شیخ ہے) صوفیا کے نزدیک فقر فقط فاقہ اور مال کے نہ ہونے کا نام نہیں ہے یہ اس سبب سے کہ یہ جانتے ہیں کہ روزی سے دوست دشمن کسی کو محروم نہیں کرتا بلکہ روئے زمین پر جتنے بھی چلنے والے ہیں ان کو بھی جیسا کہ اپنی کتاب میں فرمایا ہے وَمَامِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ رِزْقُهَا (زمین میں رینگنے والی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کی روزی میں نے اپنے ذمہ نہ لے لی ہو) اور وہ جو فرمایا بَـلِ الْـفَـقْـرُ الْمَحْمُوْدُ الثِّقَةُ بِاللّٰهِ و الرِّضیٰ بِمَا قَسَمَ. بلکہ وہ فقر جو محمود ہے اس کی تعریف یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتا اوراس کو مضبوط پکڑتا ہے۔ اوراس کی قسمت کئے ہوئے پر راضی رہتا ہے یہاں تک کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص ایسے صحرا میں پڑ جائے کہ وہاں نہ پانی ہو نہ کھانا بھوک اور پیاس کا ایسا غلبہ ہو کہ موت کے قریب پہنچ جائے اور ایسے وقت میں کھانا اور پانی مل جانے سے وہ ہلاک ہونے سے مطمئن ہو جائے اوراگر اس بھوک اور پیاس یعنی بے آب ودانہ ہونے کے وقت میں خداوندتعالیٰ کی رزاقی سے اتنا مطمئن نہ ہو جتنا کہ آب ودانہ ملنے سے مطمئن ہوا ہے تو خداوندتعالیٰ کو اس کی رزاقی کی صفت سے نہیں پہچانا ہے اوراس رازق حقیقی کے وعدہ پر کامل اعتماد نہیں۔تو فقیر کو اس کی رزاقی پر لاکھوں لاکھ بار ایسا اعتماد ہونا چاہئے جیسا کہ کھانا اور پانی کی موجودگی پر اعتماد ہوتا ہے اور جتنے اسماء اس کے ہیں اس کو بھی

اسی پر قیاس کرنا چاہئے۔

رضا محبت کے ثمرات سے ایک ثمرہ ہے اور یہ مقربان الٰہی کے مقامات میں سے ایک بہت بڑا مقام ہے کہتے ہیں کہ جو قلیل رزق پر اللہ سے خوش ہے تو اگر چہ اس کا عمل قلیل ہو اللہ تعالیٰ اس کے قلت عمل کے باوجود بھی اس سے خوش ہوتا ہے۔

حدیث شریف میں ہے کہ پیغامبران علیہم السلام میں سے ایک پیغامبر خداوند تعالیٰ کے دربار میں بھوک فقر اور جوں و چیلو سے جس میں وہ دس سال سے مبتلا تھے رویا کرتے اس دس سال کی گریہ وزاری کی مدت میں ان کو کوئی جواب نہیں ملا اس دس سال کے بعد خداوند تعالیٰ کے یہاں سے وحی آئی کہ کب تک روتے رہو گے میرے یہاں ام الکتاب میں قبل اس کے کہ آسمان وزمین کو ہم نے پیدا کیا تمہارے لئے یہی لکھا جا چکا ہے اور دنیا کے پیدا کرنے کے قبل تمہارے لئے ایسا ہی مقدر کر دیا گیا ہے کیا چاہتے ہو کہ دنیا کی آفرینش کو تمہارے لئے پلٹا دوں یا یہ چاہتے ہو کہ جو تمہارے مقدر میں لکھ چکا ہوں اسے بدل دوں مجھے اپنے عزت وجلال کی قسم اگر پھر تمہارے دل میں اس کا خیال گذرا تو تمہارا نام پیغمبروں کے دفتر سے مٹا دوں گا۔

نقل: مشائخ رحمہم اللہ میں سے ایک بزرگ کی نقل ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ میری خواہش اس حد تک پہنچی ہوئی ہے کہ اگر کل قیامت کے دن خداوند تعالیٰ مجھے ایمان کی دولت کے ساتھ دوزخ میں لے جائے اور دوسروں کو اعلیٰ علین پر پہنچا دے تو میں ان اعلیٰ علین والوں سے زیادہ خوشی محسوس کروں۔

ایک دوسرے بزرگ کی نقل ہے وہ فرماتے ہیں کہ تیس سال گذرے مگر ایسا نہیں ہوا کہ خداوند تعالیٰ نے مجھے جس حال میں رکھا اس میں میں راضی نہ رہا ہوں۔ اور وہ جو کہا اَلثِّقَةُ بِاللّٰہِ تَعَالیٰ بعنی یَکُوْنُ حَالُہٗ مَعَ اللّٰہِ کَحَالِ الطِّفْلِ فِی حِقِّ اُمِّہٖ فَاِنَّہٗ لَا یَعْرِفُ غَیْرَھَا وَلَا یَفْزَعُ اِلیٰ سِوَاھَا وَلَا یَعْتَمِدُ اِلَّا اِیَّاھَا. (اللہ کے معاملہ میں واثق ہونا یعنی یہ کہ اس کا حال اللہ کے معاملہ میں ایسا ہو کہ جیسے بچہ اپنی ماں کے معاملہ میں ہوتا ہے پس بیشک وہ ماں کے علاوہ کسی کو پہچانتا نہیں کسی کے پاس فریاد کرتا نہیں کسی پر اعتماد نہیں رکھتا سوا ماں کے) یہ ماسوا اللہ سے دل کا

منقطع ہونا ہے (مثال اس کی یہ ہے) کہ جیسے جناب موسیٰ علیہ السلام نے انتہائی سختی کی حالت میں شعیب پیغمبر علیہ السلام کی صاحبزادی کو چھوڑ دیا اور خداوند تعالیٰ کے سپرد فرمادیا اور جناب ابراہیم علیہ السلام نے جناب ہاجرہ اور اسماعیل علیہ السلام کو وادی غیر ذی ذرع (غیر آبادی وادی) میں پہنچا کر خدا کو سونپ دیا اور پورے طور پر دل اللہ سے لگالیا یہاں تک کہ ان کی مراد پوری ہوئی۔ اور وہ جو کہا وَالرِّضا بِمَا قَسَمَ (اپنی مقسوم پر راضی ہونا) بہرصورت بندہ اپنے خدا سے جو کچھ اس کے حصہ میں دیا ہے بہت زیادہ پائے جانے کہ خدا مجھ سے بہت زیادہ راضی ہے اس لئے کہ خدا تعالیٰ نے اپنی رضا کو بندہ کی رضا کے ساتھ لگایا ہے اور کہا ہے رِضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ (اللہ ان سے راضی ہوا وہ اپنے اللہ کی رضا سے راضی ہوئے)

نقل ہے کہ سلطان العارفین حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ سے لوگوں نے پوچھا خداوند تعالیٰ کے ساتھ بندہ کے راضی ہونے کی انتہا کیا ہے فرمایا کمال یعنی انتہا کو میں نہیں بیان کرسکتا لیکن اپنے حال کے سلسلے میں کچھ کہتا ہوں کہ میری رضا اس درجہ کو پہنچی ہوئی ہے کہ اگر کسی بندہ کو اعلیٰ علین پر پہنچا کر وہاں کی ہمیشگی اسے عطا فرمائیں اور مجھے دوزخ میں، اگر میں ایمان کے ساتھ ہمیشہ دوزخ میں رہوں تو میں اس بندہ سے کہیں زیادہ خوش رہوں۔

فصل-۴

صوفی اور ملامتی کی تعریف میں

قوله: وَالصُّو فِی غَیْرُ الْمَلَامَتِیِ هُوَ الَّذِیْ لَایُظْهِرُ خَیْرًا وَلَا یُضْمِرُ شَرًّا.

(ارشاد شیخ ہے) صوفی ملامتی کے علاوہ ہے تو یہ سچ ہے اور درست کہ ملامتی وہ ہے جو اچھائی کو ظاہر نہیں کرتا اور برائی کو نہیں چھپاتا یعنی صوفی اور ہیں، ملامتی اور ہیں یہ اس لئے کہ ملامتی اسے کہتے ہیں جو اپنے اچھے اعمال واحوال کو خلق پر ظاہر نہیں کرتے اور برے اعمال واحوال کو خلق سے نہیں چھپاتے اور یہ اس سبب سے ہے کہ ملامتیوں نے اخلاص کا لقمہ پایا ہے اور صدق نے ان کا دامن پکڑا ہے، وہ اس کو محبوب نہیں رکھتے کہ ان کے حال سے کوئی واقف ہو۔ اور اپنے اچھے اعمال واحوال کے چھپانے میں وہ لذت ملتی ہے کہ اگر ان کے احوال و اعمال خلق پر ظاہر ہو جائیں تو ان کو ایسی وحشت اور اتنا زیادہ رنج ہو جتنا کہ کسی گنہگار کو اس کی بداعمالیوں کے ظاہر ہو جانے سے ہوتی ہے جیسے کہ تمام عالم مقبول خلائق ہونے سے خوش وخرم ہوتے ہیں یہ لوگ ویسے ہی خلق کے نظرانداز کرنے سے شادوفرحاں ہوتے ہیں۔

پھر ملامتیان اگر اخلاص پر ہاتھ مارے ہوئے ہیں اور صدق کی بساط بچھائے ہوئے ہیں پھر بھی ان کی نظر خلق پر ہے اور یہ صوفیوں کی راہ میں شرک ہے۔ اس طایفہ کا ایک گروہ ہے جو روندگان راہ دل ہیں ایسا فعل کر گذرتے ہیں کہ خلق ان کو مردود سمجھتی ہے گرچہ وہ فعل صغیرہ وکبیرہ نہیں ہوتا مگر وہ جو خلاف شریعت کوئی چیز اختیار کرے اور یہ دعویٰ کرے کہ یہ ملامت کی راہ ہے یہ

ایک کھلی آفت اور گمراہی ہے جیسا کہ اس زمانہ میں جہلا کرتے ہیں۔ کیونکہ یہاں یہ چاہتے کہ کوئی مقبول خلایق ہو تب خود کو نگاہوں سے گرانے کا قصد کرے جو مقبول خلائق نہیں ہے اسے اپنے کو لوگوں کی نگاہوں سے گرانے کا قصد یا سامان کرنا یہ مقبول بننے کا ایک بہانہ ہے خصوصاً اس مقصد سے خلاف شرع چیز کا اختیار کرنا خود ایک ہوس ہے اور یہ کھلی ضلالت ہے۔

قوله: وَالصُّوفِی هُوَ الَّذِیْ لَا یَشْتَغِلُ بِالْخَلْقِ.

(ارشاد شیخ ہے) صوفی وہ ہے جو خلق کے ساتھ مشغول نہ ہو۔ یعنی صوفی اسے کہتے ہیں کہ اس کا مشغلہ خلق کے ساتھ نہ رہے یہ اس لئے کہ پہلے خلق پر اس کی نگاہ ہوگی تب خلق کے ساتھ مشغول ہوگا اور صوفی خلق سے پرے ہو جاتا ہے کیونکہ کُلُّ شَیْءٍ هَالِکٌ اِلَّا وَجْهَهٗ کا راز اس پر کھل گیا ہے اور سوائے خداوند تعالیٰ کے کوئی چیز اس کی نظر میں نہیں سماتی۔ اسی کو کہا ہے۔ بیت

تا کہ با خویشی عدو بینی ہمہ — چوں شوی فانی احد بینی ہمہ

(جب تک تو اپنے میں ہے تیری نگاہ میں دوئی ہے جب تو فنا ہو جائے گا تجھے ایک ہی نظر آئے گا)

اس کو صوفیہ اَلْفَنَاءُ فِی التَّوْحِیْد کہتے ہیں ایسی توحید جو حلول و اتحاد سے پاک ہو جیسا کہ کہا ہے۔ بیت۔

خیال کثر مبر اینجا وشناس — ہر آنکو در خدا گم شد خدا نیست

(کثرت کی جانب خیال مت لے جا اس موقع پر پہچان لے ہر وہ چیز جو خدا میں گم ہوئی وہ خدا نہیں ہے خواجہ عطاء رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ مثنوی۔

تو درو گم شو کہ توحید ایں بود — گم شدن گم کن کہ تفرید این بود

(تو اس ذات احد میں گم ہو جا یہی توحید ہے پھر گم ہو جانے کا شعور بھی گم ہو جائے تفرید ہے)

یہی وہ توحید ہے کہ جو روندگان و سالکان راہ طریقت کا مطلوب ہے اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنَا وَلِجَمِیْعِ الطَّالِبِیْنَ.

قوله: وَلَا یَلْتَفِتُ اِلٰی قَبُوْلِهِمْ وَرَدِّهِمْ.

(ارشاد شیخ ہے) وہ لوگوں کے قبول و رد کی طرف نگاہ نہیں اٹھاتے یعنی خلق ان کو قبول کرے یا رد کرے وہ اس کی طرف التفات نہیں کرتے۔ یہ اس لئے کہ حقیقت ان پر آشکارا ہے کہ حق جس کی تعریف کرے وہ تعریف کے لائق ہے نہ کہ خلق جس کی تعریف کرے وہ تعریف کے لائق ہے۔ حق جس کی مذمت فرمائے وہ مذمت کے لائق ہے خلق جس کی مذمت کرے وہ مذموم نہیں۔ جب ان کی نگاہ خلق پر پڑتی ہی نہیں تو ان کے قبول کرنے اور رد کرنے پر کب ہوگی؟ وہ خود اس سے آگے ہے اس سبب سے کہ حق تعالیٰ کے سوا دوسرے کو دیکھنا حق سے حجاب ہے توحید جو موحد کی صفت ہے وہ یہ ہے کہ توحید کی صفت کے ذریعہ موحد ہو لیکن اپنی صفت کو دیکھنے والا حق کو دیکھنے والا نہیں ہوتا جب تک اپنی صفت کا دیکھنے والا ہے حق تعالیٰ سے محجوب ہے جب یہ حال ہے تو خلق کو دیکھنے والا موحد کیونکر ہو سکتا ہے یہی وہ بات ہے جو کہی گئی ہے اَلتَّوْحِیْدُ اِسْقَاطُ الْاِضَافَاتِ۔

قولہ: وَاجْمَعُوْا عَلٰی اَنَّ تَرْکَ الْاِشْتِغَالِ بِالْمَکَاسِبِ وَالصَّنَاعَاتِ وَالتَّفَرُّغ لِلطَّاعَاتِ اَجَلُّ وَاَفْضَلُ لِمَنْ تَرَکَ الْاِهْتِمَامَ بِطَلَبِ الرِّزْقِ.

(ارشاد شیخ ہے) صوفیہ کا اس پر اجماع ہے یہ درست ہے اور سچ ہے کہ ترک کی یہ نوعیت کہ مشغول ہونا کسب میں اور صنعتوں میں اور اپنے کو فارغ کرنا طاعت کے لئے یہ بزرگ تر اور افضل تر ہے اس شخص کے لئے کہ جو طلب رزق کے غم و اندوہ کو ترک کرے یعنی اگر کسی کو سیر باطن حاصل ہے اور علوم احوال و مکاشفات میں اس کا عمل دل تک پہنچا ہوا ہے یا کوئی ایسا عالم ہو جو علم ظاہر کی ترتیب یعنی تالیف و تصنیف میں مشغول ہے اس لئے کہ لوگوں کو ان کے دین میں نفع پہنچائے اس علم کی یہ مشغولی عبادتوں کے ساتھ اس کے کسب و صناعت میں مشغول ہونے سے بہتر اور برتر ہے بشرطیکہ وہ روزی کے لئے اندوہ گیں نہ ہو اور یہ ایک بہت بڑا کام ہے ہر آدمی کے حصہ میں نہیں۔ حدیث شریف میں ہے کہ جو شخص اپنے تمام اندوہوں کو ایک اندوہ بنا لیتا ہے اور وہ اندوہ اس جہاں کا اندوہ ہے تو خداوند تعالیٰ اس کے تمام اندوہوں کو کفایت کرتا ہے تا کہ اس کے اسرار کسی چیز کے ساتھ مشغول نہ ہوں اور اس کی ہمت منتشر اور پراگندہ نہ ہو تو جب کسی کے شغل

کی اللہ تعالیٰ کفایت کرے نہ دنیا کو اس کے ساتھ صحبت باقی رہتی ہے اور نہ شیطان کی اس پر حکمرانی ہوتی ہے اور نہ نفس کو اس کے ساتھ اختلاف رہتا ہے۔

قولہ: وَاتَّکَلَ عَلیٰ مَضْمُونِ اللّٰہِ تَعَالیٰ اَنْ یَّسْتَوِیَ عِنْدَہُ الْخَلْوَۃُ وَالْجَلْوَۃُ وَالْمُخَالِطَۃُ وَالْعُزْلَۃُ وَیَصِیْرَ مُشَاھِداً لِلْقُدْرَۃِ فِیْ کُلِّ حَالٍ.

(ارشادِ شیخ ہے) دوسری شرط یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ کی ضمانت پر اس کو اعتماد ہو اِتَّکَلَ بمعنی اِعْتَمَدَ اس حد تک کہ اس کے نزدیک خلوت وجلوت دونوں برابر ہو یعنی تنہا ہونا یا کسی کے ساتھ ہونا اور خلق سے آمیزش اور ان سے علیحدگی، اور قدرت کا ہر حال میں مشاہدہ کرنے والا ہو یعنی اس کے نزدیک یہ تمام احوال مختلفہ جو بیان کئے گئے ایک ہوں اور وہ اس کو اچھی طرح جان لے کہ اگر تنہا رہوں یا کسی دوسروں کے ساتھ رہوں یا خلق کے ساتھ ملنا جلنا کروں یا نہ کروں خداوند تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ وہ روزی پہنچا دے گا اور وہ جو کہا وَاتَّکَلَ عَلیٰ مَضْمُوْنَ اللّٰہِ یعنی مَاضمنہ اللہ تعالیٰ بالرزق بقولہ وَمَامِنْ دَابَّۃٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُھَا (اس کا مطلب یہ ہے کہ جس کی ضمانت لی ہو اللہ تعالیٰ نے رزق کی اپنے قول کے واسطہ سے جس میں اس نے کہا ہے کہ زمین میں کوئی رینگنے والی چیز نہیں ہے جس کی روزی میں نے اپنے ذمہ نہ لے لی ہو) اور وہ جو کہا اَنْ یَّسْتَوِی یہ تفسیر ہے ان کے اپنے قول لِمَنْ تَرَکَ الْاِھْتِمَامَ (جس نے اہتمام ترک کیا) کی اور وہ جو کہا فِی کُلِّ حَالٍ یعنی بِوَاسطۃٍ اَوْ بِغَیْرِ وَاسِطَۃٍ (مراد یہ ہے کہ کسی واسطہ کے ذریعہ یا بغیر کسی واسطہ کے) یعنی یقین کرے خداوند تعالیٰ بلا واسطہ روزی دینے پر قادر ہے جیسے بواسطہ روزی دینے پر قادر ہے جب دیکھ چکا کہ سبب کا موجود ہونا خدا کی طرف سے ہے مسبب کا وجود بھی اسی کی طرف سے ہے جس طرح مسبب عاجز ومقہور ہے یہی حال سبب کا ہے اور سبب کے وجود میں سبب کی کوئی جداگانہ تاثیر نہیں بس اتنا ہے کہ مسبب کے وجود پر سبب کا وجود مقدم ہے اسے کسی چیز پر بھروسہ نہیں ہوتا نہ سعی وکوشش پر نہ مال واسباب پر اور نہ طاعت وخیرات پر اسے بھروسہ خدا پر اور امید خدا پر ہے اور اسے خدا کے ذکر کے ساتھ آرام ہے ترک وتوکل اس کا مقام بن گیا ہے۔

قولہ: وَقَالَ بَعْضٌ لَاتَكُونُوا بالرزق مُهتمِّينَ فتكونوا لِلرَّازِقِ مُتَّهِمِينَ وبِضَمَانِهٖ غَيْرَ وَاثِقِينَ.

(ارشادِ شیخ ہے) اور بعض کہتے ہیں کہ رزق کے سبب سے اندوہ گیں نہ ہوں اگر رزق کے لئے اندوہ گیں ہو گئے تو تم نے رازق پر اتہام رکھا ہے اور رازق کو متہم کرنا جائز نہیں اور اس کی ضمانت پر تم قائم رہنے والے نہ ہوئے اور جسے خداوند تعالیٰ کے ضامن ہونے پر استحکام نہ ہوا سے خود اس کی معرفت حاصل نہیں۔ نقل ایک بزرگ سے منقول ہے کہ انہوں نے کہا کہ اگر زمین و آسمان لوہا اور پتھر ہو جائیں اور اس حال میں مجھ کو رزق کا غم ہو تو میں یہ سمجھوں کہ ابھی تک میں مشرک ہوں۔ ایک دوسرے بزرگ سے منقول ہے انہوں نے کہا کہ اس شخص کا ایمان کیا ہے؟ جسے اتنا بھی خداوند تعالیٰ کی رزاقی پر استحکام نہ ہو جتنا کہ روٹی اور پانی پر۔

قولہ: وَقِيلَ لِبَعْضِهِمْ مِنْ أَيْنَ تَاكُلُ فَقَالَ لَوْ كَانَ مِنْ أَيْنَ لَفَنِيَ.

(ارشادِ شیخ ہے) ان میں سے ایک شخص سے پوچھا گیا یعنی اس گروہ کے ایک فقیر سے پوچھا گیا کہ تم کہاں سے کھاتے ہو؟ تو انہوں نے کہا میرا کھانا اگر کہیں سے ہوتا تو یقینی ختم ہو جاتا یعنی تمام ہو جاتا اس سے کہنے والے کا اس معنی کی طرف اشارہ ہے کہ میرا کھانا وہاں سے نہیں ہے جہاں سے تم کھاتے ہو اگر میرا کھانا وہاں سے ہوتا جہاں سے تم کھاتے ہو تو بے شک ختم ہو جاتا اور تمام ہو جاتا تو گویا کہتے ہیں کہ اس خزانہ سے میں کھاتا ہوں کہ جس خزانہ کی انتہا نہیں ہے اور تمام و ختم ہونا نہیں ہے یعنی جو چیز گنتی میں آئے اور اس میں کمی واقع ہو وہ فانی ہو گی تو جو چیز مخلوق کے ہاتھ میں ہے وہ شمار قبول کرتی ہے اور کمی بھی قبول کرتی ہے اسی بنا پر فانی ہے۔ لیکن خداوند تعالیٰ کا خزانہ رحمت جس سے بندوں کو رزق دیتا ہے وہ ہے کہ نہ شمار میں آسکتا ہے اور نہ کمی اس میں واقع ہو سکتی ہے تو فنا کی اس تک گذر نہیں اسی کو کہنے والے نے کہا ہے لَوْ كَانَ مِنْ أَيْنَ لَفَنِيَ (اگر ایسا ہوتا کہ وہ کہاں سے آتا ہے تو فنا ہو جاتا)۔

قولہ: وَقِيلَ لِلْآخَرِ مِنْ أَيْنَ تَاكُلُ فَقَالَ سَلْ مَنْ يُطْعِمُنِيْ مِنْ أَيْنَ يُطْعِمُنِيْ.

(ارشادِ شیخ ہے) اور ایک دوسرے بزرگ سے پوچھا گیا کہ آپ کہاں سے کھاتے ہیں

تو انہوں نے کہا یہ تو اس سے پوچھنا چاہئے جو مجھے کھلاتا ہے کہ وہ کہاں سے کھلاتا ہے۔ یعنی میں روزی کھانے والا ہوں، مجھے روزی کھانے سے کام ہے، تو یہ سوال مجھ پر عائد نہیں ہوتا، اگر یہ سوال عائد ہوتا ہے تو روزی دہندہ پر عائد ہوتا ہے۔ تو اسی لئے مجھ سے نہ پوچھو بلکہ اسی سے پوچھو۔

بزرگان دین کو خداوند تعالیٰ کی رزاقی پر اس سے کہیں زیادہ اعتماد وسکون اور اطمینان ہوتا ہے جتنا کہ دوسرے کو اسباب پر۔

حکایت: حضرت خواجہ رویم رحمتہ اللہ علیہ سے روایت کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا بیس سال ہوئے کہ میرے دل میں کھانے کی چیز کا خیال نہیں گذرا ہے۔ ہاں مگر اس وقت جبکہ کھانا سامنے آجاتا ہے۔

قولہ: وَاجۡمَعُوا عَلٰى اَنَّ اَفۡعَالَ الۡعِبَادِ لَيۡسَتۡ بِسَبَبِ السَّعَادَةِ وَالشَّقَاوَةِ.

(ارشاد شیخ ہے) صوفیہ کا اس پر اجماع ہے کہ یہ درست ہے اور سچ ہے کہ بندوں کے افعال بندوں کی سعادت و شقاوت کا سبب نہیں، یعنی بندوں کے افعال کی بنا پر بندوں کی سعادت اور ان کا ایمان نہیں ہے اور افعال ہی کی بنا پر ان کی شقاوت بھی نہیں۔ یعنی کافر ہونا بھی محض عمل کی بنا پر نہیں ہوتا۔ یہ اس لئے کہ خداوند تعالیٰ کی محبت اور عداوت کسی علت کی بنا پر نہیں ہے۔ کیونکہ محبت و عداوت خداوند تعالیٰ کی صفت ازلی ہے۔ اور بندہ کی موافقت اور اس کا خلاف کرنا وقتی ہے۔ تو محبت اور عداوت سابق ہوئی اور موافقت وخلاف لاحق یعنی بعد کی۔ لاحق سابق کی علت نہیں ہوسکتی۔ اور یہ بھی کہتے ہیں کہ جیسے علت نہیں ہے سبب بھی نہیں ہے۔ اس دلیل سے جو بیان کی گئی۔ اس لئے کہ سبب کے لئے ضروری ہے کہ پہلے ہو مسبب۔ اور سعادت یا شقاوت کا حکم ازلی ہے۔ اور بندہ کا فعل وقتی ہے تو وقتی ازلی کا سبب کیسے ہوگا۔

اور دوسری بات کہ اگر بندہ کے فعل کو سبب مانا جائے تو پھر اس کے لئے ایک دوسرا سبب تلاش کرنا ہوگا اور پھر اس سبب کے لئے بھی سبب کی دریافت ہوگی اور اس طرح ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ چل پڑے گا۔ جو باطل ہے۔ اس کے باوجود عوامی گفتگو میں سبب کہہ سکتے ہیں۔ لیکن یہ کہنا مجازاً اور اصطلاحاً ہوگا۔

قولہ: بِقَوْلِهٖ علیہ السلام اَلسَّعِیْدُ مَنْ سَعِدَ فِیْ بَطْنِ اُمِّهٖ وَ الشَّقِیُّ مَنْ شَقِیَ فِیْ بَطْنِ اُمِّهٖ.

(ارشاد شیخ ہے) یہ گفتگو اس دلیل کی بنا پر ہے کہ پیغامبر ﷺ نے فرمایا جو نیک ہے وہ شکم مادر ہی میں نیک بنایا جا چکا ہے اور جو بد ہے وہ بھی شکم مادر ہی میں لکھا جا چکا ہے۔

اور اس شکم مادر کی تشریح جناب آدم علیہ السلام ہی کا پشت کی گئی ہے۔ کیونکہ وہ اصل تھے اور اصل ہی کو ام کہتے ہیں۔ بعضوں نے ام کی تاویل لوح محفوظ کی ہے۔ کیونکہ لوحِ محفوظ ہی تمام مکتوب کی اصل ہے۔

قولہ: وَاَنَّ الثَّوَابَ فَضْلُهٗ وَالْعِقَابَ عَدْلُهٗ.

(ارشاد شیخ ہے) یہ سچ ہے اور درست ہے کہ طاعت پر ثواب اللہ رب العزت کے فضل سے ہے۔ اور معصیت پر عذاب اس کا عدل ہے۔ یہ از روئے استحقاق بندہ نہیں ہے۔ بلکہ فضل و عدل کی جہت سے ہے۔ ثواب دینا یہ اس کے فضل سے ہے اور عذاب کرنا اس کے عدل سے ہے۔ یعنی کسی کو طاعت پر ثواب دینا اور معصیت پر عذاب کرنا خداوند تعالیٰ پر واجب نہیں چونکہ ثواب کا اس نے وعدہ فرمایا ہے اس لئے ثواب واجب آیا ہے، اور چونکہ عذاب کے لئے وعید اس نے فرمائی ہے اس لئے عذاب واجب آیا ہے۔ اور یہ جو اس نے واجب کیا، اپنی مشیت کے مطابق واجب کیا، نہ کہ بندوں کے استحقاق سے۔ اور ثواب کا وعدہ کرنا فضل ہے اور عذاب کی وعید عدل ہے فضل و عدل دونوں واجب نہیں ہیں۔ یہ اس لئے کہ اگر عادل عدل نہ کرے تو فضل کرے، اور یہ اسی کا حق ہے۔ اور اگر فضل کرنے والا فضل نہ کرے، عدل کرے تو اس کا حق اسی کو پہنچتا ہے۔

اگر بندوں پر اس کی نیکیوں کی وجہ سے بھلائی کرنا واجب ہوتا تو وہ رب العزت حمد و شکر کا مستحق نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ اگر کسی پر کسی کا کوئی حق واجب ہو، اور وہ اس حق کو جو اس پر واجب تھا ادا کرے تو ایسی صورت میں شکر واجب نہیں آتا اور جب کسی پر کسی کا کوئی حق واجب نہ ہو، اور وہ جس پر حق واجب نہیں، بھلائی کرے تو اس شخص پر اس کا شکر ادا کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ تو جب جملہ انبیاء و اولیاء ایمان کے عنایت کرنے پر خدائے عز و جل کا شکر ادا کرنے میں متفق ہیں۔ تو

درست ہوا کہ ایمان عنایت کرنا اس پر واجب نہ تھا لیکن یہ اس کا فضل ہوا یہاں تک کہ خلق پر شکر ادا کرنا واجب آیا۔ اور اس گروہ صوفیہ کا اس پر اجماع ہے کہ خداوند تعالیٰ جتنی بھلائی اپنے بندوں کے ساتھ کرتا ہے یہ محض اس کا فضل ہی ہے، کیونکہ کہا ہے وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ مَازَكٰى مِنْكُمْ مِنْ اَحَدٍ اَبَدًا (اگر اللہ تعالیٰ کا فضل تم لوگوں پر نہ ہوتا اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تا ابد تم میں کا کوئی پاکی نہ اختیار کرتا۔) اور مُتَفَضِّل فضل کرنے والا وہ ہے کہ اگر فضل کرے تو روا ہو، اور اس فضل کرنے پر اس کا شکر کرنا چاہئے۔ اور اگر نہ فضل کرے تو یہ بھی جائز ہے، اور اس نہ کرنے پر اس سے کوئی جھگڑا نہیں۔ اور فضل اپنی ملکیت کو دینا ہے نہ کہ دوسرے کی ملکیت کو پہنچانا۔ اور غیر کی ملک پہنچا دینا ایک واجب حق ادا کرنا ہے نہ کہ فضل کرنا۔ تو خداوند تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر میرا فضل تم پر نہ ہوتا تو کوئی تم میں سے رستگاری نہ پاتا۔ تو ثابت ہوا کہ بندہ کے ساتھ بہتری کرنا واجب اس پر نہیں ہے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ ثواب اس کے فضل کی بنا پر ہے اور عذاب اس کا عدل ہے۔ یہ بندہ کے کسی حق کی بنا پر نہیں ہے۔

قولہ: وَالرِّضٰى وَالسَّخَطُ نَعْتَانِ قَدِيْمَانِ لَايَتَغَيَّرَانِ بِاَفْعَالِ الْعِبَادِ.

(ارشاد شیخ ہے) رضا اور سخط۔ دو صفتیں ہیں اور دونوں قدیم ہیں۔ رضا، اور نفع کا ارادہ ہے اور سخط اور میری رحمت ارادہ ضرور ہے۔ دونوں صفتیں بندوں کے افعال سے تغیر پذیر نہیں ہو سکتی ہیں۔ کیونکہ تغیر قبول کرنا خداوند عزوجل کی صفات کے لئے جائز نہیں۔ یعنی کسی کے لئے اگر خدا کی رضا کی صفت ہے تو اس شخص کی معصیت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی رضا میں کوئی تغیر نہیں ہوگا۔ جیسا کہ دربار فرعون کے ساحروں کا حال ہوا۔ شعر

فِىْ وَجْهِهٖ شَافِعٌ يَمْحُوْ اِسَائَتَهٗ مِنَ الْقُلُوْبِ وَيَاتِىْ بِالْمَعَاذِيْرِ

(دوست کے چہرے میں ایک شفیع ہے جو دلوں کی برائیوں کو محو کرتا ہے اور عذر پیدا کرتا ہے)

اور ایک دوسرے نے کہا ہے۔ شعر

وَاِذَالْحَبِيْبُ اَتٰى بِذَنْبٍ وَاحِدٍ جَائَتْ مَحَاسِنُهٗ بِاَلْفِ شَفِيْعٍ

(حبیب جب کوئی ایک گناہ سامنے لاتا ہے۔تو اس کے حسن ہزاروں شفیع لاتے ہیں)

اور جس کے لئے سخط ہے اگر طاعت کرے جب بھی اس سخط میں تغیر نہیں ہوتا جیسے ابلیس کا معاملہ۔شعر۔

مَنْ لَمْ یَکُنْ لِلْوَصَالِ اَهْلاً فَکُلُّ اِحْسَانِهٖ ذُنُوْبٌ

(جس میں وصال کی اہلیت نہیں ہے،اس کی تمام خوبیاں گناہ ہیں)

(یہ اس لئے کہ تغیر و تبدل مخلوقات کی صفات میں جائز ہے،حق سبحانہ تعالیٰ کی صفات میں جائز نہیں۔جس کے لئے محبّ ہے اس کا دشمن نہیں ہوگا اور جس کا دشمن ہے اس کا دوست نہیں ہوگا۔کیونکہ خداوند تعالیٰ کی محبت اور عداوت ازلی ہے۔لیکن ایسا شخص کہ خداوند تعالیٰ اس کا محبّ ہے جب اعداء کی صفت میں ہوتا ہے جیسے ربار فرعون کے ساحر تو حق کی محبت غالب آتی ہے اور احبا کی صف میں اسے کھینچ لاتی ہے۔اور حق تعالیٰ جس کے ساتھ عدو ہے چاہے جتنا ہی وہ احبا کی صفت میں ہو،جیسے ابلیس (اللہ نے اس پر لعنت کی) حق تعالیٰ کی عداوت احبا کی صفت سے اعدا کی صفت میں لے آتی ہے کیونکہ اَلْمَعْلُوْمُ لَایَتَغَیَّرُ. (جس کو جو ہونا ہے اللہ کو اس کا علم ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی) ازل کی مقدرات کا یہی مقام حیرت ہے جس سے تمام دلوں کے سکھ چین رخصت ہو چکے ہیں۔بیت۔

ملک آنِ تست و فرمان مملوک راچہ درمان گر بیگنہ بگیری در بے خطا برانی

(ملک تیرا ہے اور حکم تیرا ہے،غلام کے لئے کیا چارہ،بے گناہ چاہے گرفت کرے اور بے خطا کے نکال دے)۔

قولہ: فَمَنْ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ اِسْتَعْمَلَهٗ بِعَمَلِ اَهْلِ الْجَنَّةِ وَمَنْ سَخِطَ عَلَیْهِ اِسْتَعْمَلَهٗ بِعَمَلِ اَهْلِ النَّارِ.

(ارشاد شیخ ہے) تو جس کسی سے اللہ تعالیٰ خوش ہے اسے اہل بہشت کے جو کام ہیں ان کاموں میں لگا دیتا ہے اور جس کو رد کرنے والا ہے اسے اہل دوزخ کے کاموں میں مشغول کر دیتا ہے۔یہی اس حدیث شریف کا مضمون ہے۔جیسا کہ فرمایا حضورؐ نے اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ الْجَنَّةَ

وَخَلَقَ اَهْلَهَا وَخَلَقَ النَّارَ وَخَلَقَ لَهَا اَهْلَهَا. لَا یَزِیْدُ فِیهِمْ وَلَا یَنْقُصُ عَنْهُمْ. (بے شک اللہ تعالیٰ نے جنت پیدا کی ہے اور اس کے لئے اس کے اہل پیدا کئے، آگ پیدا کی اور اس کے لئے اس کے اہل پیدا کئے، اس میں نہ تو زیادتی ہوگی اور نہ کمی) یہی وہ بات ہے جو کہتے ہیں کہ بندوں کے اعمال وافعال علامت ہیں اس بات کے جو اس کے لئے ازل میں مقدر ہو چکا ہے۔ جو بہشت کے لئے پیدا کیا گیا ہے طاعت اور اسباب طاعت اس کو میسر ہے، خواہ چاہے یا نہ چاہے۔ اور جو دوزخ کے لئے پیدا کیا گیا ہے معصیت اور معصیت کے اسباب اس کے لئے میسر ہیں خواہ وہ چاہے یا نہ چاہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں عارفوں کے دل ٹکڑے ٹکڑے ہیں کہ وہ جو چاہتا کرتا ہے اسے کسی کا خوف نہیں۔ بیت۔

بکسے نمی توانم کہ شکایتت رسانم ہمہ جانب تو خواہند و تو آن کنی خواہی

(کسی کو ایسا نہیں پاتا ہوں کہ جس سے تیرا شکوہ کروں، سب تیرے طرفدار ہیں اور تیری شان یہ ہے کہ تو جو چاہتا ہے کرتا ہے)

امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ نے احیاء العلوم میں بیان کیا ہے کاش کہ یہ معلوم ہوتا۔ اس کی وہ کون ادا تھی جس نے اس ایک شخص کے لئے اکرام واجب کر دیا اور اسے اس سے مخصوص کر لیا کہ اسے طاعت اور اسباب طاعت میسر کر دیا۔ اور وہ کون سی ادا تھی جس نے اس پر واجب کر دیا کہ اس دوسرے کو ذلیل کر دیا اور دور ہٹا دیا اس طرح کہ معصیت پر بلانے والے اس کے ساتھ مقرر کر دیئے۔ یہی مقام ہے۔

از چنیں کارے کہ در پیش آمدہ است علم مفلس عقل درویش آمدہ است

(اسی طرح کے کام جو سامنے آتے ہیں اس کے سمجھنے سے علم مفلس ہے عقل بے مایہ ہے)

سبحان اللہ کیا پاک ہے تیری ذات کہ پہنچایا تو نے محمد ﷺ کو اعلیٰ علیین میں آپ کے وجود میں آنے سے قبل بغیر اس کے کہ آپ سے کوئی وسیلہ ظاہر ہو۔ اور ابو جہل کو اسفل السافلین میں قبل اس کے پیدا ہونے کے ڈال دیا بغیر کسی گناہ کے جو اس سے سرزد ہوا ہو۔

یہی وہ مقام ہے جہاں کہ ایک بزرگ نے کہا ہے فَتَلَتْنِیْ مَسْئَلَةُ الْقَضَاءِ وَالْقَدْرِ.

مسئلہ قضاوقدر نے تو میری جان ہی لے لی ہے۔رباعی۔

آرند یکے و دیگرے برپایند   بر ہیچ کس ایں راز ہمی نکشایند

ماراز قضا جز ایں ہمیں نمایند   پیمانہ توئی باد بتو پیمایند

(ایک کو پکڑ لیتے ہیں دوسرے کو چھوڑ دیتے ہیں، کسی پر اس کا راز بھی ظاہر نہیں کرتے۔ مجھ کو قضا کے متعلق اس سے زیادہ نہیں بتاتے ہیں کہ تم خود پیمانہ ہو تم سے تم کو ناپتے ہیں۔عارفوں کا قول ہے۔دَخَلْنَا الدُّنْیَا مُضْطَرِیْنَ ٥ وَبَقِیْنَافِیْھَا مُتَحَیِّرِیْنَ ٥ وَخَرَجْنَا مِنْھَا کَارِھِیْنَ. (مجھے دنیا میں حالت اضطرار میں داخل کیا، جب تک رکھا عالم حیرت میں رکھا اور مجھے جب نکالا وہ بھی میری پسند کو بغیر پوچھے ہوئے)۔

خلاصہ یہ کہ جسے نیکی پر مامور فرمایا یہ اس کی اس رضا کا اثر ہے۔اور جس کو برے کاموں یعنی اہل دوزخ کے کاموں پر عمل پیرا کیا۔یہ اس سخط کا اثر ہے۔اس لئے کہ خداوند تعالیٰ کی یہ دونوں صفتیں قدیم ہیں۔وہ جو کہا ہے کُلٌّ مُیَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَهٗ (آدمی جس چیز کے لئے پیدا کیا گیا ہے وہی اس کے لئے آسان ہوتا ہے) اور وہ جو کہا اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ الْجَنَّةَ وَخَلَقَ لَهَا اَھْلَهَا وَخَلَقَ النَّارَ وَخَلَقَ لَهَا اَھْلَهَا لَایَزِیْدُ فِیْهِمْ وَلَا یَنْقُصُ عَنْهُمْ یہی پریشانی کی جگہ ہے۔

قولہ: وَیَرَوْنَ الرِّضیٰ بِالْقَضَاءِ وَالصَّبْرَ عَلَی الْبَلَاءِ. وَالشُّکْرَ عَلَی النَّعْمَاءِ وَاجِباً عَلیٰ کُلِّ وَاحِدٍ.

(ارشاد شیخ ہے) یہ لوگ دیکھتے ہیں یعنی یہ لوگ اعتقاد رکھتے ہیں کہ قضا پر راضی رہنا اس کی بلاؤں پر صبر کرنا، خداوند تعالیٰ کی نعمتوں پر شکر کرنا، ہر ایک شخص کے لئے واجب ہے صبر کا ادنیٰ درجہ مخلوق سے شکایت کرنے کو ترک کرنا ہے اور مخلوق سے شکایت کرنا معصیت ہے۔

استاد ابو علی دقاق رحمتہ اللہ علیہ سے منقول ہے انہوں نے فرمایا، صبر کی حد یہ ہے کہ تجھ کو تقدیر پر اعتراض نہ ہو۔اور یہ بھی فرمایا صبر یہ ہے کہ جس بلا میں مبتلا ہو نالہ نہ کرے رضا کی تعریف کہ جس بلا میں بھی مبتلا ہوا اس سے کراہت نہ کرے۔

بلا عوام کو گناہ سے پاک کرتی ہے اور خواص کے باطن کو ماسوا اللہ سے پاک کرتی ہے۔

بندہ کے لئے معصیت کا جھیلنا بندہ اور خدا کی دوستی کی دلیل ہے۔ مصرع۔

نازش بکشم جو صبری توانم۔ (میں اس کی ناز برداری کرتا ہوں چونکہ اس کے بغیر مجھے صبر نہیں) کہتے ہیں کہ صبر تمام کاموں میں لائق ستائش ہے۔ مگر عشق میں، کیونکہ عشق صبر کو قبول نہیں کرتا اور معشوق صابروں کو مقبول نہیں بناتا۔ وَعَجِلْتُ اِلَیْکَ رَبِّ لِتَرْضیٰ. (میں نے تیری لقا میں عجلت کی اے میرے اللہ تا کہ تو راضی رہے) جناب موسیٰ علیہ السلام کے اس قول کا اشارہ اسی طرف ہے۔

نقل ہے کہ قلم نے سب پہلی چیز جو لوحِ محفوظ میں لکھی وہ یہی تھی مَنْ لَمْ یَرْضَ بِقَضَائِیْ وَلَمْ یَصْبِرْ عَلیٰ بَلَائِیْ وَلَمْ یَشْکُرْ عَلیٰ نِعْمَائِیْ فَلْیَطْلُبْ رَبًّا سِوَائِیْ. جو میرے فیصلہ پر راضی نہیں، اور جو میری بلاؤں پر صبر نہ کرے، میری نعمتوں پر شکر نہ کرے تو اس سے کہہ دو کہ میرے علاوہ کوئی پروردگار ڈھونڈ لے۔

خدا تعالیٰ سے راضی وہی شخص ہوتا ہے کہ جس کو تقدیرِ الٰہی پر کسی طور سے بھی اعتراض نہ ہو۔ رضا کے بارے میں یہاں تک کہتے ہیں کہ بندہ کو یہ نہیں کہنا چاہئے کہ آج بہت گرمی یا بہت ٹھنڈک ہے۔

نقل: ایک بزرگ سے منقول ہے انہوں نے کہا کہ اگر میرے جسم کو قینچی سے ریزہ ریزہ کر دیں تو مجھے یہ کہیں محبوب ہے اس بات سے کہ میں کہوں کاش ایسا ہوتا یا کاش کہ ایسا ہوتا۔ کیونکہ ایسا کہنا تقدیرِ الٰہی پر اعتراض کرنا ہے۔

نقل ہے کہ ایک شخص نے اپنے استاد سے پوچھا کہ کیا بندہ یہ تمیز کر سکتا ہے کہ خداوند تعالیٰ اس سے راضی ہے؟ کہا کہ رضا غیب میں ہے تو یہ کیسے پہچان سکتا ہے کہ وہ راضی ہے۔ شاگردوں نے کہا میں سمجھتا ہوں کہ تمیز کر سکتا ہے، استاد نے کہا وہ کیسے؟ کہا کہ جب میں اپنے دل کو خدا سے راضی پاؤں تو یہ سمجھ لوں کہ خداوند تعالیٰ مجھ سے راضی ہے استاد نے کہا اَحْسَنْتَ خوب کہا اے لڑکے۔

کہتے ہیں کہ بندہ کو ایسا راضی ہونا چاہئے کہ ملے یا نہ ملے، بلا میں مبتلا ہو یا نعمت سے

نوازا جائے، دونوں اس کے نزدیک یکساں ہوں۔ اسی موقع پر کہا گیا ہے کہ رضا زہد سے افضل تر ہے یہ اس لئے کہ راضی کو کوئی تمنا نہیں ہوتی۔ اور زاہد صاحب تمنا ہوتا ہے۔

نقل ہے کہ ایک بزرگ فرمایا کرتے اِنْ تُعَذِّبْنِی فَانَا لَکَ مُحِبٌّ. وَاِنْ تَرْحَمْنِیْ فَانَا لَکَ مُحِبٌّ. اگر مجھے تو دوزخ میں جھونک دے جب بھی تو میرا دوست ہے اور اگر مجھ پر رحمت فرمائے جب بھی تیرا میں دوست ہوں۔ بندہ، حق رضا ادا کرے یا نہ کرے مقدر بدل نہیں سکتی۔ ایسے حال میں اضطراب کا ثمرہ گنہگاری کے سوا اور کچھ نہیں۔ جو راضی ہے وہ جمال با کمال کے نظارہ میں مستغرق ہے۔ ایسا شخص دونوں جہاں کی بلائیں جھیل سکتا ہے۔ جو اپنی مرضی پر کام کرتا ہے وہ خود بینی میں مبتلا ہے۔ اسے طاقت کہاں کہ بلا کے ایک ذرہ کی بھی تاب لا سکے۔ جب جناب آدم علیہ السلام نے اپنی مرضی کے موافق کام کیا تو گذرا جو کچھ ان پر گذرا۔

نقل: خواجہ ابو سلیمان دارانی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے انہوں نے فرمایا، رضا وہ ہے کہ خدا تعالیٰ سے نہ بہت طلب کرے اور نہ دوزخ سے چھٹکارے کی طلب کرے۔

سلطان العارفین بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا میری رضا حق تعالیٰ کے ساتھ یہاں تک پہنچی ہوئی ہے کہ اگر مجھے دوزخ میں ہمیشہ رکھے تو میں اس شخص سے کہیں زیادہ خوش رہوں جو اعلیٰ علین میں ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ جو خدا تعالیٰ کے کاموں پر خوش ہے وہ حق تعالیٰ کے دیدار میں ہے اور حق کے ساتھ ہے اور جب حق کے ساتھ ہوگا تو دونوں جہاں کی بلائیں بلا خوف جھیلے گا اور اپنی مرضی اپنے اختیار سے کام کرنا یہی اصل بلا ہے۔ جیسا کہ آدم علیہ السلام کے قصہ سے ظاہر ہے کہ بہشت ان کی جائے آسائش تھی حوا ان کی مونس تھیں عزت کا تاج زیب سر تھا۔ ایک قدم اپنے اختیار سے اٹھایا بہشت سے باہر کر دیئے گئے رفیقہ حیات سے جدا ہو گئے تاج عزت سر سے اتار لیا گیا۔ دار بقا سے دار فنا میں ڈال دیئے گئے۔ محض اک لقمہ اپنے اختیار سے کھانے کا یہ معاملہ ہوا۔ تو جو عمر بھر اپنی مرضی پر چلتا ہے اپنے اختیار سے کام کرتا ہے اس کا حال کیسا ہوگا؟۔

نقل ہے کہ جناب موسیٰ علیہ السلام نے کہا خداوند مجھے وہ کام بتا کہ جس کے کرنے سے تو

خوش رہے فرمان ہوا کہ تم سے نہ ہو سکے گا۔ جناب موسیٰ علیہ السلام نے سر بسجود ہو کر تضرع و زاری شروع کی تو وحی آئی کہ اے عمران کے بیٹے میری تقدیر پر تیرے خوش رہنے میں میری رضا ہے۔

نقل ہے خواجہ سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ ایک دن رابعہ بصریہؒ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، بول اٹھے اے رب تو مجھ سے راضی ہو جا۔ رابعہؒ نے کہا تمہیں شرم نہیں کہ اس کی رضا طلب کرتے ہو جس سے تم راضی نہیں۔ رابعہ نے یہ اس لئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے رضا کو رضا پر منحصر رکھا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡھُمۡ وَرَضُوۡ عَنۡہُ. (اللہ راضی ہوا ان سے اور وہ راضی ہوئے اس سے) تو بندہ خود کو جتنا خدا سے خوشنود پائے سمجھے کہ حق تعالیٰ اتنا ہی زیادہ مجھ سے خوشنود ہے۔

صبر نہیں آتی: ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے، فرمایا کہ صبر قرآن میں تین طرح ہے۔ ایک صبر، خداوند تعالیٰ کے فرائض کی ادائیگی پر ہے۔ اس کے تین سو درجے ہیں۔ دوسرا صبر، خدا کی حرام کی ہوئی چیزوں سے بچنے پر ہے، اس کے چھ سو درجے ہیں۔ تیسرا صبر، مصیبت آنے کے وقت ہے۔ اس کے نو سو درجے ہیں۔

کہتے ہیں کہ پہلا درجہ، تائبون کا درجہ ہے، دوسرا درجہ مقدور بھر راضی رہنا ہے، یہ درجہ زاہدوں کا درجہ ہے، تیسرا درجہ خداوند تعالیٰ جو کچھ اس کے ساتھ کرے اس کو دل سے پسند کرنا ہے۔ اور یہ درجہ صدیقوں کا ہے۔

فَاصۡبِرۡ صَبۡرًا جَمِیۡلًا ؕ کے معنی میں کہتے ہیں کہ صبر جمیل کی تعریف یہ ہے کہ صاحب مصیبت خلق کے درمیان ایسا رہے کہ لوگ تمیز نہ کر سکیں کہ صاحب مصیبت ہے۔

ذکر اثبات کرامات اولیاء

یہاں پر یہ بھی اچھی طرح جان لینا چاہئے کہ صبر کی جتنی قسمیں ہیں سب کی سب محمود نہیں ہیں۔ بلکہ یہاں پر صبر کی وہ مخصوص قسمیں مراد ہیں۔ کیونکہ بندہ بلائے مطلق پر صبر کرنے کے لئے مامور نہیں ہے۔ یہ اس لئے کہ کفر بھی ایک بلا ہے، اور اس کفر پر صبر نہیں اور اسی طرح معصیت بھی بلا ہے۔ معصیت پر صبر نہیں۔ بلکہ کافر کے حق میں یہ ہے کہ وہ کفر کو ترک کرے۔ اور

گنہگار کے حق میں یہ ہے کہ وہ معصیت کو ترک کرے۔ بلکہ وہ تمام بلائیں جس کے دفع کرنے پر قادر ہے، آدمی ان سب پر صبر کرنے کے لئے مامور نہیں ہے۔ مثلاً اگر کوئی آدمی پانی پینا چھوڑ دے اور پیاس کی اس طویل مدت میں تشنگی کی تکلیف حد سے بڑھ جائے تو ایسی صورت میں آدمی کو صبر کرنے کا حکم نہیں ہے۔ بلکہ اسے پیاس کی تکلیف درد کرنے کا حکم ہے۔ تکلیف و مصیبت پر صبر کرنا اس وقت آیا ہے کہ بندہ کو اس تکلیف کے دور کرنے کی قدرت نہ ہو۔

تحقیق شکر: شکر کی تعریف محققین کے نزدیک عاجزی کے طور پر منعم کے نعمت کا اعتراف ہے ایک بزرگ نے کہا ہے کہ شکر سے اپنے عجز کو جاننا شکر ہے۔ شکر پر شکر، شکر سے بڑھا ہوا ہے۔

اور کہتے ہیں کہ نعمت نایافتہ کو صید کرنا اور حاصل شدہ نعمتوں کو قید کرنا شکر ہے۔ اس تقریر کا حاصل یہ ہے کہ ہر ایک چیز کا شکر اس چیز کی مناسبت سے ہے۔ مثلاً دل کا شکر یہ ہے کہ دل، حق تعالیٰ کو منعمی کی صفت کے ساتھ جانے۔ جو اس کو منعم نہیں جانتا وہ کافر ہے۔ اور اعضاو جوارح کا شکر یہ ہے کہ جوارح اس کی خوشنودی میں لگے رہیں۔ مال کا شکر یہ ہے کہ مال اس کی خوشنودی میں خرچ کیا جائے۔

اعضاو جوارح کا شکر نماز ہے، مال کا شکر زکوۃ ہے۔ پیٹ کی بھوک اور فرج کی شہوت کا شکر روزہ ہے۔ کیونکہ بطن اور فرج کی شہوت یہ دونوں بہت بڑی نعمت ہے۔ ایک آدمی کی زندگی کی بقا کا سبب ہے دوسری، نسل کی بقا کا سبب ہے۔ نقل ہے کہ امام شبلی رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا منعم پر نظر رکھنا، شکر ہے نہ کہ نعمت پر۔ یعنی اس بات پر یقین کرے کہ نعمت منعم سے ہوا اور منعم اللہ تعالیٰ ہے، اور تمام واسطے تمام ذرائع اسی کی طرف مسخر ہیں، جیسے کہ وزیر اور خازن، بادشاہ کے ہاتھ میں مسخر ہیں۔ تو جو شخص وزیر اور خازن پر نگاہ رکھتا ہے، جو اس کو ملا ہے اس میں ان لوگوں کو دخیل سمجھتا ہے تو یہ ایک حقیقت ہے کہ نعمت کے معاملہ میں بادشاہ کا ان لوگوں کو شریک ٹھہرایا۔ اور اس نے نعمت کو بہمہ وجوہ بادشاہ کی جانب سے نہیں دیکھا۔ بلکہ بعض حیثیت سے بادشاہ کی طرف سے اور بعض حیثیت سے بادشاہ کے غیر یعنی وزیر اور خازن کی طرف سے تو ایسی صورت میں وہ بادشاہ

کے حق میں موحد نہیں۔

نقل ہے کہ جناب داوٗد علیہ السلام نے عرض کی کہ میں تیرا شکر کس طرح پر کروں، کہ یہ میرا شکر تیری نعمت پر ہے تیرے حضور میں۔ خداوند تعالیٰ کی جانب سے وحی آئی کہ اب تم نے شکر کیا۔

نقل ہے کہ جناب موسیٰ نے اپنی مناجات میں کہا کہ الٰہی تو نے آدم کو اپنے ید قدرت سے پیدا کیا اور ان کے ساتھ ایسا ویسا کیا تو انہوں نے تیرا شکر کس طور پر ادا کیا۔ خداوند تعالیٰ نے وحی کی کہ آدم نے شکر اس طرح پر ادا کیا کہ انہوں نے یہ جانا کہ یہ سب کچھ میری طرف سے ہے۔ ان کا یہ جاننا اور سمجھنا کہ یہ میری طرف سے ہے یہی سمجھنا میرا شکر تھا۔

سوال: یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر کوئی یہ کہے وہ ساری چیزیں جن سے میں اپنے اختیار سے کام لیتا ہوں تو وہ خداوند تعالیٰ کی نعمت کے علاوہ ایک دوسری ہی نعمت ہوئی۔ یہ اس لئے کہ ہمارے تمام جوارح، اعضا اور ہماری قدرت، ہماری ارادت، اور وہ سارے امورات جو ہماری حرکت کے اسباب ہیں اور خود ہماری حرکت خداوند تعالیٰ کے خلق سے ہے اور یہ اس سے ایک نعمت ہے تو یہاں لازم آتا ہے کہ شکر محال ہوگا۔ اور شکر پر شرع کا حکم ہے؟

جواب: جواب اس کا یہ ہے کہ یہ ایک خدشہ تھا جو جناب داوٗد علیہ السلام اور جناب موسیٰ علیہ السلام کو ہوا تھا۔ تو خداوند تعالیٰ نے ان دونوں پر وحی بھیجی کہ جب تم نے یہ پہچان لیا تو یہ سچ ہے کہ تم نے میرا شکر ادا کر لیا۔

قولہ: وَاَنَّ الْخَوْفَ وَالرَّجَاءَ زَمَامَانِ لِلْعَبْدِ يَمْنَعَانِهٖ مِنْ سُوْءِ الْاَدَبِ وَكُلُّ قَلْبٍ خَلَا مِنْهَا فَهُوَ خَرَابٌ.

(ارشاد شیخ ہے) یہ درست ہے اور سچ ہے کہ خوف درجا یہ دونوں بندہ کے ہاتھ میں نکیل کے مانند ہیں۔ یہ دونوں بندہ کو بے ادبی سے روکتے ہیں۔ ہر وہ دل جو خوف درجا (امید و خوف) سے خالی ہے، وہ دل خراب ہے۔ یہ دلیل بنتی ہے اس بات کی کہ طاعت سے دل کی آبادی ہے اور یہ مقتضائے رجا ہے اور ترک معصیت کہ وہ مقتضائے خوف ہے۔ تو جب طاعت کا فقدان ہوگا معصیت ہوگی۔ اور جب معصیت ہوگی بلاشبہ وہ دل خراب ہوگا۔

خوف خداوندی یہ ہے کہ بندہ کو خدا سے ڈرنا چاہئے کہ وہ عذاب کرتا ہے، دنیا و آخرت میں۔ اور خداوند تعالیٰ نے بندوں پر فرض کیا ہے کہ وہ خدا سے ڈرتا رہے۔

خداوند تعالیٰ کے علاوہ تین چیز ایسی ہے کہ اس سے ڈرنا چاہئے۔ نفس، شیطان، اور دوزخ۔ نفس سے ڈرنے کی علامت یہ ہے خواہشات کو مارتا رہے۔ اور شیطان سے ڈرنے کی علامت یہ ہے کہ اس کی مراد پوری نہ ہونے دے۔ اور دوزخ سے ڈرنے کی پہچان یہ ہے کہ اوامر دنواہی کے حدود سے قدم باہر نہ نکالے۔

نقل ہے کہ فرمایا حسن رحمۃ اللہ علیہ نے مَنْ فَانَ مِنْ شَیْءٍ سِوَی اللّٰہِ اَوْرَجیٰ سِوَاہُ اُغْلِقَ عَلَیْہِ اَبْوَابُ کُلِّ شَیْءٍ وَمُسَلِّطٌ عَلَیْہِ الْمُخَافَۃُ وَحُجِبَ بِسَبْعِیْنَ حِجَاباً اَیْسَرُہُ شَکٌّ. (اللہ کے سوا جس کو کسی اور سے ڈر ہوا، یا کسی اور سے امید باندھی، تمام چیزوں کے دروازے اس کے لئے بند کر دئے جاتے ہیں اور خوف اس پر مسلط کر دیا جاتا ہے اور ستر پردے اس کے سامنے ڈال دئے جاتے ہیں جن میں کا سب سے آسان پردہ شک ہے)

اور اسباب خوف چند قسم کے ہیں (۱) توبہ کے قبل کی موت کا خوف (۲) توبہ کے بعد توبہ کے نقص کا خوف ہے۔ (۳) نعمت کے پے در پے حاصل ہونے پر استدراج کا خوف ہے۔ (۴) غیر خدا کے ساتھ اشتغال کا خوف۔ (۵) خاتمہ کا خوف۔ (۶) پھر سابق کا خوف یعنی ازل میں کیا ہے کیونکہ خاتمہ کا انحصار ازل پر ہے۔ اسی موقع کی بات ہے۔ بیت

راندۂ سابقت ندانم چیست   خواندہ خاتمت ندانم کیست

(قبل کیا حکم دیا جا چکا ہے میں نہیں جانتا، خاتمہ کیسا ہونا ہے یہ بھی نہیں معلوم) بیت

زہدت بچہ کار آید گر راندۂ درگاہے   کفرت چہ زیاں دار گر نیک سر انجامے

(تیرا زہد کیا کام آئے گا اگر تو راندۂ درگاہ ہے۔ تیرے کفر سے کیا نقصان ہوگا اگر خاتمہ نیک ہونا ہے)

کسی کو جملہ صدیقوں کی طاعت حاصل ہو تو بھی وہ اس خوف سے پریشان رہے۔ تو خوف درجا ایسا ہونا چاہئے جیسا کہ حضرت صدیق اکبر ﷜ کو تھا آپ فرمایا کرتے، میرا خوف اس

حد کو پہنچا ہوا ہے کہ قیامت کے دن اگر یہ ندا ہوگی کہ آج کوئی دوزخ میں نہیں جائے گا مگر ایک شخص، تو میں یہ جان لوں کہ وہ ایک شخص میں ہی ہوں۔ اور میری امید اس حد کو پہنچی ہوئی ہے کہ اگر قیامت کے دن ندا ہوگی کہ آج کوئی بھی بہشت میں نہیں جائے گا مگر ایک شخص، تو میں یہ سمجھ لوں کہ وہ ایک شخص میں ہی ہوں۔

بے خوفی اور ناامیدی دونوں حرام ہیں۔ شیخ عبداللہ نے فرمایا ہے کہ جب تم اپنے کو بے خوف پاؤ، تو اس وقت بے خوفی سے ڈرو۔ مصرع یک لحظ کہ خندید کہ عمر ے نہ گریست (کون ہے جو ایک لحظہ بھی ہنسا اور عمر بھر نہ رویا) فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ (وہ جو چاہتا ہے کر گذرتا ہے) سے امن کی نفی کی جانب اشارہ فرمایا ہے۔

خواجہ فضیل عیاض رحمتہ اللہ علیہ سے منقول ہے آپ نے فرمایا اگر تم سے کوئی پوچھے خداوند تعالیٰ سے ڈرتے ہو؟ تو خاموش رہا کرو۔ کیونکہ اگر تم نے یہ کہا کہ نہیں تو کافر ہو جاؤ گے اور اگر کہا کہ ہاں تو تمہارا یہ کہنا غلط ہو جائے گا۔ بزرگوں نے فرمایا ہے۔ بیت۔

حسن را گفتی از فردا بیندیش تو از انجام ترسی او ز آغاز

(حسن سے لوگوں نے کہا کہ کل کے متعلق فکر کرو، حال یہ ہے کہ تمہیں انجام کی فکر ہے اور اسے نوشتہ ازل کی)

ترس ہمہ مرد ماں ز فرد است ما بیم ز حکم دینہ داریم

(لوگوں کو خاتمہ کا خوف مجھے یہ ڈر ہے نہ جانیں ازل میں کیا لکھا گیا ہے)

اگر کوئی شخص خدا کو پہچانتا ہے جیسا کہ اس کے پہچاننے کا حق ہے تو وہ یقیناً اسی اللہ سے ڈرے گا نہ کسی دوسری چیز سے۔ بلکہ گنہگار اگر خدا کو پہچانے جیسا کہ اس کے پہچاننے کا حق ہے۔ تو اسے یقیناً اللہ سے ڈرنا چاہئے، نہ معصیت سے۔

جب اللہ جل شانہ نے محمد ﷺ کو حضور ﷺ کے کسی اعمال کے وسیلہ سے پہلے اعلیٰ علین پر حضور ﷺ کے وجود کے قبل پہنچایا اور ابوجہل کو اسفل السافلین میں بغیر اس کے کسی گناہ کے اس کے پیدا ہونے کے قبل گرا دیا۔ تو جب یہ حال ہے لازم ہے کہ تم اس سے ڈرو۔

حدیث شریف میں ہے کہ داؤد علیہ السلام پر خداوند تعالیٰ نے وحی بھیجی کہ اے داؤد مجھ سے ایسے ڈرتے رہو جیسے درندہ سے ڈرا کرتے ہیں یعنی درندہ سے جو ڈرتے ہیں وہ اس کی ذات سے ڈرتے ہیں نہ اس سبب سے کہ اس درندہ کا کوئی گناہ انہوں نے کیا ہے بلکہ اس لئے ڈرتے ہیں کہ چیر پھاڑ دینا اس کی صفت ہے اور اپنے اس فعل میں وہ درندہ کسی سے نہیں ڈرتا وَلِلّٰہِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰی (اور اس میں سب سے اونچی مثال ذات الٰہی ہے)۔ وَتَکَلَّمُوْا فِی الرِّجَاءِ قَالَ الشَّاہُ الْکِرْمَانِی عَلَامَۃُ الرَّجَاءِ حُسْنُ الطَّاعَۃِ. (بات ہو رہی تھی رجا کے متعلق شاہ کرمانی نے ارشاد فرمایا۔ امید کی علامت طاعت میں اچھے رہنا ہے)

ایک بزرگ سے منقول ہے انہوں نے کہا کہ رجا کے تین درجے ہیں۔ مثلاً ایک شخص نیک کام کرتا ہے اور امید رکھتا ہے کہ اس کا وہ کام قبول ہوگا۔ دوسرے ایک شخص برے افعال کا مرتکب ہوتا ہے، اس برے کام کے ارتکاب کے بعد توبہ کرتا ہے امید رکھتا ہے کہ وہ تبارک تعالیٰ اسے بخش دے گا۔ اور تیسرے جھوٹی رجا ہے اس کی مثال یہ ہے کہ وہ گناہ پر اصرار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں امید مغفرت کی رکھتا ہوں۔

تمنا اور رجا میں فرق ہے ایک شخص کاہلی اختیار کرتا ہے کام نہیں کرتا تمنا رکھتا ہے ایسے شخص کو متمنی کہتے ہیں یہ مذموم ہے۔ رجا یہ ہے کہ کام کرتا رہے اور امید رکھے یہ محمود ہے آیات و احادیث میں رجا کے اسباب بہت ہیں ان میں سے ایک یہ ہے جو خداوند تعالیٰ نے فرمایا قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا ؕ اے محمد ﷺ میرے بندوں سے کہہ دیجئے جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتیاں کی ہیں (یعنی مرتکب گناہ ہوئے ہیں) اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہوں۔ باوجودیکہ تم نے زیادتیاں کی ہیں، خداوند تعالیٰ تمام گناہوں کو بخش دے گا۔ کہتے ہیں کہ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو حضور پیغامبر ﷺ نے فرمایا قولہ: لَا اُبَالِی اِنَّہٗ ھُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ. (کوئی مضائقہ نہیں بے شک وہ بخشنے والا اور رحمت والا ہے)

شیخ عبداللہ انصاری رحمۃ اللہ کہتے ہیں کہ اگر کل قیامت کے دن ہزار آدمی عبداللہ سے

اس بات کی فریاد کریں کہ مجھ کو رحمت الٰہی پر تم نے فریفتہ کر دیا، مجھے یہ سب اس شخص کے مقابلہ میں زیادہ پسندیدہ ہیں جو یہ کہے کہ تو نے مجھے اللہ کی رحمت سے ناامید کر دیا جب کہ کتے کیلئے بھی دوستی کی راہ ہے اور پتھر کو امید دیدار، تو مجھے کیا پڑی ہے کہ ناامیدی اختیار کروں۔

نقل: حضرت ابو جعفر بن محمد علی (یعنی امام جعفر صادق ؒ) سے منقول ہے فرمایا، کہ اے اہل عراق تم کہتے ہو کہ کتاب اللہ میں سب سے زیادہ امید افزا آیت قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ. الایه. ہے۔ ہم اہل بیت رسول اللہ ﷺ کہتے ہیں کہ سب سے امید افزا آیت وَلَسَوْفَ یُعْطِیْکَ رَبُّکَ فَتَرْضٰیؕ ہے کیونکہ جواب میں پیغامبر ﷺ نے فرمایا لَایَرْضٰی مُحَمَّدٌ رَبُّکَ فَتَرْضٰیؕ ہے کیونکہ جواب میں پیغامبر ﷺ نے فرمایا لَایَرْضٰی مُحَمَّدٌ وَّ وَاحِدٌمِّنْ اُمَّتِهٖ فِی النَّارِؕ کہ ہرگز محمد ﷺ راضی نہ ہوگا جب تک کہ اس کی امت کا ایک شخص بھی دوزخ میں رہے گا۔

محمد بن حنیفہ امیر المومنین علی ﷛ سے نقل فرماتے ہیں کہ فرمایا جب یہ آیت فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِیْلَ نازل ہوئی تو پیغامبر ﷺ نے جبرئیل ؑ سے پوچھا مَا الصَّفْحُ الْجَمِیْلُ یَا جِبْرَئِیْلُ صفح جمیل کیا ہے اے جبرئیل؟ جبرئیل ؑ نے جواب دیا کہ جب اپنے اوپر ظلم کرنے والے کو معاف کر چکو تو پھر عتاب نہ کرو۔ پیغامبر ﷺ نے فرمایا کہ اے جبرئیل خداوند تعالٰی تو اس سے کہیں بزرگ و برتر ہے کہ وہ بندوں کو معاف کرنے کے بعد ان پر عتاب کرے۔ یعنی بخش دینے کے بعد اسی اللہ تعالٰی سے امید نہیں کہ وہ عتاب کرے گا۔ اس پر پیغامبر ؑ اور جبرئیل ؑ رونے لگے۔ خداوند تعالٰی نے میکائیل ؑ کو بھیجا۔ انہوں نے آ کر کہا کہ اللہ تعالٰی فرماتا ہے میں کیوں کر اس شخص پر عتاب کروں جسے معاف کر چکا ہوں۔ یہ میری شان کریمی کے لائق نہیں۔

قوله: وَاَنَّ الْاَمْرَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّهْیَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَاجِبٌ عَلٰی مَاامْکَنَهٗ وَبِمَا اَمْکَنَهٗ.

(ارشاد شیخ ہے) یہ سچ ہے اور درست ہے کہ معروف شرع یعنی مستحسن شرع میں امر کرنا

واجب ہے جملہ مشروعات اس قسم میں داخل ہیں۔ یعنی بطور کفایہ کے فرض ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ط وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ہ (تم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہی جو خیر کی دعوت دے۔ معروفات کا حکم کرے۔ منکر سے رو کے ایسے ہی لوگ فلاح پانے والوں میں ہیں۔)
آیت میں ایجاب کا بیان ہے کیونکہ اس کا قول وَلْتَكُنْ امر ہے اور امر ظاہر ایجاب ہے اور آیۃ میں بیان ہے کہ فلاح معروفات کے امر اور منہیات کے روکنے میں ہے۔ کیونکہ مخصوص کر کے فرمایا کہ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ہ اور آیت میں بیان ہے کہ امر معروف و نہی منکر فرض عین نہیں ہے، فرض کفایہ ہے کیونکہ یہ نہیں کہا کہ كُوْنُوا كُلُّكُمْ اٰمِرِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ (تم سب کے سب امر بالعرف کرنے والے ہو جاؤ) بلکہ فرمایا وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ تو جب کہ کوئی ایک فرد یا کوئی جماعت اس کام کیلئے کھڑی ہوگئی تو سبھوں پر سے یہ فرض ساقط ہو گیا اور اگر اس کام سے تمام لوگ رخ پھیر لیں، باز رہیں تو لامحالہ سب کے سب گنہگار ہوں گے۔

اور بعض کہتے ہین آمر و ناہی (حکم کرنیوالے اور منع کرنیوالے) کے حق میں عدالت شرط ہے یعنی آمر و ناہی کو چاہئے کہ اوامر کی بجا آوری اور نواہی کے اجتناب سے خود کو آراستہ کرے جب اس کا عامل ہولے تب اس پر امر د نہی کرنا واجب آتا ہے۔ اور وہ دلیل میں اس آیۃ کو لاتے ہیں جو ایسے شخص کے حق میں وارد ہے کہ وہ جس کام کا لوگوں کو حکم دیتا ہے اور خود اس پر عمل نہیں کرتا اور وہ آیت یہ ہے اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ (کیا تم لوگوں کو بھلائی کا حکم دیتے ہو اور خود کو بھلا دیتے ہو) جیسا کہ روایت کرتے ہیں کہ حق سبحانہ تعالیٰ نے بجناب عیسیٰ علیہ السلام پر وحی کی کہ اے ابن مریم اپنے آپ کو نصیحت کر، تو جب تو نے خود نصیحت پر عمل کر لیا پھر اس کے بعد خلق کو نصیحت کر، اگر ایسا نہیں تو مجھ سے شرم کر کہتے ہیں کہ جس نے اپنے آپ کو نہیں سنوارا۔ اس سے دوسرے کیسے سنور سکیں گے۔ اس لئے کہ ٹیڑھی لکڑی کا سایہ کیونکر سیدھا ہو سکتا ہے۔

اور یہ قول صحیح نہیں ہے۔ قول صحیح اور حق یہ ہے کہ عدالت شرط نہیں یہ اس لئے کہ اگر

عدالت کی شرط کو مان لیا جائے تو معرف کے امر اور منکر کے منع کا سدِ باب لازم آتا ہے۔ کیوں کہ صحابہ جب معصوم نہ تھے تو دوسرے لوگوں میں عصمت کہاں تک ہوگی نقل۔ سعید جبیر رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر امر معروف و نہی منکر کو انجام نہ دے مگر ایسا شخص جو خود کے لئے ہوئے نہ ہو یعنی جملہ اوامر بجالائے ہوئے اور جملہ نواہی سے کنارہ کش ہو تو اس وقت کوئی ایسا شخص جہاں میں نہ ملے گا جو خود امر معروف اور نہی منکر کا پابند ہو۔

امر معروف کے آداب میں سے علائق کو کم کرنا ہے تا کہ اس پر ڈر غالب نہو اور خلق سے طمع کا قطع کرنا ہے، تا کہ مداہنت (سستی) اس سے ختم ہو جائے۔

نقل ہے کہ ایک بزرگ کے پاس ایک بلی تھی۔ اس بلی کے لئے قصاب سے جوان کے پڑوس میں رہتا تھا جانور کی گلٹیاں منگواتے ایک دن اس قصاب کے پاس منہیات شریعہ میں سے کوئی چیز دیکھی گھر آ کر بلی کو گھر سے نکال دیا۔ پھر قصاب کے پاس تشریف لائے اور منکر یعنی منہیات شریعہ سے اسکو منع کرنا شروع کیا۔ قصاب نے کہا اچھا اب آپ کی بلی کے لئے کچھ نہ دیں گے۔ ان بزرگ نے فرمایا کہ ہم نے پہلے بلی کو جدا کر دیا پھر تمہارے پاس آ کر تم سے باز پرس کر رہا ہوں۔

بزرگوں کا قول ہے کہ جو شخص یہ چاہتا ہے کہ لوگ اس سے خوشدل رہیں اور لوگ اس کی تعریف کریں تو ایسا شخص ہر گز امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا پابند نہیں ہوسکتا۔ فرمایا عَلٰی مَاامْکَنَہٗ وَبِمَا امْکَنَہٗ حکم کرنا امر معروف اور روکنا منکر شرع سے واجب ہے جہاں تک اس سے ممکن ہو اور جیسے بھی اس سے ممکن ہو۔ یعنی ہاتھ سے زبان سے یا دل سے۔ ہاتھ سے حاکمان اور فرمانروایاں کے لئے اور زبان سے علماء کے لئے دوسرے لوگوں کے لئے دل سے۔ بزرگوں نے فرمایا ہے۔ امر معروف میں ہر مسلمان کے لئے مستحب یہ ہے کہ جب اچھے کاموں کی نصیحت کرے تو اپنے آپ سے شروع کرے اور پہلے اپنے آپ کو فرائض کی پابندی اور محرمات کے ترک سے آراستہ کرے۔ اور اپنے گھر والوں کی تربیت کرے پھر اپنے ہمسایہ کو تعلیم دے جب ان سے فارغ ہو تو پھر اپنے محلے والوں کو بتلائے جب ان سے فارغ ہو اپنے شہر والوں کو سکھائے جب شہر والوں سے فراغت ہو تو پھر مضافات شہر کی تربیت میں مشغول ہو۔

وَاَحْکَامُ الْعُبُودِیَّةِ لَازِمَةٌ لِلْعَبْدِ مَادَامَ عَاقِلاً. غَیْرَ اَنَّهُ اِذَا صَفَا قَلْبُهُ مَعَ اللّٰہِ سَقَطَ عَنْهُ کُلْفَةُ التَّکَالِیْفِ لَانَفْسَ وُجُوبِهَا.

(ارشادِ شیخ ہے) بندگی کے احکام بجالانا بندہ کے لئے واجب ہے۔ جب تک وہ عاقل ہیں مگر جس کسی کا دل خدا تعالیٰ کی معیت میں صاف ہو جاتا ہے تو اس سے عبادات کی تکلیف و مشقت اٹھ جاتی ہے، مکلف ہونے کا وجوب نہیں اٹھتا۔ یہ اس لئے کہا گیا کہ اللہ کی لعنت ہو، ملحدوں کا ایک گروہ جو طریقت سے تعلق کا دعویٰ رکھتا ہے۔ کہتا ہے خدمت (بندگی) اتنی کرنی چاہئے کہ بندہ حق کا ولی ہو جائے۔ اور جب حق کا ولی ہو گیا تو خدمت اٹھ گئی۔ مثال میں وہ کہتے ہیں زاد و راحلہ کی ضرورت کعبہ تک پہنچنے کے لئے ہے۔ جب کعبہ پہنچ گئے راہ خرچ کی ضرورت باقی نہ رہی۔ یہ کھلی گمراہی ہے یہ اس لئے کہ اس راہ خداوندی میں کوئی مقام ایسا نہیں کہ جہاں بندگی کے ارکان میں سے ایک رکن کا وجوب بھی اٹھتا ہو۔

وہ جو نبیوں کے شہنشاہ ہیں اور جو جملہ صفاتِ کمالیہ سے موصوف ہیں ان سے عبادات کی تکلیف ختم نہ ہوئی یہاں تک کہ حضور کے حق میں فرمان ہوا وَاعْبُدْ رَبَّکَ حَتّٰی یَاْتِیَکَ الْیَقِیْنُ ہ اپنے خداوند کی بندگی کیجئے تا آنکہ آپ پر موت طاری ہو۔ یہاں پر لفظ یقین، سے موت طاری ہونا مراد ہے۔ اور اسی طرح تمام انبیاء علیہم السلام سے یہ حکم نہ اٹھا باوجود اس کے کہ ان لوگوں کا مرتبہ سبھوں سے بلند و بالا ہے۔ اگر یہ حکم اٹھتا تو ان سے اٹھتا جب ان سے نہ اٹھا تو ظاہر ہے دوسروں سے بھی نہ اٹھے گا۔

ہاں یہ جائز ہے کہ مکلف ہونے میں جو مشقت ہوتی ہے وہ اٹھ جائے، اور صورت حال یہ ہو جائے کہ جو دوسرے لوگ مشقت سے حاصل کرتے ہیں ان لوگوں کو آسانی سے حاصل ہو اور جو چیز دوسروں پر رنج طاری کرتی ہے ان کے اندر نشاط و مسرت لائے اور یہ نشاط و مسرت اسی تکلیف کی ادائیگی پر ان کو محسوس ہو۔ لیکن یہ کہنا کہ نفس مکلف ہونا ہی اٹھ گیا ایسا نہیں بلکہ یہ محال ہے اور ایسا کہنا گمراہی ہے۔

مشائخ رحمہم اللہ کی حکایتیں اس بارے میں بہت ہیں۔

امام شبلی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک نقل ہے آپ نے سکرات موت میں ایک شخص سے فرمایا کہ مجھے وضو کرادو۔ جب وہ وضو کرانے لگے ریش مبارک میں خلال کرانا بھول گئے امام شبلی رحمۃ اللہ نے ہاتھ پکڑ لیا اور سنت بجالائے۔

قولہ: وَاَنَّ الْبُشْرِیَّۃَ لَا تَزُوْلُ عَنْ اَحَدٍ وَلَوْ تَرَلَّجَ فِی الْھَوَاءِ. غَیْرَ اَنَّھَا تَضْعَفُ مَرَّۃً وَتَقْوٰی اُخْرٰی.

(ارشاد شیخ ہے) یہ صحیح اور درست ہے کہ سب سے بشریت زائل نہیں ہوتی گرچہ چار زانو بیٹھ کر کوئی ہوا میں اڑے ہاں یہ درست اور صحیح ہے کہ بشریت کمزور ہو جاتی ہے کبھی اور اور کبھی قوی ہو جاتی ہے۔ یعنی جب روح اور محبت کا غلبہ ہوتا ہے تو کمزور ہو جاتی ہے اور جب مراد اور خواہش کی یافت ہوتی ہے تو بشریت قوی ہو جاتی ہے۔

یہ اس لئے کہ نفس کا مجاہدہ نفس کی اوصاف کو فنا کرنے کے لئے کیا جاتا ہے نہ کہ عین نفس کی فنا کے لئے تو جب کوئی شخص نفس کی اوصاف نفس کو ریاضت اور مجاہدہ سے قابو میں کر لیتا ہے تو نفس اپنے اوصاف سے پاک ہوتا ہے لیکن عین نفس اس کے اندر باقی رہتا ہے ایسی صورت میں بھی عین نفس سے مطمئن نہیں رہنا چاہئے۔ کیونکہ نفس کی خفیہ کارروائیاں بہت ہیں۔ بجز تائید خداوندی کے آدمی اس سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ چاہے جتنا بھی ریاضتیں کرے۔ کیونکہ ایک قدم بھی خواہش نفس پر اٹھانا دین کی ساری تعمیر کو زمین پر ڈال دیتا ہے۔

اور دوسری بات یہ کہ بشر سے اوصاف بشریت کا زائل ہونا محال ہے۔ اسی بنا پر پیغمبر ﷺ نے ہم لوگوں کو خبر دے کر چتونی کی ہے اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ (میں تمہاری طرح بشر ہوں) اس کے باوجود دوسروں کا دعویٰ زوال بشریت کے سلسلہ میں کب صحیح ہوگا۔

قولہ: وَالْحُرِیَّۃُ مِنْ رِقِّ النَّفْسِ جائزۃٌ فِی حَقِّ الصِّدِّیْقِیْنَ ٥

(ارشاد شیخ ہے) نفس کی غلامی سے آزادی درست ہے یعنی صدیقوں کے حق میں ممکن ہے اور بندہ جو آزاد ہوتا ہے وہ اس وقت آزاد ہوتا ہے کہ رزق، مخلوقات کی غلامی کے تحت سے وہ باہر آجائے۔ اور کائنات کی کارفرما قوتوں کا ناموس اس پر منکشف ہو جائے اس کیفیت

کے درست ہونے کی علامت یہ ہے کہ ایسے شخص کے دل سے اشیائے باہمی کی اضافی کیفیتوں کی تمیز اٹھ جاتی ہے۔ ہر چیز اس کی نظر میں برابر ہو جاتی ہے۔ عام ازیں کہ خسیس ہو یا نفیس ایسے شخص کے نزدیک چاندی اور سونا، ڈھیلا اور پتھر سب برابر ہو جاتا ہے۔ تو حریت کا مقام یہ ہے کہ انسان نفس کی پابندی سے آزاد ہو جائے۔ قَالَ اللّٰہُ تَعَالیٰ وَیُؤْثِرُوْنَ عَلیٰ اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ کَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ط (اور یہ لوگ خود فقر و حاجت مندی میں ہونے کے باوجود اپنے اوپر دوسروں کی امداد کو ترجیح دیتے ہیں) وَاِنَّمَا اٰثَرُوْا عَلیٰ اَنْفُسِهِمْ لِتَجَرُّدِهِمْ عَمَّا خَرَجُوْا مِنْهُ وَاٰثَرُوْا بِهٖ. (اور بے شک ان لوگوں نے اپنے نفسوں کے مقابلہ میں دوسروں کو ترجیح دی یہ اس لئے کہ یہ لوگ مجرد ہو چکے ہیں ان چیزوں سے جس میں کہ یہ نہیں ہیں اور اب ان لوگوں نے ایثار اختیار کیا ہے)۔

اَلصَّادِقُ اَلْاِسْمُ مِنَ الصِّدْقِ الخ (مادہ صدق ہے صادق اسی سے اِسم ہے اور بطریق مبالغہ ہے یعنی جس کے اندر صدق بے انتہا ہو۔ جس کا پہلا درجہ یہ ہے کہ سِرّ واعلان برابر ہو، اور صادق وہ ہے جو اپنے قول میں صادق ہو لیکن صدیق وہ ہے کہ اپنے تمام اطوار میں صادق ہو، اقوال میں، احوال میں افعال میں جیسا کہ حارثہ رضی اللہ عنہ سے نقل ہے پیغامبر علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا عَزَفَتْ نَفْسِیْ عَنِ الدُّنْیَا فَاسْتَوٰی عِنْدِیْ ذَهَبُهَا وَفِضَّتُهَا وَحَجَرُهَا وَمَدَرُهَا. (نفس کو میں نے دنیا سے پھیر لیا ہے، اب دنیا کی چیزوں میں سے چاندی اور سونا مٹی پتھر سب میری نظر میں برابر ہے۔) اور یہ گروہ صوفیہ حریت اسے کہتے ہیں کہ ان کے دل میں بندگی کے تحت مخلوقات میں سے کوئی چیز نہ ہو نہ اغراض دنیاوی میں سے جو جلد ان کے سامنے آنے والی ہیں اور نہ اغراض اخروی میں سے جو بدیر سامنے آنے والی ہیں تو وہ منفرد ہو گئے ہیں اور ذات متصف صفات فردیت کے لئے۔ ہر آرزو، ہر سوال، ہر مقصد، ہر حاجت اور ہر حصہ طلب سے ان کا دل پاک ہوتا ہے۔ لَیْسَ لَهٗ حَظٌّ اِلَّا اللّٰهُ وَلَا نَصِیْبَ لَهٗ سِوَاهُ. (اللہ کے سوا کسی چیز میں انہیں حظ نہیں ملتا اور اللہ کے سوا کسی چیز میں وہ حصہ نہیں لیتے)۔

نقل۔ امام شبلی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک نقل ہے ایک شخص نے ان سے ایک حال میں کہا۔

کیا آپ یہ جانتے کہ وہ رحمٰن ہے فرمایا جانتا ہوں لیکن جب سے اس کے رحمت کی معرفت ہم نے حاصل کی ہے تو کبھی ہم نے یہ نہیں کہا کہ مجھ پر رحمت فرما۔ جس کی جسے ضرورت ہے وہ اس سے مانگے۔ لیکن جس کو خود اس کی ضرورت ہے۔ وہ اس کے سوا کچھ اور کیا چاہے گا۔ تو حریت کا مقام نہایت معزز اور اعلیٰ ہے۔

نقل ہے کہ خواجہ جنید رحمتہ اللہ علیہ سے ایسے شخص کے متعلق سوال کیا گیا جس کے پاس دنیا سے سوائے خرما کی چبائی ہوئی گٹھی کے اور کچھ نہ بچا ہو اس کا کیا حال ہے؟ خواجہ نے فرمایا جب تک ایک درم بھی باقی ہے آدمی نفس کا مکاتب غلام ہے اس قول سے اس بات کی جانب اشارہ ہے کہ جب تک اغراض دنیاوی یا اغراض اخروی میں سے کسی ایک غرض پر بھی نظر رہے گی تو اس کو حریت کا مقام مسلم حاصل نہیں۔ جب تک کہ کونین سے باہر نہ نکل جائے۔ یہاں تک کہ اگر ایک غرض بھی باقی ہے تو بندہ اس کی قید میں ہے۔ اور جب اس کے قید میں ہے تو اس کا غلام ہے۔ حریت (آزادی) کیسے ہوگی۔

قولہ: وَالصِّفَاتُ لذَّمِیْمَةُ تَفْنیٰ مِنَ الْعَارِفِیْنَ وَتَخْمُدُ فِی حَقِّ الْمُرِیْدِیْنَ ۝

(ارشاد شیخ ہے) وہ صفتیں جو مذمومہ بری ہیں مثلاً بخل، حقد، حسد، محبت دنیا، خشم، کبر، محبت جاہ خلق وغیرہ عارفوں میں فنا ہو جاتی ہیں، اور مریدوں میں مردہ ہو جاتی ہیں یعنی وہ صفتیں جو مذمومہ ہیں صفات حمیدہ کے حصول کے مجاہدہ سے عارفوں کے حق میں فنا ہو جاتی ہیں، مگر مریدوں کے حق میں صفات مذمومہ فنا نہیں ہوتیں ہاں اس کی لہک یا دھندک دب جاتی ہے۔

تبدیل کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تبدیل ذات دوسرے تبدیل صفات۔ ذات کا تبدیل ہونا خداوند تعالیٰ کی قدرت میں ہے بندہ کو اس میں کوئی دخل نہیں۔

تبدیل صفات دو طرح پر ہیں، ایک صفت وہ ہے کہ اس کی تبدیلی بندہ کی قدرت میں جیسے بخالت کی صفت کو سخاوت کی صفت سے بدلنا اور جیسے جہل کی صفت کو علم کی صفت سے تبدیل کرنا اور اسی طرح دوسری صفتیں۔

اور دوسری قسم صفات طبیعہ ہیں جیسے نیند، بھوک، پیاس، ان صفات طبیعی کا بدلنا بھی اللہ

تعالیٰ کی قدرت میں ہے۔ بندہ کو ذرا برابر اس میں دخل نہیں۔ لیکن زیادتی سے کمی کی طرف لاسکتا ہے اور اس کے غلبہ کو مغلوب بنا سکتا ہے۔

بزرگوں کا قول ہے کہ عارف وہ ہے جو موجود ہو لوگوں کے ساتھ اور معدوم ہو صفت کے ساتھ یعنی اس کا ظاہر خلق کے ساتھ ہو اور اس کا باطن، مشاہدہ حق میں ہو، ایسے کہ خلق سے غائب لیکن خلق یہ سمجھتی ہے کہ وہ ہمارے ساتھ ہے اور ہم لوگ ان کے ساتھ ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ وہ جو کچھ بولتا ہے حق ہی سے بولتا ہے اور جو کچھ سنتا ہے حق ہی سے سنتا ہے۔ اسی معنی کے اعتبار سے اس کا موجود ہونا بھی ہے اور اسی معنی کے اعتبار سے اس کا معدوم ہونا بھی ہے۔

قوله: وَاَنَّ الْعَبْدَ یَنْتَقِلُ فِی الْاَحْوَالِ حَتّٰی یَصِیْرَ اِلیٰ نعت الرُّوْحَانِیِیْنَ.

(ارشاد شیخ ہے) یہ سچ ہے اور درست ہے کہ بندہ احوال میں منتقل ہوتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ رُخ کرتا ہے روحانیوں کی صفت کی طرف۔ مطلب یہ کہ بندہ ایک حال سے دوسرے حال کی جانب منتقل ہوتے ہوئے اس حال کو پہنچتا ہے کہ اسے ملکوتی صفت حاصل ہو جاتی ہے جیسا کہ کہتے ہیں کہ اگر روح، سیدِ عالم ﷺ کی متابعت میں دائمی مجاہدہ کے ذریعہ قوت حاصل کر لے تو ہو سکتا ہے کہ قالب کشف کو جسمانیات کے لطیف مکان میں پہنچا دے۔ پہچان اس کی یہ ہے کہ پل میں دو تین ماہ کی راہ طئے کر لیتا ہے جیسا کہ جسمانیات لطیف۔ اور اگر اس کی قوت اس سے بھی زیادہ ہو تو ہو سکتا ہے کہ اپنے قالب کو لطیف تر جسمانیات کے مکان تک کھینچ لے شناخت اس کی یہ ہے کہ اگر پانی میں غوطے لگائے تو اس کا جسم تر نہ ہو، اور اگر آگ میں وہ کود پڑے تو اس کا قالب نہ جلے جیسا کہ لطیف تر جسمانیات کا حال ہوتا ہے۔ اور اس کو ایک ہی وقت میں مختلف جگہوں میں دیکھا جائے درآنحالیکہ وہ ایک ہی جگہ ساکن ہو۔

قوله: فَتطْوِیْ لَهُ الْاَرْضُ وَیَمْشِیْ عَلَی الْمَاءِ وَیَغِیْبُ عَنِ الْاَبْصَار.

(ارشاد شیخ ہے) اس وقت زمین اس کے لئے مختصر کر دی جاتی ہے چنانچہ ایک ذرا سی دیر میں مشرق سے مغرب جا سکتا ہے۔ اور پانی کی سطح پر چل سکتا ہے اور اس کا جسم ذرا تر نہ ہو۔ نظروں سے غائب ہو جاتا ہے ایسا کہ کوئی اسے نہیں دیکھ پاتا، اور وہ سب کو دیکھتا ہے۔

قولہ: وَاَنَّ الْحُبَّ فِی اللّٰہِ وَالْبُغْضَ فِی اللّٰہِ مِنْ اَوْثَقِ عُرَی الْاِیْمَان.

(ارشادِ شیخ ہے) یہ سچ ہے اور درست ہے کہ خدا کے لئے کسی سے دوستی کرنی اور خدا ہی کے لئے کسی سے دشمنی کرنی ایمان کا نہایت مضبوط رشتہ ہے۔

رشتہ اس چیز کو کہتے ہیں کہ اس کے ذریعہ لگاؤ قائم کریں نجات کے لئے۔ اَوْثَق یعنی اس چیز سے نجات کا تعلق ہو۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا فَقَدِ اسْتَمْسَکَ بِالْعُرْوَۃِ الْوُثْقیٰ (بیشک اختیار کیا انہوں نے نجات کے ذریعہ کو)۔

حاصل تقریر یہ ہے کہ جس کسی سے بھی محبت کرو محض خدا کیلئے کرو نہ کہ منفعت اور غرض کے لئے، اور ایسے ہی جس کسی سے دشمنی کرو خالص خدا کے لئے کرو نہ اپنی ہوس عداوت کے لئے، یہ محبت اور یہ عداوت وہ چیز ہے کہ جس سے بندہ نجات پاتا ہے۔

قولہ: وَاجْمَعُوا عَلیٰ اِثْبَاتِ الْکَرَامَاتِ لِلْاَوْلِیَاءِ وَجَوَازِھَا فِی النَّبِیِّ ﷺ وَفِی غَیْرِ عَصْرِہٖ.

(ارشادِ شیخ ہے) صوفیہ کا اس پر اجماع ہے کہ اولیاء کے کرامات ثابت ہیں۔ وہ ان کرامات کا تحقیق پیغامبر ﷺ کے عہد مبارک اور آپ کے زمانہ کے بعد بھی مانتے ہیں، قرآن و احادیث کی دلیل کی روشنی میں۔

کتاب اللہ سے روشنی قصہ مریم میں ملتی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے کُلَّمَا دَخَلَ عَلَیْھَا زَکَرِیَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَھَا رِزْقًا ط کہتے ہیں جاڑوں کے میوے گرمیوں میں اور گرمیوں کا پھل جاڑوں میں جناب مریم کے پاس پہنچتے تھے، اگر بے موسم میوہ نہ ہوتا جناب ذکریا کو تعجب، اور اس تعجب کے تذکرہ کا کیا مزہ ہے، انہوں نے کہا اَنّٰی لَکِ ھٰذَا (یہ تمہارے پاس کہاں سے آیا)۔

اور حدیث نبوی ﷺ کی اس حدیث سے روشنی ملتی ہے رُبَّ اَشْعَثَ اَغْبَرَ ذِیْ طِمْرَیْنِ لَا یُوبَہُ لَہٗ وَلَا یَتَزَوَّجُ الْمُنْعِمَاتِ وَلَا یُفْتَحُ لَہُ السُّدَدُ لَوْ اَقْسَمَ عَلَی اللّٰہِ لَاَبَرَّہٗ. مِنْھُمُ الْبَرَاءُ بْنُ مَالِکٍ. (بہت سے پراگندہ بال، غبار آلود، بوسیدہ لباس، از یک

انداز، جسے دیکھ کر عورتیں پردہ کی ضرورت نہ سمجھیں فارغ البال عورتیں شادی کا پیام نہ دیں۔ جن کے لئے کوئی شخص بھی اپنا دروازہ وانہ کرے۔ اپنے باطن کے لحاظ سے ایسے ہوتے ہیں کہ اگر اپنے خدا پر اعتماد کر کے کسی بات پر قسم کھالیں تو خدائے تعالیٰ اسے پورا کرنا اپنے اوپر واجب کرلے۔ انہیں میں برّہ ابن مالک ہیں۔)

اگر کوئی کسی بات کا دعویٰ کرے اور اس دعویٰ پر قسم کھالے اس پر خداوند تعالیٰ اس کو سچ کر دکھلائے تو اس سے بڑھ کر اور کیا کرامت ہوگی۔

سچی بات یہ ہے کہ کرامت کا انکار دو حال سے خالی نہیں، یا تو اس منکر کرامت نے اللہ جل شانہ کو عاجز سمجھا، یا اس نے ولی کو اس کا اہل نہیں جانا۔ اگر خدا کے متعلق یہ سمجھتا ہے کہ وہ عاجز ہے تو کفر ہے اور اگر ولی کو اس کا اہل نہیں جانتا تو یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ یہ اس لئے کہ مومن خود تمام کرامات کے لائق ہے۔ اور وہ ایمان جو اس کو عنایت ہوا ہے وہ خود تمام کرامات سے برتر ہے۔ جب سب سے بڑی کرامت عنایت فرمائی ہے تو پھر دوسری کرامتوں میں کیا کلام ہے۔

کرامت ایک ایسا فعل ہے جو قدرت کی عام روش کے خلاف ہے، تکلفات شرعی پر قائم رہتے ہوئے۔ اگر چہ معجزہ کی حد تک ہو۔ یہ اس لئے کہ جو کرامت ولی سے ظاہر ہوگی وہ سب کی سب پیغمبر علیہ السلام کے معجزہ کے صحیح ہونے کی دلیل ہوگی اور اس پر ان سبھوں کا اتفاق ہے جو کرامت کے قائل ہیں۔ تو وہ چیز جو کسی سے کرامت کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے وہ اس کے لئے تو کرامت ہے لیکن اس کے نبی کا یہ بھی ایک معجزہ ہی ہے۔ یہ کرامت جس سے ظاہر ہوئی اس کی یہ نیکی مخلوق خدا کے درمیان اپنے نبی کی پیروی ہی کی بنا پر اسے ملی ہے۔ تو ان معنوں میں کرامت خود نبی کے زمانہ میں کسی سے ظاہر ہو یا نبی کے زمانہ کے بعد اپنے اس حکم میں برابر درجہ رکھتی ہے۔

سوال: اگر تو یہ کہے کہ معجزہ ایک خلاف عادت فعل ہے جو اس کے نبی کے دعویٰ پر صادق ہونے کی دلیل بنتا ہے۔ پھر تم نے اسی چیز کو نبی کے سوا کے لئے جائز رکھ دیا تو وہ چیز خلافِ عادت کہاں رہی؟ وہ تو مطابق عادت بن گئی۔

جواب: جواب میں میں کہوں گا اس معاملہ میں جو بنیاد تمہیں نظر آتی ہے اس کی

صورت وہ نہیں ہے جوتم دیکھتے ہو۔ کیونکہ معجزہ جو عام عادت کے خلاف ہوتا ہے وہ عامۃ الخلوق کے مقابلہ میں ہوتا ہے۔ لیکن ولی سے جو کرامت ہوتی ہے وہ ولایت واتباع کی وجہ سے نبی کے دعویٰ کی تاکید کرنے والی ہوتی ہے اوراس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ نبی کا دعویٰ ایسا صادق ہے کہ نبی کے دعوی نبوت کی جو بھی متابعت کرے اس میں بھی خلق کی عام عادات کو عاجز رکھنے والی صلاحیت ہو جاتی ہے۔ یہ گویا نبی کے معجزہ کا ایک دوسرا معجزہ ہوا۔ اس سے نبی کے معجزہ کا نقص نہیں ہوتا۔ بلکہ معجزہ کی اس سے تائید وتاکید ہوتی ہے۔ اسی بنا پر طائفہ صوفیہ کا اولیاء کی کرامتوں میں سے سب سے بڑی کرامت ایک یہ ہے کہ دوامی طاعت کی انہیں توفیق ملی، اور عصمت ملی، یعنی گناہوں اور مخالف شرع سے وہ محفوظ رہے۔

سوال: اگر کوئی یہ کہے کہ آج ولی کو خداوند تعالیٰ کا دیدار کرامت کے طور پر ہوتا ہے یا نہیں؟۔

جواب: تو جواب یہ ہے کہ اکابرین صوفیہ اس پر متفق ہیں کہ نہیں ہوتا ہے۔ اور یہ مسئلہ کہ کیا یہ جائز ہے کہ کوئی ولی ہو اور پھر یکایک اس کی عاقبت بگڑ جائے؟ (اللہ اس سے پناہ میں رکھے) اختلافی ہے۔ اور اسی طرح یہ مسئلہ بھی مختلف فیہ ہے کہ کیا ولی یہ جانتا ہے کہ بطریقۂ کرامت کہ اس کی عاقبت بخیر ہے؟ اس پر اتفاق ہے مخلوق میں سے جو لوگ نبی نہیں ہیں وہ کفر سے معصوم نہیں ہیں۔ جب کفر سے معصوم نہیں ہیں تو کفر کے علاوہ دوسرے گناہوں سے بھی معصوم نہیں ہوں گے۔ پھر اگر گناہ صغیرہ یا کبیرہ ان سے سرزد ہوتا ہے تو وہ توبۂ خالص کرتے ہیں ان کو گناہ پر اصرار نہیں ہوتا۔ ہاں اگر اصرار ہے تو یہ اس بات کی ذلیل ہے کہ وہ اولیاء میں سے نہیں ہیں۔ اور وہ جو کہافِی عَصْرِ غَیْرِہٖ (اور نبی کے علاوہ زمانہ میں بھی) ایک گروہ پیغمبر ہی کے زمانہ میں ظہور کرامت کو جائز قرار دیتا ہے اور وہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ جب پیغمبر کے زمانہ میں کسی سے کرامت ظاہر ہو تو وہ کرامت اس پیغمبر کا معجزہ ہوگا جو اس زمانہ میں ہے۔ پھر جب یہی کرامت پیغمبر کے علاوہ زمانہ میں ہو تو یہ صرف اس ولی کی کرامت ہوگی، پیغامبر کا معجزہ نہ ہوگا۔ ایسی شکل میں یہ کرامت پیغمبر کے معجزہ سے التباس پیدا کرے گی۔ اس طرح کہ جب کوئی شخص اس کرامت

کو ایسے شخص سے دیکھے گا جو پیغمبر نہیں ہے لیکن اس کی کرامت معجزہ ہی کی طرح عقل کو عاجز کرنے والی ہے تو اس دیکھنے والے کو شبہہ ہوگا یہ مرد بھی پیغمبر ہی ہے۔ اس لئے ایسی چیز جو نبوت میں شبہہ ڈالنے والی ہو اس کا جائز ہونا درست نہیں۔

قولہ: وَنُبُوَّةُ الْاَنْبِيَاءِ لَمْ تَثْبُتْ بِالْمُعْجِزَةِ وَلٰكِنْ بِاِرْسَالِ اللّٰهِ تَعَالٰى اِيَّاهُمْ وَاِنَّمَا يَظْهَرُ لِلْخَلْقِ مَا كَانَ عِنْدَاللّٰهِ ثَابِتاً.

(ارشاد شیخ ہے) پیغامبروں کی پیغامبری معجزہ سے ثابت نہیں ہوتی۔ ان کی پیغامبری اسی سے ثابت ہوتی ہے کہ اللہ نے ضرورت سمجھی اور انہیں پیغامبر بنا کر بھیجا۔ اور یہ کہ معجزہ ان سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ مخلوق کو اپنی دعویٰ اشتباہ سے عاجز رکھنے کے لئے دعوت خدا کی جناب میں ثابت ہو جائے۔ یعنی پیغامبر اپنی پیغامبری کی بنا پر ہوتے ہیں، معجزہ کی بنا پر نہیں، صرف اللہ کے پیغامبر بنا کر بھیج دینے سے اور ان پر وحی اتارنے سے ہی ان کی پیغامبری ثابت ہو جاتی ہے۔

معجزہ کی تعریف یہ ہے کہ کوئی امر مخلوق کے سوال اور پیغامبر کے دعویٰ پیغامبری کے بعد خلاف عادت صادر ہو۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ جب تک ایک قوم کافر نہیں ہوتی کوئی پیغامبر ان میں نہیں آتا۔ چونکہ کافر ہیں ایمان لانا پیغامبر کے آنے سے قبل ہی ان پر واجب ہو چکتا ہے اس کے باوجود وہ ایمان نہیں لاتے کفر پر قائم رہتے ہیں۔ اسی لئے اللہ ان میں پیغامبر بھیجتا ہے تا کہ وہ ایمان کی جانب بلائے، اور ایمان لانا ان لوگوں پر لازمی قرار دے۔ اور وحدانیت کی دلیلیں قائم کرے، یہ اس لئے کہ قوم کو ایمان قبول کرنے میں کوئی عذر باقی نہ رہے۔ عذر اس لئے نہیں کہ پیغامبر ایسی چیز کی جانب بلاتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان پر پہلے سے واجب کر رکھا ہے۔ اور وہ اللہ کو ایک کہتا ہے، اور اللہ سے شرک کی نفی کرتا ہے، اب پیغامبر کے دعوت کے بعد بھی جب قوم کفر پر اصرار کرتی ہے اللہ اس وقت پیغامبر کو معجزہ دیتا ہے۔ یہ قوم کی حجت پوری کرنے کے لئے تا کہ اس کے بعد ان کا کوئی بہانہ باقی نہ رہے۔

قولہ: وَالْفَرْقُ بَيْنَ الْمُعْجِزَةِ وَالْكَرَامَةِ اَنَّ النَّبِيَّ يَجِبُ عَلَيْهِ اِظْهَارُ الْمُعْجِزَةِ

وَالتَّحدِیُ بِھَا وَالْوَلِیُّ یَجِبُ عَلَیْہِ اَنْ یَّکْتُمَ الْکَرَامَۃَ اِلَّا اَنْ یُّظْھِرَھَااللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ.

(ارشاد شیخ ہے) معجزہ اور کرامت میں فرق یہ ہے کہ کہ صحیح اور درست ہے کہ پیغامبر کے لئے امت کو معجزہ دکھلانا اور اس معجزہ کے ذریعہ ان پر تحدی کرنا واجب ہے۔ اور ولی کے لئے یہ واجب ہے کہ وہ کرامت چھپائے۔ مگر اس وقت جبکہ خود خداوند تعالیٰ ان سے کرامت ظاہر کرادے۔

تحدّی اسے کہتے ہیں کہ اپنے علاوہ تمام دوسروں سے یہ مطالبہ کرنا کہ جو چیز ہم نے دکھلائی ہے ایسی چیز تم بھی پیش کرو۔ یہ اس لئے کہ نبی کو اظہار نبوت ضروری ہے۔ کیونکہ نبوت سے مقصود خلق کو دعوت اسلام دینا ہے اور وہ نبوت کو ظاہر کئے بغیر ٹھیک طور سے انجام نہیں پا سکتا۔ جب نبی پر نبوت کا اظہار اور اپنی نبوت کا دعویٰ کرنا نبی کا حق ہے تو پھر یقیناً دلیل کے طور پر یہ ضروری ہے کہ معجزہ دکھلایا جائے، ولی کے لئے کرامت چھپانا واجب ہے۔ یہ اس لئے کہ ولایت کا حق چھپانا ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ ولایت اللہ اور بندہ کے درمیان ایک رمز ہے اور ولایت میں دعویٰ ولایت نہیں ہے۔ جب دعویٰ درست نہیں ہے تو اس پر دلیل لانے کی حاجت نہیں۔ اور جب کرامت کا دعویٰ کیا تو رمز ظاہر ہو گیا ولایت نہیں رہے گی۔ تو ولی کے لئے کتمان نبوت ہدم نبوت ہے، اور ولی کے لئے اظہار ولایت، ولایت کا گرنا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ صاحب معجزہ قطعی طور پر یہ دکھلا سکتے ہیں کہ یہ میرا معجزہ ہے اور میرے دعویٰ نبوت کی یہ دلیل وحجت ہے۔ بخلاف اس کے ولی قطعی طور پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ میری کرامت ہے۔ یہ اس لئے کہ اس میں مکر واستدراج کا احتمال قائم ہے اور مکر واستدراج کے قیام کے ساتھ وہ قطعی طور پر یہ نہیں جانتا کہ میں خدا کے ولیوں میں سے ہوں، جب ولایت میں قطعی نہیں ہے تو کرامت میں لفظ قطعی کیسے ہوگا۔

اور یہ خارق عادت (خلاف عادت) چار قسم پر ہوتا ہے۔ معجزہ، کرامت، عون، استدراج ومکر۔ پیغامبروں سے جو ظاہر ہوتا ہے اسے معجزہ کہتے ہیں، ولیوں سے جو خرق عادت کا

ظہور ہو اسے کرامت، عوام الناس سے جس کا اظہار ہو وہ عون ہے کفار و منکرین سے جو ظہور پذیر ہو وہ مکر و استدراج ہے۔

قولہ: وَانکَرُوا الْمِرَاءَ فِی الدِّیْنِ.

(ارشاد شیخ ہے) صوفیا دین میں جدال کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ دین میں جدال جھگڑے، سے ضلالت کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ کیونکہ اگلی امتیں جو بھی ہلاک ہوئی ہیں وہ سب کی سب کثرت قیل وقال اور جھگڑا پھیلنے کے سبب ہلاک ہوئی ہیں۔ صحابہ ﷺ جدال میں مشغول نہیں ہوئے ہیں اگر یہ جائز ہوتا تو یقیناً صحابہ اس میں پہل کرتے۔

دوسری بات یہ ہے کہ حق ظاہر ہو چکا تو پھر حق کے ظہور کے لئے مناظرہ کرنا یا جدال کرنا جائز نہیں یہ اس لئے کہ مناظرہ یا جدال حق کے ظاہر ہونے کے لئے ہونا چاہئے اور یہ حاصل ہو چکا ہے اور کہتے ہیں کہ جب کسی شخص کے لئے کوئی چیز قرآن، حدیث شریف اور اجماع امت کے ذریعہ درست ہو چکی اگر اس میں کوئی بدعتی اس سے جھگڑا کرے تو اس جھگڑے کی طرف دھیان نہ دینا چاہئے۔ اس سبب سے کہ اگر جدال و مناظرہ اپنے کو درست کرنے کے لئے ہو تو وہ خود اپنے آپ کو قرآن و حدیث اور اجماع امت کی روشنی میں درست کر چکا ہے جو اس جدال و مناظرہ سے کہیں بہتر ہے۔ اور اگر یہ جدال و مناظرہ دوسرے کو راہ راست پر لانے کے لئے ہے تو دوسرے کو راہ راست پر لانا اس کے لئے واجب نہیں، حدیث شریف میں ہے دَعِ الْمِرَاءَ وَاِنْ کُنْتَ مُحِقًّا تو ان حضرات صوفیا نے دین میں جدال ترک کرنے کی روش اختیار فرمایا ہے اور اپنے آپ کو سنوارنے میں مشغول ہوئے ہیں۔ لِاَنَّہٗ اَھَمُّ عَلَیْہِ. (یہ اس لئے کہ وہی ان کے لئے زیادہ اہم ہے) اگرچہ ظاہر مذہب میں اہل بدعت کے ساتھ جدال و مناظرہ جائز ہے۔

قولہ: وَنَدَبُوْا اِلَی الْاِشْتِغَالِ بِمَا ھُوَ اَھَمُّ عَلَیْھِمْ.

(ارشاد شیخ ہے) طایفہ صوفیہ اس چیز کی طرف مشغول کرتے ہیں جو سب سے زیادہ اہم ہے۔ کیونکہ دعوت مندوب ہے واجب نہیں۔ یعنی لابدیات اور ضروریات کو غیر لابدیات اور غیر ضروریات پر مقدم رکھتے ہیں۔ کیونکہ لابدیات اور ضروریات غیر لابدیات اور غیر ضروریات

سے زیادہ اہم ہے تو جب تک لابدیات اور ضروریات سے فارغ نہ ہولیں، فضولیات جو کہ غیر اہم ہیں اس کی جانب مشغول نہیں ہوتے ہیں۔

چنانچہ نقل ہے کہ ایک درویش سے لوگوں نے کہا کہ تمہارے کپڑے پھٹ گئے ہیں کہا لیکن یہ حلال طریقہ پر ہے۔ پھر کہا بہت کثیف اور میلے ہوگئے ہیں، جواب دیا مگر پاک ہیں یعنی ان دونوں کاموں سے کہیں زیادہ اہم مجھے ایک دوسرا کام ہے مجھے اس کام میں مشغول ہونا ہے نہ ان کاموں میں۔

یوں سمجھو جس شخص کے ذمہ فرض عین ہو وہ فرض کفایہ کی ادائیگی میں لگا رہے، اور یہ دعویٰ کرے کہ اس فرض کفایہ کی مشغولی سے میرا مقصود اللہ ہے تو ظاہر ہے کہ وہ جھوٹا ہے۔ کتنی بڑی حماقت اس شخص کی ہوگی کہ جس کے کپڑوں میں سانپ اور بچھو گھس آئے ہوں بجائے اس کے کہ وہ اسے مار ڈالے وہ پنکھا طلب کرے کہ دوسروں پر سے مکھیاں ہنکائے۔ تو یہ صحیح اور درست ہے کہ اپنے آپ کو ہلاک کرنے والا دوسروں کی اصلاح کی طلب میں ہو، ایسا شخص نادان ہی ہے۔ جس شخص پر اپنے آپ کو درست کرنے کی اہمیت ہے وہ جب تک خود کو راہ راست پر لانے سے فارغ نہیں ہوتا، دوسروں کو راہ راست پر لانے میں مشغول نہ ہو۔ اگر ایسا کرے گا تو یہ صریح نادانی ہوگی اور خود کا ہلاک کرنے والا ہوگا۔

قولہ: وَاجْمَعُوا عَلٰى اِبَاحَةِ لُبْسِ سَائِرِ الْاَنْوَاعِ مِنَ الثِّيَابِ اِلَّا حَرَّمَ الشَّرِيْعَةُ لُبْسَهٗ عَلَى الرِّجَالِ وَهُوَ مَا كَانَ اَكْثَرُهٗ اِبْرِيْسَمًا۔

(ارشاد شیخ ہے) اکابر صوفیہ کا اس پر اجماع ہے کہ جملہ قسم کے کپڑے پہننا مباح ہیں مگر وہ کپڑے جن کا پہننا مردوں کے لئے شریعت نے حرام کیا ہے، مباح نہیں اور وہ کپڑے وہ ہیں جن میں زیادہ حصہ ریشم کا ملا ہوا ہو۔ یعنی جان اور جسم کے لئے جتنی حاجتیں ہیں ان میں لباس کی بھی حاجت ہے اور وہ گرمی اور سردی سے بچنے کے لئے ضروریات زندگی میں ہے۔ جس طرح جان و جسم کی حاجتوں میں سے کھانا، بھوک کو دفع کرنے کے لئے ہے چنانچہ جس طرح نفس کو بقدر حاجت طعام پر قناعت نہیں ہوتی اسی طرح محض ضرورت بھر لباس پر بھی قناعت نہیں ہوتی۔ تو

طالب حق کو چاہئے کہ لباس کے معاملہ میں علم کی اتباع میں اپنے نفس کو روکے، اور علم کی مطابعت سے مقصود یہ ہے کہ شریعت نے جسے مباح قرار دیا ہے۔ اسے اختیار کرے نہ کہ جسے حرام قرار دیا ہے۔ ریشمی کپڑوں کا پہننا ازقسم حرام ہے۔

پیغمبر ﷺ سے منقول ہے کہ اگر کسی نے دس درم میں کوئی کپڑا خریدہ اس دس درم میں ایک درم حرام رقم ہوتو خداوند تعالیٰ اس کے فرضوں اور نفلوں کو قبول نہیں فرماتا۔

دوسری بات یہ کہ لباس پاک ہونا چاہئے۔ یہ اس لئے کہ نماز کے صحیح ہونے کی شرائط میں سے ایک شرط کپڑوں کا پاک ہونا بھی ہے۔ تو ضرورت سے زیادہ کپڑوں پر جس کی نظر ہے وہ فضولیوں کے زمرہ میں ہے۔

قوله: وَيَرَوْنَ الْاِقْتِصَارَ عَلَى الْاَدْوَنِ مِنَ الثِّيَابِ وَالْخُلْقَانِ.

(ارشاد شیخ ہے) اور صوفیہ بالکل معمولی مبتذل، پھٹے پرانے کپڑوں پر اکتفا کرتے ہیں یعنی مبتذل اور پرانے کپڑوں کے پہننے میں عجز وانکسار ہے اور یہ عجز وانکسار بہت بڑی راہ ہے۔

چنانچہ شیخ ابویعقوب ہمدانی رحمتہ اللہ علیہ سے منقول ہے آپ نے فرمایا اگر حلاج کے بیٹے منصور کو معرفت کی پوری حصہ داری ہوتی تو انا الحق کی جگہ انا التراب کہتے خود کو گرادو تاکہ تمہیں اٹھالیں۔ اپنے آپ کو ذلیل سمجھو تاکہ تمہیں معزز بنالیں جتنے درخت لانبے اونچے اونچے ہوتے ہیں ان کے پھل چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں اور جتنے چھوٹے چھوٹے درخت ہیں ان کے میوے بڑے بڑے ہوتے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ پھٹے، پرانے کپڑوں پر گذرا اکتفا کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اس میں عاجزی وانکساری ہے۔ ایسا شخص تکبر ورعونت سے بہت دور ہے۔ حضرت اویس قرنی ﷺ کی نقل ہے کہ کوڑے پر سے کپڑوں کے ٹکڑے اٹھالیتے اور اسے دھوڈالتے اور انہیں کپڑوں سے اپنا لباس بناتے۔ اور گٹھلیاں گلیوں اور راستوں سے چن لاتے اور اسی کو کوٹ کر غذا فرماتے۔ (اللہ آپ پر بے انتہا رحمتوں کی بارش فرمائے)۔

قوله: وَالْمُرَقَّعَاتُ اَفْضَلُ بِقَوْلِهٖ عَلَيْهِ السَّلَامُ مَاقَلَّ وَكَفٰى خَيْرٌ مِمَّا كَثُرَ

وَالْلھیٰ۔

(ارشادِ شیخ ہے) لباس میں مرقعات بہترین لباس ہیں۔ یہ اس لئے کہ پیغمبر ﷺ نے فرمایا ہے کہ جس چیز میں مشقت تھوڑی اور وہ ضرورت کے لئے کافی ہو وہ بہتر ہے اس سے جس میں مشقت زیادہ ہو اور حق سے غافل کر کے اپنے میں مشغول کرنے والی ہو اَلْاِلْھَاءُ مشغول کرنے کے معنیٰ میں، اور مرقع اس کپڑے کو کہتے ہیں کہ جسے کپڑوں کے نئے اور پرانے ٹکروں سے جوڑ جوڑ کر سیا گیا ہو۔ اس کا پہننا سنت ہے لیکن شرط اس میں یہ ہے کہ اس میں غرض سامانِ دنیا کی کمی کرنا ہو اور دل کی فراغت، جب ایسا کرے گا تو جہاں کہیں بھی چاک ہو گا وہاں پر ایک دوسرا ٹکرہ لگا دے گا۔

روایات صحیحہ میں آیا ہے کہ جناب عیسیٰ علیہ السلام کا ایک مرقع تھا، جسے آسمان پر لے جایا گیا۔ ایک بزرگ نے کہا ہے کہ جناب عیسیٰ علیہ السلام کو ہم نے اسی مرقعۂ صوف کے ساتھ خواب میں دیکھا اس مرقع کے ہر ٹکرے سے ایک نور چمک رہا تھا عرض کیا یا حضرت مسیح آپ کے لباس پر یہ کیسے انوار ہیں؟ فرمایا میرے اضطرار کے انوار ہیں۔ ہم نے پیوند کا ہر ٹکرہ ضرورت کی بنا پر لگایا ہے۔

بعض مشائخ ایسے ہوئے ہیں جنہوں نے گدڑی پوشی اختیار فرمائی ہے کوڑہ خانہ سے گرے پڑے کپڑوں کے ٹکرے چن لاتے اس سے مرقع تیار فرماتے۔ جیسے کوڑے پر کے گرے ہوئے ٹکروں کا وہ مرقع بنا لیتے، ان کے لقمے بھی ان دراوزوں سے ہوتے جہاں سے وہ گذرتے۔ اور یہ کام ایسے لوگوں کا ہوتا ہے کہ جنکو کسی کا رجوع کرنا بھی معلوم نہیں ہوتا (یعنی انہیں اس کی بھی خبر نہیں ہوتی کہاں سے ملا کس نے دیا) اور وہ کسی کے ممنون منت نہیں ہوتے۔

اور بزرگوں میں بعض ایسے بھی ہیں جو قیمتی اور فاخرہ لباس پہنتے۔ مرقع اور فقیرانہ لباس نہیں۔ ان کا یہ لباس فاخرہ اپنے حال کے استتار کے لئے ہوتا تا کہ کوئی شخص ان کے حال سے واقف نہ ہو۔ دوسری وجہ گدڑی اور فقیرانہ لباس کے ترک کی یہ ہے کہ جامۂ فقرا اور گدڑی کا جو ادب ہے اس معاملہ میں اپنے سے اس درجہ بدگمان ہیں کہ یہ ادب ہم سے نہ ہو سکے گا۔ یعنی جامہ

فقراء کے پہننے کے بعد اس کے ادب کا جو تقاضہ ہے وہ ہم سے پورا ہو سکے گا بھی یا نہیں۔ اگر چہ یہ وہ لوگ ہیں جن کو اس کے پہننے کا حق ہے۔ اہل دل حضرات کے کام ان کی اپنی نیت صالحہ سے تعلق رکھتے ہیں ایسے کہ جس پر کسی کو اعتراض کا حق نہیں۔ لیکن یہ بھی ہے کہ ہر ایک کے نزدیک یہ بات قابل تسلیم نہیں ہوتی۔ البتہ وہ لوگ جو اپنے نفس کے صفات و احوال سے واقف ہیں، اور ان لوگوں کی پوشیدہ صفتیں جو گم ہو چکی ہیں اس کا علم رکھتے ہیں انہیں یہ بات قابل تسلیم ہوتی ہے۔

قولہ: وَلِاَنَّهَا مِنَ الدُّنْيَا الَّتِىْ حَلَالُهَا حِسَابٌ وَحَرَامُهَا عَذَابٌ وَلِقَوْلِهٖ عَلَيْهِ السَّلَامُ مَنْ تَرَكَ الثَّوْبَ الْجَمَالَ وَهُوَ قَادِرٌ عَلٰى لُبْسِهٖ كَسَاهُ اللّٰهُ مِنْ حُلَلِ الْكَرَامَةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ.

(ارشاد شیخ ہے) مرقع اس لئے کہ فضول اور غفلت میں لانے والے کپڑے اسباب دنیاوی میں سے ہیں، اس میں جو حلال ہے اس کا حساب لیا جائے گا اور جو حرام ہے اس پر عذاب ہوگا یعنی زیادہ کپڑے اپنی جانب مشغول کرنے والے اللہ سے پھیر کر نفس کی رعونتوں کی جانب کھینچتے ہیں، اگر چہ وہ حلال راہ سے حاصل ہوئے ہوں، قیامت کے دن ان کا حساب دینا ہی ہوگا اور حساب سے سلامت رہ کر باہر نکل آنا یہ بہت بڑا کام ہے۔ اور اگر کپڑا حرام ذرائع سے ہیں عذاب میں ڈالیں گے جس سے رہائی نہیں اِلّا یہ کہ فضل خداوندی ہو۔

حضرت شیخ نے انہیں دو دلیلوں پر بس نہیں کیا ہے، تیسری دلیل فرمائی اس طرح کہ ارشاد ہوا مَنْ تَرَكَ الثَّوْبَ الْجَمَالَ الیٰ آخرہ۔ یہ کہ پیغمبر ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو شخص خوبصورت کپڑے ترک کرتا ہے اس حال میں کہ وہ اس کے پہننے پر قادر ہے تو اللہ رب العزت اسے قیامت کے دن عزت و شرافت کے کپڑے پہنائے گا۔ حضرت شیخ نے یہ دلیل اس لئے دی کہ اگر کوئی شخص خوف دلانے والی باتوں سے ثواب جمال سے نہ رکے تو انعامات کے وعدہ سے رکے اور خود کو حضور ﷺ کی سنت کے مطابق بنائے۔

قولہ: وَيَخْتَارُوْنَ لُبْسَ الْمُرَقَّعَاتِ لِمَعَانٍ فِيْهَا اَنَّهَا اَقَلُّ مُؤْنَةً وَاَقَلُّ تَخَرُّقًا وَاَبْقٰى عَلٰى صَاحِبِهَا وَاَقْرَبُ اِلَى التَّوَاضُعِ وَاَصْبَرُ عَلَى الْكَدِّ وَتَرْفَعُ الْحَرَّ وَالْقَرَّ.

لَامَطْمَعَ لِاَهْلِ الشَّرِّ فِيهَا وَيَمْنَعُ عَنِ الْكِبْرِ وَالْفَسَادِ.

(ارشاد شیخ ہے) حضرات صوفیا ان چند وجوہ سے گدڑی پوشی اختیار کرتے ہیں جوان گدڑیوں میں ہے۔ یہ درست ہے اور سچ ہے کہ ان وجود میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ اس میں مشقت کم ہوتی ہے۔ یعنی گدڑی پہننے والے ان لوگوں کی طرح محتاج نہیں ہیں جیسی محتاجی عام عادات کے مطابق کپڑے پہننے والوں کو ہوتی ہے یعنی جو مشقت ان لوگوں کو کپڑوں کی دھولائی وغیرہ میں ہوا کرتی ہے۔ (دوسری وجہ مرقع) بہت کم پھٹتا ہے۔ یعنی اگر پھٹتا بھی ہے تو بہت تھوڑا، اور اپنی مضبوط بنوٹ کے سبب جلد نہیں پھٹتا اور بہت دنوں تک گدڑی پوشوں کے پاس رہتا ہے یعنی باریک کپڑہ جلد پرانا ہو جاتا ہے اور جلد ہی ضائع ہو جاتا ہے اور گدڑیاں بہت دنوں تک رہتی ہیں دیر پا ہوتی ہیں (اور چوتھے) یہ تواضع (عاجزی) سے زیادہ قریب ہے یعنی گدڑی پوشی کی عادت کر لینے میں مرقع کا کھردراپن اور سختی جتنا برداشت کرنا ہوتی ہے نفس اتنا ہی شکستہ ہوتا ہے۔ اور نفس میں جتنا شکستگی پیدا ہوتی ہے اللہ اور خلق اللہ کے ساتھ اتنا ہی عاجزی بڑھتی ہے۔ گدڑی پہننے والے گدائی کرنے پر بہت زیادہ صابر ہیں۔ یعنی جب بہت دنوں پر پھٹتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ بہت ہے اور جب بہت زیادہ ہے تو وہ دوسرے کپڑوں کا محتاج نہ ہوگا اور جب دوسرے کپڑہ کا محتاج نہیں ہوگا۔ تو وہ کپڑوں کے لئے گدائی کرنے اور دست سوال کرنے کا بھی محتاج نہیں۔ کیونکہ زیادہ کپڑے کی خواہش اور ضرورت سے فاضل کی تمنا ایک بلا ہے اور صبر و قناعت سے خالی۔ اور یہ مرقع گرمی اور سردی کو دور کرتا ہے۔ یعنی بہت سارے ٹکرے پر ٹکرے جو اس میں جوڑے جاتے اس کی وجہ سے آفتاب کی گرمی اور لو، موسم سرما کے سردی کی شدت جسم میں اثر نہیں کرتی۔ اور ان گدڑیوں، مرقعات کی چوروں اچکوں کو حرص وطمع نہیں ہوتی۔ یعنی جب چور اور اچکے ان پھٹے پیوند لگے مبتذل کپڑوں کو دیکھتے ہیں تو وہ ان کپڑوں کے پہننے والے نہیں ہوتے۔ لہٰذا وہ ان لوگوں کی آفت سے محفوظ رہتے ہیں۔ اس لئے کہ یہ چور و اچکے ان چیزوں پر ہاتھ مارتے ہیں جس سے ان کی نفس کی خواہش پوری ہوتی ہے ان چیتھڑوں کے کپڑے سے ان کی کیا مراد پوری ہوگی اور ان کو کیا ہاتھ آئے گا۔ اور یہ مرقعے ظلم وفساد سے روکتے ہیں۔ یعنی جب

ان مرقعوں کو اپنے زیب تن پاتے ہیں تو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ جامہ متقیوں صالحوں، عابدوں کا لباس ہے تو بیشک گناہ کرنے سے رکتے ہیں اور اس جامہ کی لاج رکھنے کی وجہ سے بیہودگی، دیدہ دلیری، اور فتنہ وفساد میں مشغول نہیں ہوتے۔

لیکن اس زمانہ میں بعضوں کی مراد اس خرقہ پوشی اور مرقعات پہننے میں جاہ خلق ہے اس پر بھی بزرگان دین کہتے ہیں کہ جائز ہے، کیونکہ لشکر میں بہادر، شجاع ایک ہی ہوتا ہے باقی سپاہی طفیلی ہوتے ہیں۔ پورے گروہ میں محقق بہت تھوڑے ہی ملیں گے مگر اور جتنے ہیں ان کی نسبت ان کی طرف کی جائے گی تو جب کسی ایک چیز میں ان کی مشابہت کرتے ہیں تو اس حکم کے تحت اس میں داخل ہوں گے۔ اور صاحب شرع حضور ﷺ کا یہ فتویٰ ہے مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ جو شخص کسی قوم کی مشابہت اختیار کرتا ہے ان کی روش یا ان کے اعتقاد میں، تو وہ ان میں سے ہے۔

قولہ: رُوِیَ عَنْ عَائِشَه رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ اَمَرَنِی رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَنْ لَا اَطْرَحَ دِرعاً حَتّٰی اُرَقِّعَهُ. وَعَنْ اِبْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہ اَنَّهُ قَالَ فِی حَدِیْثٍ ذَکَرَهُ رَاَیْتُ النَّبِیَّ ﷺ یُرَقِّعُ ثَوْبَهُ وَرَاَیْتُ اَبَا بَکْرٍ رضی اللہ عنہ یَتَجَلَّلُ بِالْعَبَاءِ وَرَاَیْتُ عُمَرَ رضی اللہ عنہ یُرَقِّعُ جُبَّتَهُ بِرُقَاعٍ.

(ارشاد شیخ ہے) حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ مجھے حکم دیا ہے میرے پیارے رسول اللہ ﷺ نے کہ میں پیراہن کو اس وقت تک استعمال سے جدا نہ کروں جب تک کہ اسے پیوند لگا ہوا نہ بنالوں، درع بمعنی قمیص، وَالدرع القمیص اور ابن عمر رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث مروی ہے۔ انہوں نے فرمایا اپنی ایک حدیث میں جس میں انہوں نے تذکرہ کیا ہے کہ میں نے دیکھا پیغمبر علیہ السلام کو کہ آپ اپنے کپڑوں میں پیوند لگاتے تھے۔ اور پھر انہوں نے فرمایا کہ میں نے دیکھا ابوبکر رضی اللہ عنہ کو کہ وہ خود کو ایک کمبل میں چھپائے ہوئے تھے۔ اور انہوں نے فرمایا کہ میں نے عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ وہ اپنے جبہ میں پیوند لگاتے تھے اس سلسلہ میں تو یہاں تک تذکرہ آیا ہے کہ ان کے جبہ میں تیس ۳۰ پیوند تھے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں تَجَلُّلْ ہے تَسَتُّرْ کے معنی میں اور عبا ہے کِسَاء یعنی کمبل اور چادر کے معنی میں۔

بندگی شیخ رحمتہ اللہ نے یہ تمام دلیلیں دوسرے ملبوسات پر مرقع کی فضیلت میں دلائی ہیں تا کہ کسی ایک کو اس بارہ میں شک اور شبہ باقی نہ رہے اور جانے کہ یہ لباس حضور پیغمبر ﷺ اور آپ کے صحابہ اور آپ کے متبعین کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس گروہ کے مشائخ رحمہم اللہ نے مرقع خود بھی پہنا ہے اور اپنے مریدوں کو پہننے کا حکم دیا ہے۔ تا کہ خلق میں ان کی یہ علامت بنے اور تمام مخلوق اس طرح ان کی نگراں ہو جائے کہ اگر ایک قدم یہ لوگ خلاف (سنت و مشرب) اٹھائیں تو تمام لوگ زبان ملامت ان کے حق میں دراز کریں۔ اور اگر یہ لوگ چاہیں کہ اس لباس میں ارتکاب معصیت کریں تو مخلوق کی شرم سے باز رہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ جیسا کہ محققین صوفیا نے فرمایا ہے کہ اصل کام کا لگاؤ طریقت کے محض خرقہ ہی سے نہیں ہے بلکہ عمل سے ہے جب کوئی شخص راہ طریقت سے آشنا ہو جاتا ہے تب قبا اس کے لئے عبا کی جگہ ہو جاتی ہے۔ مطلب یہ کہ اگر یہ لباس اس لئے ہے کہ خدا اسے پہچانے کہ تو خاص اسی کا ہے۔ اس کے لئے لباس کے بغیر بھی وہ پہچانتا ہے۔ اور اگر اس لئے ہے کہ تو خلق میں جتائے کہ میں خدا کا ہوں یہ شکل بھی دو حال سے خالی نہیں تو واقعی اگر ایسا ہے تو دکھلانا۔ اس میں ریا کا شائبہ ہے اور اگر تیرا حال ایسا نہیں ہے تو تیری یہ نمائش تیرا نفاق ہوگا۔

قولہ: وَعَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ ؓ اَنَّهُ قَالَ كَانَ اَحَبُّ الْاَلْوَانِ اِلىٰ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ الْخُضْرَةُ وَثِيَابُ اَهْلِ الْجَنَّةِ خُضْرٌ.

(ارشاد شیخ ہے) حضرت انس ابن مالک ؓ سے مروی ہے انہوں نے روایت کی کہ بے شک حضور ﷺ کو سبز رنگ محبوب و پسندیدہ تھا آپ فرمایا کرتے بہشتیوں کے کپڑے سبز رنگ کے ہوں گے۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ تمام رنگوں میں سبز رنگ مستحب ہے۔ لیکن مریدوں کے لئے مشائخ رحمہم اللہ نے نیلا رنگ اختیار کیا ہے۔ یہ اس لئے کہ نیلا رنگ گرد خورہ ہوتا ہے اور سفید جلد میلا ہو جاتا ہے لہٰذا ان کو بہت زیادہ دھونے کی حاجت ہوگی اور اس سے ان کے معمولات میں رکاوٹ پیدا ہوگی۔ اور اس رنگ کے اختیار کرنے میں دوسری بات یہ ہے کہ نیلا رنگ عام طور سے اہل مصیبت کے لئے مخصوص ہے اور یہ لوگ اپنے کو اہل مصیبت جانتے ہیں اس لئے کہ

اوقات گذشتہ ان کے ان کے خیال میں برباد گئے ہیں۔ سیاہ رنگ بھی گرچہ گردخورہ ہوتا ہے مگر اسے خلفاء (خلفاء سے مراد بادشاہ وامراء ہیں) نے اختیار کرلیا ہے اس لئے ان لوگوں نے اسے ترک فرمادیا ہے۔ اوردوسری بات یہ ہے کہ جب یہ اہل دنیا کے واسطے مخصوص ہوگیا تو تارک دنیا کے لئے یہ زیب نہیں دیتا کہ اسے اختیار کریں۔

قولہ: وَمَارُوِیَ عَنْہُ عَلَیْہِ السَّلَامُ خَیْرُ ثِیَابِکُمُ الْبِیْضُ فَمَعْنَاہُ اَجْمَلُ ثِیَابِکُمُ الْبِیْضُ وَاَلْیَقُھَا بِسَائِرِ النَّاسِ ٥

(ارشاد شیخ ہے) اس حدیث شریف کو بندگی شیخ رحمۃ اللہ نے معترض کے جواب کے طور پر ارشاد فرمایا کہ اگر کوئی سوال کرے کہ پیغامبر ﷺ سے یہ روایت کی گئی ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا ہے تمہارے کپڑوں میں سفید کپڑہ بہترین کپڑہ ہے تو جب سفید رنگ کا کپڑہ بہتر ہوا نیلا وغیرہ اختیار کرنا کہاں سے ثابت ہے۔ جواب میں یہ کہتے ہیں کہ اس حدیث کے معنیٰ یہ ہیں تمہارے کپڑے میں سفید کپڑہ زیادہ حسین ہے اور یہ تمام لوگوں کے لئے زیادہ مناسب ہے۔ تو جب خیر سے مراد جمل لیا جائے، اعتراض وارد نہ ہوگا یہ اس لئے کہ میرا کلام رنگ میں ہے نہ خوبصورتی اور دیدہ زیبی میں۔

ان تمام باتوں کے باوجود بعض بزرگان ایسے ہیں جنہوں نے کپڑہ پہننے میں کوئی تصرف نہیں کیا ہے۔ خداوند تعالیٰ نے اگر ان کو پرانا دے دیا پرانا پہن لیا اگر مبتذل دے دیا اسی کو پہن لیا اگر نیا مل گیا نیا پہن لیا اگر لباس فاخرہ عنایت فرمادیا اسی کو زیب تن کرلیا۔ ان کی نگاہ محض غیب پر ہوتی ہے اور بس جو بھی غیب سے ملے گا اسی کو پہن لیا۔ اگر کوئی ایسا ہے کہ وہ اپنے نفس اور بری صحبتوں سے مطمئن ہے تو وہ جو کپڑہ بھی پہن لے اس کے لئے سب جائز ہے۔ جیسا کہ نقل ہے کہ شاہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ جو اس گروہ کے ایک بزرگ ہیں قبا وکلاہ پہنا کرتے تھے۔

قولہ: وَاجْمَعُوْا عَلٰی اِسْتِحْبَابِ تَحْسِیْنِ الصَّوْتِ بِالْقُراٰنِ مَالَم یَخِلُّ بِالْمَعَانِی لِقَوْلِہٖ ﷺ زَیِّنُوا الْقُرْاٰنَ بِاَصْوَاتِکُمْ وَقَوْلِہٖ علیہ السلام اِنَّ لِکُلِّ شَیْءٍ حُلْیَۃً وَحُلْیَۃُ الْقُرْاٰنِ الصَّوْتُ الْحَسَنُ.

(ارشاد شیخ ہے) حضرات صوفیہ کا اس پر اجماع ہے کہ قرآن مجید کو خوش آوازی سے پڑھنا مستحب ہے یہاں تک کہ قرآن کے معانی میں خلل نہ پڑے۔ یہ اس لئے کہ پیغامبر ﷺ نے فرمایا کہ قرآن کی قرات کو اپنی آوازوں سے زیب وزینت دو۔ اس حدیث شریف سے قرأت کو حسن ورونق دنیا مراد ہے نہ کہ قرآن کو۔ یہ اس لئے کہ قرآن خداوند تعالیٰ کا کلام ہے اور وہ اس کی ایک ایسی صفت ہے جو اس کی ذات پاک کے ساتھ قائم ہے اور زینت دینے کا قول خداوند تعالیٰ کی صفت کے ساتھ درست نہیں۔ اور ضرورت کا اطلاق مخلوق کی صفت پر ہوتا ہے اور قرأت کو زینت دیتا ہے۔

سوال: زَیِّنُوا، امر ہے اور صاحب شرع کا حکم وجوب طلب کرتا ہے تو قرأت قرآن کو زینت دینا واجب ہوگا جواب قرآن کو آواز سے زینت دینا واجب نہیں ہے۔ تب مستحب ہوگا جو واجب کے علاوہ ہے۔ تاکہ محض کلام شارع پر عمل کرنا مراد لیا جائے اور بے معنی نہ چھوڑا جائے، اور وہ جو حضور ﷺ نے فرمایا اِنَّ بِکُلِّ شَیْءٍ حُلْیَةً وَ حُلْیَةُ الْقُرْاٰنِ الصَّوْتُ الْحَسَنُ. یعنی حقیقت ہے کہ ہر ایک چیز کا ایک زیور ہوتا ہے قرآن کا زیور خوش آوازی ہے۔ یہ حدیث بھی قرأت قاری کی تحسین صورت پر مستحب ہونے کی دلیل ہے تاکہ قرآن پڑھنے والا قرآن کو اچھی آواز سے پڑھے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے سرور کائنات ﷺ نے فرمایا ابن مسعود ؓ کو اِقْرَاْ فَقَالَ اَقْرَاُ وَعَلَیْکَ اُنْزِلَ فَقَالَ النَّبِیُّ ﷺ اَنَا اُحِبُّ اَنْ اَسْمَعَ مِنْ غَیْرِیْ. قرأت کرو انہوں نے کہا کہ حضور میں پڑھوں آپ پر قرآن اترا ہے آپ خدا کے پیغمبر ہیں حضور ہم سے بہت بہتر اور بہت اچھا پڑھتے ہیں فرمایا میں پسند کرتا ہوں کہ اپنے علاوہ سے سنوں اور ابن مسعود ؓ قرآن نہایت عمدہ پڑھتے تھے اسی لئے ان کو خاص طور سے کہا گیا نقل ہے حضرت ابوموسیٰ اشعری ؓ قرآن پڑھ رہے تھے پیغامبر ﷺ نے فرمایا لَقَدْ اُوْتِیَ مِزْمَارًا مِنْ مَزَامِیْرِ آلِ دَاوٗدَ. یہ سچ ہے اور درست ہے کہ موسیٰ اشعری کو لحن داؤدی سے حصہ عطا ہوا ہے۔ یہاں پر آل الرجل کے معنی ذات رجل بھی مراد لیا گیا ہے۔

ذکر سماع

قولہ: وَيَكْرَهُونَ الْقِرَاءَةَ بِالْأَلْحَانِ الْمُقَطَّعَةِ.

(ارشاد شیخ ہے) قرآن کو کرخت آواز سے پڑھنا مکروہ جانتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ خداوندتعالیٰ نے سخت آواز کی مذمت فرمائی ہے۔ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ. بہت ہی ناپسندیدہ آواز گدھے کی آواز ہے۔

حکم اشعار و بحث سماع

قولہ: وَاَمَّا الْقَصَائِدُ وَالْاَشْعَارُ فَقَدْ سُئِلَ النَّبِيُّ ﷺ عَنِ الشِّعْرِ فَقَالَ هُوَ كَلَامٌ مَحَسْنُهُ حَسَنٌ وَقَبِيْحُهُ قَبِيْحٌ.

(ارشاد شیخ ہے) لیکن قصیدے اور اشعار کا سننا یہ درست ہے کہ حضور ﷺ سے شعر کے متعلق دریافت کیا گیا ارشاد ہوا وہ ایک کلام ہے اگر اس کے مضامین اچھے ہیں تو اچھا ہے اور اگر برے ہیں تو برا ہے جیسے نثر میں ہے یعنی نثر میں جس عبارت کا سننا حرام ہے نظم میں بھی حرام ہے اور جس کا نثر میں سننا حلال ہے نظم میں بھی حلال ہے۔

قولہ: فَالْحَسَنُ مِنْهُ مَا كَانَ مِنَ الْمَوَاعِظِ وَالْحِكَمِ وَذِكْرِ اٰلَاءِ اللّٰهِ وَنَعْمَائِهٖ وَنَعْتِ الصَّالِحِيْنَ وَصِفَةِ الْمُتَّقِيْنَ فَسَمَاعُهٗ حَلَالٌ.

(ارشاد شیخ ہے) تو عمدہ اشعار وہ ہیں جس میں نصیحتیں ہوں حکمتیں ہوں اور اللہ کے کرشمے یاد دلائے گئے ہوں اللہ کی نعمتیں شناخت کرائی گئی ہوں، صالحین کی صفات بیان کئے گئے ہوں، پرہیزگاروں کو سراہا گیا ہو۔ ان باتوں کو اشعار میں سننا حلال ہے ایسے ہی جیسے ان کو نثر میں سننا حلال ہے۔ اٰلاء وَنعماء دونوں ایک ہی معنیٰ میں ہے اور ایسا بھی کہا گیا ہے کہ اٰلاء کا لفظ باطنی نعمتوں کے لئے استعمال میں آتا ہے جیسے ہاتھوں کی طاقت، آنکھوں کی بینائی، کانوں کی شنوائی، زبان کی گویائی، پیر کی رفتار، اسی طرح کی اور چیزیں اور نعماء کا لفظ ظاہری نعمتوں کیلئے استعمال کیا جاتا ہے جیسے ہاتھ، آنکھ، کان، زبان، پاؤں، وغیرہ لیکن اس کا فرق محل استعمال ہی سے ظاہر ہوتا ہے۔

نقل ہے کہ ابوالحسن سالم رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا کہ آپ سماع کے منکر کیوں ہیں؟ جبکہ

حقیقت ہے کہ اس کو خواجہ جنید، خواجہ سری سقطی، ذوالنون مصری رحمہم اللہ نے سنا ہے تو انہوں نے کہا میں سماع کا منکر نہیں ہوں۔ اس لئے کہ اس کا جائز قرار دیا اور سنا ہے ان لوگوں نے مجھ سے کہیں بہتر ہیں اور وہ جعفر طیار ؓ ہیں۔ ہاں میں منکر ہوں ان چیزوں سے جن کا سماع میں ہونا ناپسندیدہ ہے اور وہ لہو ولعب ہے۔ اور یہ قول صحیح ہے۔ اور انہیں بزرگ سے منقول ہے وہ روایت کرتے ہیں ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے کہ ابو بکر صدیق ؓ پیغامبر ﷺ کے حضور میں حاضر ہوئے حضور ﷺ کے سامنے دو لڑکیاں تھیں جو گیت راگ گا رہی تھیں اور دونوں دُف بجا رہی تھیں حضور ﷺ اس وقت چادر مبارک سر سے پاؤں تک اوڑھے ہوئے تھے۔ امیر المومنین ابو صدیق ؓ آئے اور ان کو آواز دیا۔ اس پر سرکار دو عالم انے رخِ انور سے چادر مبارک ہٹائی اور فرمایا کو چھوڑ دو انہیں اے ابا بکر، کہ آج عید کا دن ہے۔ ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے یہ بھی روایت ہے کہ وہ فرماتی ہیں میں نے دیکھا کہ حضور ﷺ نے مجھے اپنی چادر سے پردہ میں کر لیا اور میں دیکھ رہی تھی حبشیوں کو وہ اپنے کرتب دکھا رہے تھے مسجد کے دروازہ کے سامنے یہ حال اتنی دیر رہا کہ مجھے تکلیف ہونے لگی اور میں نے تکان محسوس کی۔ اور ایسا ہی حضرت ابو طالب مکی رحمتہ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے جو جواز سماع کی دلیل ہے اور اسی طرح بہت سارے سلف صالحین سے منقول ہے جس میں صحابہ بھی ہیں اور تابعین بھی۔

اور شیخ ابو طالب مکی رحمتہ اللہ کا قول بہت ہی معتبر ہے۔ ان کے وفورِ علم کا اعلیٰ مقام ان کے احوال کا کمال، سلف میں جو ان کو فہم وذکا حاصل تھی، ورع وتقویٰ میں وہ جو مقام رکھتے تھے، فہم مسائل میں ان کے جو تجربات تھے یہ سب ان کے فیصلے کے صواب اور اولیٰ ہونے پر دلیل بنتے ہیں۔ پھر وہ دو حدیث جو امہات المومنینؓ سے روایت کی گئی ہے صحیحین میں مذکور ہے۔ اور کہتے ہیں کہ علم سلوک کو سب سے پہلے جنہوں نے تحریر میں لایا وہ ابو طالب مکی ہیں اور وہ تابعین میں سے ہیں اور اس گروہ صوفیہ کو حضرت کی تحریر وتقریر پر کلی اعتماد ہے۔

قولہ: وَمَا كَانَ مِنْ ذِكْرِ الْاَطْلَالِ وَالْمَنَازِلِ وَالْاَزْمَانِ وَالْاُمَمِ الْمَاضِيَةِ فَسَمَاعُهٗ مُبَاحٌ.

(ارشادِ شیخ ہے) اور جن اشعار میں تباہ شدہ کھنڈرات کے ٹیلے ان کے مکانات کا تذکرہ ہو، یا پہلی امتوں کے زمانہ کے احوال ہوں ان کا سننا مباح ہے۔ اسی طرح جیسے ان چیزوں کا نثر میں سننا، اَلطَّلل وہی کھنڈرات کے ٹیلے ایسے ٹوٹے پھوٹے مکانات جس کے کچھ حصے باقی ہوں اور کچھ ڈھیر ہو گئے ہوں۔ اور اس کی جمع اَطْلَال آتی ہے۔

قولہ: وَمَا كَانَ مِنْ هَجْوٍ وَسُخْفٍ فَسَمَاعُهُ حَرَامٌ.

(ارشادِ شیخ ہے) اور جن اشعار میں فحش وسُخف ہو اس کا سننا حرام ہے۔ یعنی جو اشعار مسلمانوں کی مذمت، حقارت، تذلیل وطعن میں ہوں جیسے رافضیوں کے اشعار جو پیغامبر ﷺ کے صحابہ کرام کے حق میں انہوں نے دشمنی سے کہے ہیں۔ یا کوئی ایسی عورت جسے لوگ جانتے ہوں کی صفت بھی لوگوں کے سامنے اشعار میں بیان کرنا حرام ہے یہ اس لئے کہ غیر عورت کی تعریف غیروں کے سامنے بیان کرنا منع آیا ہے۔

ہاں ایسے اشعار جس میں زلفوں کی صفت ہو، خال کا تذکرہ ہو مطلقاً جمال وصورت کے حسن بتائے گئے ہوں، فراق کی باتیں ہوں، وصال کی طلب ہو اور اسی طرح کی باتیں جو ایک عاشق کے تذکرہ میں ہوتی ہیں، مطلقاً اس کا کہنا اور سننا حرام نہیں۔ حرام اس وقت ہوتا ہے کہ اس کے ذریعہ کوئی شخص اپنی فکر غیر عورت سے لگائے جسے دوست رکھتا ہے۔ یا کسی کمسن سے اس وقت یہ اشعار ان بنیادوں پر حرام قرار دیئے جائیں گے۔ یہاں تک کہ اگر اس کے خیال میں اس کی اپنی بیوی یا شرعی باندی آ جائے تب بھی اس کا سننا اس پر حرام نہیں کیونکہ اس کا نثر میں بھی سننا حرام نہیں۔

سُخف کے معنی خفت کے آتے ہیں۔ تمام چیزوں کے ہلکا پن پر سُخف کا اطلاق ہوتا ہے اس موقع پر سخف سے مراد ہے کہ کوئی کسی کا تذکرہ اسے ہلکا کرنے کے لئے یا اس کی کم عقلی و حمق کو بتانے کے لئے کرے۔

قولہ: وَمَا كَانَ مِنْ وَصْفِ الْخُدُوْدِ وَالْقُدُوْدِ وَالشُّعُوْرِ وَمَا يُوَافِقُ طِبَاعَ النُّفُوْسِ فَمَكْرُوْهٌ.

(ارشادِ شیخ ہے) خد وخیال، قد وقامت زلف وگیسو کا ذکر بطور سراپا، ہو جس سے

طبیعتین اور نفس موافقت کرتی ہوں وہ مکروہ ہے۔ یہ اس لئے کہ طبیعت نفس کی موافقت ہے تو جو کچھ سنتا ہے جب نفس کے لئے سنتا ہے تو وہ اپنی خواہشات کے موافق سمجھتا ہے اور وہ عشق باطل کی آگ کو زیادہ تیز کرے گا۔ جب اس آگ کا بجھانا واجب ہے تو اس کا مشتعل کرنا کیسے جائز ہوگا۔ ہاں اگر یہ اس کے عشق کو اس کی اپنی بیوی اپنی کنیز کی طرف لی جائے تو یہ اور دوسرے دنیاوی مباحات میں شمار ہوگا جس سے وہ فائدہ اٹھاتا ہے۔

اس تفصیل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سماع نہ مطلقاً حلال ہے اور مطلقاً حرام ہے جو مطلقاً حلال کہتا ہے وہ غلطی پر ہے اور جو مطلقاً حرام کہتا ہے وہ بھی غلطی کرتا ہے۔ حلال یا حرام اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا جائے تو یہ عنوان درست ہوگا۔

شیخ ابو طالب مکی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تصنیف قوت القلوب میں فرمایا ہے کہ اگر میں سماع کا مطلقاً یا اجمالاً انکار کروں تو میرا یہ انکار ستر ۷۰ صدیقوں کے فعل کا انکار ہوگا۔ محققین صوفیہ کا قول ہے کہ خداوند تعالیٰ کا ایک عظیم سرِّ آدمی کے دل میں ہے وہ دل میں ایسا نہاں ہے جیسے آگ پتھر اور لوہے میں، جس طرح لوہے اور پتھر کے چوٹ پڑنے سے وہ آگ ظاہر ہوتی ہے اور اس پتھر سے باہر آجاتی ہے بالکل ویسے ہی سماع گانا اور خوش آوازی اس سرِّ دل کو جنبش میں لاتا ہے اور اس کے اندر بے اختیار ایک عجیب حال پیدا کر دیتا ہے۔ چنانچہ روایت ہے کہ بندگی شیخ قطب الاقطاب بختیار اوشی رحمۃ اللہ علیہ اس بیت کو سنتے ہی کہ

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را — ہر زمان از غیب جانے دیگر است

اور بندگی شیخ مجد الدین بغدادی رحمۃ اللہ علیہ اس بیت کو سنتے ہی

بے جرم و گناہ عاشقان را مکش — پس بر سر گورشان زیارت مکن

جام شہادت نوش فرمائے۔ اور نقل ہے کہ شیخ شرف الدین کرمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس بیت کو سنتے ہی

دوزے کہ رسد ز جانم آواز مرا — کائے کاہل را عشق در باز مرا

کہا کہ میں ہارا، اور جان دے دی۔

قولہ: **اِلَّا لِعَالِمٍ رَبَّانِيٍّ يُمَيِّزُ بَيْنَ الطَّبْعِ وَالشَّهْوَاتِ وَالْاِلْهَامِ وَالْوَسْوَسَةِ وَقَدْ**

اَمَاتَ نَفْسَهٗ بِالرِّیَاضَاتِ وَالْمُجَاهِدَاتُ وَخَمِدَتْ بَشَرِیَّتُهٗ وَفَنِیَتْ حُظُوظُهٗ وَبَقِیَتْ حُقُوقُهٗ

(ارشاد شیخ ہے) مگر اس عالم کے لئے کہ جو عامل ہو اور وہ عالم ایسا ہو کہ جو طبیعت، شہوت، الہام اور وسوسہ میں اچھی طرح تمیز کر سکتا ہو، اور حقیقتاً اپنے نفس کو طرح طرح کے ریاضتوں اور قسم قسم کے مجاہدوں سے مار ڈالے ہوئے ہو اور اس کی بشریت بجھ گئی ہو اور اس کے نفس کے حظوظ فانی اور مٹ گئے ہوں، اور محض اس کے نفس کے حقوق باقی رہ گئے ہوں۔ یعنی عالم ربانی سماع میں اشعار کا ہر ایک لفظ جو سنتا ہے اس لفظ سے ایک ایسا معنی لیتا ہے جو اس کے حال کے مطابق ہوتا ہے، نہ یہ کہ اس کے ذہن میں لفظ کے محض ظاہری معنی ہوتے ہیں۔ زلف سے وہ کفر کی تاریکی مراد لیتے ہیں کہ جو دوری اور بیزاری کا سبب ہے جیسا کہ یہ شعر ہے۔ بیت۔

رنگ زلفِ تو سیہ کردہ است روئے روز را　　　　نور رویت محو گرداند ظلمت راز شب

نور سے نور ایمان کا مفہوم لیتے ہیں کہ جب موجب قرب و رضا ہے۔ اور ہو سکتا ہے کہ زلف سے سلسلۂ اشکال ربوبیت کا مفہوم لیں اور زلف کے پیچ و خم سے قضا و قدر مراد لیتے ہوں جیسا کہ یہ رباعی ہے۔

گفتم بشمارم سر یک حلقہ زلفش　　　　تا بو کہ بتفصیلش سرِ جملہ برآرم

خندید بمن بر سر زلف مشکینش　　　　یک پیچ بہ پیچید وغلط کرد شمارم

یعنی جب کوئی یہ چاہے کہ اپنے اختیار سے اس کے قضا و قدر کے عجائبات کو ایک سر مو بھی پہچانے ایک ایسا پیچ اس میں پڑ جائے کہ تمہاری تمام گنتیاں غلط ہو جائیں اور تمہاری عقلیں مدہوش و گم ہو کر رہ جائیں۔ اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ لفظ کفر سے اپنی ہستی اور اپنے اعمال کا چھپانا مراد لیتے ہوں اور لفظ ارتداد سے اپنے سے پھرنا سمجھتے ہوں جیسے یہ سنئے۔ بیت

کافر نشوی عشق خریدار تو نیست　　　　مرتد نہ شوی قلندری کار تو نیست

لغت میں کفر کے معنی چھپانے کے ہیں اس شعر کے معنی یہ ہوئے کہ جب تک تیری ہستی اور تیرے اعمال صدق تجھ پر اور تمام خلق سے پوشیدہ نہ ہوں تیرا دعویٰ عشق صحیح نہیں اور جب تک اپنے آپ

سے نہیں لوٹ آتا اور اپنے نفس سے بیزار نہیں ہوتا قلندری کا دم بھرنا تیرے لئے درست نہیں۔ اور اسی طرح مستی، شراب، خرابات، اور ایسا ہی ہر ایک لفظ سے ایک ایسا معنی مراد لیتے ہیں جو ان کے حال کے موافق ہوتا ہے۔ مثلاً یہ شعر جب سنتے ہیں۔ بیت۔

گر مے دو ہزار رطل بر پیمائی ناخود نخوری نباشدت زیبائی

اس سے یہ مطلب لیتے ہیں کہ دین کا معاملہ محض علم اور قیل وقال سے درست نہیں ہوتا جب تک تو خود اس پر عمل نہ کرے اور اس صفت سے متکیف نہ ہو جائے تجھے زیب نہیں دیتا۔ اور لفظ خرابات کے سلسلہ میں جب یہ شعر سنتے ہیں۔ بیت۔

ہر کو بخرابات نشد بے دین است زیرا کہ خرابات اصول دین است

خرابات سے یہ مفہوم لیتے ہیں کہ صفات بشری 'وجود انسانی میں' جو آباد ہے جب تک خراب نہیں ہوتی (یعنی نہیں مٹتی) وہ صفات جو جو ہر انسانی میں نہاں ہے وہ ظاہر نہیں ہوگی اور انسان کا قلب آباد نہ ہوگا۔ جملہ اشعار و الفاظ جو اس طرح کے ہیں اس میں ان لوگوں کے لئے ایک اصل معنیٰ اور مطالب ہیں۔

کہتے ہیں کہ اشعار کی مثال آئینہ کی ہے کہ جیسے آئینہ میں کوئی شکل وصورت معین نہیں ہے ہر شخص اپنی صورت جیسی ایک تصویر اس میں دیکھتا ہے بالکل اسی طرح اشعار میں کوئی معنیٰ معین نہیں ہر شخص اپنے علم اپنی سمجھ اور اپنے حال کے مطابق اس میں مطلب ومفہوم لیتا ہے۔

حقوق نفس اور حظوظ نفس میں فرق یہ ہے کہ نفس کی حاجتیں دو قسم پر ہیں۔ حظوظ و حقوق۔ ضرورت سے زیادہ کا نام حظوظ ہے اور یہ فضول کی قسم ہے۔ نفس کو اس سے روکنا مستحسن اور محمود ہے۔ بقدر حاجت کے لئے حقوق لابدی ہے اور وہ ضرورت کی قسم سے ہے نفس کو اس سے روکنا قبیح اور برا ہے، اگر بھوک کے وقت لقمہ اور پیاس کے حال میں پانی تو نہ دے تو اعضا بیکار ہو جائیں گے فرائض خداوندی فوت ہو جائیں گے نتیجہ ہلاکت ہے اسی لئے شرع نے اس کی اجازت نہیں دی ہے۔ خودکشی کرنے والا بندہ عذاب کا مستحق ہے۔ حدیث شریف میں پیغامبر ﷺ سے روایت ہے کہ عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو حضور ﷺ نے دیکھا کہ نفس کے ساتھ بے انتہا ریاضت

کئے ہوئے ہیں اور مجاہدات سے اس حد کو پہنچ گئے ہیں کہ قوت ان کی ساقط ہوگئی ہے ہاتھ اور پاؤں کی حرکت باقی نہیں۔ آنکھیں قعر دماغ تک دھنس گئی ہیں حضرت رسالت پناہ ﷺ نے جب ان کو اس حال میں دیکھا، پسند نہیں فرمایا ارشاد ہوا یَا عَبْدَ اللّٰہِ اِنَّ لِنَفْسِکَ عَلَیْکَ حَقًّا. اے عبداللہ اسے چھوڑو کیونکہ تمہارے نفس کا تم پر حق ہے، تم جب اس کی ہلاکت کا قصد کروگے تو پکڑے جاؤ گے اور گناہ میں گرفتار ہوگے۔ اور حدیث شریف میں ہے کہ پیغامبر ﷺ نے فرمایا اَرْبَعٌ مِنَ الدُّنْیَا وَلَیْسَتْ مِنْھَا کِسْرَۃٌ تَسُدُّ بِھَا جَوْعَاتَ. وَخِرْقَۃٌ تُوَارِیْ بِھَا عَوْرَتَکَ. وَبَیْتٌ تُسْکِنُکَ مِنَ الْقُرِّ وَالْحَرِّ. وَزَوْجَۃٌ صَالِحَۃٌ تَسْکُنُ اِلَیْھَا. وَمَا سِوٰی ذَالِکَ فَلَیْسَ فِیْہِ حَقٌّ. چار ایسی چیزیں ہیں جو دنیا سے ہیں اور دنیا سے نہیں بھی ہیں۔ روٹی کے ٹکڑے جو تمہاری بھوک سے وابستہ ہیں، کپڑے کے ٹکڑے کہ جس سے تمہاری ستر پوشی ہوتی ہے، اور مکان کہ گرمی اور سردی میں تمہارے سر چھپانے کی جگہ ہے، اور نیک بیوی کہ تم اس سے تسکین حاصل کرتے ہو۔ ان کے علاوہ جتنی چیزیں ہیں اس میں کوئی حق نہیں اور اس سے اس جانب اشارہ ہے کہ ان چار چیزوں پر مزید اضافہ یہ نفس کا حق نہیں ہے۔

قولہ: فَھُوَ کَمَا قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی فَبَشِّرْ عِبَادِیَ الَّذِیْنَ یَسْمَعُوْنَ الْقَوْلَ فَیَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَہٗ.

(ارشاد شیخ ہے) میں آیت کریمہ سے سماع کی قبولیت اور اباحت بطور دلیل پیش کی گئی ہے۔ معنی یہ ہے کہ اے محمد ﷺ میرے ان بندوں کو خوشخبری دے دیجئے جو اللہ و رسول کی باتیں سنتے ہیں اور احسن پہلو سے اس کی پیروی کرتے ہیں جس کی جانب یہ اقوال بہت زیادہ رہنمائی کرتے ہیں۔ یہ سماع ہے اور سماع حق ہے۔ اہل ایمان میں سے کوئی ایسا نہیں جسے اس میں اختلاف ہو، کیونکہ اس سماع کے سننے والے کو ہدایت یافتہ ہونے کا حکم دیا گیا۔ اور بعضوں نے یوں تشریح کی ہے کہ آیت کریمہ میں لفظ قول پر الف، لام، داخل کیا گیا ہے اور وہ جنسیت کے استغراق کے لئے ہے۔ حق تعالیٰ نے اپنے بندوں کی سماعت اور بطریقۂ احسن پیروی کرنے کی مدح کی ہے۔ ظاہر ہے اللہ کی مدح ایسی ہی چیزوں پر ہوگی جو محمود ہو اور شریعت میں پسندیدہ ہو۔ تو اس موقع پر یہ بات

معلوم ہوئی کہ از جنس قول برائے اتباع احسن سماعت کرنا محمود ہوگا نہ مذموم۔

کعبہ اور بادیہ کی مدح میں حاجیوں کے اشعار اور گانے جو خانہ خدا کے آتش شوق کو بھڑکانے والے ہیں، اور غازیوں کے اشعار وگانے جو لوگوں کو آمادۂ جنگ کرتے ہیں، اور جنگ میں دلیر بناتے ہیں۔ اور نوحہ گانا، وہ نوحہ جو اپنی تقصیر پر ہو اس گناہ کے سبب جو اس سے سرزد ہوئے ہیں۔ سبھوں کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ محمود ہے۔ جیسا کہ نوحۂ داؤد علیہ السلام کہ جب وہ نوحہ گاتے سننے والے جان دے دیتے اور ان کے سامنے سے لوگوں کے نعش اٹھائے جاتے تھے۔ ان کے اس سنانے میں اچھی آواز کے ساتھ ایک لَے ہوتی تھی۔

قولہ: وَعَلَامَةُ مَنْ هٰذِهٖ صِفَتُهٗ اَنْ يَسْتَوِىَ عِنْدَهُ الْمدحُ وَالْقَدْحُ وَالْعَطَاءُ وَالْمَنْعُ وَالْجفَاءُ وَالْوَفَاءُ.

(ارشاد شیخ ہے) جو نفس کو ریاضات اور مجاہدات سے مغلوب کئے ہوئے ہو اور اس صفت سے متصف ہو اس کی پہچان یہ ہے کہ اس کے نزدیک خلق کی مدح وذم، عطا ومنع جفا اور وفا سب برابر ہوں۔ یعنی جب اسے کوئی اچھا کہے، اس کی تعریف کرے، اسے کوئی چیز دے اس کے ساتھ وفا کرے، یا اسے کوئی برا کہے، اس کی مذمت کرے اور کوئی چیز نہ دے، اس کے ساتھ جفا کرے تو یہ دونوں قسمیں اس کے نزدیک برابر ہوں۔ نہ اس کے ساتھ محبت اس وجہ سے ہو کہ اس کی تعریف کرتا ہے اور نہ کسی کے ساتھ عداوت اس کی مذمت کرنے کے سبب سے ہو۔ یہ اس کے صحت حال کی دلیل ہے۔ یہ اس لئے کہ ہر شخص ایسی باتوں کا دعویٰ کرتا ہے لیکن محض دعویٰ کرنے سے کوئی شخص اپنے دعویٰ میں صادق نہیں کہا جاسکتا جب تک یہ علامت اس میں نہ ہو اور اس صفت سے وہ متصف نہ ہو۔ اور یہی مقام حریت ہے، حریت بڑا معزز مقام ہے، حضرت خواجہ جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا گیا کہ کیا فرماتے ہیں اس شخص کے حق میں جس کے پاس دنیاوی املاک میں سے کوئی چیز نہ رہی ہو مگر ایک خرمہ کی گٹھلی کے برابر ہو۔ فرمایا اَلْمكَاتِبُ عَبْدٌ وَاِن بَقِىَ عَلَيْهِ دِرْهَمٌ. مکاتب تو غلام ہی ہے عام ازیں کہ اس پر ایک ہی درم باقی ہو۔

قولہ: سُئِلَ بَعْضُ الْمَشَائِخِ عَنِ السَّمَاعِ فَقَالَ مُسْتَحَبٌّ لِاَهْلِ الْحَقَائِقِ. مُبَاحٌ

لِاَهْلِ النُّسُکِ وَالْوَرَعِ. مَکْرُوْہٌ لِاَهْلِ النُّفُوْسِ.

(ارشادِ شیخؒ ہے) بعضے مشائخ رحمہم اللہ سے سماع کی بابت سوال کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ سماع اہل حقائق کے لئے مستحب ہے، عابدوں اور پرہیز گاروں کے لئے مباح ہے نفس پرستوں لذت اندوزوں کے لئے مکروہ ہے، جیسا کہ گذرا۔ اور زیادہ تر نوجوان اسی طرح کے ہوتے ہیں یہ اس لئے کہ جب زلف وخال اور حسن جمال کی تعریف سنتے ہیں تو یہ سماع ان کے عشق باطل کی آگ کو بھڑکاتا ہے اور ان کی شہوت کو حرکت میں لاتا ہے۔

کچھ تو ایسے لوگ ہوتے ہیں کہ دوران سماع ان پر مکاشفہ ظاہر ہوتا ہے عالم غیب سے لطائف کا نزول ہوتا ہے۔ اس طرح کہ بیرون سماع میں نہیں ہوتا۔

سماع کے لئے ایک حکم نہیں:

سماع کے درمیان سماع کی وجہ سے ان حضرات پر جو لطیف احوال نازل ہوتے ہیں اسی کو وجد کہتے ہیں۔ وجد کے معنیٰ پالینے کے ہیں مطلب یہ کہ انہوں نے ایک ایسی حالت پائی جو سماع سے پہلے نہ تھی، اس حال کے سلسلہ میں بڑی طویل گفتگو ہے کہ یہ ہے کیا؟ صحیح یہ ہے کہ اس کی نوعیت ایک نہیں ہوتی، بلکہ اس کی بہت سی نوعتیں ہیں۔

اور متن میں یہ جو کہا گیا کہ اہل زہد اور پرہیز گاروں کے حق میں مباح ہے، اس لئے کہ اگرچہ سماع میں لطایف اور مکاشفہ سے ان کو حصہ نہیں ہوتا۔ پھر بھی ایسی چیزیں نہیں ہوتیں جواز روئے شرع منکر ہے تو ظاہر ہے کہ اور مباحات کی طرح سماع بھی ان کے لئے مباح ہوا۔

قولہ: وَسُئِلَ الْجُنَیْدُ عَنْهُ فَقَالَ کُلُّ مَا یَجْمَعُ الْعَبْدُ بَیْنَ یَدَیِ اللّٰهِ فَهُوَ مُبَاحٌ.

(ارشادِ شیخ ہے) جنیدؒ سے جب سماع کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا جو چیز کہ بندہ کو خدا کی جناب میں جمع کرے وہ مباح ہے۔

یہ گروہ صوفیہ لفظ اور تفرقہ سے جمع وتفرقہ باطن مراد لیتے ہیں۔ حاصل معنی یہ ہوئے کہ جب بندہ کی ہمت ساری چیزوں میں صرف ایک چیز کو طلب کرتی ہے تو اس کو مجتمع کہتے ہیں اور جب اس کی ہمت ہر ایک چیز کی خواہش مند ہو تو اس کو متفرق کہتے ہیں۔ حدیث شریف میں ہے

کہ جس کی ہمت پراگندہ ہوتی ہے خداوند تعالی کو اس کی پرواہ نہیں کہ وہ ہر ایک وادی میں ہلاک ہو جائے۔ یعنی جس کسی وادی میں ہے ہلاک ہو جائے۔ خواہ وادی نفس، وادی شیطان وادی دنیا، وادی خلق، کیونکہ اصل تفرقے یہی چار ہیں۔

یقین کرو کہ جو شخص سماع، وجد اور صوفیوں کے احوال کا انکار کرتا ہے وہ اپنی کم علمی کی وجہ سے کرتا ہے اور اس کا انکار کرنے میں وہ معذور ہے۔ یہ اس لئے کہ خود اس کو یہ بات حاصل نہیں ہے اور نہ اس کی شناخت ہے، جیسے کہ عنّی نامرد لوگ، اگر نامرد اس بات کو باور نہ کرے کہ مباشرت میں ایک خاص لذت ہے تو وہ بیچارہ معذور ہے۔ اس لئے کہ یہ لذت شہوت کی قوت سے ملتی ہے، جب اس میں شہوت پیدا ہی نہیں کی گئی ہے تو وہ کیسے جان سکتا ہے۔ اور نابینا اندھا سبزے اور آب رواں کے نظارے کے لطف ولذت کا انکار کرے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے جبکہ اس کو آنکھ ہی نہیں دی گئی۔ صوفیوں کے کاروبار بہت ہی اونچے اور عظیم ہیں، بہت ہی گہرے اور پوشیدہ ہیں۔ ناجنسوں کو کسی اور دوسری چیز میں اتنی غلط فہمی نہیں ہوتی ہے جتنا کہ ان کے کاروبار میں، اس قدر اشارہ اس لئے کیا گیا تا کہ معلوم ہو کہ یہ بدگمانی کرنے والے خود اپنے نفس کے مظلوم ہیں۔ یہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ طایفہ صوفیہ موجودہ دور کی پیداوار ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ خیال کر کے یہ لوگ خود اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں۔ کیونکہ اس طرح ان لوگوں کے متعلق خیال کرتے ہیں یہ تصرف بیجا سے کام لیتے ہیں۔ یا دوسروں پر انہیں بھی قیاس کرنے کا شیوہ اختیار کرتے ہیں۔

سوال: اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ جب صوفیوں کے سماع کی بنیاد اصل پر ہے اور یہ اللہ کے لئے ہے تو چاہئے کہ سماع کی دعوتوں میں قاریوں، قرآن خوانوں کو بٹھائے تا کہ وہ قرآن سناتے نہ کہ قوالوں اور گوئیوں کو بٹھایا جائے۔ یہ اس لئے کہ قرآن خدائے تعالی کا کلام ہے تو اس کا سننا اولی تر ہے۔

جواب: یہ ہے کہ سماع کا اتفاق قرآن کی قرأت کے ساتھ بھی بہت ہوتا ہے یعنی وہ بھی بہت زیادہ سنا جاتا ہے۔ اور ایسا بھی ہوا ہے کہ بہت سے لوگ قرأت قرآن کے سننے سے

بے ہوش ہو گئے ہیں اور بہت ایسا بھی ہوا ہے کہ لوگوں نے جان دے دی ہے۔ ہاں ایسا کیوں ہوتا ہے کہ قاری کے عوض قوالوں کو بٹھاتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ قرآن کی تمام آیتیں عاشقوں کے احوال سے مناسبت نہیں رکھتیں کیونکہ قرآن میں کافروں کا قصہ، معاملات اہل دنیا کے احکام، اور دوسری بہت ساری چیزیں ہیں، جب قاری یہ آیت پڑھے کہ ماں کو میراث میں چھٹا حصہ ملے گا اور بہن کو نصف، یا یہ آیت پڑھے کہ جس عورت کا شوہر مر جائے اس کو چار مہینے دس دن عدت کے پورے کرنے ہوں گے تو یہ ہر شخص کے آتش عشق کو تیز نہ کرے گی اِلَّا یہ کہ کسی کا عشق انتہا کو پہنچ چکا ہو اور قرآن کا ہر حصہ وہ خدا سے سنتا ہو اور سنانے والے کا واسطہ اٹھ جائے، ہاں ایسا شخص اگرچہ ظاہر میں آیات کے مقصود سے دور ہوگا لیکن باطنی حیثیت سے وہ اپنے مقصود پر ہوگا استغراق کی بنا پر جیسا کہ کہا انا لیلیٰ و لیلیٰ انا۔

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اکثر و بیشتر لوگوں کو قرآن یاد ہے اور بہت زیادہ پڑھتے رہتے ہیں اور سنتے ہیں جو چیز بہت سنی جاتی ہے اس میں یہ کیفیت بھی پیدا ہو جاتی ہے کہ دل پر کم کام کرتی ہے۔ یہ تو منقول ہے حضور ﷺ کے زمانہ میں اہل عرب جب تازہ آتے اور قرآن سنتے تو روتے اور ان پر احوال ظاہر ہوتے جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے جب انہیں دیکھا تو فرمایا کُنَّا كَمَا كُنْتُمْ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُنَا میں بھی قبل تمہارے ہی طرح تھا اب میرا دل پتھر ہو گیا ہے یعنی سماعت قرآن کے لئے اس میں ٹھہراؤ پیدا ہو گیا ہے۔

قولہ: أَمَّا السَّمَاعُ الصَّوْتِ الْحَسَنِ وَالنِّعْمَةِ اللَّطِيْفَةِ فَهُوَ حَظُّ الرُّوْحِ وَهُوَ مُبَاحٌ لِأَنَّ الصَّوْتَ الطَّيِّبَ فِي ذَاتِهِ مَحْمُودٌ.

(ارشاد شیخ ہے) بہر حال سماع اچھی آواز لطیف ادا سے، وہ روح کو لذت بخشتا ہے اور یہ مباح ہے۔ یہ اس لئے کہ اچھی اور پاکیزہ آواز بذات خود محمود ہے۔ یعنی اچھی آواز روح کی لذت کا سبب ہے اپنی لطافت کی اس اشتراک کی بنا پر جو آواز اور روح کے درمیان ہے۔ پھر یہ درست نہیں ہے کہ اس کا سننا اس وجہ سے حرام ہو کہ وہ اچھی ہے اور خوش ہے۔ تمام خوشیاں حرام نہیں ہیں۔ اور خوشیوں میں سے جو حرام ہے وہ نہ اس سبب سے حرام کہ وہ خوش ہے بلکہ اس سبب سے حرام ہے کہ

اس میں ایک قسم کا ضرر ہے۔ اور ایک قسم کا فساد ہے۔ کیا یہ نہیں دیکھتے کہ چڑیوں کی آوازیں سریلی ہوتی ہیں اور وہ حرام نہیں ہیں۔ تو سریلی آواز کا سننا کان کے حق میں ویسا ہی ہے جیسا کہ آنکھ کیلئے سبزہ اور آب رواں کی حیثیت ہے۔ جناب داؤد علیہ السلام کی مدح میں حدیث وارد ہے کہ وہ اپنے اوپر نوحہ، اور زبور کی تلاوت اس خوش الحانی سے کرتے تھے کہ ان کی خوش الحانی سن کر جن وانس، طیور و وحوش جمع ہو جاتے تھے اور ان کی مجلس سے ہزاروں جنازے اٹھائے جاتے تھے۔

قولہ: وَقِیْلَ فِی قَوْلِہٖ تَعَالٰی "یَزِیْدُ فِی الْخَلْقِ مَایَشَاءُ" اَنَّہُ الصَّوْتُ الطَّیِّبُ.

(ارشاد شیخ ہے) کلام الٰہی یَزِیْدُ فِی الْخَلْقِ مَایَشَاءُ کے متعلق یہ بھی کہا گیا ہے کہ یزید میں آواز خوش کی زیادتی مراد ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کے متعلق احسان رکھا ہے اور ظاہر ہے کہ احسان کسی نعمت ہی پر رکھا جاتا ہے ایسی چیز پر جو محمود ہے۔

قولہ: وَقَالَ بَعْضُھُمْ اِنَّ الصَّوْتَ الطَّیِّبَ لَایُدْخِلُ فِی الْقَلْبِ شَیْئًا وَلٰکِنَّہٗ یُحَرِّکُ مَافِی الْقَلْبِ.

(ارشاد شیخ ہے) بعض صوفیوں کا قول ہے بے شک خوش الحانی دل میں کوئی مزید چیز داخل نہیں کرتی بس اتنا ہوتا ہے کہ جو چیز دل میں ہے خوش آوازی اس میں تحریک پیدا کر دیتی ہے۔ تو سماع کے حکم کا تعلق دل سے ہے۔ یعنی جس کے قلب میں ایسی چیز ہے کہ شروع میں وہ محمود ہے، محبوب ہے، اور اس کی قوت بھی مطلوب ہے، جب سماع سے اس میں افزائش و زیادتی ہو تو سماع سننے والے کو اس میں ثواب حاصل ہوگا۔ اور جس کے دل میں ایسی چیز ہے جو شریعت میں مذموم ہے اور یہ راگ و راگنی اس میں تحریک پیدا کر دیتی ہے تو اس سماع کے سننے والے کو اس پر عذاب ہوگا۔ اور جس کا دل ان دونوں چیزوں سے خالی ہے یعنی نہ محمود، نہ محبوب نہ مکروہ، نہ مذموم شرعاً۔ لیکن ایسا شخص محض طبیعت میں ایک لذت پاتا ہے تو یہ سماع اس کے لئے مباح ہوگا جیسے اور دوسری تمام لذتیں۔

قولہ: ثُمَّ اِنَّ اَھْلَ السَّمَاعِ فِی سَمَاعِھِمْ مُتَفَاوِتُوْنَ ط فَمِنْھُمْ مَنْ یَّغْلِبُ عَلَیْہِ فِی حَالِ سَمَاعِہِ الْخَوْفُ وَالْحُزْنُ وَالشَّوْقُ فَیُؤَدِّیْہِ اِلَی الْبُکَاءِ وَالْاَنِیْنِ

وَالشَّھقَةِ وَتمزِیقِ الثِّیَابِ وَالغَیبَةِ وَالاِضطِرَابِ.

(ارشادِ شیخ ہے) پھر حقیقاً اہل سماع اپنے سماع میں ایک دوسرے سے مختلف المراتب ہوتے ہیں، پھران میں سے بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جن پر حالت سماع میں خوف، اندوہ، اور شوق کا غلبہ ہوجاتا ہے۔ اور وہ اس غلبہ حال سے رُونا، نالہ کرنا، نعرے لگانا، کپڑے چاک کرنا شروع کر دیتے ہیں بے ہوش ہوجاتے ہیں اور اضطراب میں آجاتے ہیں۔ یہ باتیں جو ظہور پذیر ہوتی ہیں اس کو تواجد کہتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ سماع کی مثال اہل سماع کے لئے مانند آفتاب کے ہے کہ تمام چیزوں پر اس کی روشنی پڑتی ہے اور ہر چیز پر یہ تابش اس کے مقدار اور رتبہ کے اعتبار سے ہوتی ہے اور اسی اعتبار سے بہ لحاظ مشرب اس کا ذوق بلند ہوتا ہے، کوئی ایک جلتا ہے، کسی ایک میں روشنی کی تیزی ہوتی ہے، کسی ایک میں نوازش عطا کا سکون ہوتا ہے، کسی دوسرے میں گداز و تڑپ ہوتی ہے۔

قوله: وَمِنهُم مَن یَغلِبُ عَلَیهِ الرِّجَاءُ وَالفَرحُ وَالاِستِبشَارُ فَیُؤَدِّیهِ اِلَی الطَّربِ وَالرَّقصِ وَالتَّصفِیقِ کَمَا رُوِیَ اَنَّ دَاوٗدَ عَلَیهِ السَّلَامُ. اِستَقبَلَ السَّکِینَةَ بِالرَّقصِ فَقَالَت لَهٗ زَوجَتُهٗ اَترقُصُ وَاَنتَ نَبِیٌّ فَقَالَ لَهَا اَتحکُمِینَ عَلیٰ قَلبِی فَاَنتِ طَالِقٌ.

(ارشادِ شیخ ہے) اور ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں کہ ان پر امید و خوشی، اور فرحت غالب ہوتی ہے وہ اس غلبہ میں رقص و طرب کرنے لگتے ہیں۔ اور تالیاں بجانے لگتے ہیں۔ درمیان قوالان سماع گا رہے تھے جب ان کی نظر حضرت شیخ پر پڑی خاموش ہوگئے۔ خواجہ نے فرمایا کیوں چپ ہوگئے کہتے جاؤ جو کہہ رہے تھے۔ اگر عالم کے تمام نغمے میرے کانوں کے گرد اکٹھا ہوجائیں تو میرے اندوہ کی مشغولیت سے ہٹا کر مجھے اپنی جانب نہیں موڑ سکتے۔ جو غم مجھے ہے وہ اس سے مجھے شفا نہیں دے سکتے۔

قوله: حُکِیَ عَن اَبِی عَبدِاللّٰهِ اَحمَدُ بنِ عَطَاءِ الرُّودَبَارِیِّ اَنَّهٗ قَالَ شَرطُ الصَّادِقِ فِی السَّمَاعِ ثَلٰثَةٌ. اَلعِلمُ بِاللّٰهِ. وَالوَفَاءُ بِمَا هُوَ عَلَیهِ. وَجَمعُ الهِمَّةِ.

(ارشاد شیخ ہے) ابی عبداللہ احمد ابن عطار رودباریؒ (رود بار مکران سے قریب ہے) کی حکایت ہے یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے فرمایا سماع میں صادق کی علامت تین ہے۔ ایک یہ کہ بواسطۂ علم وہ خدا کے ساتھ ہو، دوسرے یہ کہ اس میں وہ وفاداری برتے، تیسرے یہ کہ ہمت جمع رکھے۔ علم بخدا ہے، یعنی وہ عارف ہواس کی ذات کا صفات کا اس کے افعال کا، اور اگر ایسا نہیں تو فکر محض میں پڑ جائے گا۔ جب اسے ذات وصفات کی معرفت نہ ہوگی اور سماع محبت خداوندی میں سنے گا تو تشبیہ میں پڑ جائے گا۔ تو جس کو خداوند تعالیٰ کے ذات وصفات وافعال کی معرفت نہ ہوگی اسے نہیں چاہئے کہ خدا کی محبت میں سماع سنے۔ اور وفا، یعنی شریعت کی رو سے جو حقوق اس پر واجب ہیں اس کو وفا کیے ہوئے ہو اور ان سب کو بجالائے ہوئے ہو، اور ان سب سے فارغ ہو۔ اور جمع ہمت حاصل ہو یہاں تک کہ بجز خدا کے اس کی ہمت کسی اور جانب نہ جائے۔

بزرگوں نے کہا ہے، جمع ہمت کی تعریف یہ ہے کہ اس کے دل میں بجز حق تعالیٰ کے اور کوئی چیز نہ ہو۔ اور سوائے اللہ کے ذکر کے کسی چیز میں آرام نہ پائے۔ اور حق تعالیٰ کے علاوہ کسی سے کوئی مطلب نہیں رکھتا ہو، اور دونوں عالم کی یافت اسے آسودہ نہ کرے۔ دونوں جہان اسے سیر نہ کریں۔ وجود و عدم اور اس کے علاوہ اس کے نظر میں کچھ نہ ہو۔ بس ایک ذات حق ہو، کیوں کہ وہ تو دریائے وحدت میں غرق ہو چکا ہے۔ جو کچھ سنتا ہے اسی سے سنتا ہے غیر سے نہیں۔ صحابہ کے فعل کا انکار ہے اور ان کے فعل کو خلاف شرع کی جانب منسوب کرنا ہے۔

قولہ: قَالَ اَبُو عُبَيْدَةَ اَلْحَجَلُ اَنْ تَرْفَعَ رِجْلاً وَتَقْفِزَ عَلَى الْاُخْرىٰ وَقَدْ يَكُوْنُ ذٰلِكَ بِالرِّجْلَيْنِ جَمِيْعاً اِلَّا اَنَّهٗ قَفْزٌ وَلَيْسَ بِمَشْيٍ.

(ارشاد شیخ ہے) ابو عبیدہ کا قول ہے حجل یہ ہے کہ ایک پیر کو تو اٹھائے اس طرح کے دوسرے پیر پر زور دے اور کبھی یہ شکل دونوں پیر پر ہوتی ہے۔ مگر بالجملہ یہ سچ ہے کہ اس میں تڑپ ہوتی ہے یہ کوئی رفتار نہیں ہے یعنی اس طرح سے نہیں کہ دونوں پیر سے کودتا ہوا چلے، بلکہ وہ تڑپ ہی کی قسم ہے جیسا کہ فقد کے سلسلہ میں ہم نے کہا اَلْقَفْزُ پاؤں سے پاؤں پر کودنا۔

قولہ: قَدْ يُحْدِثُ لِلْمُسْتَمِعِ فِي حَالِ سَمَاعِهٖ شَيٌّ اِلٰى مَا يَذْكُرُ فَيَثِبُ مِنْ مَّكَانِهٖ

مِثْلِ مَنْ یُّدِیْدُ الذَّھَابَ اِلیٰ مَحْبُوْبِہٖ فَاِذَا عَلِمَ اِنْ لَا سَبِیْلَ لَہٗ اِلیٰ ذٰلِکَ کَدَّرَ الْوُثُوْبُ مِرَارًا اِذْ یَدُوْرُ دَوْرًا مُتَتَابِعًا۔

(ارشادِ شیخ ہے) یہ درست ہے اور سچ ہے کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اہل سماع کو حالت سماع میں اس چیز کا شوق پیدا ہو جاتا ہے جو اسے یاد آتی ہے پھر وہ اپنی جگہ سے جست کرتا ہے اور اس شخص جیسا فعل اس سے ظہور میں آتا ہے جو اپنے محبوب کی طرف جانا چاہتا ہے اور جب اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ مجھے محبوب کی جانب جانے کی راہ نہیں اور کودنے سے اس کی طرف نہیں پہنچتا تو بار بار اچھلتا کودتا، متواتر، پے بہ پے گردش کرنے لگتا ہے کہ مَنْ مَنِعَ عَنِ النَّظْرِ یَتَمَلّٰی بِالْاٰثِ تو جب بے چارہ محبوب کا دیدار نہیں کر سکتا تو کیا کرے کسی چیز سے اپنے کو تسلی دیتا ہے اَلْوَثْبُ وَالْوُثُوْبُ کودنا۔

قولہ: وَقَدْ یَکُوْنُ ذٰلِکَ مِنْ تَرَدُّدٍ یَظْھَرُ فِیْ حَالِ السَّمَاعِ بَیْنَ الرُّوْحِ وَالْجَسَدِ وَذٰلِکَ لِاَنَّ الرُّوْحَ رُوْحَانِیَّۃٌ عُلْوِیَّۃٌ وَالْجَسَدُ سِفْلَانِیٌّ خُلِقَ مِنَ التُّرَابِ وَالرُّوْحُ یَعْلُوْ اِلیٰ فَوْقٍ وَالْجَسَدُ یَنْزِلُ اِلیٰ مَحَلِّہٖ اِلیٰ اَنْ یَّفَحَ السُّکُوْنُ۔

(ارشادِ شیخ ہے) یہ سچ اور درست ہے اور کبھی یہ کودنے اور اچھلنے کی کیفیت اس معنی کے ورود سے ہوتی ہے جس کی کیفیت سماع کرنے والے پر حالتِ سماع میں جسم و روح کے درمیانی نظام پر ہوتی ہے۔ اور یہ بست و کشاد اس وجہ سے ہوتی ہے کہ روح کی اپنی خالص روحانی کیفیت ہے اور وہ علوی ہے اور جسم سفلی ہے خاک سے پیدا کیا گیا ہے تو روح علو کی جانب اٹھتی ہے اور جسم کا میلان نیچے کی جانب ہوتا ہے، جو اس کا محل ہے۔ اس بنا پر قرار و سکون اس کا آنا جانا ہے، اس سے یہ گمان نہیں کرنا چاہئے کہ ایسا شخص جو خود کو زمین پر ڈالتا ہے یا گردش کرتا ہے، اور اضطراب میں ہوتا ہے یہ اپنے وجد میں اس شخص سے زیادہ مکمل ہے جو اپنی جگہ پر ٹھہرو ساکن ہے۔ بلکہ بسا اوقات ساکن رہنے والے از روئے وجد زیادہ مکمل ہوتے ہیں متحرک ہونے والے سے۔ بلکہ بہت ایسے شخص سماع میں ہوتے ہیں کہ جو ساکن ہیں لیکن وہ کامل وجد میں ہیں ان کا وجد اس متحرک شخص سے کہیں بڑھا ہوا ہے۔

نقل ہے کہ امام جنید رحمتہ اللہ علیہ ابتدائی زمانہ میں حرکت فرماتے اور جھومتے تھے مقام انتہا میں جب پہنچے تو ساکن ہو گئے ذرا جنبش نہیں کرتے لوگوں نے اس کے متعلق ان سے پوچھا فرمایا تم میری رفتار کو نہیں دیکھتے۔ جب رفتار انتہائی تیز ہوتی ہے تو معلوم نہیں ہوتی ہے بادصبا یوں گذر جاتی ہے کہ کسی کو خبر نہیں ہوتی۔ اور یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ. (تم دیکھتے ہو پہاڑوں کو گمان کرتے ہو کہ اپنی جگہ ساکن ہیں، حالانکہ وہ چل رہے ہیں ایسے جیسے بدلی چلتی ہے۔

قوله: وَقَدْ يَكُونُ ذٰلِكَ مِنْهُمْ عَلىٰ سَبِيلِ التَّفَرُّجِ وَالتَّفَسُّحِ وَالتَّطَايُبِ فِي حَالِ السَّمَاعِ وَلَيْسَ بِمَحْظُوْرٍ.

(ارشاد شیخ ہے) اور یقیناً کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ان کا یہ رقص حال سمع میں کشادگی دل اور ایک دوسرے کو خوش کرنے کے طور پر ہوتا ہے۔ اور یہ ممنوع نہیں ہے۔ فقر اور تفسح ہم معنی ہیں اس میں کچھ فرق بیان کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ تفرح مخصوص ہے اس کشادگی کیلئے جو دل کو اندوہ کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ اور تفسح عام ہے کشادگی کے لئے۔ عام ازیں کہ وہ غم سے کشادگی ملی ہو یا اس کے علاوہ سے اور تطائب حالت سماع میں وجد و حال کے اظہار کئے بغیر ممنوع نہیں اِذالرَّقْصُ مِنْ غَيْرِ اِظْهَارِ الْوَجْدِ مُبَاحٌ قَدْفَعَلَ. بَعْضُ الصَّالِحِيْنَ. (کیونکہ رقص وجد کے اظہار کئے بغیر مباح ہے۔ اور بعض صالحین نے ایسا کیا ہے) جب کوئی سچے وجد میں بغیر زیادہ تکلف اٹھ جائے تو قوم کو بھی ان کی موافقت میں قیام کرنا چاہئے۔ یہ آداب مجلس ہے۔

اور دوسری دلیل یہ کہ مسجد نبویؐ کے در کے سامنے حبشیوں نے رقص کیا ہے مگر پیغامبر علیہ السلام نے منع نہیں فرمایا ہے۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ ممنوع نہیں ہے اس کے باوجود کہا گیا ہے کہ اگر کوئی ہمیشہ اس رقص کی عادت کرلے تو ممنوع ہوگا۔ یوں سمجھو کہ جیسے کبھی کبھی مزاح کرنا مباح ہے لیکن اگر کوئی مزاح کی عادت اختیار کرلے تو وہ مسخر ہوگا اور یہ درست نہیں ہے۔

سماع میں تکلف دو طرح کے ہیں۔ ایک وہ تکلف جو سامع طلب جاہ اور منفعت دنیاوی کے لئے کرے تو یہ درست نہیں۔ سماع میں تکلف کی دوسری قسم وہ ہے جو طلب حقیقت کے

لئے کیا جائے۔ جیسے کہ تواجد کے ذریعہ وجد کی کیفیت طلب کرنا اور وہ روتی شکل بنانے کی مثال میں ہے اور وہ جائز ہے جیسا کہ پیغامبرں نے فرمایا ایسے شخص کے لئے جسے قرآن کی سماعت میں گریہ کے وقت گریہ نہ آئے تو کم از کم وہ اپنی رونی شکل بنائے اور یہ تو تکلف ہی ہوگا، اسی موقع پر بعضوں نے کہا ہے کہ طلب احوال میں کسب کو کچھ دخل ہے۔ ظاہر ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو حدیث مذکور میں تبا کی یعنی بہ تکلف رونی شکل بنانے سے کیا فائدہ۔

قوله: اِلَّا اَنَّهٗ لَيْسَ مِنْ صَفَاتِ الْمُحَقِّقِيْنَ.

(ارشاد شیخ ہے) یہ صحیح ہے کہ یہ رقص محققین جو حال و مرتبہ رکھتے ہیں اس اعتبار سے ان کے اوصاف نہیں ہیں۔ کیونکہ یہ لوگ اس کے محتاج نہیں کہ رخصت کے درجہ تک اتریں۔

خواجہ ممشاد دینوری کا ایک وقت ایک گروہ کے نزدیک سے گذر ہوا کہ جن کے درمیان قوالان سماع گا رہے تھے جب ان کی نظر حضرت شیخ پر پڑی خاموش ہو گئے خواجہ نے فرمایا کیوں چپ کیوں ہو گئے۔ کہتے جاؤ جو کہہ رہے تھے۔ اگر عالم کے تمام نغمے میرے کانوں کے گرد اکٹھا ہو جائیں تو میرے اندوہ مشغولیت سے ہٹا کر مجھے اپنی جانب نہیں موڑ سکتے، جو غم مجھے ہے وہ اس سے مجھے شفا نہیں دے سکتے۔

قوله: حُكِيَ عَنْ اَبِي عَبْدِ اللّٰهِ اَحْمَدِبْنِ عَطَاءِ نِ الرُّوْدَبَارِيْ اَنَّهٗ قَالَ شَرْطُ الصَّادِقِ فِي السَّمَاعِ ثَلٰثَةٌ. اَلْعِلْمُ بِاللّٰهِ وَالْوَفَاءُ بِمَا هُوَ عَلَيْهِ وَجَمْعُ الْهِمَّةِ.

(ارشاد شیخ ہے) ابی عبداللہ احمد ابن عطا رودباریؒ (رود بار مکران سے قریب ہے) کی حکایت ہے یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے فرمایا سماع میں صادق کی علامت تین ہے۔ ایک یہ کہ بواسطۂ علم وہ خدا کے ساتھ ہو، دوسرے یہ کہ اس میں وہ وفاداری برتے، تیسرے یہ کہ ہمت جمع رکھے۔ علم بخدا ہے، یعنی وہ عارف ہو اس کی ذات کا صفات اسکا اس کے افعال کا، اور اگر ایسا نہیں تو فکر محض میں پڑ جائے گا۔ جب اسے ذات وصفات کی معرفت نہ ہوگی اور سماع محبت خداوندی میں سنے گا تو تشبیہ میں پڑ جائے گا۔ تو جس کو خداوند تعالیٰ کے ذات وصفات وافعال کی معرفت نہ ہوگی اسے نہیں چاہئے کہ خدا کی محبت میں سماع سنے۔ اور وفا، یعنی شریعت کی رو سے جو حقوق اس پر

واجب ہیں اس کو وفا کیئے ہوئے ہو اور ان سب کو بجالائے ہوئے ہو، اور ان سب سے فارغ ہو۔ اور جمع ہمت حاصل ہو یہاں تک کہ بجز خدا کے اس کی ہمت کسی اور جانب نہ جائے۔

بزرگوں نے کہا ہے، جمع ہمت کی تعریف یہ ہے کہ اس کے دل میں بجز حق تعالیٰ کے اور کوئی چیز نہ ہو۔ اور سوائے اللہ کے ذکر کے کسی چیز میں آرام نہ پائے۔ اور حق تعالیٰ کے علاوہ کسی سے کوئی مطلب نہیں رکھتا ہو، اور دونوں عالم کی یافت اسے آسودہ نہ کرے۔ دونوں جہان اسے سیر نہ کریں۔ وجود وعدم اور اس کے علاوہ اس کے نظر میں کچھ نہ ہو۔ بس ایک ذات حق ہو، کیوں کہ وہ تو دریائے وحدت میں غرق ہو چکا ہے۔ جو کچھ سنتا ہے اسی سے سنتا ہے غیر سے نہیں۔ رباعی۔

آنکس کہ بدریائے غمش غرق بود　　　باخلق بود ولے نہ از خلق بود

ناذات وراز جنس مانشماری　　　بسیار میان ماوا و فرق بود

قولہ: وَالْمَكَانُ الَّذِىْ يَسْمَعُ فِيْهِ يَحتَاجُ اِلىٰ طِيْبِ الرَّوَائِحِ وَالْحُضُوْرِ وَالْوِقَارِ وَعَدَمِ الْاَضْدَادِ وَرُوْيَةُ مَن يَّتَلَهّىٰ وَمَنْ يَّتَبَسَّم.

(ارشاد شیخ ہے) مجلس سماع میں خوشبو، حضور قلب سکون، اغیار کا نہ ہونا، ایسے لوگوں کی نظر کا نہ ہونا جنہیں دیکھ کر دیکھنے والے کے دل میں مزاح کی کی کیفیت پیدا ہو، اور ایسے آدمی جو مسکرا رہے ہوں ان کا نہ ہونا۔ ان تمام چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ مطلب یہ کہ جہاں سماع کی مجلس ہوتی ہے اسے معطر کرنا چاہئے تاکہ باطن میں خوشی اور کشادگی پیدا ہو اور کدورتیں دور ہوں۔ یہ مجلس، سکون، حضور، عدم اغیار، کی محتاج ہے اس کا مطلب یہ کہ مجلس میں درویشوں ہی کو ہونا چاہئے اور یہ کہ وہ اہل سماع ہوں اہل دنیا نہ ہوں اور منکر سماع نہ ہوں اور وہ جگہ ایسی ہو کہ تمام مخلوق سے خالی ہو ایسے نوجوان اور ایسے لوگ اس میں حاضر نہ ہوں جن کو ایسے کاموں سے کوئی حصہ نہیں۔

قولہ: وَيَسْمَعُ عَلىٰ ثَلٰثَةِ مَعَافِ اَلْحُبَّهُ وَالْخَوْفُ وَالرِّجَاء.

(ارشاد شیخ ہے) سماع کی سماعت تین طرح پر ہوتی ہے۔ محبت، خوف، اور رجاء۔ مطلب یہ کہ سماع جو سنتے ہیں۔ کبھی خدا کی دوستی کی کیفیت میں تاکہ وہ سماع دوستی میں زیادتی اور استحکام کا سبب بنے۔ اور کبھی خدا سے جدائی اور انقطاع کے خوف کی کیفیت میں اور کبھی دیدار

جمال کے مشاہدہ کیفیت کی امید میں۔اور یہ تمام کے تمام باطنی احوال ہیں۔جس میں بندہ اپنی انہیں کیفیتوں میں مضطرب ہوتا ہے، جوش میں آتا ہے۔آرام نہیں پاتا ہے،اور اس سے باہر نکلنے کی اسے کوئی راہ نہیں ملتی۔تحیر کی کیفیت طاری ہوتی ہے اور ڈر رہتا ہے کہ حیرت سے راہ گم نہ کردے، یاہلاک ہوجائے۔جیسا کہ کہا گیا ہے۔بیت۔

دریاب اگر تو درنیابی ناچیز شوم بدین خرابی

(مجھے تھام لو اگر سہارا نہ دو گے، معدوم ہوجاؤں گا اس بے قراری میں)

ایسے ہی لوگوں کو سماع کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ حالت سماع میں وہ کوئی چیز ایسی سنے جو کہ اس کے وقت کے موافق ہو۔تاکہ اس سے موانست لیں یا کچھ دیر اس حال میں ان کا نفس آرام پائے اور اس طرح وقت کا بوجھ اٹھانے کے لئے قوت حاصل کریں۔اور یہ خود متعارف ہے اشتیاق رکھنے والے اور محبت کرنے والے ہیں۔

وہ لوگ جو صاحب بلا ہیں ان کے نالوں کے سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ اگر نالہ کرنے میں راحت نہ ہوتی تو بلاؤں کے برداشت کرنے کی کسی کو قوت نہ ہوتی اور اس بلا سے زیادہ دشوار اور کون ہوگی کہ انسان اپنے ضعیف قالب میں ذات خداوندی کا بوجھ اٹھائے جیسا کہ کہا ہے۔بیت۔

من چون تو ہزار عاشق از غم کشتم کالو دہ نشد ز خون کس انگشتم

(تیرے جیسے ہزاروں عاشق کو میں نے اپنے غم میں قتل کیا ایسے کہ کسی کے خون سے میری انگلی آلودہ نہ ہوئی)

بشرطیکہ کے اگر کوئی بلا نہ ہوتی تو اس کے لئے یہی بلا کافی تھی کہ وہ نہیں جانتا ہے کہ میرے کام کا خاتمہ فراق پر ہوگا یا وصال پر۔ہاں جب ایسی بلا میں آدمی ہلاکت کے قریب ہوتا ہے اور ہاتھ سے جانے لگتا ہے تو اس کو سماع شفا بخشتی ہے۔یہاں تک کہ کچھ دیر اس کو راحت ملتی ہے اس سے وہ بلا کے برداشت کرنے کی قوت پاتا ہے۔رباعی۔

دل را طمع وصل بلا را اسیر است جاں دردم قہر ہجر و پر خطر است

بیرون وصال و ہجر کارے دگر است ہمت چو بلند شد ہمہ درد سر است

(دل کے لئے وصل کا طمع بلا کے مقابلہ میں ڈھال ہے۔ جان ہجر کے قہر کی گھڑی میں خطرہ میں پڑ جاتی ہے۔ ہجر اور وصال سے باہر ہے تو کام دوسرا ہے ہمت جب بلند ہو۔ یہ سب درد سر ہے۔ کیا دیکھتے نہیں کسی کو جب کوئی بہت بڑا درد ہوتا ہے یقیناً اس کا دل غم و نار سے بھر جاتا ہے۔ اور اس کا نالہ اس کے لئے راحت کا سبب بنتا ہے۔

قولہ: وَالْحَرَكَةُ فِي السَّمَاعِ عَلَىٰ ثَلٰثَةِ اَنْوَاعٍ. اَلطَّرَبُ وَالْوَجْدُ وَالْخَوْفُ.

(ارشاد شیخ ہے) اور سماع کے اندر کی جنبش تین قسم کی ہے طرب، وجد، اور خوف طرب یہ ہے کہ اس کے باطن میں خوشی پیدا ہوا ایسی کہ اس مقام میں اس کو مقصود تک پہنچنے کی امید ہو اور وہ اس حال میں خوش ہو جائے۔ وجد یہ ہے کہ اپنے باطن میں کچھ پائے سماع کی حالت میں، وہ چیز کہ سماع سے قبل نہ پایا ہو۔ اس کیفیت میں سامع صاحب وجد و حال ہو جائے۔ خوف یہ ہے کہ اس کے باطن میں کوئی چیز ظاہر ہو، ایسی کہ اس حال میں اس کو مقصود تک پہنچنے کی امید نہ ہو۔ یَالَیْتَ رَبَّ محمدٍ لَمْ یَخْلُقْ مُحَمَّداً. (اے کاش رب محمد، محمد ﷺ کو نہ پیدا کرتا) یہ جملہ اسی کیفیت کی نشاندہی ہو سکتی ہے۔ عدم کی خواہش کے علاوہ دوسری کس چیز کی طلب ہو گی۔ خدمت شیخ رحمتہ اللہ علیہ نے ذکر کردہ تمام احوال کے لئے علامتیں ظاہر کی ہیں تا کہ صحیح وسقیم ان میں کا ظاہر ہو جائے۔ اور یہ بھی روشن ہو جائے کہ ان میں سے اس وقت یہ معنیٰ ظاہر ہوا ہے۔ اور حضرت شیخ نے ایک ہی معنیٰ بیان کر کے ختم نہیں کیا بلکہ ہر ایک کے تین معنیٰ ذکر کیے تا کہ وہ معنیٰ ظاہر ہو اور تینوں علامتیں ظاہر نہ ہوں تو ایک تو ظاہر ہو اور وہ علامتیں یہ ہیں۔

قولہ: فَالطَّرَبُ لَهٗ ثَلٰثَةُ عَلَامَاتٍ الرَّقْصُ وَالتَّصْفِيْقُ وَالفَرْحُ وَالْوَجْدُ لَهٗ ثَلٰثَةُ عَلَامَاتٍ اَلْغَيْبَةُ وَالْاِصْطِلَامُ وَالصَّرْخَاتُ وَالْخَوْفُ لَهٗ ثَلٰثَةُ عَلَامَاتٍ اَلْبُكَاءُ وَاللَّطْمُ وَالذُّهْرَاتُ.

(ارشاد شیخ ہےؒ) پھر طرب۔ اس کی تین علامتیں ہیں۔ رقص کرنا۔ ہاتھ پر ہاتھ مارنا، اور خوشی ظاہر کرنا۔ وجد کے لئے بھی تین علامتیں ہیں۔ اپنے اوصاف سے غائب ہو جانا کبھی غلبہ حق میں اس کی کوئی صفت باقی نہیں رہتی۔ نعرہ مارنا۔ خوف کی تین علامتیں ہیں۔ رونا، چہرہ پر تماچہ

مارنا، تیز سانس چلنا۔ یعنی سماع کے سننے والے پر جب طرب ظاہر ہوتا ہے اس حال میں کبھی وہ ناچتا ہے، کبھی ہاتھ سے ہاتھ مارتا ہے کبھی خوشی کا اظہار کرتا ہے۔ اور جب وجد ظاہر ہوتا ہے اس حال میں کبھی غائب ہو جاتا ہے اپنے اوصاف سے اور صرف اسی ایک مقرر صفت میں ٹھہر جاتا ہے۔ اور کبھی حق کے غلبہ میں پڑتا ہے اور مصطلم ہو جاتا ہے۔

اصطلام کے معنیٰ لغت میں اپنی جڑ سے اکھڑ جانے کو کہتے ہیں۔ لیکن اس طایفہ کی اصطلاح میں اس لفظ سے یہ معنیٰ مراد لیتے ہیں کہ حق کا غلبہ کبھی پورے طور پر اپنا مقہور اور اسیر بنا دیتا ہے اور اس کے اپنے اوصاف اس سے جدا ہو جاتے ہیں۔

کبھی وجد میں سامع بے ہوش کی طرح ہو جاتا ہے اور نعرہ مارتا ہے اور جب خوف ظاہر ہوتا ہے تو اس حال میں رونے لگتا ہے، اپنے چہرہ اور گال پر تماچہ مارتا ہے، ٹھنڈی سانس باہر لاتا ہے اور اندر کھینچتا ہے غمزدہ اور اندوہ گیں کی طرح۔

اَلزَّفِیرُ سانس لینا اور اسی کا مقابل شہق ہے،، سانس باہر نکالنا۔ اَلزَّفِیرَۃُ اسم ہے جمع اس کی زُفَرَات آتی ہے۔

ایک بزرگ سے منقول ہے ان سے 'درست وجد' کے متعلق پوچھا گیا فرمایا مجلس میں جب سب ہم جنس ہوں اضداد نہ ہوں تو اس کی پہچان یہ ہے کہ لوگوں کا دل اسے قبول کرے۔ اور اگر مجلس میں اغیار کی بھی آمیزش ہے تو ہم جنسوں کو اس سے اُنس ہو اور اغیار کو اس سے وحشت ہو۔

الحمدللہ ترجمہ شرح آداب المریدین حصہ اول تمام ہوا
بمنہ و کمال کرمہ

فصل-۵

فروغِ دین اور اس کے احکام کے بیان میں

قولہ: واما فروع الدین و احکامه فقد اجمعوا علی وجوب تعلم مالا یصح جهله من احکام الشریعة وما یحل وما یحرم.

(ارشادِ شیخ ہے) حضرات صوفیا کا اس پر اجماع ہے کہ ان چیزوں کا سیکھنا واجب ہے جن سے جاہل رہنا جائز نہیں ہے اور وہ احکام شرعیہ اور حلال وحرام کے مسائل ہیں۔

شرح: حضرات صوفیا کا اس بات پر اجماع اور اتفاق ہے کہ ان چیزوں کا سیکھنا واجب ہے جن سے جاہل رہنا جائز اور درست نہیں ہے۔ وہ توحید وایمان کے بعد شریعت کے احکام ہیں جیسے نماز وروزہ اور دوسرے تمام فرائض، مالی وبدنی عبادات اور وہ جو حلال ہے اور حرام ہے۔ سارے معاملات علم ہی سے درست ہوتے ہیں۔

جس علم سے اعمال درست وصحیح ہوتے ہیں وہ علم شریعت ہے۔ یہ بات اس لئے کہی گئی کہ ملحدوں کی جماعت میں بعض لوگ ایسے ہیں جو اپنے کوصوفیا کی جماعت سے منسلک سمجھتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ بندہ ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں عبادت کی ذمہ داری اس پر سے اٹھ جاتی ہے۔ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ اسی کو ظاہر فرمارہے ہیں کہ یہ ضلالت وگمراہی ہے۔ اس لئے

کہ جس کا مقامِ باطن جتنا زیادہ صاف، درست اور قریب ہوگا اس کا ظاہر اتنا ہی زیادہ باادب اور باحرمت ہوگا اسی کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے یُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (البقرہ:۲۵۷) (نکال لیتا ہے انہیں اندھیروں سے نور کی طرف)

ظلمات دو طرح کے ہیں: (۱) ظلماتِ ظاہر (۲) ظلمات باطن

ظلماتِ باطن: کفر ہے، ضلالت ہے اور بدعت ہے۔

ظلماتِ ظاہر: بے حرمتی، بے ادبی اور تقصیر ہے۔

لہٰذا ظلماتِ باطن، باطنی صحت سے ختم ہوتی ہے۔ اور ظلماتِ ظاہر کا اٹھنا ظاہری صحت پر منحصر ہے۔

کہتے ہیں کہ جب حضرت امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے عبادات کے احکام پر ایک کتاب تصنیف کی تو لوگوں نے ان سے کہا نماز و روزہ زھد سے قریب ہے؟ فرمایا یہ غلطی ہے۔ زھد کی اصل اور بنیاد حلال کھانے پر ہے۔ جس شخص کو اس کتاب کا علم نہیں ہوگا وہ حلال نہیں کھا سکتا۔ اور جب حلال نہیں کھائے گا تو پھر حرام کھائے گا اور جب حرام کھائے گا تو نہ اس کا فرض قبول ہوگا اور نہ نفل۔ جیسا کہ حدیث شریف میں حضرت ابن عباس ﷛ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر رات بیت المقدس پر فرشتہ آواز لگاتا ہے کہ جو حرام کھاتا ہے اس کا نہ صرف قبول ہوتا ہے، نہ عدل۔ صرف نفل کو کہتے ہیں اور عدل فرض کو۔

کہا جاتا ہے جو چالیس روز تک مشتبہ لقمہ کھاتا ہے اس کا دل سیاہ ہو جاتا ہے۔

اور یہ جو کہا گیا کہ علم شریعت کا حاصل کرنا بندہ پر فرض ہے اس میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ سب سے پہلے علم توحید اور علم معرفت کو مستحکم کیا جائے۔ اس لئے کہ اصل یہی ہے اور علم شریعت تو فرع ہے۔ مرفوع کی بنیاد اصل پر ہوتی ہے۔ کیا آپ نے یہ نہیں دیکھا کہ انبیاء علیہم السلام نے سب سے پہلے بندوں کو توحید کی دعوت دی۔ جب اس کو قبول کر لیا تو پھر شریعت کی طرف بلایا۔ اہل سنت و جماعت کا مذہب بھی یہی ہے کہ کفار شریعت کے مخاطب نہیں ہیں۔

اگر کوئی کافر سو سال کی عمر میں دولتِ ایمان سے مشرف ہوتا ہے تو اس پر سو سال گذشتہ

کے نماز وروزہ کی قضا نہیں۔

اس سے یہ بات ظاہر ہوگئی کہ توحید ومعرفت اصل ہے اور شریعت اس کی فرع۔ اصل کے بغیر فرع کی درستگی ممکن نہیں۔

اسی لئے کہتے ہیں کہ جو شخص علم شریعت کو مقدم نہیں رکھتا اور جماعت صوفیاء کے علم میں قدم رکھتا ہے تو وہ دین کو برباد کررہا ہے۔

جماعتِ صوفیاء کا پہلا علم اعمال کی برائیوں اور خرابیوں کو جاننا ہے۔ اگر کوئی شخص احکام کو درست کئے بغیر اعمال کی برائیوں کو سیکھتا ہے تو سمجھ لے کہ اعمال تک اس کی رسائی نہیں ہوئی۔ وہ رک گیا۔ اور دین کو برباد کیا۔

ہاں! جب اعمال کو علم شریعت کے مطابق درست کرلیا اس کے بعد اعمال کی برائیوں کو سیکھتا ہے تو اس وقت اس کے اعمال میں اخلاص پیدا ہوگا۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے بھی عبادت کو اخلاص کی شرط کے ساتھ واجب کیا ہے۔

عبادت معاملات ہے اور اخلاص معاملات سے برائیوں کو نکالنا ہے۔ تو سب سے پہلے معاملات کا وجود ہے۔ اس کے بعد معاملات سے عیبوں کو نکالنا ہے۔ اور معاملات علم شریعت کے بغیر درست نہیں ہوسکتے۔

قولہ: لیکون العمل موافقاللعلم فقد قیل اذا تجرد العلم عن العمل کان عقیماً و اذا خلل العمل عن العلم کان سقیماً

(ارشاد شیخ ہے) تاکہ عمل، علم کے مطابق ہوجائے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کہا گیا ہے کہ اگر علم عمل سے خالی ہے تو وہ عقیم ہے اور جب عمل، علم سے خالی ہو تو وہ سقیم۔)

شرح: یہ سچ اور درست ہے کہ جب علم عمل سے خالی ہوتا ہے تو وہ عقیم ہے یعنی اس سے کوئی پھل ملنے والا نہیں۔ اور جب عمل، علم سے خالی ہوتا ہے تو وہ سقیم یعنی نادرست ہے۔

العقیم: وہ ہوا جو نفع بخش نہ ہو، وہ دن جس میں بھلائی نہ ہو اور وہ عورت جس کو اولاد نہ ہو۔

السقیم: بیمار۔ اس سے نادرستی مراد ہے۔

حدیث ہے المتعبد بلا فقه کالحمار فی الطاحونة۔ جس عابد کو فقہ کا علم نہیں وہ کولہو کے اس گدھے کی طرح ہے جو کھمبے کی چاروں طرف دن بھر چکر لگاتا رہا اور جہاں سے چلا تھا وہیں کا وہیں ہے۔ کچھ بھی راستہ اس نے طۓ نہیں کیا۔

عوام کی ایک جماعت علم کو عمل پر ترجیح دیتی ہے اور دوسری جماعت عمل کو علم پر افضل سمجھتی ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں قال نہیں عمل چاہیئے اور بعض لوگوں کا کہنا ہے عمل نہیں علم چاہیئے ——— اور یہ دونوں باتیں غلط اور باطل ہیں۔ علم کے بغیر چارہ نہیں۔ علم ہی سے عمل درست ہوتا ہے۔

لیکن یہ بات بھی سامنے رہے کہ علم بے انتہا ہے اور زندگی مختصر ——— تمام علوم کا حاصل کرنا فرض نہیں ہے۔ بس اتنا علم حاصل کیا جائے جتنا شریعت کا تقاضا ہے اور جن سے معاملات صحیح و درست رہ سکتے ہیں۔

حضرت خواجہ ابراہیم ادھم رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا میں نے راستہ میں ایک پتھر دیکھا جس پر لکھا تھا "مجھے پلٹ کر دیکھئے اور پڑھیے"۔ فرماتے ہیں کہ میں نے جب اس پتھر کو پلٹ کر دیکھا تو اس پر لکھا تھا انت لا تعمل بما تعلم کیف تطلب مالا تعلم۔ جب تم اپنے علم کے مطابق عمل نہیں کرتے تو پھر یہ بھی محال ہے کہ جس کا تمہیں علم ہی نہیں۔ اس کی طلب کرو۔

یعنی بندوں کے کام یہ ہیں کہ وہ علم اور جانکاری حاصل کرے تاکہ اس کی برکت سے جس کا علم نہیں وہ علم بھی حاصل ہو جائے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ جب علم کی دولت حاصل ہو گئی تو پھر معاملات میں کوشش کرے۔

علم دو کوششوں کے درمیان ہے۔ ایک تو جہد طلب جو اس کے حصول سے پہلے ہوتی ہے اور دوسرا جہد استعمال ——— یعنی ایک کوشش علم کے حاصل ہونے کے پہلے حاصل کرنے کے لئے۔ اور دوسری کوشش علم حاصل کرنے کے بعد اس علم کے استعمال میں۔

اگر طلب کو مقدم نہیں رکھیں گے تو جاہل رہ جائیں گے۔ خدا کی معرفت حاصل نہیں ہوگی اور عبادت کو صحیح طریقہ سے نہ کرنے کی وجہ کر رسوا و ذلیل ہوگا۔ اگر علم حاصل کر لیا۔ لیکن علم

کے مطابق عمل نہیں کیا تو اس پر حجت اور وبال ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ دونوں جہان میں علم سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں۔ اسی لئے جو چیز محترم و باعزت ہوتی ہے وہ اپنی ذات سے مشکل و دشوار ہوتی ہے اور اس کی طلب و یافت بھی مشکل ہو جاتی ہے۔ اور اسی سے بندہ کی نجات و خلاصی وابستہ ہوتی ہے۔

اس جماعتِ صوفیا کے جملہ مشائخ اہلِ علم ہوئے ہیں اور تمام مریدوں کو علم کی طرف مائل کرنے میں متحرک رہے ہیں۔

حضرت ابوعلی ثقفی فرماتے ہیں کہ علم دل کو جہالت کی موت سے نجات دے کر حیات بخشتا ہے اور آنکھوں کو کفر کی تاریکیوں سے نکال کر یقین کی روشنی عطا کرتا ہے۔ جسے علم معرفت حاصل نہیں اس کا دل جہالت سے مردہ ہے۔ اور جس کو علم شریعت نصیب نہیں اس کا دل جہالت کے روگ سے بیمار ہے۔ لہٰذا کافروں کا دل مردہ ہے اس لئے کہ اس کو اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل نہیں۔ اور اہل غفلت کا دل بیمار ہے کیونکہ اس کو اللہ تعالیٰ کے احکام کا علم نہیں۔

قولہ: فقال علیہ السلام طَلَبُ الْعِلم فَرِیضَةٌ علىٰ کُلِ مُسْلِمٍ وَمُسْلِمَةٍ.

(ارشادِ شیخ ہے) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر مسلمان مرد و عورت پر علم طلب کرنا فرض ہے۔

شرح: لیکن اتنا جاننا چاہیئے کہ کون سے علم کی طلب فرض ہے۔ اس مسئلہ میں علماء کے الگ الگ اقوال ہیں

متکلمان کہتے ہیں کہ وہ علم، علم کلام ہے۔ اسی علم کلام کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفت کا علم ہوتا ہے۔

فقہا کہتے ہیں کہ وہ علم، علم فقہ ہے، اسی علم فقہ سے عبادات کا علم ہوتا ہے اور حلال و حرام کی پہچان ہوتی ہے۔ دین میں اتنی مقدار کا جاننا فرض ہے جس کا انسان محتاج ہے اور جس کی ضرورت ہے۔ واقعات و حادثاتِ نادرہ کا جاننا فرض نہیں ہے۔

مفسرین اور محدثین فرماتے ہیں کہ وہ علم، علمِ کتاب و سنت ہے۔ اس لئے کہ قرآن و

حدیث ہی سے تمام علوم تک رسائی ہو سکتی ہے۔

لیکن اختیار کرنے کے لائق تاویل وہی ہے جس کو حضرت ابو طالب مکی رحمۃ اللہ علیہ نے قوت القلوب میں بیان فرمایا ہے اور علم ان پانچ ارکان کا جاننا ہے جن پر اسلام کی بنیاد ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **بنی الاسلام علی خمسٍ شھادۃ ان لا الہ الا اللہ و اقام الصلوۃ وایتاء الزکوٰۃ وصوم رمضان و حج البیت من استطاع الیہ سبیلا۔** اسلام کی بنیاد ان پانچ چیزوں پر ہے (۱) گواہی دینا اس بات پر کہ وجود میں نہیں ہے کوئی معبود اللہ تعالیٰ کے سوا۔ (۲) نماز قائم کرنا (۳) زکوٰۃ دینا (۴) رمضان کا روزہ رکھنا (۵) اگر استطاعت ہو تو خانہ کعبہ کا حج کرنا۔

قولہ: واختار وامن المذاھب مذھب فقھاءِ اصحاب حدیث.

(ارشاد شیخ ہے) اور اختیار کیا ہے جملہ صوفیا نے تمام مذاہب میں فقہائے اصحاب حدیث کے مذہب کو۔

شرح: چنانچہ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فقہائے اصحابِ حدیث میں ہیں۔ جو شخص مذاہب اربعہ میں سے کسی مذہب پر بھی رہا ہو اور اس کے بعد فقر و طریقت کو اختیار کیا ہے تو اس نے حضرت امام شافعیؒ کے مذہب کو اختیار کیا ہے جیسا کہ ان حضرات صوفیا کی کتابوں میں تحریر ہے کہ حضرت امام شافعی سے پہلے جو مشائخ کبار رضوان اللہ علیہم اجمعین اور دیگر ارباب فقر و طریقت ہوئے وہ اسلاف کے مذہب پر تھے اور اپنے شیخ کے مذہب پر تھے جیسے حضرت سلطان العارفین (بایزید بسطامی) قدس اللہ سرہ حضرت ابو جعفر صادق ﷺ کے مذہب پر تھے۔

طریقت میں یہ بات ہرگز درست نہیں کہ کوئی مرید اپنے شیخ کے علاوہ کسی دوسرے شیخ کے مذہب (روش) کو اختیار کرے۔ اور یہ بھی جائز نہیں کہ اپنے شیخ کے حرکات وسکنات کی کوئی مرید مخالفت کرے۔

اسی بات سے کسی کے دل میں یہ خیال پیدا نہ ہو کہ حضرت امام اعظم (ابو حنیفہ) رضی اللہ عنہ

کے مذہب میں کوئی کمی یا خامی ہے۔ حاشا وکلا ایسی بات نہیں۔ حضرت امام اعظم تو بہت بڑے بزرگ ہیں اور ایسے امام ہیں کہ ان کا مذہب پسندیدہ مذہب ہے۔ خود امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت امام اعظم ﷺ کی تعریف میں اشعار کہے ہیں:

لقد زان البلاد ومن علیها	امام المسلمین ابو حنیفه
بایات و اسنادٍ و فقهٍ	کایات الزبور علی الصحیفه
فما بالمشرقین له نظیر	ولا بالمغربین ولا بکوفه
امام الانصار فی الاسلام نورا	امینا للرسول وللخلیفه
فلعنة ربنا اعداد رمل	علی من رد قول ابو حنیفه

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جو مسلمانوں کے امام ہیں انہوں نے قرآن مجید کی آیات اور احادیث پاک کے اسانید کی تشریحات اور فقہ وفتاویٰ کی تدوین کے ذریعہ ملک اور اہل ملک پر اس طرح حکمرانی کی ہے جس طرح زبور نے گذشتہ انبیاء کے صحیفوں پر کی ہے۔

حضرت امام ابوحنیفہ کے جیسا مشرق ومغرب اور کوفہ میں کوئی نہیں ہے۔

مددگاران اسلام کے امام حضرت ابوحنیفہ ایک روشن چراغ ہیں اور رسول خدا ﷺ و خلفائے راشدین کے پیغام کے امین ہیں۔

لہٰذا جو بھی حضرت امام ابوحنیفہ کے قول کی تردید کرتا ہے اس پر ریگستان کے ریگ کی تعداد میں ہمارے رب کی لعنت ہو۔

مشائخ طریقت نے حضرت امام شافعی کے مذہب کو اس لئے اختیار فرمایا کہ حضرت امام شافعی کا مذہب نفس پر سخت اور دشوار تر ہوتا ہے۔ اور صوفیائے کرام کی روش یہ ہے کہ نفس پر غلبہ حاصل کیا جائے۔ نفس کو ذلیل وخوار کیا جائے۔ نفس کو تنگی اور دشواریوں میں ڈالا جائے۔ نفس کا قلع قمع کیا جائے اور دین کے کاموں میں احتیاط کی راہ اختیار کی جائے۔ اسی بنا پر ان حضرات نے امام شافعی کے مذہب کو اختیار کیا ہے ——— ہرگز اور کسی وجہ سے نہیں ———

قولہ: ولا ینکرون الاختلاف بین العلماء رحمة اللّٰه فی الفروع

لقوله علیه السلام اختلاف العلماء رحمة.

(ارشادِ شیخ ہے) علماء کے درمیان فروع میں جو اختلاف ہے صوفیا اس کے منکر نہیں ہیں۔ اس لئے کہ حضرت رسول اللہ ﷺ نے فرمایا علماء کا اختلاف کرنا رحمہم ہے۔

شرح: یعنی احکام شریعت میں عالموں کا اختلاف اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کے لئے رحمت ہے۔ لیکن یہ اختلاف فروعات میں ہو اصول میں نہیں۔ اصول میں اختلاف کا ہونا رحمت نہیں بلکہ ضلالت و گمراہی اور بدعت ہے۔

جماعتِ صوفیا کا مذہب (طریقہ) یہ ہے کہ جس مسئلہ میں فقہا کا اختلاف ہوتا ہے اس میں اس قول کو اختیار کرتے ہیں جو زیادہ مضبوط اور مستحکم ہوتا ہے۔ مثلاً اگر کسی چیز کے جواز اور عدم جواز میں فقہا کا اختلاف ہو جائے تو وہ عدم جواز والے مسئلہ کو اختیار کرتے ہیں تا کہ یقین کے ساتھ اس فرض سے عہدہ برآ ہو سکیں۔ اگر حلال و حرام میں اختلاف ہو جائے تو یہ حضرات حرام کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ اگر حلال ہے تو حلال سے اجتناب کوئی نقصان دہ نہیں۔ اور اگر حرام ہے تو حرام کا ارتکاب نقصان میں ڈال دے گا۔ چنانچہ ترک میں احتیاط کرنا چاہیئے۔ اور دین کے باب میں احتیاط کرنا واجب ہے، احتیاط میں وسعت ہے۔ اسی لئے تو محتاط لوگ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہوتے ہیں اور متوسع (غیر محتاط) لوگ کبھی حق کے ساتھ ہوتے ہیں اور کبھی باطل کے ساتھ۔

اس کا دوسرا مفہوم یہ بھی ہے کہ ہر وہ مسئلہ جس میں فقہا کو اختلاف ہو تو اس کو اختیار کرنا چاہیئے جس میں سب سے زیادہ احتیاط نظر آئے، جو اجماع سے زیادہ نزدیک ہو، جو زیادہ مشکل اور زیادہ گراں بار معلوم ہو۔

ہر وہ طاعت و عبادت جو جسم پر دشوار اور مشکل ہو وہ زیادہ افضل و بہتر ہے۔ اس لئے کہ تمام طاعت و عبادت کا راز نفس کی مخالفت میں ہے۔

یہ باتیں جو کہی گئیں وہ شریعت ہیں لیکن حقیقت تو کچھ اور ہے۔ جماعت صوفیا کی حقیقت کا حال یہ ہے کہ وہ ساری زندگی نفس کی مراد پر ایک قدم بھی رکھنا جائز نہیں سمجھتے۔ لوگوں

نے کہا ہے موافق النفس کعابد الصنم نفس کی مواقفت اور پیروی کرنے والا بت پرست کے جیسا ہوتا ہے۔ کیا آپ یہ نہیں دیکھتے کہ اگر ابلیس کے اندر تعظیمِ نفس کی برائی نہ ہوتی تو لعنت کا بوجھ لئے وہ مارا مارا نہیں پھرتا اور اگر فرعون میں تعظیم نفس کی خرابی نہ ہوتی تو وہ خدائی کا دعویٰ نہیں کرتا۔

قوله: وَسُئِلَ بعضُهُم عَنِ العُلَمَاءِ الَّذِيْنَ اِخْتِلافِهِم رَحْمَةٌ فَقَالُ هُمُ الْمُعْتَصِمُونَ بِكتَابِ اللّٰه تَعالىٰ الْمُجَاهِدُوْنَ فِيْ مُتَابعَةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ عَلَيهِ السَّلام اَلْمُقْتَدُونَ بِاَصحَابِهِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَهُم ثَلاثَة اَصْنَافٍ اصحَابُ الْحَدِيث وَالفُقَهَاء وَالْعُلَمَاءُ الصُّوفِيَة.

(ارشادِ شیخ ہے) وہ علماء جن کے اختلاف کو رحمت کہا گیا ہے سے متعلق ایک محقق صوفی سے جب سوال کیا گیا تو فرمایا یہ وہ لوگ ہیں جو قرآن کریم کو مضبوطی سے پکڑے رہتے ہیں، رسول اللہ ﷺ کی اتباع و پیروی میں لگے رہتے ہیں، اصحاب رسول ﷺ کی اقتدا کرتے ہیں۔ یہ حضرات تین طرح کے ہیں: (۱) اصحاب حدیث (۲) فقہا (۳) علمائے صوفیا۔

شرح: علمائے صوفیا وہ علماء ہیں جو اللہ تعالیٰ کی کتاب کو مضبوطی سے پکڑے رہتے ہیں، ان کی دوسری صفت یہ ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی اتباع و پیروی میں کوشاں رہتے ہیں، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **المجاهد من جاهد نفسه فی طاعة اللّٰه** (مجاہد وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے لئے اپنے نفس سے جنگ کرے) اور اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت کے لئے اپنے حبیب ﷺ کی اتباع کو شرط قرار دے دیا ہے جیسا کہ فرمایا: **ان کنتم تحبون اللّٰه فاتبونی یحببکم اللّٰه** [ال عمران:۳۱] (آپ فرما دیجئے کہ اگر تم واقعی محبت کرتے ہو اللہ سے تو میری پیروی کرو تب محبت کرنے لگے گا تم سے اللہ)۔

جو حضور ﷺ کی اتباع کے بغیر اللہ تعالیٰ سے محبت کا دعویٰ کرتا ہے وہ جھوٹا ہے اور راہِ

مستقیم سے دور ہے۔

حضرت خواجہ ابوسعید ابوالخیر رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے انہوں نے فرمایا کہ اللہ کے رسول ﷺ کا جو قول اور جو فعل میں نے کتابوں میں پڑھا دیکھا اور پایا ان پر عمل کیا اور فرشتوں کے اعمال سے متعلق جو کچھ سنا ان پر بھی عمل کیا۔

تمام مشائخ کی سیرت یہی ہے کہ وہ سنن ونوافل کو اپنے لئے واجب بنا لیتے ہیں۔ اس کی تائید میں یہ روایت پیش کی جاسکتی ہے کہ حضرت ابوعمرو یشخوانی (ویشخوان ہرات کا ایک قصبہ ہے) نے فرمایا کہ تیس سال سے میرا دایاں اور بایاں ہاتھ ناف سے نیچے نہیں گیا مگر اس سنت کی وجہ سے جو میں نے سنا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: الید الیمنی لا عالی البدن والید الیسریٰ لا سافل البدن (داہنا ہاتھ جسم کے اوپر والے حصہ کے لئے ہے اور بایاں ہاتھ جسم کے نیچے والے حصہ کے لئے ہے)

ان علمائے صوفیا کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ اصحابِ رسول ﷺ کی اقتدا و پیروی کرتے ہیں۔ ان کی پیروی اعتقاد میں بھی ہوتی اور اقوال واحوال میں بھی۔ اس لئے کہ صحابہ کرام کا اعتقاد، ان کا قول اور ان کا عمل رسولِ خدا ﷺ کے اعتقاد اور قول وفعل پر مبنی تھا، جیسا کہ حضور ﷺ نے فرمایا: اصحابی کا لنجوم بأیھم اقتدیتم اھدیتم میرے صحابہ ستاروں کی طرح ہیں ان میں سے جن کی پیروی کرو گے ہدایت پاؤ گے۔

عالم ربانی اس عالم کو کہتے ہیں جو علم حاصل کرنے کے بعد علم کے مطابق عمل کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی خیر کی طرف بلاتے ہیں۔ عالم ربانی یہی لوگ ہیں۔

ربانی اس وجہ سے کہتے ہیں کہ ان نے معاملات خواہشات کے تابع نہیں ہوتے۔ وہ رب تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی پر قائم رہتے ہیں۔ ایسے ہی عالموں کے بارے میں کہا گیا ہے من زار عالماً فکانما زار نبیاً جس نے کسی عالم کی زیارت کی اس نے نبی علیہ السلام کی زیارت کی۔ یہی حضرات علمائے سنت وجماعت ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو دنیا پر آخرت کو ترجیح دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کو نفس پر مقدم رکھتے ہیں۔ ان کی علامت و پہچان یہ ہے کہ وہ ہمیشہ حق کے لئے نفس سے

دشمنی رکھتے ہیں، نفس کے لئے حق کی مخالفت نہیں کرتے۔ حق دوست ہے اور نفس دشمن۔ لہٰذا دوست کے لئے دشمن سے جنگ کی جاتی ہے۔ دشمن کے لئے دوست سے جنگ نہیں ہوتی۔

حضرت خواجہ ابو سعید رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں منقول ہے کہ جب ان کو علمِ حال حاصل ہوگیا تو علم قال سے رخ موڑ لیا۔ اپنے کتب خانہ کی ساری کتابوں کو یکجا کر کے دفن کر دیا۔ وہاں پر ایک چبوترہ بنا دیا۔ اس پر ایک درخت لگا دیا، آج تک لوگ اس جگہ کو بابرکت سمجھتے ہیں۔ جب لوگوں نے حضرت سے عرض کی کتابوں کو کیوں دفن کر دیا تو فرمایا کتابیں تو میرے لئے بہترین دلیل تھیں۔ لیکن جب مدلول (جس کے لئے دلیل لائی جائے) حاصل ہوگیا تو پھر دلیل سے لگے رہنا کیا معنی؟ یہ تو بہت مشکل اور محال ہے۔

اس کے بعد فرمایا کہ اس کا راز یہی ہے کہ دوات توڑ دی جائے اوراق جلا دیئے جائیں اور تمام علوم فراموش کر دیئے جائیں۔ یعنی (ظاہری) مشغولیت ترک کر دی جائے۔

لوگوں نے حضرت سے پوچھا یہ کتابیں جو دفن کر دی گئیں اگر کسی کو دے دی جاتیں تو کیا یہ بہتر نہیں تھا؟ فرمایا میں اپنے لئے احسان مندی اور عطاء و بخشش کے تذکرہ کو بھی پسند نہیں کرتا اور پورے طور پر اپنے دل کو ان چیزوں سے پاک رکھنا چاہتا ہوں۔

ان علماء کی تین جماعتیں ہیں (۱) اصحاب حدیث (۲) اصحاب فقہ (۳) صوفیاء فروعی معاملات میں ان کا اختلاف رحمت ہے۔

اس کے بعد ان تینوں جماعتوں کی تفصیل یوں بیان کی گئی۔

قولہ: فَاَمَّا اَصْحَابُ الْحَدِیث فَاِنَّھُمْ تَعَلَّقُوا بِظَاھِرِ حَدِیْث رسولُ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم وھُوَ اَسَاسُ الدِّین لِاَنَّ اللّٰہ تعالیٰ یَقُوْلُ وَمَا اٰتٰکُمُ الرسُول فَخُذُوْہُ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوا وَاشْتَغَلُوا بِسَمَاعِہٖ وَنَقْلِہٖ وَتَدْوِیْنِہٖ وَتَمْیِیز صَحِیحَۃ من سَقِیْمِہٖ وَھُمْ حُرَّاسُ الدِّینِ.

(ارشاد شیخ ہے) یہ سچ اور درست ہے کہ اصحابِ حدیث، رسول اللہ ﷺ کی ظاہری

حدیث سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور ظاہر حدیث سے تعلق رکھنا ہی تو دین کی بنیاد ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے بھی فرمایا وما اتکم الرسول فخذوہ وما نھکم عنه فانتھوا (الحشر: ۷) جو کچھ اللہ کے رسول ﷺ نے تمہارے لئے لایا ہے اسے لے لو اور جن چیزوں سے تم کو منع کریں ان سے باز رہو۔ اصحاب حدیث، حدیثوں کو سننے، نقل کرنے، کتابی شکل دینے، صحیح حدیثوں کو موضوع سے اور قوی حدیثوں کو ضعیف سے الگ کرنے میں مشغول رہتے ہیں۔ یہی دین کے پاسبان اور شریعت کے نگہبان ہیں۔

شرح: التدوین = دیوان میں لکھنا، کتابی شکل دینا۔

اصحابِ حدیث نے سماعِ حدیث کو کافی بنالیا ہے، عقلی معاملات ہوں یا نقلی یا اجتہاد کا معاملہ ہو سب میں اسی نص قرآن وما اتکم الرسول فخذوہ وما نھکم عنه فانتھوا کو بنیاد بنا کر کام کیا ہے۔ چنانچہ اس آیت کریمہ کی روشنی میں رسول اللہ ﷺ کی اتباع و پیروی فرض و لازمی ہے۔ اس کا ترک کسی حال میں نہ ہو۔ اس حکم کی مخالفت ضلالت و ہلاکت کے سوا اور کچھ نہیں۔

خواجہ ابوسعید رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے، انہوں نے فرمایا جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ غزوۂ احد میں حضور نبی کریم ﷺ کا پائے مبارک زخمی ہو گیا تھا اور آپ ﷺ نے انگلیوں کے سہارے کھڑے ہو کر نماز پڑھی تھی تو میں نے بھی انگلیوں کے سہارے کھڑے ہو کر چار سو رکعتیں نماز پڑھی۔

حراس دین = یہ لوگ دین کی ایسی حفاظت کرتے ہیں اور آیات و احادیث پر ایسی نظر رکھتے ہیں کہ کوئی دوسرا اپنے مفاد کے پیش نظر دین میں تصرف نہ کر سکے۔

قولہ: وَاَما الفُقَهَاءُ فَاِنَّهُم فُضِّلُو عَلٰی اَصْحَابِ الْحَدِیث بعد قبولِ عِلْمِهِمْ بِمَا خصُّوا بِهٖ مِنَ الفَهمِ وَالاِستنبَاطِ فی فقه الحدِیثِ والتعمّقِ بِدَقِیقِ النَّظَرِ فِی تَرتِیب الاَحکام وَحدُودالدِّینِ والتَّمِیزِ بَیْنَ النَّاسِخِ و المَنسُوخِ وَالمُطلَقِ

وَالـمُـقَیّدِ وَالمُجمَلِ وَالمُفَسَّرِ وَالخَاصِّ والعَامِ وَالمُحکَمِ وَالمُتَشَابِہِ فَھُم حُکَّامُ الدِّیْنَ وَاعلَامُہُ.

(ارشاد شیخ ہے) یہ سچ اور درست ہے کہ اصحاب حدیث کے علم کو قبول کرنے کی وجہ سے فقہا کو اصحاب حدیث پر فضیلت حاصل ہے۔ یہ فقہا تو وہ ہیں جو اس بات کے لئے مخصوص کردیئے گئے ہیں کہ وہ فقہ حدیث میں معنی کو سمجھیں، ان کو بیان کریں، اپنی باریک نظری سے ان پر غور کریں، دین کے احکام اور دین کے حدود کو مرتب کریں، ناسخ منسوخ، مطلق مقید، مجمل مفسر، خاص عام، محکم متشابہ کو ایک دوسرے سے الگ کریں اور ان چیزوں کے فرق وتمیز کو ظاہر کریں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو دین کی علامت و نشانیاں ہیں دینی معاملات میں انہیں کا حکم چلتا ہے۔

شرح: یعنی یہ لوگ دین کے حاکم اور اس کے مقتدا ہیں۔ اس لئے کہ دوسرے لوگ جو دینی و دنیوی معاملات کو انجام دیتے ہیں وہ انہیں فقہا کے احکام کے مطابق انجام دیتے ہیں۔ چنانچہ دین کے حکام یہی حضرات ہیں۔ اور یہ ایسے ہوتے ہیں جن کو دیکھ کر لوگ سمجھ جاتے ہیں کہ یہ حضرات دیندار ہیں۔ شریعت کے خلاف ان سے کوئی ایسا عمل ظاہر نہیں ہوتا اور نہ ایسے افعال کے مرتکب ہوتے ہیں جو شریعت کے منافی ہو، ظاہری پاکی، باطنی درستگی وصحت کی علامت ہوتی ہے۔ **الظاهر عنوان الباطن**، ظاہر باطن کا عنوان ہوتا ہے۔ جو خواص ہوتے ہیں انہیں کے باطن درست ہوتے ہیں۔

وہ فقہا جن کا اکثر ذکر آیا ہے اور جن کے مذہب کی پیروی واتباع کی بات کہی گئی ہے وہ پانچ ہیں: اماا عظم ابوحنیفہ، امام شافعی، امام احمد حنبل، امام مالک اور امام سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہم۔ ان میں سے سب کے سب عبادت، زہد اور علوم آخرت میں مشہور ہیں اور لوگوں کے دینی و دنیوی مسائل ومعاملات کے فقہی حل کے لئے معروف ہیں۔ ان کا تفقہ محض رضائے الٰہی اور خوشنودی حق کے لئے تھا۔ اللہ تعالیٰ ان پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔

قولہ: وَاَمَّا عُلَمَاءُ الصُّوفِیَۃِ فَاتَّفَقُوا مَعَ الطَّائِفَتَینِ فِی مَعَانِیھِم

وَرُسُومِهِم اِذَا كَانَ ذٰلِكَ مجانباً لِاتِّبَاعِ الهوىٰ وَمَنُوطاً بِالِاقْتِدَاءِ.

(ارشادِ شیخ ہے) علمائے صوفیا وہ حضرات ہیں جو معانی ورسوم میں ان دونوں جماعتوں (اصحابِ حدیث اور فقہا) سے اتفاق رکھتے ہیں۔ بشرطیکہ ان کے وہ رسوم ہوا و ہوس یعنی خواہشات نفسانی سے دور و الگ ہوں۔ وہ اقتدا پر موقوف اور اسی سے وابستہ ہوں۔

شرح: یعنی صوفیائے کرام، اصحابِ حدیث اور فقہا سے ان چیزوں میں اتفاق رکھتے ہیں جو ان کے معانی ورسوم میں ممکن ہوں۔ اس شرط کے ساتھ کہ ان کے وہ معانی ورسوم ہوا۔ یعنی خواہشات نفسانی سے وابستہ نہ ہوں اور صحابہ ﷺ کی اتباع پر موقوف ہوں۔

قوله: فَمَن لَم يُحِطْ مِنَ الصُّوفِيه عِلْماً بِمَا اَحَاطُوا بِهِ يَرْجِعُوْنَ فِيْهِ اليهِم فِي اَحْكَامِ الشَّرْعِ وَحُدُوْدِالدِّيْنِ فَاِذَا اِجْتَمِعُوْا عَلىٰ اِجْمَاعِهِم وَاِذَا اختلفوا اَخَذَا لصوفيه بِالْاَحْسَنِ وَالْاَولىٰ.

(ارشادِ شیخ ہے) وہ صوفیا جو اصحابِ حدیث اور فقہا کے ذریعہ احاطہ کے گئے علوم پر قدرت نہیں رکھتے تو ایسی صورت میں وہ اصحاب حدیث اور فقہا کی طرف رجوع ہوتے ہیں، احکامِ شریعت اور حدودِ دین میں اگر اصحابِ حدیث اور فقہا کا اجماع ہوتا ہے تو وہ صوفیا ان کے اجماع پر قائم رہتے ہیں اور جب اصحاب حدیث وفقہا کا اختلاف ہوتا ہے تو صوفیا احسن واولیٰ کو اختیار کرتے ہیں۔

شرح: ایسے مسائل جن کے جواز اور عدم جواز پر اصحاب حدیث اور فقہا کے درمیان اختلاف ہو تو ان پر عمل کرنا ہے جن میں نفس کو دخل نہ ہو، اس لئے کہ بندہ کا سخت ترین دشمن نفس ہے اور لوگوں کو ایمان سے سب سے زیادہ دور کرنے والا نفس ہی ہے اور یہ ایسا سرکش ہے جس سے نجات پانا بہت مشکل ہے۔ ہاں! مجاہدہ کی چھری سے ذبح کر دیا جائے تو نجات مل سکتی ہے۔

قولہ: وَلَیسَ مِنْ مَذهبِهِمْ طَلَبُ التاوِیلاتِ وُرکُوبُ الشَّهوَاتِ.

(ارشاد شیخ ہے) اور صوفیا کا مذہب یہ نہیں ہے کہ وہ تاویلات کی تلاش وطلب میں لگے رہیں اور شہوات یعنی خواہشات نفس کی تکمیل میں اپنا وقت لگائیں۔

شرح: یعنی صوفیا کی روش تاویلات کی تلاش وطلب اور شہوات وخواہشات کا ارتکاب نہیں ہے۔ وہ اپنے معاملات میں نص ظاہر پر عمل کرتے ہیں۔ تاویل نہیں ڈھونڈھتے۔ اس لئے کہ تاویل میں نفس کی لذت وشہوت اور چھوٹ کا سامان مل جاتا ہے۔ اگر کوئی ہزار سال تک نفس پر قہر ڈھاتا رہے اور صرف ایک بار اپنی مراد کی طرف چل پڑا تو سمجھ لیجئے کہ اس نے اپنی مسلمانی کو زمین پر پٹخ دیا۔ خواجہ عثمان رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی یہ گمان کرے کہ اس پر اس راہ کی کچھ چیزیں کھول دی گئی ہیں مجاہدہ کے ذریعہ، تو ایسا گمان غلط ہے امام ابوعلی رودباری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اگر کوئی صوفی پانچ دن کے فاقہ کے بعد اپنی بھوک کا اظہار کرتا ہے تو اس کو بازار بھیج دیجئے اور کہئے کہ جا کر روزی کمائے۔

صوفیا ان باتوں کی طرف مائل نہیں ہوتے جو کسی طرح اور کسی نوعیت سے بھی شہواتِ نفس سے مطابقت رکھتی ہوں۔ جو بات نفس کے لئے مشکل ترین ہوتی ہے اسی کو اختیار کرتے ہیں۔ یہ لوگ نفس کے مخالف ہوتے ہیں موافق نہیں۔ نفس کے ساتھ موافقت کرنا اس گرم ہوا کے مترادف ہے جو ہلاکت خیز ہوتی ہے۔

دوسری بات یہ کہ تاویلات کی تلاش وطلب مجاہدۂ نفس سے فرار ہے اور مراد ومقصد کی تکمیل میں نفس کو قرار ہے، ایسی صورت میں صوفیا اس کو اختیار کرتے ہیں جو جسم پر بار اور نفس پر دشوار ہے۔ افضل الاعمال اشقها علی البدن۔ بہترین اعمال وہ ہیں جو جسم پر سخت اور دشوار تر ہوں۔

شہوات یعنی نفس کی خواہشات کا ارتکاب صوفیا نہیں کرتے۔ نفس کی مراد پر ایک قدم بھی نہیں چلتے، نفس کی آرزو وخواہشوں کو پوری نہیں کرتے، اسی لئے بزرگوں نے کہا کہ جو اپنی

پوری زندگی میں نفس کی مراد پر ایک قدم بھی چلتا ہے وہ محبت میں جھوٹا ہے۔

جب بہشت کو جو مخلوق ہے نفس کی مخالفت کے بغیر پانا محال ہے تو خالقِ بہشت کو نفس کی موافقت کے ساتھ کیسے پا سکتے ہیں۔

جو اپنی تمام مرادوں اور لذتوں کو ختم کر دینے کی صلاحیت رکھتا ہے وہی محبت میں سچا اور صحیح ہے۔ اگر دونوں جہان میں اس کی اپنی ایک مراد بھی باقی ہے تو محبت کے دعویٰ میں وہ صحیح و درست نہیں۔ اسی لئے کہتے ہیں من رکبها هلک ومن خالفها ملک۔ جو اپنی خواہشات کا بندہ ہو گیا وہ ہلاک ہوا۔ اور جو کسی چیز کا اسیر و قیدی ہے وہ اللہ کا بندہ نہیں بلکہ اسی چیز کا بندہ ہے۔ جو اپنی خواہشات کی قید سے آزاد ہو گیا وہ درحقیقت حق سبحانہ تعالیٰ کا بندہ ہو گیا۔ اور وہ اپنے مقصد کو پا کر مسرور ہو گیا۔ بیت

بگذار ھوا و بر ھوا شو　　معراج تو ایں بود تو آں کن

(اپنی خواہشات کو ترک کر کے بلندیوں میں پرواز کرتا جا۔ یہی تیری معراج ہے تو اسی میں لگا رہ۔)

قوله: ثُمَّ اِنَّهُمْ خُصُّوا بَعدَ ذٰلِکَ بِعلُومُ عَالِيَةِ وَاَحوَالِ شَرِيفَةٌ.

(ارشاد شیخ ہے) صوفیا ان علوم کے بعد علوم عالیہ اور احوال شریفہ کے لئے مخصوص کر دیئے گئے ہیں۔

شرح: یعنی صوفیا دو علوم کے مالک ہوتے ہیں۔ (۱) علم دراست (۲) علم وراثت۔ علم دراست، علم شریعت کو کہتے ہیں جو پڑھنے اور محنت و مشقت کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ علم وراثت، علم باطن کو کہتے ہیں۔ جب کوئی علم ظاہری یعنی علم شریعت کو حاصل کر لیتا ہے اور اس پر معمل و کاربند رہتا ہے تو وہ علم وراثت اسے عطا کر دیا جاتا ہے جس کا یوں وعدہ کیا گیا ہے من عمل بما علم اورثه الله تعالیٰ علم مالم يعلم جو شخص علم کے مطابق عمل کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو وہ علم عطا کر دیتا ہے جو علم اسے حاصل نہیں تھا۔

علم وراثت، علم باطن کو کہتے ہیں جو بغیر کسی استاد اور کتاب کے صوفیا کے دلوں میں اللہ تعالیٰ ڈال دیتا ہے۔ علم فقہ اور علم حدیث کی تحصیل کے بعد یہ حضرات اس علم وراثت کے لئے مخصوص ہیں اور یہ نعمت انہیں حاصل ہوتی ہے۔

احوال شریفہ جو کہا گیا اس کا مطلب یہ ہے کہ صوفیا بزرگ و برتر احوال کے لئے مخصوص ہیں۔ ان کے احوال کی کوئی انتہا نہیں۔ ہر لمحہ ان میں اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے۔ یہ احوال ایسے ہوتے ہیں جن کو نہ بیان کیا جا سکتا ہے اور نہ عبارت میں لایا جا سکتا ہے۔ احوال کا جو مالک ہے وہی جانتا ہے کہ وہ کیا دیکھ رہا ہے اور جس کو ان احوال سے واسطہ ہے وہی سمجھتا ہے کہ وہ کہاں سے نالہ کر رہا ہے، لیکن صاحب حال کو یہ قدرت حاصل ہے کہ وہ اپنے احوال کو عبارت میں لا سکتا ہے۔ ہاں! وہ بیان نہیں کرے۔ اس لئے کہ احوال تو اسرار ہیں۔ اگر ان کو کھول دیا جائے اور بیان کر دیا جائے تو پھر راز، راز نہیں رہے گا۔

قوله: فتكلموا في علوم المعاملات و عيوب الحركات والسكنات و شريف المقامات و ذلك مثل التوبة والزهد والورع والصبر والرضىٰ والتوكل والمحبة والخوف والرجاء والمشاهدة والطمانية واليقين والقناعة والصدق والاخلاص والشكر والذكر والفكر والمراقبة والاعتبار والوجل والتعظيم والاجلال والندم والحياء والجمع والتفرقة والفنا و البقاء ومعرفة النفس ومجاهداتها ورياضاتها و دقائق الرياء والشهوة الخفية والشرك الخفي و كيفية الخلاص منها.

شرح: صوفیا نے معاملات کے علوم، حرکات و سکنات کے عیوب اور مقامات کے محاسن جیسے توبہ، زہد وغیرہ پر گفتگو کی ہے اور ہر ایک عنوان کی مختصر تعریف بیان فرمائی ہے۔

المعاملات مابين العبد و مولاه = ان معاملات سے دل کے وہ معاملات مراد

ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہوں اور وہ ظاہری بھی ہوں۔

عیوم الحرکات والسکنات = اپنے اعمال وافعال کو دنیاوی اور اخروی اغراض ومقاصد سے پاک رکھیں۔ جو کچھ کریں وہ اللہ کی رضا کے لئے کریں۔ اللہ تعالیٰ کی محبت کا تقاضا یہ ہے کہ اس سے محبت، دوزخ کے خوف اور بہشت کی لالچ میں نہ کی جائے۔ زبور میں ہے کہ اس سے بڑا ظالم کون ہوگا جو دوزخ کے خوف اور بہشت کی لالچ میں میری عبادت کرے۔ اگر میں بہشت ودوزخ کو پیدا نہیں کرتا تو کیا میں عبادت وپرستش کے لائق نہیں رہتا اور میری عبادت نہیں کی جاتی۔

وشریف المقامات = مقامات اس کو کہتے ہیں جس کا تعلق بندہ کے کسب سے ہوتا ہے اور حال اس کو کہتے ہیں جو بندہ کے دل میں بغیر کسب کے پیدا ہوتا ہے۔

التوبہ = توبہ گناہ کے ترک کا نام ہے اور یہ تمام مقامات میں اول مقام پر ہے۔

الزھد = دنیا کو ترک کرنے اور اپنے ظاہر وباطن کو دنیا کی طلب سے پاک رکھنے کا نام ہے۔

الورع = شبہات کے ترک کو ورع کہتے ہیں۔

الصبر = شکایت کا ترک کرنا صبر ہے۔

الرضی = تقدیر پر اعتراض کے ترک کا نام رضا ہے۔

التوکل = حق پر اعتماد رکھنے کا نام توکل ہے۔

المحبۃ = اللہ تعالیٰ کی محبت مقامات میں سب سے بلند اور درجات میں سب سے اعلیٰ درجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل ہونے کے بعد پھر کچھ باقی نہیں رہتا۔ ہاں! محبت کے ثمرات جیسے شوق، اُنس وغیرہ کا ظہور ہوتا ہے۔ محبت سے آگے کوئی مقام نہیں ہے۔ مگر ہاں! محبت کے مقدمات کچھ ہیں۔ جیسے توبہ، ورع، زہد وغیرہ۔ امت کا اس پر اجماع ہے کہ اللہ اور اللہ کے رسول کی محبت فرض ہے۔

والخوف = خوف ڈرنے کو کہتے ہیں۔ بزرگان دین قطعیت یعنی ترک خوف سے

ہمیشہ خائف رہے ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ قطعیت کو ترک نہ کرو اور جو چاہو کرو۔ عام لوگ عذاب اور پکڑ سے ڈرتے ہیں۔

الرجاء = رجا کے معنی امید رکھنا ہے۔ بزرگان دین کو اللہ تعالیٰ کے دیدار اور اس کی رضاء کے علاوہ اور کوئی امید نہیں رہتی۔عوام کی امید دوزخ سے نجات اور بہشت میں داخل ہونے کی ہوتی ہے۔

المشاھدۃ = نور یقین کے ذریعہ دل سے دیکھنا ہے۔دیدار یقین اور دیدار عیاں میں فرق ہے۔

الطمانیۃ = طمانین کے معنی میں ہے۔یعنی تقدیر کے سامنے ساکن رہنا ہے۔

الیقین = شک کو دور کرتے ہوئے، یقین کرنا۔

القناعہ = اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی قسمت پر خوش رہنا۔

الصدق = احوال، افعال اور اعمال میں سچائی برتنا۔

الاخلاص = اپنے کاموں کو صرف اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص کر دینا۔

الشکر = نعمتیں عطا فرمانے والے یعنی اللہ تعالیٰ کی تعریف کرنا۔

الذکر = اللہ تعالیٰ کی یاد میں لگے رہنا۔

الفکر = غور وفکر کرنا۔اور اس کی چند قسمیں ہیں۔

(۱) ازل میں غور کرنا کہ اس کی قسمت میں کیا لکھا گیا ہے۔

(۲) خاتمہ کے متعلق فکر کرنا کہ نہ جانے خاتمہ کیسا ہوگا۔

(۳) موجودہ وقت کے بارے میں غور کرنا کہ دیکھئے کیا سامنے آتا ہے۔

المراقبہ = اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر جاننا اور اس بات پر یقین رکھنا کہ اللہ تعالیٰ ان کے احوال کو جان رہا ہے، ان کی باتوں کو سن رہا ہے اور ان کے کاموں کو دیکھ رہا ہے۔ان چیزوں کا جاننا بندوں کے لئے تمام نیک کاموں کی اصل ہے۔

الاعتبار = اس چیز کے جیسی چیز کو کہتے ہیں۔

الوجل = جمال با جلال کے مشاہدہ میں دل کی عاجزی و درماندگی کو کہتے ہیں۔

التعظیم = بزرگ رکھنا اور حرمت کے معنی میں ہے۔

الاجلال = بزرگ رکھنا، اور یہ ہیبت کے معنی میں ہے۔

الندم = گذشتہ حالات پر ندامت و شرمندگی کو کہتے ہیں۔

الحیاء = اللہ تعالیٰ سے شرم کرنے کے معنی میں ہے۔

نقل ہے کہ ایک روز رسول اللہ ﷺ نے صحابہ ؓ سے فرمایا کیا تم لوگ اللہ تعالیٰ سے شرم رکھتے ہو۔ جیسا کہ شرم رکھنے کا حق ہے؟ صحابہ نے عرض کی۔ اے اللہ کے نبی! الحمد للہ! ہم لوگ اللہ سے شرم رکھتے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا شرم رکھنا یہ نہیں ہے بلکہ شرم رکھنا یہ ہے کہ سر اور جو کچھ سر سے متعلق ہے اس کا خیال رکھے، شکم اور شکم سے متعلق جو کچھ ہے اس کا خیال رکھے، موت کو یاد رکھے، بدن کے نچلے حصہ کو پوشیدہ رکھے اور جو آخرت کا طلب گار ہے وہ دنیا کی زینت کو ترک کردے۔ یہ جو کچھ کہا گیا ان پر جو عمل کرتا ہے وہی حقیقت میں اللہ تعالیٰ سے شرم رکھتا ہے جیسا کہ شرم رکھنے کا حق ہے۔

والجمع = جب بندہ کی ہمت تمام چیزوں میں سے کسی ایک چیز کو طلب کرتی ہے تو اس کو جمع کہتے ہیں۔

التفرقة = جب بندہ کی ہمت تمام چیزوں کو طلب کرے تو اس کو متفرق کہتے ہیں۔

بندہ جتنی دیر اور جتنی مقدار میں کسی چیز کے ساتھ مشغولی اختیار کرتا ہے اتنی دیر دوسری چیزوں سے الگ ہو جاتا ہے۔ خواہ دنیا کو اختیار کرے یا عقبیٰ کو۔ جب کسی کی ہمت عقبیٰ سے الگ ہوتی ہے تو وہ دنیا میں مشغول ہو جاتا ہے اور جب دنیا میں مشغول ہوتا ہے تو عقبیٰ سے دور ہو جاتا ہے۔ اور جب تک ان دونوں سے الگ نہیں ہوتا مولیٰ کے ساتھ اس کی مشغولی نہیں ہوگی۔

الفناء = مذمومات کا محمودات کی طرف جانا ___ فنا ہے ___ جیسے جہل ___ جب جہل فنا ہوگا تو یقیناً علم باقی رہ جائے گا۔ جب معصیت فنا ہوگی ___ تو طاعت ___ باقی رہ جائے گی۔ جب غفلت فنا ہوگی ___ تو ذکر ___ باقی رہ جائے گا۔ اسی طرح تمام صفات مذمومہ کے فنا سے تمام

صفات محمودہ کی بقا ہے۔۔۔ فناء و بقا یہی ہے۔۔۔

البقاء = بقا کا معنی وہی ہے جو فنا کے ضمن میں گذرا۔ یعنی بقا۔۔۔ فنا۔۔۔ کی ضد ہے۔ یہ جماعتِ صوفیا بقا سے ذات کی بقا مراد نہیں لیتے، صفت کی بقا مراد لیتے ہیں۔ اور فنا سے ذات کی فنا مراد نہیں لیتے۔ بلکہ صفت کی فنا مراد لیتے ہیں۔ اس معنی کے رو سے عین وہ چیز مراد نہیں ہے بلکہ اس چیز کا معنی مراد ہے۔ جب کسی چیز میں وہ معنی موجود ہے تو اس کو بقا کا نام دیتے ہیں۔ اور جب اس چیز سے معنی معدوم ہو تو اس چیز کو فانی کہتے ہیں۔

معرفۃ النفس و مجاھداتھا و ریاضاتھا = نفس کی معرفت، اس کے مجاہدے اور اس کی ریاضتیں۔

کہتے ہیں کہ نفس و روح قالب کے اندر لطائف ہیں۔ جس طرح عالم میں شیاطین اور فرشتے ہیں۔ اور بہشت و دوزخ ہیں۔ ایک نیکیوں کی جگہ ہے اور دوسری برائیوں کی۔ نفس کی مخالفت ہی میں تمام عبادتوں کا راز ہے اور نفس کی مخالفت ہی میں تمام مجاہدوں اور ریاضتوں کا کمال ہے۔ نفس کی مخالفت ہی سے بندہ اللہ تک پہنچتا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ موافقت رکھتا ہے اور نفس کے ساتھ مخالفت تو سمجھ لیجیے کہ وہ اللہ کا دوست ہے اور اسی کے برعکس اگر کوئی نفس سے موافقت رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے مخالفت تو وہ نفس کا دوست ہے۔ جو دوست کے ساتھ موافقت رکھتا ہے وہ دشمن کا مخالف ہوتا ہے۔

ودقائق الریاء والشھوت الخفیۃ = ریا کی باریکیوں کو پہچاننا کوئی آسان نہیں اس کو مخلصین ہی پہچان سکتے ہیں۔ ایک شخص نے کہا میں تیس سال سے پہلی صف میں نماز پڑھ رہا تھا، ایک روز پہلی صف میں شریک نہیں ہو سکا، کسی مجبوری سے مجھے دوسری صف میں جگہ ملی۔ لوگوں نے صف میں مجھ کو کھڑا ہوتے دیکھا تو مجھے شرم آنے لگی کہ لوگ آج مجھے دوسری صف میں دیکھ رہے ہیں۔ اس احساس کے بعد مجھے یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ لوگوں کا صفِ اول میں مجھے دیکھنا یہ میرے نفس کی شراب تھی۔ اور اس سے نفس کو راحت مل رہی تھی۔ افسوس! میں نفس کی اس باریکی و گہرائی کو سمجھ نہ سکا۔ بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جن کے کام اس مثال سے خالی ہوں۔ اور بہت کم

لوگوں کی یہاں تک رسائی ہو۔ ہاں! اربابِ عقل وخرد ان باریکیوں کو جانتے اور پہچانتے ہیں۔ اور ان باریکیوں کی وجہ سے اپنے تمام حسنات کو آخرت کے لئے سئیات سمجھتے ہیں۔

اس فتنہ میں اگر سب سے زیادہ کوئی بتلا ہے تو وہ علما ہیں۔ اس لئے کہ اپنے علم کی نشرو اشاعت وشہرت سے ان پر خوشی کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ اور جب یہ دیکھتے ہیں کہ لوگ ان کی بڑی تعداد میں اتباع وپیروی کررہے ہیں اور ان کی تعریف میں رطب اللساں ہیں تو اس وقت خوشی سے جھومنے لگتے ہیں۔ اس وقت شیطان ان پر چھپ کر وار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دین کی اشاعت اور رسول ﷺ کی شریعت کی حفاظت اور امداد ونصرت تمہاری غرض ہے۔

والشهوة الخفية = حدیث شریف ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا یہ سچ اور درست ہے کہ میں اپنی امت کے لئے سب سے زیادہ پوشیدہ ریا اور چھپی ہوئی خواہشات سے ڈرتا ہوں کہ کہیں یہ اس میں بتلا نہ ہو جائے۔

پوشیدہ ریا کالی رات میں کالے پتھر پر کالی چیونٹی کے رینگنے سے زیادہ پوشیدہ ہے۔ جب اس راہ کے سالکین اس کی شناخت نہیں کرسکتے تو دوسرے کس شمار میں ہیں۔ اس شہوت پنہاں یعنی چھپی خواہشات میں اصل چیز یہ ہے کہ لوگوں کے درمیان صاحبِ عزت ومرتبہ ہونا پسند آئے اور نام ونمود وشہرت کی طرف دل مائل رہے۔

امام ثوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگلے بزرگوں نے دو شہوتوں اور خواہشوں کو مکروہ سمجھا ہے، ایک تو یہ کہ لباس فاخرہ زیب تن کیا جائے۔ اور دوسرے یہ کہ پھٹا پرانا کپڑا اور گدڑی کو اپنا لباس بنایا جائے جس سے دوسروں کو کراہت آئے۔

پوشیدہ اور چھپی ہوئی شہوت وخواہش تو عجیب چیز ہے۔ بعض لوگ اپنے کو کمزور ونحیف بنادیتے ہیں، ان کے چہرے پیلے پڑ جاتے ہیں تاکہ لوگ یہ سمجھیں کہ یہ مجاہدے میں لگے ہیں۔ بہت کم خوراک ہیں، غذا بہت کم لیتے ہیں۔ چہرے کی زردی دیکھ کر لوگ یہ قیاس کرلیں کہ یہ شب بیدار ہیں اور دین کے لئے ہر وقت فکر مند ہیں۔ اسی طرح بعض لوگ پھٹے پرانے اور میلے وگندے کپڑے پہنتے ہیں۔ الجھے ہوئے بال رکھتے ہیں تاکہ لوگ یہ سمجھیں کہ یہ دینی کاموں میں

اس درجہ منہمک و مشغول ہیں کہ کپڑا دھونے اور کنگھی کرنے کی فرصت نہیں ملتی۔ایسی باتوں سے نفس کو خوشی حاصل ہوتی ہے تسکین ملتی ہے اور لوگوں کے درمیان اس طرح کی جو باتیں جس قدر ظاہر ہوتی ہیں اسی قدر نفس کو مسرت حاصل ہوتی ہے۔اسی طرح بعض لوگ اونی لباس، گندے کھردرے کپڑے تنگ آستین کے پرانے کرتے اور پھٹے پوشاک استعمال کرتے ہیں تا کہ لوگ یہ سمجھ لیں کہ سنت کی اتباع اس حد تک کر رہا ہے اور صوفیوں کی پیروی میں لگا ہے۔

اگر ان کو کھانے پینے اور دھلے ہوئے اوسط لباس پہننے کی تاکید کی جائے اور اس پر زور دیا جائے جس طرح اگلے بزرگوں نے استعمال کیا ہے تو ان پر بہت جبر گذرتا ہے اور یہ ایسا اظہار کرتے ہیں کہ جیسے ان کی گردن ماری جارہی ہے۔

اس میں راز یہ ہے کہ اگر کھانے پینے لگے اور اچھا لباس استعمال کرنے لگے تو لوگ ان کو عزت وتوقیر کی نظر سے نہیں دیکھیں گے اور یہی کہیں گے کہ فلاں شخص نے آج کل زہد و درویشی چھوڑ دی ہے اور دنیا میں ملوث ہو گئے ہیں۔

اس طرح کی چھپی ہوئی خواہشات کی بہت ساری مثالیں ہیں جو اہل تصوف کی نگاہوں کے سامنے ہیں اور وہی اس کا علاج جانتے ہیں وہ اس راہ سے گذرے ہوئے ہیں۔مگر زہاد و عباد اسی میں گرفتار اور اسی پر مغرور ہیں کہ ہم بہت بڑا کام کر رہے ہیں۔

الشرک الخفی = اہل تصوف کے نزدیک غیر حق سے نفع ونقصان کی امید رکھنا اور غیر حق سے خوف وامید کا معاملہ ہی شرک خفی ہے۔اسی لئے کہتے ہیں التوحید اسقاط الاضافات اضافتوں کا اٹھا دینا ہی توحید ہے۔یعنی نفع ہو یا نقصان، خیر ہو یا شر سب کو خدا کی جانب سے سمجھا جائے۔توحید تو ایک جاننے کا نام ہے۔اور ایک جاننا یہ ہے کہ اس کے سوا اور کوئی نگاہ میں نہ ہو۔ اللہ کے ساتھ اگر کسی اور پر نگاہ ہے تو یہ توحید نہیں ہے۔اس لئے کہ یہ دو دیکھنا ہوگا اور دو دیکھنا توحید نہیں ہے۔

یہ ایسا شرک ہے جو اصل ایمان کو زائل تو نہیں کرتا لیکن ایمان کی حقیقت کو ضرور مجروح کرتا ہے۔مثلاً خالص سونا بھی سونا ہے اور جس میں کچھ ملا ہو وہ بھی سونا ہے۔لیکن قیمت میں یہ

ملاوٹ والا سونا خالص سونا کے برابر نہیں ہو سکتا۔

کیفیة الخلاص منها = نفس کی آفتوں سے نجات اسی حال میں ممکن ہے کہ بھوک و پیاس کے ذریعہ اور مجاہدات و ریاضت میں ڈال کر نفس کی مخالفت کی چھری سے نفس کو ذبح کردیا جائے۔ جیسا کہ کتابوں میں درج ہے۔ یہاں پر تفصیل سے لکھنا طوالت سے خالی نہیں۔

حجاب چار ہیں: دنیا، خلق، شیطان اور نفس۔ ان چاروں میں سب سے بڑا حجاب نفس ہے۔ سلطان العارفین حضرت بایزید بسطامی قدس اللہ سرہٗ نے اپنی مناجات میں جب عرض کیا انھی کیف الطریق الیک اے اللہ رب العزت! تجھ تک پہنچنے کا راستہ کیا ہے؟ تو اُدھر سے جواب ملا دع نفسک و تعال۔ نفس کو چھوڑ دو اور چلے آؤ۔

قوله: ولهم ایضاً مستبنطات من علوم مشكلة على الفقهاء و ذلک مثل العوارض والعوائق و حقائق الاذكار و تجريد التوحيد و منازل التفريد و جنايات السروتلاشِيُ المحدث اذا قيل بالقديم وعيوب الاحوال وَجميع المتفرقات والاعراض عن الاغراض و ترک الاعتراض فهم مخصوصون بالوقوف على المشكل من ذلک بالمنازلة والمباشرة والهجوم ببذل المهج.

(ارشاد شیخ ہے) نیز صوفیوں نے ایسے علوم کا تخراج واستنباط کیا جو فقہا کے لئے مشکل ہیں جیسے عوارض، عوایق، حقایق اذکار، تجرید التوحید، منازل تفرید، جنایات سر قدیم کے سامنے محدث کا معدوم ہو جانا، عیوب احوال، جمیع المتفرقات اغراض سے اعراض، اعتراض کا ترک، اور وہ مخصوص ہیں اس بات کے لئے کہ وہ مشکل امور سے واقف ہیں۔ اپنے ذوق اور مباشرت کے ذریعہ۔ صرف علم کے ذریعہ نہیں۔

شرح: الاستنباط الاستخراج = حضرات صوفیا علوم کے ان مشکلات کو ظاہر وعیاں کرنے والے ہیں جو فقہا پر مشکل ہیں۔ اور یہ استخراج نص قرآن واحادیث وآثار

سے کرتے ہیں، اہلِ بصیرت ان کا ادراک کرتے ہیں اور اہلِ ظاہر مجبور و عاجز ہوتے ہیں۔ چونکہ یہ اہلِ ظاہر ان باتوں کو سمجھنے سے قاصر و مجبور ہیں تو پھر یقیناً ان باتوں کا انکار کر دیتے ہیں۔ حالانکہ اس کی تائید میں اللہ تعالیٰ کا یہ قول موجود ہے فاوحی الی عبدہٖ ما اوحی [النجم:١٠] (پس وحی کی اللہ نے اپنے بندہ کی طرف جو وحی کی) یعنی اس کے اسرار و کلمات یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسرار محدود محصور نہیں ہیں۔

نقل ہے کہ ایک روز خواجہ ابو سعید رحمۃ اللہ علیہ نیشاپور میں وعظ کہہ رہے تھے، اسی جلسہ میں ایک عالم صاحب بھی موجود تھے، وہ اس فکر میں پڑ گئے کہ قرآن میں تو یہ سب باتیں نہیں ہیں۔ خواجہ ابو سعید نے اپنے کشفِ باطن سے یہ معلوم کر لیا اور فرمایا بندگانِ خدا کے دل میں جو اترتا ہے اس کی کوئی حدود و انتہا نہیں ہے۔ اور نہ اس کا انقطاع ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں پر ایک فرشتہ مقرر فرما دیتا ہے۔ اس کی تائید میں التقوا فراست المؤمن فانہ ینظر بنور اللہ (ڈرو مومن کی فراست سے کیونکہ وہ دیکھتے ہیں اللہ کے نور سے) موجود ہے۔

العوارض = راہِ طلب میں اس راہ کے چلنے والوں کو جو پیش آئے اس کو عوارض کہتے ہیں۔

العوائق = راہِ طلب میں جو موانعات پیش آئیں ان کو عوائق کہتے ہیں۔

حقایق الذکار = ذکر ویسا ہی ہے جیسے حیات۔ جس طرح حیات (زندگی) ہر طرف عمل کرتی ہے۔ ذکر حقیقت بھی عمل کرتی ہے۔ اور حقیقتِ ذکر یہ ہے کہ ذاکر، ذکر کے دوران خود کو فراموش کر دے۔ جیسا ارشاد ہوا واذکر ربک اذا نسیت [الکھف:٢٤] (اور یاد کر اپنے رب کو جب تو بھول جائے) ای اذا نسیت نفسک۔ اس عبارت میں بھی کہا گیا ہے اذا نسیت یعنی اذا نسیت مادون اللہ فقد ذکرت اللہ۔ اپنے خدا کو یاد کرنا یہ ہے کہ اللہ کے سوا جو کچھ ہے سب کو فراموش کر دیا جائے۔

التجرید التوحید = واللہ اعلم. تجرید توحید یہ ہے کہ بندہ توفیق اور ارادہ کو اللہ کی جانب سے سمجھے جنہیں توحید کی نعمت عطا فرمائی۔ اپنا ارادہ اور اپنا فعل نہیں سمجھے۔ اس لئے کہ

اپنی صفت پر نظر رکھنے والا اللہ تعالیٰ کو دیکھنے والا نہیں ہوسکتا۔ جب تک اپنی صفت کو دیکھنے والا ہے اللہ تعالیٰ سے حجاب میں ہے۔ غیر کو دیکھنا حق سے حجاب ہے چنانچہ موحد غیر حق ہے۔ اس کی توحید جو اس کی صفت ہے وہ بھی غیر حق ہے۔ اور غیر حق کا دیکھنے والا حق سے حجاب میں ہے۔ اس طرح جو حق سے محجوب ہے وہ موحد نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا توحید یہ ہے کہ موحد کی نظر میں نہ موحد رہے نہ توحید۔

تجرید توحید کا ایک دوسرا معنی یہ بھی ہے کہ اس کا ظاہر اغراض سے خالی ہو۔ یعنی دنیا کو ترک کرنے کا عوض اور بدلہ اللہ تعالیٰ سے طلب نہ کرے۔ اس عوض و اجر کی طلب نہ دنیا میں نہ عقبیٰ میں ——— اس لئے کہ طمع اور اخلاص دونوں یکجا نہیں ہوسکتے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ کسی طمع اور لالچ میں جو کام کیا جائے وہ اجرت ہے اور اخلاص کے ساتھ جو عمل ہو وہ عبودیت ہے۔

لیکن ——— تجرید توحید کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ خیال اور دل میں تشبیہ و تعطیل کا ذرہ برابر دخل نہ ہو۔ اس کو یوں سمجھئے کہ جب اعتقاد کے ساتھ وحدانیت کو ثابت کر دیا تو پھر اس بات پر غور و فکر نہ کی جائے کہ میری ثابت کی ہوئی وحدانیت بے مثل کیوں کر ہوگی۔ اور یہی بات تمہیں تعطیل میں ڈال دے گی۔ اس طرح جب کسی نے دوسری بات بیان کی تو ہستی کا منکر ہوا اور تعطیل میں پڑ گیا، جب ہستی کو ثابت کر دیا تو پھر کسی ہست کے ساتھ اس کو قیاس نہ کر۔ اگر کیا تو تشبیہ میں پڑ جاؤ گے۔

ومنازل التوحید = جس منزل میں وہ ٹھہرا ہوا ہے اس سے تفرید کی جستجو کرے۔ یعنی عبودیت کی جتنی طاقت ہے اس طاقت سے اس میں لگا رہے۔ جن باتوں کا حکم دیا گیا ہے ان کی بجا آوری میں کمی و کوتاہی نہ ہو۔ تمام کاموں کو پورا کرتا رہے، اس کے باوجود اپنے کو تمام لوگوں میں سب سے زیادہ مفلس سمجھے۔ جب یہ باتیں حاصل ہوں گی تو اپنے کاموں میں وہ فرد ہو جائے گا جس طرح توحید میں مجرد ہو گیا۔ پہلے تجرید ہے پھر تفرید۔ جب تک بندہ لوگوں سے مجرد نہیں ہوتا وہ اللہ تعالیٰ کے لئے فرد نہیں ہوتا۔

اس کا معنی شاید یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اولیاء جن نعمتوں، دولتوں سے نوازے جائیں اور

ان پر جو احوال ظاہر ہوں، اپنے کو نہ اس حال کے لائق سمجھیں اور نہ کسی منزل و مقام کے مناسب جانیں۔ اگر اس حال میں انہیں آرام ملے اور اس حال و مقام سے نفس کو سکون حاصل ہو یا ان کے سر کو اس حال اور منزل سے انسیت پیدا ہو تو ایسی صورت میں وہ منزل پرست و مقام پرست ہوگا حق پرست نہیں۔ اگر کوئی شخص ظاہری یا باطنی طور پر حق کے علاوہ کسی دوسری چیز سے آرام اختیار کرتا ہے تو وہ مشرک ہے، ایسی صورت میں قریب سے قریب تر ہونے کے باوجود اپنے کو سب سے زیادہ دور سمجھے، یہاں تک کہ اس مقام تک پہنچ جائے، جس کی تمنا سارا عالم کرتا ہے، جو لوگ اس مقام کو دیکھ لیتے ہیں پھر اس مقام سے خیر اور بھلائی پا لیتے ہیں اس کے باوجود وہ ھمہ دم خائف رہتے ہیں۔ اور یہی سمجھتے ہیں کہ وہ بت پرستی کر رہے ہیں۔ یا خدا کے ساتھ شرک کر رہے ہیں۔ کسی کا یہ شعر خوب ہے ؎

تا یار شود ترا خریدار　　　　خود را تو بفضل بی بہا کن

(تم اپنے کو اس کے فضل و کرم کے صدقے ایسا انمول بنالو کہ خود تمہارا یار تمہارا خریدار بن جائے)

وجنایات السر = اس کے باطن میں ایک حال یا کوئی وقت ظاہر ہوتا ہے اور اس کا سر اس وقت یا حال سے انس اختیار کر لیتا ہے۔ جب اس حال سے انس اختیار کر لیا تو پھر وہ حق سے دور ہو گیا۔ من رضی بمقامه حجب عن امامه جس نے اس مقام کے ساتھ انس اختیار کر لیا وہ آگے کے مقام سے رک گیا۔

وتلاشی المحدث اذا قوبل بالقدیم = تلاشی محدث یہ ہے کہ جب محدث کو قدیم کے سامنے کیا جائے تو محدث معدوم ہو جائے۔ جب بندہ توفیق اور ارادہ کو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی توفیق و ارادہ سمجھ لیتا ہے تو اپنے تمام افعال کو لا شی، ونیست و نابود پا لیتا ہے۔ اس طرح جب محدث کی قدرت کو قدیم کی قدرت کے ساتھ اور تمام دوسری صفات بلکہ سارے موجودات عالم کو واجب الوجود کی ذات کے سامنے برابر کیجئے تو سب کو لاشی، اور نیست و نابود پائے گا۔ اس لئے کہا گیا ہے عند ظهور الحق ینور الخلق اور اس وقت کل من علیها فان ویبقی وجه ربک ذوالجلال والاکرام (سورہ رحمن) کا جمال روشن و تابناک ہوتا ہے۔

جتنے ممکنات ہیں سب اپنی ذات میں عدم ہیں۔ ان کا وجود عارضی ہے ذاتی نہیں۔ اسی لئے تو اہلِ بصیرت کی نگاہ ان کے عدم پر ہوتی ہے جو ان کی اصل ہے۔ ان کے (ظاہری) وجود پر نہیں جاتی جو عارضی ہے۔ ایک درویش نے فرمایا **لیس فی الوجود الا اللّٰہ**۔

نقل ہے کہ حضرت خواجہ جنید رحمۃ اللہ علیہ کے ایک مرید کو چھینک آگئی۔ انہوں نے کہا الحمدللہ۔ حضرت جنید نے فرمایا الحمدللہ رب العلمین کہو۔ کیا قرآن میں الحمدللہ رب العلمین نہیں پڑھا ہے۔ مرید نے عرض کیا محدث کو قدیم کے ساتھ کیسے کروں؟ خواجہ نے فرمایا کیا یہ نہیں جانتے کہ جب محدث کو قدیم کے مقابل اور سامنے کیا جاتا ہے تو وہ لاشی ہو جاتا ہے۔

وعیوب الاحوال = یہ حضرات صوفیا احوال کے عیوب کا علم رکھتے ہیں، احوال، معاملات دل کا نام ہے۔ اذکار کی صفائی سے دل میں جو مقامات پیدا ہوتے ہیں ان کی نہ کوئی انتہا ہے اور نہ ان کو عبارت میں لایا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ احوال اسرار ہیں۔ اگر اسرار کو تحریر و تقریر کے ذریعہ افشاء کر دیا تو پھر اسرار، اسرار کہاں رہے۔

وجمع المتفرقات = طالب کے دل سے ہمت کی پریشانی کا پورے اور مکمل طور پر زائل ہو جانا جمع متفرقات ہے، یعنی جب بندہ کی ہمت کسی ایک چیز کو طلب کرتی ہے تو اس کو مجمع کہتے ہیں اور جب اس کی ہمت بہت ساری چیزوں کی طلب و تلاش میں رہے تو اس کو متفرق کہتے ہیں۔

اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جب تک بندہ کی نظر غیر حق پر رہتی ہے وہ متفرق ہے اور جب اغیار سے نظر اٹھ جاتی ہے، وہ صرف حق سبحانہ تعالیٰ پر نظر رکھتا ہے تو مجتمع ہے یعنی جب اس کی نگاہ میں یہ ہو کہ "میں ہوں، میں نے یہ کیا، میں نے وہ کیا" تو سمجھ لیجئے کہ وہ اپنی خودی کے ساتھ موجود ہے اور حق سبحانہ تعالیٰ سے دور ہے۔ یہی فرقت ہے۔ اور جب کسی کی نظر اس بات پر ہو کہ "میں کوئی شخص نہیں ہوں نہ میرا کوئی عمل دخل ہے" تو اس وقت وہ اپنی خودی سے دور ہے۔ اپنے آپ کو نہ دیکھنا اپنے آپ سے فرقت ہے۔ حق سبحانہ تعالیٰ ہی پر نگاہ رکھنا جمع ہے۔

والاعراض عن الاعتراض = تمام اغراض و مقاصد سے رخ موڑ لینا اعراض ہے یعنی ہر وہ چیز جو نفس کا حصہ ہے طالب کو اس سے غرض اور اس کی طلب نہ ہو۔ نہ دنیا میں نہ عقبیٰ

میں۔اس لئے کہ دنیا اور عقبیٰ دونوں نفس کا حصہ ہے اور جب تک کوئی اپنے حصہ کی فکر و غرض میں لگا ہے وہ اپنی خودی کے ساتھ ہے اور جو اپنی خود کے ساتھ ہے وہ حق سے محجوب ہے۔

امام شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اگر مجھے اختیار دیا جائے کہ بہشت لوگے یا دوزخ! تو میں دوزخ کو قبول کرلوں اس لئے کہ بہشت نفس کی مراد اور اس کی طلب ہے اور دوزخ دوست کی مراد ہے۔

وترک الاعتراض = اعتراض کا ترک یہ ہے کہ تقدیر میں جو چیز لکھ دی گئی اور ان میں سے جو مشکل، دشوار اور کٹھن معلوم ہو ان پر زبانِ تصرف بند رکھے۔ ''مجھے یہ چاہیئے، وہ نہیں چاہیئے، ایسا کیجئے اور ویسا نہ کیجئے''۔ اس طرح کی باتیں زبان پر نہ آئیں۔ مولیٰ نے جو احکام نافذ کردیئے ہیں اور جو کچھ تقدیر میں لکھ دیا ہے بندہ کو اس کے آگے سرِ تسلیم خم رکھنا چاہیئے۔ جب تک بندہ سرِ تسلیم خم نہیں کرے گا اور راضی برضا نہیں رہے گا تقدیر پر اعتراض کرتا رہے گا۔

فھم مخصوصون بالوقوف علی المشکل من ذلک بالمنازلۃ والمباشرۃ والھجوم ببذل المھج.

(صوفیا اس بات کے لئے مخصوص ہیں کہ راہِ طریقت کی مشکلات سے ذوق اور مباشرت کے ذریعہ واقف رہیں صرف علم کے ذریعہ نہیں۔ (یعنی وہ راہِ طریقت کی مشکلات کا مزہ چکھے ہوئے اور ان سے گذرے ہوئے ہوں۔ مترجم))

منازلت نزول سے بنا ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ جب تک دل کسی مقام میں نہیں پہنچا ہے اس مقام کی اسے خبر نہیں۔ جو شخص کسی منزل کی خبر دیتا ہے وہ اس وقت تک منزل کی خبر نہیں دے سکتا جب تک اس منزل پر پہنچا نہیں۔

والھجوم = اچانک آجانا۔

والمھج = مھجۃ کی جمع ہے اور یہ روح کے معنی میں ہے۔

وہ علم جو ان کاموں کے حدود، حقائق، اسباب ثمرات اور علاج پر مبنی ہو وہ آخرت کا علم ہے۔ اور علمائے آخرت کے فتویٰ کے مطابق فرض عین ہے۔

اگر کسی فقیہہ سے ان چیزوں کے بارے میں دریافت کیجئے جن کے لئے صوفیاء مخصوص ہیں جیسے اخلاص، توکل یا ریا سے بچنے کی صورت تو ان کے لئے جواب مشکل ہو جائے حالانکہ یہ علم فرض عین ہے۔ اور ان سے ناواقفیت آخرت میں ہلاکت کا سبب ہے۔

ہاں! اگر لعان اور ظہار (فقہی مسائل) کے بارے میں پوچھئے تو لمبی لمبی تقریریں کر دیں، جلد کی جلد لکھ ڈالیں، ایسے ایسے دقیق نکات برسوں بیان کریں جن کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور اگر ضرورت ہو بھی تو اس کے لئے علما سے شہر خالی نہیں۔ وقتی ضرورت کو پوری کرنے کے لئے یہ کافی ہیں۔ لیکن یہ لوگ تو رات دن اسی محنت میں لگے رہتے ہیں اور اسی کو یاد کرنے میں اپنا وقت گذار دیتے ہیں۔ اور دین کے اہم کاموں سے غافل ہیں۔ صحابہ ﷺ فتویٰ کے کاموں سے احتراز کرتے تھے اور یہ کام کسی دوسرے کے حوالہ کر دیتے، ہاں! اگر کوئی علمِ قرآن اور آخرت سے متعلق سوال کرتا تو اس کا جواب ضرور دیتے۔

امام سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ جو علم ظاہر کے بھی امام تھے فرماتے ہیں کہ علم فتویٰ آخرت کا توشہ نہیں ہے۔

قولہ: حتی طالبوا من ادعیٰ حالاً منھا بدلائلھا۔

(ارشاد شیخ ہے) یہاں تک کہ اگر کوئی شخص ان احوال میں سے کسی حال کا دعویٰ کرتا ہے تو اس سے دلیل طلب کرتے ہیں۔

شرح: اور اس کی سند یہ ہے کہ ایک روز رسول اکرم ﷺ نے حارثہ ﷺ سے پوچھا کیف اصبحت یا حارثہ !اے حارثہ! تمہاری صبح کیسی ہوئی؟ انہوں نے عرض کی اصبحت مومنا حقا میں نے اس حال میں صبح کی کہ میں مومن تھا حقیقتاً۔ یہ ان کا دعویٰ تھا۔ لیکن نبی اکرم ﷺ نے صرف دعویٰ پر نہیں چھوڑا۔ بلکہ ان سے اس دعویٰ کی دلیل طلب فرمائی اور فرمایا لکل حقیقۃ فما حقیقۃ ایمانک ہر سچائی کی ایک حقیقت ہوتی ہے اور تمہارے ایمان کی حقیقت کیا ہے؟

حارثہ ﷺ نے اپنے دعویٰ کی دلیل یوں پیش کی عرفت نفسی عن الدنیا میں نے

اپنے نفس اور دنیا میں دوری پیدا کر لی ہے۔ واظمات نھاری دن کو روزہ رکھتا ہوں واسھرت لیلی شب بیداری کرتا ہوں واستوی عندی ذھبھا وفضتھا وحجرھا ومدرھا میرے نزدیک سونا چاندی اور دنیا کے اینٹ پتھر برابر ہیں وکانی انظر الی عرش الرحمن بارز اور ایسا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے عرش کو ظاہر اور عیاں دیکھتا ہوں وکانی انظر الی اھل الجنة یتزاورون والی اھل النار یتغاورون اور ایسا ہے کہ میں جنت والوں کو دیکھتا ہوں کہ زیارت کر رہے ہیں اور دوزخ والوں کو دیکھتا ہوں کہ وہ فریاد کر رہے ہیں۔ حارثہ کی یہ دلیل سن کر حضور ﷺ نے فرمایا اصبت فالزم۔ ہاں! اب تم راستے پر لگ گئے، اسے اپنے لئے لازم کرلو۔

قولہ: وکلموا فی صحیحھا و سقیمھا فھم حماۃ الدین واعیانہ واعوانہ.

(ارشاد شیخ ہے) صوفیا احوال کی صحت اور اس کی سقامت پر گفتگو کرتے ہیں، یہ حضرات دین کے حمائتی، اس کے نگہبان، شہرت دینے والے اور ناصر و مددگار ہیں۔

شرح: یعنی صوفیا صحیح حال کو سقیم (برے) حال سے الگ کرنے والے ہوتے ہیں۔ ہر وہ صفت جو بندہ کو اللہ سے قریب کردے اور جو بندہ کو اللہ کے دوستوں کی فہرست میں شامل کردے وہ سب کی سب صوفیا کے اندر پائی جاتی ہیں۔ ظاہری درجات سے گذر کر دین کے اسرار و حقائق تک یہ پہنچے ہوتے ہیں۔ ملک وملکوت میں جو کچھ ہے وہ سب ان کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہتیں، اشیاء اور اشیاء کی حکمتیں جیسی کہ ہیں انہیں جانتے ہیں اور دیکھتے ہیں۔ بشر کے لئے جتنے کمالات و معانی ہیں ان تک ان کی رسائی ہوتی ہے اور حقیقتاً مقتدائی کے درجات پر فائز ہوتے ہیں۔ اور الشیخۃ خلافۃ النبوۃ شیوخ نبی کی جانشینی کی مسند پر جلوہ افروز ہوتے ہیں۔

قولہ: ثُمَّ اَنَّ کل مَن اَشکَل عَلَیہِ عِلمٌ مِنْ عُلُومِ الثَلا ثَۃ عَلَیہِ اَن یَرجِعَ فِیہِ اِلیٰ ائمتھا فَمَنْ اَشکلَ عَلَیہِ شیٔ مِنْ عُلومِ الْحَدِیث وَمَعرفَۃِ الرِّجَال یَر جِعُ فِیہِ اِلیٰ اَئمَّتِہِ الْحَدِیث لا اِلَی الْفُقَھَاءِ

وَمَنْ اَشْکَلَ عَلَیہِ شئ مِن دَقَائِقِ الْفِقْہِ یَرجعُ فِیہِ اِلیٰ ائمَۃِ الْفِقہِ وَمَنْ اَشْکَلَ عَلَیہِ شئ مِنْ عُلُومِ الاَحوَالِ و الرِّیاضَاتِ وَدَقَائِقِ الْوَرَعَ وَمَقَامَات الْمُتوَکلِینِ یَرجعُ فِیہِ الَی الصُّوفِیَّۃِ لَا اِلیٰ غَیرِھِمْ وَمَنْ فَعَلَ غَیرِ ذٰلِکَ فَقَدْ اَخطَاءَ

(ارشاد شیخ ہے) یہ سچ اور درست ہے کہ جس شخص کو ان تینوں گروہ اصحاب حدیث، فقہا اور صوفیا کے علوم میں سے کوئی مشکل پیش آئے تو اس پر لازم ہے کہ اس مشکل مسئلہ میں اس علم کے اماموں کی طرف رجوع کرے۔ یعنی اگر کسی علم حدیث اور راویان حدیث سے متعلق کوئی مشکل آجائے تو اس کو ائمہ حدیث سے رجوع ہونا چاہیئے فقہا کی طرف نہیں۔ جس شخص کو فقہ کے دقائق میں سے کسی مسئلہ میں دشواری معلوم ہو تو اسے ائمہ فقہ کی طرف رجوع ہونا چاہیئے، اسی طرح کسی شخص کو علوم احوال، ریاضات اور ورع کے دقیق نکات اور متوکلین کے مقامات کی مشکلات کو حل کرنا ہے تو اس کو صوفیا کی طرف رجوع ہونا چاہیئے، نہ کہ کسی دوسرے شخص کی طرف رجوع ہوگا۔ اور جس نے برعکس کیا تو اس نے یقیناً غلطی کی۔

شرح: صوفیا ہی اس علم کے لئے مخصوص ہیں۔ یعنی نفس کے آفات کو یہی لوگ جانتے ہیں، نفس کو یہی لوگ پہچانتے ہیں، اصلاحِ نفس کے لئے جو ریاضتیں ہیں ان سے یہی لوگ واقف ہیں۔ اخلاق کو پاکیزہ بنانے کا علم انہیں کے پاس ہے اسی طرح تمام علوم حکمت کے واقف کار یہی حضرات ہیں۔ اس کے حکیم یہی لوگ ہیں۔ نفس، دنیا اور شیطان کے علم کو جاننے والے یہی لوگ ہیں۔ اپنی حکمت سے اپنے کو ان سے بچا کر رکھتے ہیں۔

احوال اعمال کے ثمرات ہیں۔ اعمال پر شریعت کی بنیاد ہے، احوال اسرار کی صفات ہیں۔ جس کے ظاہری معاملات پاک وصاف نہیں ہوں گے اس کے باطنی احوال درست نہیں ہوں گے۔ حال اس معنی کو کہتے ہیں جو بغیر کسی قصد وارادے کے دل پر وارد ہو، چاہے وہ خوشی ہو یا

حزن، بسط ہو قبض ہو یا شوق۔

ومن فعل غیر ذلک فقد اخطاء جو کہا گیا اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر علم حدیث کی مشکلات کو فقہا سے پوچھا جائے، فقہی مسائل کو اصحابِ حدیث سے دریافت کیا جائے یا احوال و ریاضات کی باتیں غیر صوفی سے جاننے کی کوشش کی جائے تو یہ یقیناً غلطی اور خطا ہے۔ جو چیز جہاں کی ہے اس کو اسی مقام اور اسی محل میں طلب کی جائے جیسے اگر موتی کی تلاش ہے تو صدف میں ڈھونڈھئے اس لئے کہ اس کی جگہ وہی ہے سورج کو بروج میں دیکھئے اس کے نکلنے کی جگہ وہی ہے اور شہد کو مکھی کے چھتے سے نکالئے۔

فصل-٦

علم تصوف سے متعلق صوفیا کے اقوال اوران کے آداب کے بیان میں

قوله: فصل فی ذکر اقاویلهم فی التصوف و ادابهم

(ارشاد شیخ ہے) یہ فصل علم تصوف میں صوفیوں کے اقوال اور ان کے آداب میں ہے۔

شرح: **التصوف ماخوذ من الصفاء و الصفاءُ محمود فی کل لسانٍ** ۔صفاء کا لفظ تمام زبانوں میں پسندیدہ اور محمود ہے،صفا کی ضد کدورت ہے اور یہ تمام زبانوں میں مذموم ہے۔حدیث شریف ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **ذهب الصفاء من الدنیا وبقیت الکدورۃ فالموت تحفة للمسلم.** صفا دنیا سے رخصت ہو گیا کدورت باقی رہ گئی۔موت ہر مسلمان کے لئے تحفہ ہے۔

لفظ ''صوفی'' صفا سے بنا اور یہ نام اس جماعت کے لئے غالب ہو گیا۔یہاں تک کہ کہا جانے لگا ''صوفیٌ'' اس جماعت کے لوگوں کو صوفیہ کہتے ہیں اور جن لوگوں نے اپنے کو ان سے وابستہ کر لیا ہے ان کو متصوف کہتے ہیں۔اور اس جماعت کے لوگوں کو متصوفہ کہتے ہیں۔اور یہ بھی کہتے ہیں کہ ان ناموں کے لئے عربی قواعد کے رو سے کوئی ثبوت وشہادت نہیں ہے نہ قیاسی نہ اشتقاقی۔

اور یہ بات بالکل صاف وواضح ہے کہ یہ لفظ بہ طور لقب ہے۔اور ان کا باطن جس

صفائی سے آراستہ ہوتا ہے اسی کی وجہ سے ان کو صوفی کہتے ہیں۔

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ لفظ لغت کے رو سے بھی ہے تصوف اسی لبس الصوف کما یقال نقمص ای لبس القمیص ۔(تصوف یعنی صوف پہننا، جیسے کہتے ہیں تقمص یعنی قمیص پہننا)

حضور نبی کریم ﷺ کے عہد مبارک کے بعد بزرگوں کو صحابہ، ان کے بعد کے لوگوں کو تابعین، تابعین کے بعد کے لوگوں کو تبع تابعین اور ان کے بعد والوں کو زہاد و عباد کہا جاتا۔ ان کے بعد اہلِ بدعت پیدا ہو گئے اور سب نے اپنے زاہد و عابد ہونے کا دعویٰ کر لیا۔ اہل سنت و جماعت کے خواص اس نام (صوفی) سے مفرد ہوئے اور اسی نام سے مشہور ہو گئے، یہاں تک کہ یہی نام ان کی شناخت بن گیا۔

آداب کی حقیقت اچھی اور پسندیدہ خصلتوں کا جمع ہونا ہے۔ مؤدب کو اس لئے مؤدب کہتے ہیں کہ اچھی اور پسندیدہ صفتیں جو ہونی چاہیئے وہ سب ان میں پائی جاتی ہیں۔ لہٰذا جس شخص میں تمام اچھی خصلتیں و عادتیں جمع ہوں وہ ادیب ہے۔ لیکن لفظ ادیب کا استعمال لوگوں نے اس طرح مروج کر لیا ہے کہ جو شخص علم لغت اور صرف ونحو کا جاننے والا ہے وہ ادیب ہے۔ اس گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ جو پسندیدہ صفات رکھتا ہو وہ ادیب ہے۔

جماعت صوفیا شریعت کے تمام آداب سے آراستہ ہوتے ہیں۔ کیونکہ ذرہ برابر بے ادبی اور بے حرمتی بادشاہ کی قربت کے لائق نہیں۔

قولہ: **اختلف اَجوبۃُ المَشائخ فِی التَّصوُّف لِاختلاف الاحوال و کل اجاب علیٰ حَسَبِ حالِہ او علی قدر ما یحتمل مقام السَّائِل۔**

(ارشاد شیخ ہے) تصوف کے بارے میں مشائخ کے جوابات میں جو اختلاف ہے وہ احوال کے مختلف ہونے کی وجہ سے ہے۔ ہر ایک نے یا تو اپنے حال کے مطابق جواب دیا ہے یا سائل کا مقام جس بات کا متحمل ہو سکے، اس کو سامنے رکھتے ہوئے جواب دیا ہے۔

شرح: مثلاً کسی نے کہا ''صوفی'' وہ ہے جس کی ملک میں کچھ نہ ہو۔ اگر اس کے پاس کچھ آئے بھی تو وہ دوسروں کو دیدے، اس کے دل میں اس بات کی خواہش نہ ہو کہ دنیا کی کوئی چیز بھی اس کے پاس ہو۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے لئے کبھی یہ پسند نہیں فرمایا کہ کوئی رات بھی آپ کی ایسی گذرے جس میں دنیا کی کوئی چیز بھی آپ کے پاس رہ جائے۔

دوسرے نے کہا ''صوفی'' وہ ہے جو اپنے دل کو اللہ تعالیٰ کے لئے صاف وشفاف بنا کر رکھے، یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی طلب اس کے دل میں نہ ہو۔ جس مقام میں بھی اس کی پہنچ ہو اس کو چھوڑ کر آگے بڑھے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ تک پہنچ جائے، کسی مقام میں اس کو آرام نہ ہو، اس لئے کہ صوفی کی منتہا اللہ تعالیٰ سے دوسرا کوئی مقام نہیں جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا وَاَنَّ اِلٰی رَبِّکَ الْمُنْتَھٰی (النجم/۴۲) (اور یہ کہ سب کو آپ کے رب کے پاس ہی پہنچنا ہے) یہاں پر ان الی المقام المنتھی نہیں کہا۔ اور جبرائیل علیہ السلام نے بھی فرمایا و مامِنَّا اِلَّا لَهٗ مقامٌ معلوم ہم فرشتوں میں سے کوئی فرشتہ ایسا نہیں جس کو یہ معلوم نہ ہو کہ اس کا یہ مقام ہے۔ اس مقام سے آگے اس کی گذر نہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ فرشتے اصحابِ مقام ہوتے ہیں اور آدمیوں کی وہ ذات ہے جن کا کوئی مقام نہیں۔ اگر ان کی قیام گاہ ہے تو صرف اپنے پروردگار کی بارگاہ۔

قولہ: **فَاِذَا کَانَ مُرِیْدًا اجیبَ عَلٰی ظَاھِرِ الْمَذْھَب مِنْ حَیْثِ الْلمَعاملات.**

(ارشاد شیخ ہے) اگر وہ سائل مرید ہے تو معاملات کے رو سے ظاہری مذہب کے مطابق جواب دیا جائے گا۔

شرح: یعنی وہ معاملات ظاہری جن کا مرید متحمل ہو سکے اور جس میں اس کا فائدہ بھی ہو جیسے توبہ، ترک دنیا، ترک شہوات، ترک لذات، عزلت وخلوت، اوراد و وظائف اور نماز و روزہ وغیرہ۔

قولہ: **وَان کان متوسطاً اُجِیبُ مِنْ حیثِ الاَحوال.**

(ارشادِ شیخ ہے) اگر وہ سائل متوسط ہے تو اس کے احوال کے مطابق جواب دیا جائے گا۔

شرح: یعنی اس کے احوال کے مطابق ایسا جواب دیا جائے گا جس کا وہ متحمل ہو سکے اور اس میں فائدہ بھی ہو جیسے ذوق، شوق، قبض، بسط، حیرت اور ہیبت وغیرہ۔

قوله: **وان كانَ عارِفاً اجيب مِن حَيث الحقيقة.**

(ارشادِ شیخ ہے) اگر وہ سائل عارف ہے تو اسے حقیقت کے رو سے جواب دیا جائے گا۔

شرح: یعنی حقیقت کے رو سے اس کو ایسا جواب دیا جائے گا کہ اس کا مقام اس کا متحمل ہو سکے، اور وہ اس کے لئے فائدہ مند بھی ہو۔ حقیقت ایسی چیز ہے کہ کسی وقت ہو بھی سکتی ہے اور نہیں بھی ہو سکتی ہے۔ ہاں! اس کا رد نہیں ہے۔

اب اگر کوئی یہ سوال اٹھائے کہ عارف کو کیا ضرورت کہ وہ کسی دوسرے سے پوچھے اور وہ اس کو اس طرح جواب دے کہ اس عارف کا مقام اس کو برداشت کر سکے۔

اب سوال کا جواب یہ ہے کہ جب قدرت کے عجائب وغرائب کی کوئی انتہا نہیں ہے تو مکاشفات کی بھی انتہا نہیں ہے۔ لہٰذا مزید وضاحت اور اطمینانِ قلب کے لئے ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں ایک بزرگ نے فرمایا میرے دل پر ایک بات ظاہر ہوئی اور مجھے اس کا کشف ہوا لیکن چالیس روز تک اس بات کو میں نے اپنے دل میں جگہ نہیں دی جب تک کتاب وسنت یعنی قرآن و حدیث سے اس کا ثبوت اور اس کو شہادت نہیں مل گئی۔

قوله: **وَاظهرهٗ مَا قَالَ بعضُهُمْ اَوَّلَ التَّصُوفُ عِلْمٌ وَاَوسطهُ عَمَلٌ وَآخِرهٗ مَوهبةٌ.**

(ارشادِ شیخ ہے) اور ظاہر ترین جواب اس مسئلہ میں یہی ہے جو بعض لوگوں نے کہا ہے کہ تصوف کا پہلا علم ہے اس کا اوسط عمل ہے اور آخر خطاء و بخشش ہے۔

شرح: یعنی اس جماعت صوفیا کے لوگ علم شریعت کو صرف اللہ تعالیٰ کے لئے خالصاً حاصل کرتے ہیں، پھر محض اللہ کے لئے اس علم کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ اس کے بعد آخر میں وہ عنایتیں حاصل کرتے ہیں کہ جن سے اللہ رب العزت کی قربت کے لائق بن

جائیں۔ اللہ تعالیٰ کی قربت صفت میں ہے مکان میں نہیں۔ چنانچہ جو شخص جتنا بڑا عالم ہے اور علم میں بلند تر مقام رکھتا ہے وہ اتنا ہی زیادہ اللہ تعالیٰ سے نزدیک ہے۔

یہ تقریر اس بات کی دلیل ہے کہ پوری جماعت صوفیا کے لوگ اہل علم ہوتے ہیں۔ اس راہ میں پہلا مقام ''علم'' ہے۔ جو بغیر علم کے عبادت کرتا ہے وہ جھوٹا ہے۔ جس طرح منافقین۔ جو توحید کی باتیں تو کرتے مگر توحید کا علم نہیں رکھتے۔ اسی لئے ان کو کاذبین کہا گیا۔

قولہ: **فَالعِلمُ یکشف عَنِ المُراد وَالعَملُ یُعِینُ عَلَی الطلَب وَالمَوهبة یبلغ غَایة الامَل.**

(ارشاد شیخ ہے) علم مراد کی راہ کھول دیتا ہے، عمل طلب میں ان کی مدد کرتا ہے اور موہبت مقصود تک پہنچا دیتی ہے۔

شرح: علم ان کی مراد یعنی طلب و مقصود کی راہ ان پر کھول دیتا ہے، عمل ان کی طلب یعنی مقصود کے حصول میں ان کی مدد کرتا ہے اور موہبت یعنی اللہ تعالیٰ کی بخشش و عطا ان کو امید کی غایت و انتہا تک پہنچا دیتی ہے جو ان کا مقصود و مطلوب ہے اور یہی وہ بات ہے جو کہی گئی ہے کہ جذبة من جذبات الحق توازی عمل الثقلین (اللہ تعالیٰ کی کششوں میں سے ایک کشش ہے جو دونوں جہان کے عمل کو ڈھانک لیتی ہے)۔

قولہ: **وَاَهلُهُ عَلیٰ ثلث طبقاتٍ مُرید طالب و متوسط سائر و منتهی واصل.**

(ارشاد شیخ ہے) اہل تصوف تین درجے کے ہیں (۱) مرید طالب (۲) متوسط سائر (۳) منتہی واصل۔

شرح: اہلِ تصوف تین درجے کے ہیں ایک مرید طالب ہیں اور طلب کا استعمال ظاہری معاملات میں کرتے ہیں، دوسرے متوسط ہیں جو راہ طئے کرنے والے ہیں، یہ سیر کا استعمال دل کے احوال میں کرتے ہیں، تیسرے منتہی واصل ہیں۔

وصول دو طریقے پر ہے۔ ایک تو وہی ہے جو علمائے ظاہر کرتے ہیں، کہ العلم باللہ

تعالیٰ وصول الیہ اللہ تعالیٰ کو جاننا اس تک پہنچنا ہے، یعنی جس نے اس کو جانا اور اس پر ایمان لایا وہ اس تک پہنچ گیا۔ وصول کا دوسرا طریقہ وہی ہے جو صوفیا کی جماعت کہتی ہے کہ غیر سے منقطع ہونا اللہ تعالیٰ سے اتصال ہے اور غیر سے اتصال اللہ تعالیٰ سے انفصال ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اور بندہ کے درمیان حجاب نہ آسمان ہے نہ زمین، نہ پہاڑ ہے نہ دریا، نہ جنگل ہے نہ بیابان۔ بلکہ حجاب ہے تو غیر حق کے ساتھ مشغول ہونا ہی حجاب ہے، وہ تو تمہاری رگ گردن سے بھی زیادہ نزدیک ہے نحن اقرب الیہ من حبل الورید (قٓ/۱۶) (اور ہم اس سے شہ رگ سے بھی زیادہ نزدیک ہیں)

تم جس چیز کو اپنے سے زیادہ نزدیک سمجھتے ہو وہ اس سے بھی زیادہ تم سے نزدیک ہے۔ وہ تمہاری رگِ گردن سے زیادہ قریب ہے۔ وہ تمہاری آنکھوں کی بینائی سے، تمہاری قوت سماعت سے تمہاری قوت گویائی سے بھی زیادہ تم سے قریب و نزدیک ہے۔ اس لئے کہ قربُ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور اللہ تعالیٰ کی صفت حقیقت کے سوا نہیں ہے۔ اور بعد کی اس کے یہاں گذر نہیں۔ جیسا کہ کسی نے کہا ہے ؎

اے در طلب گرہ کشائی مردہ — با وصل بزادہ و از جدائی مردہ
ای برلب بحر تشنہ در خاک شدہ — وای بر سر گنج و از گدائی مردہ

(اے وہ شخص کہ اس کی طلب و تلاش کے عقدے حل کرنے میں مر رہا ہے، ساتھ پیدا ہوا اور جدائی میں مر رہا ہے، سمندر کے کنارے پیاسا خاک پر لوٹ رہا ہے، خزانہ پر بیٹھا ہے اور گداگری میں مارا پھر رہا ہے)

دوسری بات یہ ہے کہ جب سالک کو مشاہدۂ حق کا کمال حاصل ہو جاتا ہے اور وہ اس کے مشاہدہ میں ایسا مستغرق رہتا ہے کہ لا یسمع فیہ غیرہ۔ کہ پھر اس حال میں کوئی رہتا ہی نہیں۔ اور اس وقت وہ کہہ اٹھتا انا من اھوی ومن اھویٰ لنا۔

اور مستی میں یوں کہتا ؎

معشوق عیاں بود نمی دانستم — بامن بمیاں بود نمی دانستم

گفتم بطلب مگر بجای برسم خود تفرقہ آن بود نمی دانستم

(میرا محبوب میرے سامنے ہی تھا اور مجھے خبر نہیں۔ وہ تو میرے ساتھ ہی تھا اور مجھے کچھ پتا نہیں۔ میں نے کہا اس کی تلاش میں کہیں چلوں، یہ خود تفرقہ تھا جسے میں سمجھ نہ سکا)

قوله: فَالمُرِید صَاحِب وَقتٍ وَالمُتوسِّط صَاحب حالٍ وَالمُنتَهی صَاحب نفسٍ وَاَفضَل الاَشیَاء عِندهُم عَددالانفاس.

(ارشادِ شیخ ہے) مرید صاحب وقت ہے متوسط صاحب حال ہے اور منتہی صاحب نفس ہے سب سے افضل چیز ان کے نزدیک سانسوں کی گنتی ہے۔

شرح: یعنی مرید صاحبِ وقت ہوتا ہے۔ وقت میں جو سب سے اہم اور بہتر ہے اسی سے اس کو کام ہے، متوسط صاحبِ حال ہوتا ہے وہ ظاہری مقامات سے گذر کر احوال کی ترقی میں لگا رہتا ہے، ہر گھڑی اور ہر لمحہ ایک حال سے دوسرے حال پر ترقی کرنا اس کا کام ہے۔ اسی کو کسی نے کہا ہے ؎

صوفیاں در دمے دو عید کنند عنکبوتاں مگس قدید کنند

(حضرات صوفیا ایک ہی سانس میں دو دو عیدیں مناتے ہیں۔ مکڑیاں مکھی شکار کیا کرتی ہیں)

ان کی ایک عید اس حال سے نکلتا ہے جس میں تھے اور دوسری عید پھر اس دوسرے حال سے نکلنا ہے اور ترقی پر ترقی کرنا ہے۔ اسی معنی کے اعتبار سے ہر لمحہ اور ہر لحظہ ان کی دو عید ہوتی ہے۔ یعنی ان کو دو خوشیاں ملتی ہیں۔

منتہی صاحبِ نفس ہوتا ہے، اس کے نزدیک سب سے افضل چیز سانسوں کی گنتی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کی کتنی سانسیں چل رہی ہیں۔ اس لئے ہر سانس میں بارگاہِ الٰہی سے ان کو تحفہ پہنچتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی نوازش و کرم کی کوئی انتہا نہیں تو اللہ رب العزت جو تحفہ ان کو پہنچاتا ہے اس کی بھی کوئی انتہا نہیں۔ اسی کو کہا ہے مَن غابَ طرفة عين لم يهتد اليه ابداً جو ایک

پلک مارنے کی حد تک بھی اس کی یاد سے غافل اور غائب رہتا ہے وہ ہرگز اس تک راہ نہیں پاتا۔ یعنی اگر ایک پل اور ایک لمحہ بھی اس کی یاد چھوٹ گئی تو اس کی پہنچ اس بارگاہ تک نہیں ہو سکتی۔ اسی خوف سے اس کی ایک سانس بھی اللہ سے غائب نہیں ہوئی۔

حاصل کلام یہ کہ صاحبِ وقت، وقت کے حکم پر چلتا ہے، صاحبِ حال، حال کے حکم پر عمل کرتا ہے اور منتہی اسے کہتے ہیں جو اپنے نفس پر فتحیاب ہوتا ہے، جب نفس پر فتح و نصرت حاصل کر لیا تو اسے واصل کہا جاتا یعنی اوصاف بشری کو اس نے جڑ سے اکھاڑ پھینکا، حجاب سے نکل آیا، ملک و ملکوت اس پر کھل گئے۔

سانسوں کی گنتی کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ سانس کی گنتی کا خیال رکھنا چاہیئے اگر تم نہیں گنو گے تو وہ خود تم کو شمار کر لے گا جیسا کہ فرمایا **انّما نعد لھم عدا** (مریم / ۸۴) (بیشک ہم ان کی ایک ایک سانس کا حساب کریں گے) جب آدمی اپنی سانس کی گنتی خود کرتا رہے گا اور اس کا شمار رکھے گا تو قیامت میں اس کا حساب دینا آسان تر ہو جائے گا۔ اس لئے کہ شمار کرنے کے معنی کسی چیز کی گنتی کرنا نہیں ہے بلکہ سانسوں کی حفاظت اور اس کا خیال رکھنا ہے۔ جب تک کسی چیز پر عمل نہیں ہو گا اس چیز کا حاصل اسے کہاں مل سکتا۔ یعنی سانس کی اس حفاظت میں اتنے غلبہ حاصل ہونا چاہیئے۔ اس کی اصل یہ ہے کہ آدمی جب کسی مراتب پر پہنچتا ہے تو وہ دانا تر ہو جاتا ہے اسی وجہ سے اس کی تلاش و آرزو بڑھتی جاتی ہے۔ یہ لوگ نہ ایسی کوئی بات بولتے ہیں اور نہ ایسا کوئی کام کرتے ہیں جو ادب اور حرمت کے خلاف ہو۔ یہ محافظت اس کی رگ و پے میں ہو، تاکہ ایسی بات کی گذر دل میں نہ ہو جو ادب واحترام کے منافی ہو، جس قدر ادب واحترام میں اضافہ ہو گا اسی قدر نفس کی محافظت بھی بڑھے گی، یہاں تک کہ ہر وقت کی حاضری و حضور کا شرف حاصل ہو جائے گا، ایک سانس بھی وہ حضوری سے غائب نہیں رہے گا اور نہ ایک پل حضور سے اوجھل ہو گا، نہ ایک جملہ حضور کے بغیر زبان سے ادا ہو گا اور نہ ایک حرکت حضوری کے بغیر ہو گی، اگر ایسا ہوا تو پھر اس کی پکڑ سے نکلنا مشکل اور عتاب سے چھٹکارا دشوار۔ **المخلصون علی خطر عظیم** میں ہے۔

قولہ: فَا لمُرید متعُوبُ فی طَلَبِ المُراد.

(ارشادِ شیخ ہے) مرید طلب مراد میں رنج وتکلیف اٹھانے والا ہوتا ہے۔

شرح: یعنی مرید تلاش وجستجو میں رہتا ہے اور تلاش وجستجو میں پریشانی اور بلا کے سوا کیا ہے اور یہ بھی معلوم رہے کہ مطلوب جس درجہ ومرتبہ کا ہوتا ہے اس کے حصول میں پریشانی بھی اسی درجہ کی ہوتی ہے، جب مطلوب بہت زیادہ عزیز اور معزز ہے تو اس کی طلب میں بھی اتنی ہی زیادہ دشواریاں ہیں اور یہ بات طئے ہے کہ حق سبحانہ تعالیٰ سے زیادہ کوئی شئے عزیز اور محترم نہیں تو یہ بات بھی سچ ہے کہ اس کے طالب کو اس کے طلب میں آسانیاں کہاں نصیب ہوسکتی ہیں۔ مثل ہے کہ ''**عاشقِ آفتاب را آسانی بنود**'' سورج کے عاشق کو آسانی اور آرام وعافیت کہاں نصیب۔

قولہ: وَالمُتَوسّط مَطالِب بِاٰداب الْمَنازِل وَهُوَ صَاحب تلوِین لَانّهٗ یر تقی مِن حالٍ اِلیٰ حالٍ وَمن وَصف الیٰ وصفٍ وهُو فِی الزّیادہ.

(ارشادِ شیخ ہے) متوسط وہ ہے جس سے آدابِ منازل کا مطالبہ ہوتا ہے وہ صاحبِ تلوین ہے اس لئے کہ وہ ایک حال سے دوسرے حال میں اور ایک صفت سے دوسری صفت کی طرف ترقی کرتا ہے اور وہ اس کی زیادتی میں رہتا ہے۔

شرح: متوسط اسے کہتے ہیں جس سے منازل کے آداب کا مطالبہ ہو۔ وہ صاحبِ تلوین ہے۔ کیونکہ وہ ایک حال سے دوسرے حال کی طرف اور ایک صفت سے دوسری صفت کی جانب ترقی کرتا ہے، اس ترقی میں وہ ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف بڑھتا رہتا ہے، تلوین اربابِ احوال کی صفت ہے۔

قولہ: وَالمُنتَهِی الواصِلَ محمولٌ قَد جَاوز المقَامات وهُو فِی مَحل التمکین لَا یغیرہ الاَحوال وَلَا یؤثر فِیه الاَهوال.

(ارشادِ شیخ ہے) منتہی واصل ہوتے ہیں وہ جذب میں ہوتے ہیں، وہ تمام مقامات

طئے کئے ہوتے ہیں وہ مقامِ تمکین میں ہوتے ہیں، نہ ان کو احوال متغیر کرتے ہیں اور نہ اہوال سے متاثر ہوتے ہیں۔

شرح: یعنی جو بشریت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتا ہے، ظلمات کے حجاب سے نکل آتا ہے، نفس پر قابو اور فتح پالیتا ہے اور ملک وملکوت وجبروت کے صحرائے کشف میں گشت لگاتا ہے اسی کو منتہی کہتے ہیں اور اسی کو واصل بھی کہتے ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اسے احوال و اہوال متغیر نہیں کرتے۔ اور اہوال یہ نہیں ہے کہ بندہ کے اندر کسی طرح کا تغیر ہی نہ ہو۔ یہ بات تو محال ہے اس لئے کہ بندہ بشر ہے اور ایک حال سے دوسرے حال کی طرف ہونا اس کی لازمی صفت ہے، اس سے مراد دراصل یہ ہے کہ جو حقیقت منکشف ہو وہ اس سے پوشیدہ نہ رہے، اس میں کوئی کمی نہ ہو، لیکن جو صاحبِ تلوین ہوتے ہیں ان کے لئے یہ جائز ہے کہ ان کے کشف میں کمی ہو، بشری صفات کے ظہور کے وقت وہ اور اس کی حقیقت بعض احوال میں اس سے پوشیدہ رہے۔

محمول = مجذوب کے معنی میں ہے۔ یہ جذبہ سے بنا ہے جس کے معنی ہے اللہ تعالیٰ کی وہ قدرت جو بندہ کو اپنے طرف کھینچتی ہے جہاں چاہتی ہے۔

الاھوال = اہم اور سخت ودشوار کام۔

قوله: **كما قِيلَ ان زلَيخة لمّا كانَت صاحبة تمكين في شانِ يوسف لَم يؤثر فيها روية يوسف كما اثرت في ألّلاتي قطعن أيديهن فان كانت أتم في حبه منهن.**

(ارشاد شیخ ہے) جیسا کہ کہا گیا ہے کہ زلیخا، یوسف کی محبت میں صاحبِ تمکین تھیں، اس لئے یوسف کے دیدار سے وہ متاثر نہیں ہوئیں جس طرح ان عورتوں پر اثر ہوا جنہوں نے یوسف کو دیکھ کر اپنے ہاتھ کاٹ لئے، حالانکہ زلیخا، حضرت یوسف کی محبت میں ان عورتوں سے زیادہ کامل تھیں۔

شرح: یعنی جس وقت حضرت یوسف علیہ السلام ان عورتوں کے سامنے آئے اس وقت ان عورتوں

نے جو کرلیا وہ کرلیا، لیکن اس وقت وہاں پر زلیخا بھی موجود تھیں۔ ان کے جسم کا ایک رواں بھی متاثر نہیں ہوا۔ اس لئے کہ وہ حضرت یوسف کے معاملہ میں صاحب تمکین ہو چکی تھیں۔

قوله: فمقام المريد المجاهدات والمكابدات و تجرع المدارات ومجانبة الحظوظ وما للنفس فيه متعة.

(ارشاد شیخ ہے) مرید کا مقام مجاہدے کرنا، سختیاں جھیلنا، کڑوے گھونٹ پینا اور نفس کی لذتوں سے دور رہنا ہے۔

شرح: یعنی مرید کا کام نفس کو آرام دینا اور اس کی مراد کو پوری کرنا نہیں ہے۔ اس میں ذرہ برابر ڈھیل اور رخصت زہر قاتل ہے۔

المجاهدات = اللہ تعالیٰ کے لئے کسی سے جنگ کرنا مجاہدات ہے۔

المکابدات = سختی جھیلنا۔

یعنی نفس کی مخالفت سے بڑھ کر نفس کے لئے کوئی سخت اور تلخ چیز نہیں ہو سکتی۔ اور نفس کی مخالفت ہی میں نفس کے شر سے سلامتی مل سکتی ہے۔ نفس کے مکر سے اللہ تعالیٰ ہی نکال سکتا ہے، اگر ایک پل کے لئے بھی نفس کو موقع دے دیا تو سمجھ جایئے کہ وہ ہزاروں زنا باندھ دے گا اور ہزاروں بُت سامنے لا کر رکھ دے گا۔ کسی حال میں بھی نفس کو خیر اور بھلائی کرنے والا نہیں سمجھنا چاہیئے۔ اگر سو ہزار سال تک بھی نفس پر قہر ڈھاتے رہے، اس کی مخالفت کرتے رہے اور صرف ایک بار اس کی مراد پوری کر دی تو وہ تمہاری ساری سلامت روی کو زمین پر پٹخ دے گا اور برباد کر کے رکھ دے گا۔ اِسی کو کسی نے کہا ہے ؎

آنچہ با من ایں سگی شوم آن کند　　　　کافرم گر کافر روم آن کند

(میرے ساتھ میرا یہ منحوس نفس جو کچھ کر رہا ہے قسم ہے روم کے کفار بھی وہ نہیں کرتے)

نفس کے کچھ حقوق ہیں اور حقوق سے زیادہ جو کچھ ہے وہ سب لذتیں ہیں۔ حقوق بس

اسی مقدار میں ہوں جن سے نفس قایم رہے اور وہ روٹی، کپڑا اور مکان ہے۔ ان کے علاوہ جو مرادیں اور سامانِ راحت ہیں وہ سب لذتوں کی قسمیں ہیں۔ اسی وجہ سے مرید کے حق میں کہا جاتا ہے نومہ غلبة و اکله و کلامه ضرورة۔

جتنی زیادہ لذتیں ہوں گی وہ حظوظ میں شامل ہوں گی، حظوظ ضرورت سے زیادہ کو کہتے ہیں، کہا جاتا ہے کہ مرید طالب اور جستجو و تلاش کنندہ ہوتا ہے۔ طالب اور تلاش کنندہ کو رنج و تکلیف اور بلاء و مصیبت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ چنانچہ مطلوب جتنا زیادہ عزیز ہوگا طالب کو اتنا ہی زیادہ سختیاں برداشت کرنی پڑیں گی، جیسا کہ پہلے کہا گیا اور پھر دنیاوی کاموں میں بھی تو یہی دیکھنے کو ملتا ہے۔

نقل ہے کہ حضرت خواجہ ابراہیم ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کوئی شخص بھی اس وقت تک صالحین کے درجہ پر نہیں پہنچ سکتا جب تک وہ ان چھ گھاٹیوں سے گذر نہ جائے:

۱. نعمت کا دروازہ اپنے اوپر بند کرے اور سختیوں کا دروازہ کھول لے
۲. عزت کا دروازہ اپنے اوپر بند کرلے اور ذلت کا دروازہ کھول لے
۳. خوشحالی کا دروازہ اپنے اوپر بند کرلے اور فقر کا دروازہ کھول لے
۴. نیند کا دروازہ اپنے اوپر بند کرلے اور بیداری کا دروازہ کھول لے
۵. آرام وعافیت کا دروازہ اپنے اوپر بند کرلے اور رنج و تکلیف کا دروازہ کھول لے
۶. آرزو و امید کا دروازہ اپنے اوپر بند کرلے اور تیاریٔ موت کا دروازہ کھول لے

قوله: وَمقَام المُتَوسّط رکوب الاَهوال فِی طَلَبِ المراد وَمراعات الصِدق فِی الاَحوالِ وَاستعمالِ الا دَابِ فِی المَقَامَاتِ.

(ارشاد شیخ ہے) متوسط کا مقام مراد کی طلب میں سختیاں اور دشواریاں اٹھانا ہے احوال میں سچائی یعنی صدق کی حاظت کرنا ہے اور تمام مقامات میں اس کے آداب پر کاربند رہنا ہے۔

شرح: یعنی متوسط اس کو کہتے ہیں جو مرید کے مقام سے گذر چکا ہو لیکن منتہی کے مقام پر نہیں

پہنچا ہو، یعنی جس حال میں بھی رہے اس حال میں صادق رہے کیونکہ ہر مقام کا ایک ادب ہے۔ متوسط کے حق میں مقامات کا استعمال مجازاً ہوا ہے۔

صدق کا پہلا درجہ یہ ہے کہ ظاہر و باطن یکساں ہو۔ حضرت خواجہ احمد بن خضرویہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جو یہ چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ ہو اس کو اپنے لئے صدق لازم کر لینا چاہیئے اس لئے کہ اللہ رب العزت فرماتا **ان اللہ مع الصادقین۔**

اور صادق اسی کو کہیں گے جو اپنے تمام اقوال میں سچا ہو اور صدیق اس کو کہیں گے جو اپنے تمام اقوال افعال اور احوال میں سچا ہو۔

قوله: ومقام المنتهى الصحو والتمكن واجابة الحق من حيث دعاهُ.

(ارشاد شیخ ہے) منتہی کا مقام صحو و تمکن ہے اور اللہ تعالیٰ جہاں بلائے اس کی دعوت کو قبول کرنا ہے۔

شرح: صحو، سکر کا ضد ہے اور تمکن، تلون کا ضد ہے یعنی صاحب صحو، صاحبِ تمیز ہوتا ہے لیکن صاحبِ سکر میں ایسی بات نہیں ہوتی۔ اسی طرح صاحبِ تمکن وارد کے ورود ہونے سے دور رہتا ہے (ورودِ وارد سے مراد انتقالِ احوال ہے۔ مترجم)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ تمکن میں کاموں کا ملکہ ہو جاتا ہے، یعنی صاحبِ تمکین کو کاموں کے لئے کوشش کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اور وہ کوشش یعنی تگ و دَو سے آزاد رہتا ہے اور **اجابت الحق من حیث دعاهُ** کا معاملہ میرے سِر سے ہے، اللہ تعالیٰ سِر کے ذریعہ اپنے اولیاء سے امر و نہی کا خطاب فرماتا ہے جس طرح ظاہر میں مخاطبت ہوتی ہے، چنانچہ ظاہری مخاطبت میں اوامر کی بجا آوری اور نواہی سے اجتناب فرض ہے لہٰذا اربابِ تمکین کے لئے ان کے معاملات میں منہیات سے پرہیز اور احکام کی پیروی فرض ہے یہ فرض حال کے حکم میں ہے۔ اسی کو فرضِ حالی کہتے ہیں۔ جب ان کے دل پر کوئی بات گذرتی ہے تو وہ فوراً اس تحقیق میں لگ جاتے ہیں کہ ان سے کس چیز کا مطالبہ ہو رہا ہے اور امر و احکام کی عظمت کو قایم رکھنے کے لئے کہا جا رہا ہے یا

شریعت کو قایم رکھنے کی بات کہی جارہی ہے یا پھر غیروں کی اصلاح کا حکم دیا جارہا ہے۔ جب ان کے دل کو یہ یقین ہو جاتا ہے کہ اس معاملہ میں حق سبحانہ تعالیٰ کی رضاء وطلب کیا ہے تو فوراً اسے قبول کر لیتے ہیں اور اس کی بجا آوری میں لگ جاتے ہیں۔

قوله: قد استوی فی حالة الشدة والرجاء والمنع والعطاء والجفاء والوفاء.

(ارشاد شیخ ہے) یہ سچ اور درست ہے کہ منتہی کے حال میں سختی و آسانی، دینا اور نہ دینا، جفا و وفا سب یکساں ہو۔

شرح: یعنی اگر تمام ملکوت آسمانی (تمام آسمانوں کی نعمتیں) اس کے پہلو میں لاکر رکھ دیں تو وہ اپنے حال پر رہے اور اگر دونوں جہاں کی ساری بلائیں و مصیبتیں اس کے سر پر ڈال دی جائیں تو وہ ویسا ہی رہے۔ کسی حال میں بھی اس میں کوئی فرق نہ آئے۔ اسی کو کہتے ہیں **حقیقة المحبة لا تزید بالعطاء ولا تنقص بالمنع والجفاء** حقیقتِ محبت یہی ہے کہ عطاء و بخشش سے نہ اس میں اضافہ ہو اور سختی و جفا سے اس میں نہ کمی ہو۔ بیت ؎

خواهیم بکش خواه بزن خواه بدار　　　یک رویہ شدہ است مرمرا با تو کار

(تو مجھ کو مارے یا قتل کرے یا اپنے پاس رکھے میں جان و دل سے اپنے کام کو تیرے سپرد کر چکا ہوں)

قوله: اکلہٗ کجوعه ونومه کسهره قد فنیت حظوظه وبقیت حقوقه وظاهره مع الخلق وباطنه مع الحق.

(ارشاد شیخ ہے) ان کا کھانا ان کے بھوک کی طرح اور ان کی نیند ان کی بیداری کی طرح ہوتا ہے۔ ان کی لذتیں اور خواہش فنا ہو جائیں اور حقوق باقی رہ جائیں۔ ان کا ظاہر خلق کے ساتھ ہوتا ہے اور ان کا باطن حق کے ساتھ۔

شرح: یعنی مخلوق سے اپنی کوئی مراد طلب نہیں کرنا ان حضرات کو پسند ہے اگر چہ ان کے اسرار

حق سبحانہ تعالیٰ کے ساتھ ہوتے ہیں اس کے باوجود حق تعالیٰ ان کے ظاہر کو ایسا بنا دیتا ہے اور ایسی جگہ پر رکھ دیتا ہے جہاں شریعت کے حدود میں رہ کر معمولی کاموں میں لگے رہیں تا کہ لوگوں کو ان کی ذات سے فائدہ پہنچتا رہے۔ اس وقت ان کا باطن اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہوتا ہے۔

ان کا ظاہر خلق کے ساتھ ہو اس سے مراد شریعت ہے اور ان کا باطن حق کے ساتھ ہو اس سے مراد حقیقت ہے، جیسا کہ کسی نے کہا ہے ؎

دل پیش توام دیدہ بجای دگرستم تا خلق نداند کہ ترامی نگرستم

(لوگ یہ نہ سمجھیں کہ میں آپ کو دیکھ رہا ہوں اس لئے میرا دل تو آپ کے پاس ہوتا ہے مگر میں اپنی نگاہ کو دوسروں کی طرف کیے رہتا ہوں۔)

حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا انی ابیتُ عند ربی اور یہ بھی فرمایا اظل عند ربی۔ میں ہمیشہ رات دن اپنے رب کے حضور رہتا ہوں۔

لفظ "عِندَ" سے حضوری، قربت اور نزدیکی مراد ہے اور حضور ﷺ کا رب تعالیٰ کے پاس ہونا سِر (باطن) سے ہے، بظاہر تو آپ اپنے اصحاب، رفقاء اور اہلِ بیت کے ساتھ ہوتے اور لوگ یہ سمجھتے کہ حضور ہمارے ساتھ ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ انبیاء ذوطرفین (دونوں طرف والے) ہوتے ہیں۔ یعنی ظاہر و باطن والے۔ ظاہری صحبت خلق کے ساتھ اور باطنی صحبت حق کے ساتھ ہوتی ہے۔ ان کا ظاہر قایم بصفاتِ خلق ہوتا ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا قُل اِنَّمَا اَنَا بَشَر مِثلکم (الکھف / ۱۱۰) (فرمادیجئے کہ میں بشر ہی ہوں تمہاری طرح) اور ان کا باطن قایم بہ صفات حق ہوتا ہے اس کی دلیل میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے انی لست کاحد کم (درحقیقت تم لوگوں سے کسی ایک کی طرح بھی میں نہیں ہوں) اور پھر یہ بھی ارشاد نبوی ہے جس میں دونوں باتیں بیان فرمائی ہیں تنام عینائی و لاینام قلبی (میری آنکھیں سوتی ہیں اور میرا دل جاگتا ہے) چوں کہ آپ کا ظاہر خلق کے ساتھ ہوتا ہے اس لئے ظاہراً سوئے اور باطن حق کے ساتھ ہوتا اس لئے باطناً جاگتے۔

ہاں! جو پیغمبر نہیں ہیں ان کے لئے جائز ہے کہ وہ ایسی صفت پر ہوں کہ نہ لوگ ان کے ساتھ میل جول رکھیں اور نہ ان کو لوگوں سے آرام وسکون حاصل ہو۔ جب لوگ ان کو اس صفت کے ساتھ دیکھتے تو کہتے ''یہ دیوانے ہیں'' اِس امت میں ایسے لوگ بہت ہوئے ہیں جو لوگوں سے بھاگتے ہیں اور کسی سے تعلقات نہیں رکھتے۔ اپنے نفس کی مراد کسی سے پوری نہیں کرتے، جو کچھ سامنے آجاتا اسی کو جائز سمجھتے یعنی اسی پر اکتفا کرتے، بھوک وپیاس اور تشنگی وبرہنگی برداشت کرتے ہیں۔ چنانچہ لوگ ان کو دیوانہ کہنے لگتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں میں ایک شخص بہلول بھی ہوئے۔

ہاں! یہ بھی معلوم رہے کہ یہ صفت اور یہ حال پیغمبروں کے لئے جائز نہیں۔ اس لئے کہ یہ تو مخلوق کی اصلاح کے لئے تشریف لائے ہیں، اگر یہ حضرات مغلوب الحال ہوتے تو خلق برباد ہوجاتی اور شریعت واضح نہیں ہوتی۔

قولہ: وکل ذلک منقول من احوال النبی ﷺ واصحابه اولاً کان متخلیا فی غار حرا ثم صار مع الخلق ولافرق عنده بین الخلوۃ والجلوۃ وکذالک اصحاب الصفة صاروا فی حالة التمکن امراء ووزراء فان المخالطة لا تؤثر فیهم.

(ارشادِ شیخ ہے) اور یہ جو کچھ میں نے کہا یہ سب نبی اکرم ﷺ اور آپ کے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے احوال سے منقول ہیں۔ آپ ﷺ پہلے غارِ حرا میں خلوت نشیں رہے۔ پھر وہاں سے لوگوں کے درمیان تشریف لائے۔ آپ کے نزدیک خلوت وجلوت میں کوئی فرق نہیں تھا۔ یہی حال اصحابِ صفہ کا تھا۔ اس حالِ تمکن میں وہ امراء ووزراء ہوئے۔ لیکن یہ سچ اور درست ہے کہ اختلاط اور میل جول سے ان پر کوئی اثر نہیں پڑا۔

شرح: یعنی ظہورِ نبوت سے پہلے رسول اللہ ﷺ اس غار میں چلے جاتے جو حراء پہاڑ میں ہے۔ وہیں مشغول بحق رہتے، جب وحی کا نزول ہوا اور دعوت کا حکم ملا تو لوگوں کی دعوت کی

طرف لگ گئے۔ اُس خلوت اور اِس مشغولیت میں کوئی فرق نہیں تھا، اس لئے کہ آپ ﷺ متمکن ہو چکے تھے اور میں کہہ چکا ہوں کہ متمکن کے لئے خلوت وجلوت دونوں برابر ہیں۔ یہی حال جملہ اصحاب صفہ رضی اللہ عنہم اجمعین کا تھا، ان میں اکثر وبیشتر حالتِ تمکن میں ہوتے ہوئے بھی امراء و وزراء ہوئے۔ لوگوں کے کاموں میں مشغول رہے۔ لیکن ان کا یہ ظاہری مشغلہ، ان کو مشغولیتِ حق سے روک نہ سکا۔ اس لئے کہ ان میں سے ہر ایک توحید میں متمکن ہو چکے تھے۔

ایک بزرگ نے فرمایا موحد وہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے اور دونوں جہان کے درمیان جدائی ڈال دی ہو۔ یہاں دونوں جہاں سے دنیا وآخرت دونوں مراد ہیں۔ یعنی جب توحید کی نعمت حاصل ہوگئی تو اس کے سامنے کوئی مراد ہوتی ہی نہیں۔ نہ دنیا کی نہ آخرت کی۔ اس لئے کہ دنیا اور عقبیٰ دونوں غیر حق ہیں اور غیر حق کے ساتھ مشغولیت اس بات کی علامت ہے کہ وہ اللہ سے دور اور غافل ہے۔ جو اللہ سے غافل اور فارغ نہیں اس کے لئے خلوت کیا اور جلوت کیا۔ مثل مشہور ہے کہ جنگل میں جہاں شیر اپنا گھر بنالیتا ہے وہاں کسی دوسرے جنگلی جانور کی گذر کہاں! جہاں یہ محال ہے وہیں یہ بھی محال ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کو اپنا ولی بنا کر اپنے لئے مخصوص کر لیتا ہے اور ولی کے دل میں کسی غیر کی گذر ہو جائے۔ اسی کو کسی نے کہا ہے ؎

آنجا کہ سلطان خیمہ زد غوغا نماند عام را

(جہاں بادشاہ کا خیمہ لگتا ہے وہاں عوام کا شور وہنگامہ نہیں ہوتا)

فصل-۷

صوفیاء کے مذہبی احکام کے بیان میں

قولہ: فصل فی بیان احکام المذھب.

(ارشاد شیخ ہے) یہ فصل اہلِ تصوف کے مذہب کے احکام کے بیان میں ہے۔

شرح: حضرت امام قشیری رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے، انہوں نے فرمایا مریدوں کے لئے سب سے بری بات یہ ہے کہ وہ اپنے کو کسی دوسرے مذہب سے منسوب کرے۔ صوفیاء کو اہل تصوف کے مذہب کے علاوہ مختلف مذاہب میں سے کسی مذہب سے بھی نسبت نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ اپنے مسائل میں اہلِ تصوف کی دلیلیں دوسروں کی دلیلوں سے زیادہ واضح اور روشن ہیں۔ اور صوفیا کے مذہب کے اصول و قاعدے دوسروں کے اصول و قاعدے سے زیادہ مضبوط وقوی ہیں۔ دوسرے لوگ اصحاب اثر ونقل اور ارباب فکر وعقل ہوتے ہیں اور جماعتِ صوفیا کے مشائخ دریائے فکر واثر اور عقل ونقل کو عبور کر کے اس مقام پر پہنچے ہوتے ہیں جہاں ان کے لئے کوئی چیز نظروں سے اوجھل نہیں ہوتی۔ جو کچھ دوسروں سے پوشیدہ ہے وہ ان پر روشن ہے۔ دوسرے لوگ جن چیزوں کے لئے دلیل کے محتاج ہیں یہ مشائخ ان کو بغیر دلیل جانتے و پہچانتے ہیں۔ یعنی ان کو دلیل کی حاجت نہیں ہوتی۔

قولہ: ثم ان للمذهب ظاهراً و باطناً فظاهره استعمال الادب مع الخلق و باطنه منازلة الا حوال و المقامات مع الحق.

(ارشادِ شیخ ہے) پس یہ سچ اور درست ہے کہ مذہب کے لئے ظاہر بھی ہے اور باطن بھی۔ مذہب کا ظاہر خلق اللہ کے ساتھ ادب کا استعمال ہے اور اس کا باطن احوال و مقامات کے نزول کے وقت حق سبحانہ تعالیٰ کے ساتھ ہوتا ہے۔

شرح: یعنی اہل تصوف کے یہاں مذہب کے لئے ایک ظاہر ہے اور ایک باطن ہے۔ ان کے مذہب کا ظاہر خلق کے ساتھ ادب کا استعمال ہے اور یہ شریعت ہے۔ ظاہر مذہب کے مطابق جیسا کہ شریعت کا حکم ہے لوگوں کے ساتھ معاملات کرتے ہیں۔ لوگوں سے اپنی مراد کی طلب ان کو پسند نہیں جیسا کہ پہلے بیان ہوا۔

اور ان کے مذہب کا باطن یہ ہے کہ احوال و مقامات کا نزول حق سبحانہ تعالیٰ کے ساتھ کرتے ہیں۔ یعنی صدق سے احوال و مقامات کی تحقیق کرتے ہیں اور یہ مذہب کی حقیقت ہے۔ حاصل کلام یہ کہ وہ حقیقت کے حکم کے مطابق حق تعالیٰ کے ساتھ ہوتا ہے، حق سبحانہ تعالیٰ جس طرح اس کے باطن کو حرکت و سکون بخشتا ہے وہ بندہ حرکت و سکون میں آتا ہے اور یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے تصرف سے ہوتا ہے، بندہ تو درمیان میں صرف علامت ہے۔

حال: یہ وہ معنی ہے جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے دل میں جگہ پاتا ہے۔ اس کو اگر خود سے دفع کرنا چاہے تو دفع نہیں کر سکتے اور اگر بتکلف لانا چاہے تو لا نہ سکے۔

مقام: محلِ اجتہاد میں طالب کی راہ اور اس کی قدم گاہ سے عبارت ہے۔

حال اللہ تعالیٰ کے اس فضل اور لطف و کرم سے عبارت ہے جو بندہ کے دل پر بغیر کسی مجاہدہ کے ہوتا ہے۔ مقام کا تعلق اعمال سے ہے اور حال کا تعلق افضال یعنی فضل و کرم ہے۔

صاحبِ مقام اپنے مجاہدہ سے قایم ہوتا ہے اور صاحبِ حال اپنے آپ سے فانی ہوتا ہے۔ اس کا قیام اس حال میں ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر پیدا کر رکھا ہے۔

حال کو دوام اور ہمیشگی حاصل ہوتی ہے یا نہیں اس میں مشائخ رحمہم اللہ کی مختلف رائے

ہے۔ بعض حضرات دوامِ حال کو جائز اور روا سمجھتے ہیں اور بعض مشائخ کے خیال میں دوامِ حال روا نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حال بجلی کی چمک کی طرح ہے۔ ابھی چمکی اور فوراً غائب ہوگئی۔ ہاں! جو کیفیت باقی رہتی ہے وہ حال نہیں ہے بلکہ حدیث نفس ہے۔

حضرت حارث محاسبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دوامِ حال روا ہے، یعنی حال کو ہمیشگی حاصل ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ محبت، شوق، قبض، بسط یہ سب کیا ہیں، احوال ہی تو ہیں۔ اگر ان کو ہمیشگی اور دوام حاصل نہیں تو پھر نہ محب، محب رہے گا اور نہ مشتاق، مشتاق رہے گا۔ جب تک بندہ ان احوال سے موصوف نہیں ہوتا اس اسم سے موسوم نہیں ہوتا۔ اسی لئے وہ رضاء کو جملہ احوال میں شمار کرتے ہیں۔

قولہ: الاتری ان النبی علیہ السَّلام لما نظر الی المصلی وھو یعبث فی صلواتِہٖ قال لو خشع قلبُہٗ لخشعت جوارحہ.

(ارشادِ شیخ ہے) کیا تم یہ نہیں دیکھتے کہ نبی اکرم ﷺ نے جس وقت ایک نماز پڑھنے والے کو اس حال میں دیکھا کہ وہ اپنی نماز کی حالت میں شغل کررہا تھا تو حضور ﷺ نے فرمایا اگر اس کے دل میں ڈر ہوتا تو یقیناً اس کے اعضاء میں بھی ڈر ہوتا۔

شرح: یعنی جب رسول ﷺ نے ایک نماز ادا کرنے والے کو اس حال میں دیکھا کہ وہ حالتِ نماز میں کپڑوں سے کھیل رہا ہے تو فرمایا اگر اس کے دل میں ڈر ہوتا تو یقیناً اس کے جسم پر بھی خوف کی کیفیت طاری رہتی۔ اس کے اعضا اللہ تعالیٰ کے خوف سے پُرسکون رہتے۔ اور وہ اپنی نماز میں حاضر رہتا۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جس طرح باطن کو صحیح و درست ہونا ہے اسی طرح ظاہر بھی صحیح درست رہے۔ چنانچہ باطن جتنا زیادہ پاکیزہ اور باادب ہوگا ظاہر اتنا ہی زیادہ درست ہوگا۔ جس کا ظاہری ادب جس درجہ نمایاں اور شفاف ہوگا اس کی باطنی صفات اسی قدر تاباں و درخشاں ہوگی۔ کیا یہ نہیں دیکھتے کہ انبیاء علیہم السلام اپنے باطن کی صحت میں تمام مخلوق میں سب سے زیادہ افضل و اعلیٰ ہوتے ہیں تو وہ اپنے ظاہر میں بھی سب سے زیادہ باادب اور بہ احترام

ہوتے ہیں عالمِ مشاہدہ میں بھی اس کی مثال ملتی ہے کہ جو جتنا زیادہ باادب ہوتا ہے وہ بادشاہوں سے اتنا ہی قرب ہوتا ہے۔ اور جو شخص جتنا بے ادب ہوتا ہے وہ بادشاہوں سے اتنا ہی دور ہوتا ہے۔ بے ادبی بے حرمتی ہے اور بے حرمتی قطعیت (دوری) کی متقاضی ہے نہ کہ قربت کی۔ دیکھئے نا ابلیس اتنی ساری عبادتوں کے باوجود بے ادبی کا مرتکب ہو گیا اور کہہ اٹھا اَنَا خَیرٌ مِنۡهُ (میں آدم سے بہتر ہوں) اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ طوقِ دوری اس کی گردن میں ڈال دیا گیا۔ اس کے برعکس حضرت آدم علیہ السلام جن کے پاس عبادت کی کوئی پونجی نہیں تھی۔ مگر ادب کی دولت سے مالا مال تھے یوں عرض پیش کی ربنا ظلمنا انفسنا تو اس کے صلہ میں تاجِ قربت ان کے سر پر رکھ دیا گیا۔

اس مثال سے یہ بات واضح ہوگئی کہ بے ادبی میں بے حرمتی ہے اور بے حرمتی قطعیت یعنی دوری کا سبب ہے۔ ادب میں حرمت و تعظیم ہے اور حرمت و تعظیم قرب کا سبب ہے، شریعت آداب کی نگہداشت کا نام ہے، باطن کی درستگی سے حق سبحانہ وتعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے، لہٰذا جو شخص آداب میں زیادہ ہے وہ قُرب میں آگے ہے۔

خشوع = اس خوف و ڈر کو کہتے ہیں جس میں سکون بھی شامل ہو۔ جو دل کو حرمت اور ظاہری اعضاء کو ادب سے آراستہ کرتا ہے۔

قوله: ولما قال الجنيد لا بى حفص الحداد رحمه الله عليهما أ ادبت اصحابک اداب السلاطين قال لَا يا ابا القاسم ولكن حسن الادب فى الظاهر عنوان حسن الادب فى الباطن.

(ارشادِ شیخ ہے) جب حضرت جنید نے حضرت ابی حفص حداد رحمۃ اللہ علیہما سے فرمایا کہ کیا آپ نے رفقاء یعنی مریدوں کو شاہانہ آداب کی تعلیم دی ہے تو حضرت ابو حفص حداد نے عرض کیا اے ابا القاسم ایسی بات نہیں ہے۔ بلکہ ظاہر کا پسندیدہ ادب باطن کے پسندیدہ ادب کا عنوان ہوتا ہے۔

شرح: یعنی جب حضرت جنید نے ابی حفص حداد رحمۃ اللہ علیہما سے فرمایا کہ آپ نے اپنے احباب اور رفقاء کو شاہانہ آداب سکھائے ہیں؟ اس کا پورا قصہ اس طرح ہے کہ حضرت ابو حفص حداد اپنے رفقاء یعنی مریدوں پر ایسا رعب داب رکھتے کہ آپ کے سامنے بغیر اجازت نہ کوئی بول سکتا اور نہ بیٹھ سکتا۔ یہی سب دیکھ کر حضرت جنید بغدادیؒ نے ان سے یہ سوال کر دیا جس کے جواب میں حضرت ابو حفص حداد نے عرض کیا اے ابا القاسم! ایسی بات نہیں ہے جو آپ کہہ رہے ہیں کہ میں نے ان کو شاہانہ آداب برتنے کی تعلیم دی ہے۔ لیکن یہ تو ہے کہ ظاہر کا پسندیدہ ادب باطن کے پسندیدہ ادب کا عنوان ہوتا ہے۔ لہٰذا باطن جتنا زیادہ باادب ہوگا ظاہر اتنا ہی مؤدب ہوگا اور باطن جتنا زیادہ بے ادب ہوگا ظاہر بھی اتنا ہی زیادہ بے ادب ہوگا۔ یہ عوام وخواص سب میں دیکھنے کو ملے گا۔ تمام پسندیدہ خصائل کا اجتماع ہی دراصل حقیقتِ ادب ہے۔ ادیب اسی کو کہیں گے جس میں تمام پسندیدہ خصائل جمع ہوں۔ یہ بات بہت وضاحت کے ساتھ بیان کی جا چکی ہے۔

قوله: **وقال السری رحمة اللّٰه حسن الادب ترجمان العقل و مراعات الادب فيما بينهم مقدم على غيره.**

(ارشاد شیخ ہے) عقل کا ترجمان حسنِ ادب ہے، صوفیا کے درمیان ادب کی نگہداشت اور اس کی رعایت دوسری باتوں پر مقدم ہے۔

شرح: الترجمان = اس کے معنی ہیں کلام کو کسی دوسری زبان میں بیان کرنا۔ نقل ہے کہ حضرت استاد ابو علیؒ نے فرمایا بندہ طاعت کے ذریعہ بہشت تک پہنچتا ہے اور جب اپنی طاعت وعبادت میں ادب کو شامل کر لیتا ہے یعنی طاعت وعبادت کو ادب کے ساتھ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ تک پہنچ جاتا ہے۔ بے ادبی سے دوری پیدا ہوتی ہے جیسے ابلیس کے پاس طاعت وعبادت کی پونجی تھی لیکن ادب کے ترک کرنے سے وہ مردود ہوگیا اور حضرت آدم علیہ السلام ذَلّت یعنی لغزش میں مبتلا ہونے کے باوجود ادب کی راہ اختیار

فرمائی اور درخواست کی ربنا ظلمنا انفسنا تو ادب کی بجا آوری نے ان کو مقبول بارگاہ بنادیا۔

قولہ: **الاتری کیف مدح اللّٰہ تعالیٰ اھلہ و شرف محلہٗ بقولہ تعالیٰ اِنَّ الَّذِیْنَ یَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَھُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ امْتَحَنَ اللّٰہُ قُلُوْبَھُمْ لِلتَّقْوٰی لَھُمْ مَّغْفِرَۃٌ وَّاَجْرٌ عَظِیْمٌ.**

(ارشاد شیخ ہے) کیا یہ نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام میں اہل ادب کی کس درجہ تعریف کی ہے اور کیسی تشریف و تکریم فرمائی ہے کہ بے شک جو لوگ رسول اللہ ﷺ کے پاس اپنی آوازیں پست رکھتے ہیں یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ تعالیٰ نے تقویٰ اور پرہیزگاری کے لئے پاک کر دیا ہے اور مختص کر لیا ہے، ان کے لئے بخشش اور اجر عظیم ہے۔

شرح: اس آیت کریمہ کا نزول صحابہ رضی اللہ عنہم کے حق میں ہوا ہے۔

قولہ: **وقال ابو عبداللّٰہ بن خفیف قال لی رویم یا بنی اجعل علمک ملحاً وادبک دقیقاً و قیل التصوف کلہ ادب ولکل وقت ادب ولکل حال ادب ولکل مقام ادب فمن لزم الأدب بلغ مبلغ الرجال ومن حرم الادب فھو بعید من حیث یظن القربۃ ومَرْدُوْدٌ من حَیْثُ یرجو القبول وقیل من لم یتأدب للوقت فوقتہ مقت، ادب النفس ان تعرفھا الخیر وتحثھا علیہ وتعرفھا الشر وتزجرھا عنہ وقیل الادب سند الفقراء وَزین الاغنیاء.**

(ارشاد شیخ ہے) حضرت عبداللہ بن خفیف رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ مجھ سے حضرت رویم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اے میرے بیٹے! اپنے علم کو نمک اور ادب کو آٹا بناؤ۔ اور کہا گیا ہے کہ سارا تصوف ادب ہے ہر وقت کے لئے ایک ادب ہے ہر حال کے لئے

ایک ادب ہے اور ہر مقام کے لئے ادب ہے۔ جس نے ادب کو لازم کر لیا وہ بڑے لوگوں کے درجہ پر پہنچ گیا۔ جو ادب سے محروم رہا وہ دور ہے وہاں سے جہاں قربت کا گمان ہو۔ اور مردود ہوا وہاں سے جہاں قبولیت کی امید ہو اور جس نے وقت کا ادب بجا نہیں لایا تو اس کا وقت اس کے لئے مقت (یعنی اللہ کا غضب) ہے۔ نفس کا ادب یہ ہے کہ تو اسے خیر اور بھلائی سے آشنا کرے، نفس کو خیر و صلاح پر آمادہ کرے۔ نفس کو شر سے ناشنا سا کرے، اور شر کے کاموں سے اسے روکتا رہے۔ اور کہا گیا ہے کہ ادب فقرا کے لئے سند اور امراء کے لئے زینت ہے۔

شرح: **وقال ابو عبداللّٰہ بن خفیف قال لی رویم یا بني اجعل علمک ملحاً وادبک دقیقاً** = یعنی علم کو نمک اور ادب کو آٹا بنانے سے مراد یہ ہے کہ علم تھوڑا ہو اور ادب زیادہ ہو۔ تمہارا علم تھوڑا ہو سکتا ہے لیکن ادب میں کمی نہ ہو۔ یہ بات ادب کی تشریف و تعظیم کی دلیل ہے، مثل ہے کہ **اَدَبُ النَّفْس خَیر مِنْ اَدب الدرس** (درس اور سبق کے ادب سے کہیں بہتر نفس کا ادب ہے) ایک بزرگ نے فرمایا کہ اپنے ظاہر و باطن کے لئے ادب کو لازمی بنالو۔ لہٰذا جو ظاہر میں بے ادب ہے اس کو ظاہر میں سزا ملتی ہے اور جو باطن میں بے ادب ہے اس کو باطن میں سزا دی جاتی ہے۔ دیکھئے نا ایک نوخیز لڑکے پر ایک درویش کی نگاہِ غلط پڑ گئی اور ایک بزرگ پر یہ بات افشاء ہو گئی تو انہوں نے فرمایا اس کی سزا تو اس درویش کو مل کر رہے گی چاہے برسوں بعد ہی کیوں نہ ملے، اس درویش نے بتایا کہ اس نگاہِ بد ڈالنے کی سزا بیس سال کے بعد مجھے یہ ملی کہ قرآن کو میں بھول گیا۔

خواجہ سری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے کہ میں ایک رات وظیفہ میں مشغول تھا اور اس وقت محراب میں پاؤں پھیلائے تھا۔ ایک ندا آئی اے سری! کیا بادشاہوں کے سامنے اسی طرح بیٹھا جاتا ہے۔ میں نے اسی وقت پاؤں سمیٹ لیا اور کہا تیری عزت و جلال کی قسم! اب میں عمر بھر پاؤں نہیں پھیلاؤں گا۔

حضرت خواجہ جنید رحمۃ اللہ علیہ نے تیس سال تک پاؤں نہیں پھیلائے۔ نہ دن کو اور نہ رات کو۔

حضرت عبداللہ مبارکؒ سے منقول ہے انہوں نے فرمایا جو ادب برتنے میں کاہلی کرتا ہے اسے سنت سے محرومی کی سزا ہوئی ہے اور جو سنت کی ادائیگی میں تکاسلی کرتا ہے اسے فرائض سے محرومی کی سزا ملتی ہے، جو فرائض کی ادائیگی میں آسکت سے کام لیتا ہے اسے معرفت سے محرومی کی سزا دی جاتی ہے۔ اللہ اپنی پناہ میں رکھے۔

اور یہ بھی حضرت عبداللہ ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے انہوں نے فرمایا میں بہت زیادہ علم کی بہ نسبت مختصر ادب کا زیادہ محتاج ہوں۔ التصوف کلہ ادب۔= سارا تصوف ادب ہے، حضرت شیخ نے یہ بات اس لئے کہی کہ تصوف، قول میں، فعل میں اور اخلاق میں نبی کریم ﷺ کی اقتدا اور پیروی کا نام ہے اور یہ بات تو معلوم ہی ہے کہ رسول ﷺ نے ادب اللہ رب العزت سے لیا ہے جیسا کہ حضور ﷺ نے خود فرمایا ان اللّٰہ ادّ بنی فاحسن ادبی اللہ نے مجھے ادب سکھایا ہے بہترین ادب۔

حضرت استاد ابو علی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ جو شخص بادشاہوں کے سامنے حاضر رہنے کے وقت ادب کو ملحوظ نہیں رکھتا تو اسے اپنی جہالت کی وجہ سے قتل کی سزا سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

حضرت خواجہ یحییٰ معاذ رازی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا جب عارف اپنے معروف کے ساتھ ادب سے پیش نہیں آتا تو یہ سچ اور درست ہے کہ وہ ہلاک ہو جانے والوں کے ساتھ ہلاک ہو جاتا ہے۔ ولکل وقتِ ادب ولکل حال ادب و لکل مقام ادب فمن لزم الادب بلغ مبلغ الرجال = اور یہ جو کہا گیا کہ ہر وقت کے لئے ایک ادب ہے، ہر حال کے لئے ایک ادب ہے اور ہر مقام کے لئے ایک ادب ہے اس سے مراد یہ ہے کہ اس وقت اس حال اور اس مقام کے مناسب و مطابق ادب برتا جائے۔ وقت، حال اور مقام کی صحت و درستگی کی علامت و پہچان یہ ہے کہ بندہ کو بے ادبی سے محفوظ رہنا چاہیئے۔ جب تک بے ادبی کی خصلت سے پاک نہیں ہوتا قُرب کے لائق نہیں ہوتا۔ بے ادبی سے پاک ہونے کے لئے بہت زیادہ ریاضت کی ضرورت ہے تاکہ

وقت حال اور مقام کے مناسب ادب کی بجا آوری ہو سکے۔ جب بہت زیادہ ریاضتیں ہوں گی تو یہ محال ہے کہ صاحب وقت و حال و مقام سے بے ادبی کا ارتکاب ہو۔ اور اگر بے ادبی کا صدور ہوتا ہے تو پھر سر کی بازی لگانی ہوگی۔ اور یہ تو دنیاوی بادشاہوں کے یہاں بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ لہٰذا جو ادب کو اپنے لئے لازم کر لیتا ہے وہ مردانِ خدا کے مقام تک پہنچ جاتا ہے۔

حضرت استاد ابو علی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ اس آیت کریمہ وَاَیُّوبَ اِذْ نَادٰی رَبَّهٗ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرَّاحِمِین (الانبیاء/۸۳) (اور یاد کرو ایوب کو جب پکارا انہوں نے اپنے رب کو کہ مجھے پہنچی ہے سخت تکلیف اور تو ارحم الرحمین ہے) میں حضرت ایوب علیہ السلام نے "ارحمنی" نہیں کہا بلکہ اظہار خطا میں ادب کا پاس رکھا۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جب کہا اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ط (المائدہ/۱۱۶) (اگر میں نے کہی ہوتی ایسی بات جو ضرور جانتا اس کو) یہاں بھی بارگاہِ رب العزت کے ادب کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ نہیں کہا کہ میں نے نہیں کہا ہے اور حضور رحمتِ عالم ﷺ کی حدیث ہے اِنَّهٗ قَالَ اللّٰه ادبنی فاحسن تادبنی میرے پروردگار نے مجھے ادب سکھایا اور بہترین ادب سکھایا۔ ادب = ادب کے معنی ظاہر و باطن کو سنوارنا ہے عقل کے ساتھ۔ جب بندہ کا ظاہر و باطن پاک ہو جاتا ہے تو وہ صوفی ہو جاتا ہے اور وہ دوسروں کو ادب سکھانے والا بن جاتا ہے بندہ میں کمالِ ادب اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب مکارم اخلاق میں کمال حاصل ہوتا ہے۔ عادات و خصائل کو نیک و صالح بنانے ہی سے مکارم اخلاق کا اجماع ہوتا ہے۔ خَلق انسان کی صورت کا نام ہے اور خُلق انسان کے معنی کو کہتے ہیں اور اعتبار تو معنی کا ہے صورت کا نہیں۔ بہت سارے آدمی ایسے ہیں جو بظاہر تو آدمی کی صورت میں ہیں مگر معناً وہ آدمی نہیں۔ حقیقت میں وہ گائے اور گدھے ہیں۔ ہاں! جو صورتاً اور معناً دونوں اعتبار سے آدمی ہوں ایسے لوگ بہت کم ہیں۔ جو مکمل دانائی رکھتے ہیں وہی ایسے لوگوں کو دیکھتے اور پہچانتے ہیں اور سب کے ساتھ نیک برتاؤ کرتے ہیں اور کیوں نہ کریں۔ اہل علم کا یہی دستور ہے ہاں جو اہلِ قوت یعنی زور زر والے ہیں وہی نہیں کرتے۔ چنانچہ جب یہ بات طئے ہوگئی کہ صورت کا اعتبار نہیں ہے معنی کا اعتبار ہے تو جو معناً آدمی ہے وہی آدمی ہے اور جو معناً

حیوان ہے یعنی جو حیوانی صفت رکھتا ہے وہ آدمی کی صورت میں حیوان ہے۔

وَمن حرم الادب فھو بعید من حیث یظن القربة ومردود من حیث یرجو القبول = اور یہ جو کہا گیا کہ جوادب سے محروم رہا وہ دور ہے وہاں سے جہاں قربت کا گمان ہو اور مردود ہوا وہاں سے جہاں قبولیت کی امید ہو اس سے مراد یہ ہے کہ ویسی طاعت و بندگی جس کے ساتھ احترام کا معاملہ نہ ہو امفید اور سودمند نہیں۔ شیطان بظاہر طاعت وعبادت کی پونجی رکھتا تھا مگر حرمت سے محروم تھا تو **انا خیرٌ منه** کا دعوٰی کر دیا، نتیجہ سامنے ہے کہ مردود بارگاہ کر دیا گیا اور حضرت آدم علیہ السلام کے پاس طاعت وعبادت کا سرمایہ نہیں تھا لیکن حرمت واحترام کی دولت رکھتے تھے، انہوں نے یوں اقرار واعتراف کیا **ربنا ظلمنا انفسنا** ان کو یہ ثمرہ ملا کہ شرف قبولیت سے مشرف کر دیئے گئے۔

حضرت استاد ابوعلی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ادب کا ترک کرنا نکال دیئے جانے کا سبب ہے۔ چنانچہ جو بادشاہوں کے فرش پر بے ادبی کا ارتکاب کرتا ہے وہ سزاؤں میں ڈال کر نکال دیا جاتا ہے اور جو بادشاہوں کے در پر بے ادبی کرتا ہے وہ دربان کے ڈنڈے کھا کر وہاں سے بھگا دیا جاتا ہے۔ بادشاہوں کا یہ طریقہ ہے کہ جس غلام کو خدمت کے لئے منتخب کرتے ہیں اس کو پہلے کسی خادم کے سپرد کر دیتے ہیں تا کہ وہ خادم اسے آدابِ خدمت سکھا دے۔ جب وہ خدمت کے آداب سیکھ لیتا ہے تو اسے خدمت میں رکھتے ہیں اور جب کسی غلام کو حرم سرا یعنی زنان خانہ کے لئے رکھنا چاہتے ہیں تو جب تک اسے خواجہ سرا بنا دیتے یعنی آلہ بے ادبی (آلہٗ مردانگی) دور نہیں کر دیتے محل سرا میں داخلہ کی اجازت نہیں دیتے۔ جب بے ادب غلام بادشاہوں کی خدمت وصحبت کے لائق نہیں ہوتا۔ جب آلہٗ بے ادبی والا مرد حرم سرا کے لائق نہیں ہوتا تو وہ سر جو ادب سے خالی ہے اللہ تعالیٰ کی صحبت کے لائق کیسے ہو سکتا ہے۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ **العارف اذا ترک الأدب صار من الھالکین** عارف جب تارکِ ادب ہو جاتا ہے تو اس کا شمار ہلاک شدگان میں ہوتا ہے۔ **ومن حرم الادب فقد حرم** = جوادب سے محروم ہوا وہ یقیناً تمام بھلائیوں سے محروم رہا۔ اس لئے کہ تمام مقامات میں وصول کا سبب ادب ہی ہے۔ جب بندہ کو

ادب میں محرومی نصیب ہوئی تو یقیناً تمام بھلائیوں میں بھی ناامیدی و مایوسی ہوگی۔

چنانچہ ایک بزرگ نے فرمایا توحید موجب ہے وہ ایمان کو واجب کرتا ہے تو جس کے پاس ایمان نہیں اس کے پاس توحید نہیں۔ ایمان موجب ہے علم شریعت کو واجب کرتا ہے تو جس کے پاس شریعت نہیں اس کے پاس ایمان نہیں توحید نہیں۔ اسی طرح علمِ شریعت موجب ہے یہ ادب کو واجب کرتا ہے تو جس کے پاس ادب نہیں اس کے پاس نہ شریعت ہے نہ ایمان ہے اور نہ توحید ہے۔ اس سے بڑی مایوسی محرومی اور ناامیدی اور کیا ہوگی؟

چنانچہ حضرت خواجہ ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جب مرید ادب سے نکل آتا ہے تو وہ اس مقام سے نیچے آجاتا ہے جہاں پہنچا تھا۔ اس لئے کہ وہ ادب کے ذریعہ اس بلند مقام تک پہنچا تھا تو ادب اس کی ترقی کا سبب تھا۔ اور جب سبب ہی نہیں رہا تو ترقی بھی نہیں رہی۔ اس طرح جس مقام پر تھا وہاں سے گر کر شیاطین کے مرتبہ تک اس کا پہنچنا ضروری ہو گیا۔

من لم يتأدب الوقت فوقته مقت = جس نے وقت کا ادب بجا نہیں لایا اس کا وقت اس کے لئے مقت ہے۔ اس لئے کہ ترکِ ادب سے بے حرمتی پیدا ہوئی ہے اور بے حرمتی عداوت کو جنم دیتی ہے۔ عبادت و بندگی میں اگر کمی ہے تو وہ صحبت کے لائق ہے لیکن عدمِ احترام اور نفی اگر کسی میں ہے تو وہ صحبت کے لائق نہیں۔ چنانچہ جو شخص صحبت سے دور ہوا وہ ''مقت'' میں پڑ گیا ''مقت'' اللہ تعالیٰ کے غصہ و عتاب کو کہتے ہیں، لغت کے اعتبار سے **المقت** کے معنی دشمنی رکھنا ہے۔

ادب النفس ان تعرفها الخير وتحثها عليه وتعرفها الشر = نفس کا ادب یہ ہے کہ اسے خیر اور بھلائی سے آشنا کیا جائے، خیر و صلاح پر آمادہ رکھا جائے، نفس کو شر سے شناسا کیا جائے اور برے کاموں سے اسے روکا جائے۔ یہ باتیں اس آیت کے موافق ہیں جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا **فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا** (**الشمس / ۸**) (پھر اس کے دل میں ڈال دیا ان کی نافرمانی اور اس کی پارسائی کو) اللہ تعالیٰ نے نفس کے لئے **فجور** (نافرمانی) اور تقوی (پرہیزگاری) سے آگہی کو لازم قرار دے دیا ہے۔ **فجور** (نافرمانی) سے واقفیت کو اس لئے

لازم کیا کہ اس سے بچا جائے اور پرہیز کیا جائے اور تقوی (پرہیزگاری) کی واقفیت اس لئے لازم کی گئی کہ اس پر عمل کیا جائے اور اس کو اپنایا جائے۔ جب ایسا ہوگا تو دوزخ سے نجات ملے گی اور بہشت میں رسائی ہوگی۔ بندہ طاعت کے ذریعہ بہشت تک پہنچتا ہے اور جب طاعت کے ساتھ ادب بھی ہوتا ہے تو حق سبحانہ وتعالیٰ تک پہنچ جاتا ہے۔ جیسا کہ کہا گیا ہے **العبد بطاعته الی الجنة وبادبه فی طاعته الی الله تعالی**۔ یہ اہلِ تصوف کا معاملہ ہے۔ عوام طاعت پر کاربند ہوتی ہے اور خواص طاعت کے ساتھ ادب کو بھی بروئے کار لاتے ہیں۔ اسی لئے کہا گیا ہے الادب للأکابر ادب اکابر کا حصہ ہے اور اکابر تو یہی خواص ہیں۔

الہام سے مراد اس کو باخبر اور آگاہ کرنا ہے۔

الادب سند الفقراء وزین الأغنیاء = ادب فقرا کے لئے سند اور امراء کے لئے زینت ہے یعنی فقرا کے لئے باعثِ شرف ومجد ہے۔ یہ بات اس معنی میں کہی گئی ہے کہ فقرا کے پاس زبانِ سوال نہیں ہوتی۔ وہ کسی سے کچھ مانگتے نہیں۔ اپنی جانب سے ہمیشہ بے نیازی پیش کرتے۔ جماعتِ فقرا کی بلندئ ہمت کا یہ حال ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے دنیا نہیں مانگتے جب خدا سے طلب نہیں کرتے تو مخلوق کے سامنے اپنی حاجت کیا پیش کریں گے۔

ایک درویش نے حضرت خواجہ ابراہیم ادھم رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا اگر فقیر ایک روز بھوکا رہے تو کیا کرے؟ فرمایا صبر کرے۔ پھر پوچھا اگر دو روز فاقہ ہو جائے تو کیا کرے؟ فرمایا صبر کرے۔ پھر دریافت کیا اگر تین روز تک بھوک میں رہے تو کیا کرے؟ فرمایا صبر کرے۔ اس درویش نے عرض کی تین روز کی بھوک تو قتل ہے۔ ارشاد ہوا **الدیۃُ علی القاتل** (خونبہا قاتل پر ہے)

کمالِ ادب کا آفتاب پوری پاکیزگی کے ساتھ انبیاء علیہم السلام اور صدیقوں پر طلوع ہوتا۔ اخص الخواص تو انبیاء ہی ہیں اور ان کے بعد صدیقین ہیں۔ ادب انہیں کا زیور ہے اس لئے کہ الادب للاکابر ہے۔ ترکِ ادب بے حرمتی وعدم احترام کو کہتے ہیں اور انبیاء وصدیقین کا ظاہر و باطن اس بے حرمتی سے معصوم ومحفوظ ہوتا۔

قوله: والناس فی الأدب علی ثلث طبقات أهل الدنیا وأهل الدین وأهل الخصوصیة من أهل الدین. أما اهل الدنیا فاکثر اٰدابهم فیها الفصاحة والبلاغة وحفظ العلوم واخبار الملوک واشعار العرب أما أهل الدین فأکثر ادابهم مع العلوم ریاضة النفوس وتأدیب الجوارح وتهذیب الطبائع وحفظ الحدود وترک الشهوات واجتناب الشبهات والمسارعة الی الخیرات وأما أهل الخصوصیة من أهل الدین فادابهم حفظ القلوب ومراعات الاسرار واستواء السر والعلانیة.

(ارشادِ شیخ ہے) ادب کے معاملہ میں لوگ تین درجہ کے ہیں: (۱) اہل دنیا (۲) اہلِ دین (۳) اور اہلِ دین میں اصحاب خصوص۔ اہل دنیا کے آداب زیادہ تر دنیاوی امور میں فصاحت و بلاغت علوم کی یادداشت، بادشاہوں کی تاریخ، ان کے واقعات کا یاد رکھنا اور شعرائے عرب کے اشعار کا حفظ کرنا شامل ہے۔

اہل دین کے بیشتر آداب علوم کی تحصیل کے ساتھ ساتھ نفس کی ریاضت ہوتی ہے۔ جوارح یعنی اعضاء کو ادب سکھانا، طبیعت کو پاک کرنا، شریعت کے حدود کی محافظت شہوات و خواہشات کا ترک، مشتبہ اور مشکوک سے اجتناب و پرہیز، نیکیوں اور بھلائیوں کی طرف دوڑنا۔

اہل دین میں سے ارباب خصوص کے آداب دلوں کی نگہداشت، اسرار کی محافظت اور ظاہر و باطن کو یکساں کرنا ہے۔

شرح: اما أهل الدنیا فأکثر ادابهم فیها = اہلِ دنیا کے جو آداب بتائے گئے وہ زیادہ تر وہی صفتیں اور عادتیں ہیں جو ان لوگوں کے درمیان پسندیدہ ہیں اور ان صفات کی وجہ سے آپس میں ممتاز سمجھے جاتے ہیں اور پسندیدہ شمار کئے جاتے ہیں اور جس میں

خصائل نہیں ہوتے اس کو بے ادب کہتے ہیں۔

الفصاحة= زبان کی حدت، گرمی، روح اوراسپرٹ کوفصاحت کہتے ہیں۔

والبلاغة= عمدہ، انوکھے اوراچھے معانی کی طرف زبان کی رسائی کو بلاغت کہتے ہیں۔

وأما أهل الدين فأكثر أدابهم مع العلوم رياضة النفوس وتاديب الجوارح =اہل دین کے جو آداب بتائے گئے اس سے مراد یہ ہے کہ اہلِ دین نفس کو نرم اور کمزور بنادیتے ہیں تاکہ وہ حق سبحانہٗ تعالیٰ کا مطیع وفرمانبردار رہے۔اس لئے کہ جب نفس علم کا اعزاز اور لوگوں کے درمیان اپنی قبولیت عام کا مظاہرہ کرتا ہے تو اس وقت وہ جاہ ومرتبہ کی مسند پر جلوہ افروز ہونا چاہتا ہے ایسی صورت میں اس کو نہ خدا یادرہتا ہے اور نہ آخرت کی یاد آتی ہے۔اسی لئے کہتے ہیں کہ جاہ ومرتبہ کے ساتھ دین حاصل نہیں ہوتا۔جاہ ومرتبہ بھی ہو اور دین بھی ہو یہ تو اللہ رب العزت کی ربوبیت کے ساتھ جھگڑا کہا جائے گا۔اس لئے کہ عظمت وکبریائی یعنی بزرگی و بڑائی تو رب تعالیٰ کی صفات ہیں۔لہٰذا جو کوئی لوگوں پر اپنی عظمت وکبریائی کی دھاک جمانا چاہتا ہے اور دوسروں سے اپنی بزرگی وبرتری کا سکہ منوانا چاہتا ہے وہ دراصل یہ کہنا چاہتا ہے کہ **انا ربکم الاعلیٰ**۔میں ہی تمہارا بزرگ وبرتر پروردگار ہوں۔ایک طرف یہ خواہش اور دوسری طرف دین۔دونوں کا اجماع ممکن نہیں۔اسی لئے جماعتِ صوفیا کا کہنا ہے **التصوف اسقاط الجاه وسوادالوجه فی الدنیا والاخرة**۔

جاہ ومرتبہ کو مٹادینے میں صوفیا نے پوری کوشش کی ہے۔کہا جاتا ہے کہ اگر درویش کے پاس اس کی جان کے سوا اور کچھ نہ ہو اور وہ درویش اپنی جان بھی کتوں کے آگے ڈال دے تو ادھر پلٹ کر نہ دیکھے کہ کتوں نے اس کی جان کے ساتھ کیا سلوک کیا۔

تهذيب الطبائع=طبائع کی آراستگی اور تہذیب سے مراد یہ ہے کہ ——

طبائع چار ہیں: خون، بلغم، صفرا، سودا۔

شوخ روی صفرا کا فعل ہے۔

بخیلی اور گھٹیا پن سودا کا فعل ہے۔

خفتہ روی و مادہ روی یعنی نزاکت و ٹیڑھا پن خون کا فعل ہے۔

کند فہمی اور فراموشی بلغم کا فعل ہے۔

جب تک ان چاروں طبائع سے فراغت و علیحدگی نہیں ہوتی اللہ تعالیٰ کی صحبت کے لائق نہیں ہوتا۔

ایسی صورت میں شوخی چھوڑ دے، نرمی و مہربانی اختیار کرے۔

بخالت چھوڑ دے، سخاوت و فیاضی اختیار کرے۔

کاہلی و سستی چھوڑ دے، عجلت اور مستعدی اختیار کرے۔

کند فہمی کو ترک کر کے تیز فہمی اختیار کرے۔

سیری اور آرزؤوں کو ترک کر دے بھوک اور نامرادی پیدا کرے۔

ایک بزرگ نے فرمایا دنیا کی کنجی بھر پیٹ کھانا ہے اور آخرت کی کنجی بھوکا رہنا۔ پیٹ ہی تمام شہوات کا منبع اور تمام آفات کی جڑ ہے۔ یہیں سے یہ سب چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔ عورتوں کی شہوت اور ان سے نکاحوں کی خواہش اس کا لازمہ ہے۔ جب عورتوں کی شہوت اور نکاحوں کی آرزو پیدا ہوگی تو مال و دولت اور جاہ و منزل کی طرف رغبت ہوگی اور جب مال و دولت اور جاہ و منزلت کی طرف رغبت ہوگی تو یقیناً دعوی داری لڑائی جھگڑا، حسد، جلن اور اسی طرح کی دوسری خرابیاں پیدا ہوں گی۔ جب بندہ اپنے نفس کو بھوک کے ذریعہ ذلیل و خوار بناتا ہے اور بھوک کے ذریعہ شیطان کا داخلہ اپنے اوپر ممنوع کر لیتا ہے تو اس وقت وہ اللہ تعالیٰ کی طاعت و عبادت کے آگے گردن جھکا دیتا ہے اور پھر سرکشی بغاوت اور فتنہ و فساد سے نکل آتا ہے۔

اسی لئے کہتے ہیں کہ اگر فرعون بھوکا رہتا وہ بھوک و پیاس کی تکلیف سے آشنا ہوتا تو ہرگز خدائی کا دعویٰ نہیں کرتا۔ اس کی شکم سیری نے اس سے خدائی کا دعوی کرا دیا۔

حضرت خواجہ فضیل رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ اپنی مناجات میں کہتے ـــــــ الٰہی مجھے بھوکا رکھ، میرے بال بچوں کو بھی بھوکا رکھ اور مجھے اندھیری رات میں بے چراغ رکھ۔ یہ سب معاملات تو اپنے دوستوں کے ساتھ کرتا ہے اب مجھے یہ بتا دے کہ میں ان

چیزوں کو تجھ سے کیسے حاصل کروں؟____

کہتے ہیں کہ مومن کو کھانے میں اختیار سے کام لینا چاہیئے۔ دن رات میں صرف ایک وقت کھائے۔ اسی کو اولیت حاصل ہے۔ اگر اس سے زیادہ کھانا ہوتا ہے تو یہ اسراف ہے اور ایسا شخص بھوک کی نعمت سے محروم ہے، کھانے میں اسراف دولت مندوں کا کام ہے اور رسول اللہ ﷺ کی سنت کے خلاف ہے۔ آپ ﷺ نے حضرت ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا اسراف سے پرہیز کرو اور اس سے دور رہو یہ سچ اور درست ہے کہ دن بھر میں دوبار کھانا اسراف ہے۔

اور وہ مریدان جن کا شمار اہلِ ریاضت میں ہوتا ہے انہوں نے طئے کے روزے تیس دنوں تک رکھے ہیں اور بعض نے تو چالیس روز تک طئے کے روزے پہنچادیئے ہیں۔ بعض علماء کا کہنا ہے کہ جن لوگوں نے چالیس دنوں تک طئے کے روزے رکھے ہیں ان پر ملکوتی قدرتیں اس طرح ظاہر ہونے لگتی ہیں کہ بعض اسرارِ الوہیت ان پر کھلنے لگتے ہیں۔

وما أهل الخصوصية من أهل الدين فأدابهم حفظ القلوب و مراعات الأسرار واستواء السر و العلانيه = اہل دین میں جو اصحاب خصوص ہوئے ہیں ان کے جو آداب بتائے گئے ہیں وہ یہ ہیں کہ یہ حضرات دلوں کی حفاظت کرتے ہیں، اسرار پر نظر رکھتے ہیں اور اپنے ظاہر و باطن میں یکسانیت پیدا کرتے ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ یہ حضرات اپنے دلوں کی اس طرح حفاظت کرتے ہیں کہ کہیں کوئی دوسرا ان کے دل میں داخل نہ ہو جائے۔ ارباب خصوص اہلِ دل ہوتے ہیں ان کا کام دل کی پاسبانی ہے۔ ہر وقت اس بات سے خائف رہتے ہیں کہ کہیں کوئی چیز ان کے دل میں داخل نہ ہو جائے جو انہیں محبوب سے محجوب کر دے، حجاب نہ آسمان ہے نہ زمین، نہ پہاڑ ہے نہ دریا، نہ دشت ہے نہ بیاباں بلکہ حجاب ہے تو غیر کے ساتھ مشغولیت ہی حجاب ہے۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ غیر سے انفصال حق سے اتصال ہے یعنی غیر سے دوری و انقطاع میں حق سبحانہ وتعالیٰ کی قربت ہے جب غیر نہیں ہوگا تو حجاب نہیں ہوگا۔ اور اس وقت مشاہدہ ہی مشاہدہ ہوگا۔

یہ حضرات خصوص اپنے اسرار کی حفاظت کرتے ہیں کہیں غیر کی گذر نہ ہو جائے اس

لئے وہ اپنے اسرار کو ان چیزوں میں مشغول رکھتے ہیں جو حق سبحانہ تعالیٰ کے موافق ہیں۔ نفس کی خواہش اور اس کی لذتوں میں نہیں لگاتے۔

ہو سکتا ہے کہ اس کا مفہوم یہ ہو کہ یہ حضرات اپنی ولایت کی حفاظت کرتے ہیں۔ اس لئے کہ ولایت، خدا اور بندہ کے درمیان ایک سیر ہے۔

اللہ بہتر جانتا ہے، شاید اس کا مطلب یہ ہو کہ ان کے اور خدا کے درمیان ایسے اسرار ہوں جن کو چھپا کر رکھنا چاہتے ہوں۔ سلاطین بھی ہر راز کی بات ہمرازوں کو بھی نہیں بتا دیتے، راز کو ہوا جیسی پرواز ہوتی ہے۔ اس لئے یہ کوئی ضروری نہیں کہ ایک راز بتا دیں تو دوسرا بھی بتا دیا جائے۔ یہ بات سب لوگوں پر ظاہر ہے۔

یہ حضرات اپنے ظاہر و باطن کو یکساں رکھتے ہیں اس سے مراد یہ ہے کہ ان کے ظاہر و باطن میں کوئی نفاق نہیں ہوتا۔ ان کا جو باطن ہوتا ہے وہی ظاہر اور یہ بہت اہم اور بڑا کام ہے۔

یہ لوگ اپنے اقوال، اپنے افعال اور اپنے احوال کو نفاق کی آلودگی سے ایسا پاک رکھتے ہیں کہ حق اور خلق کے ساتھ یکساں ملتے ہیں گرچہ یہ بہت مشکل اور دشوار کام ہے۔ اسی لئے بعض اہلِ سلوک نے نفاق کی صفت کو دور کرنے میں اپنے کو مجبور سمجھا تو زنار باندھ لی اور کہنے لگے اگر میں مخلص مسلمان نہیں ہوں تو پھر منافق بن کر بھی نہیں رہ سکتا ہوں اس لئے کہ نفاق کفر سے بھی بدتر ہے۔

قولہ: والمریدون یتفاضلون بالعمل والمتوسطون بالاداب والعارفون بالهمة.

(ارشاد شیخ ہے) مریدوں میں جو فضیلت ہے وہ عمل کی وجہ سے ہے، متوسط کے درمیان ادب کی وجہ سے اور عارفوں کی فضیلت میں جو فرق ہے وہ ان کی ہمت کی وجہ سے ہے۔

شرح: مریدوں کے درمیان جو فضیلت ہے وہ عمل کی وجہ سے ہے۔ جو عمل میں زیادہ ہے وہی زیادہ افضل ہے۔ کیونکہ ان کے کاروبار کا معاملہ عمل سے ہے ان کے درمیان فضیلت و برتری عمل سے لازم آتی ہے۔

متوسطین کی فضیلت کا تعلق ادب سے ہے جو ادب میں زیادہ ہے وہی افضل ہے۔ متوسط صاحب حال ہوتا ہے۔ ان کے کاروبار کی نگہداشت ہے۔ ان کے درمیان فضیلت کا معیار ادب ہے۔

عارفوں کے درمیان فضیلت کا انحصار ہمت پر ہے جس میں ہمت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ وہی زیادہ افضل ہے۔

ہاں! یہاں پر ایک فرق ہے۔ بعض لوگوں کی ہمت کرامت اور نعمت تک رہ جاتی ہے اور بعض لوگوں کی ہمت مکرم اور منعم تک پہنچ جاتی ہے۔

جیسا کہ ایک بزرگ نے خواب میں اللہ رب العزت کو دیکھا، اس نے ارشاد فرمایا اے فلاں! سب لوگ مجھ سے میری شان و شوکت مانگتے ہیں اور بایزید ہیں کہ مجھ سے مجھ ہی کو مانگتے ہیں۔ ؎

جز ذات تو ام حرام بادا　　　حاجت کہ بخواھم از خدا من

(اے خدا! جب تیری ذات کے علاوہ سب کچھ مجھ پر حرام ہے تو پھر میں تجھ سے اپنی کون سی حاجت پیش کروں)

جو اللہ تعالیٰ کی پرستش نعمت و کرامت کی وجہ سے کرتا ہے تو وہ اپنی پرستش کر رہا ہے۔ خدا کی عبادت نہیں کر رہا ہے اور وہ خود پرست ہے خدا پرست نہیں۔

اسی لئے کہتے ہیں کہ جو تمہارا مقصود ہے وہی تمہارا معبود ہے اور جو تمہارا دلبند ہے وہی تمہارا خداوند ہے۔ زبانی لا الہ الا اللہ کی رٹ لگانے سے کیا فائدہ؟ ؎

تا کی بزبان خدا پرستی　　　ایں نیست مگر ھوا پرستی

تا نگر دی تو مسلماں از دروں　　　کی توانی شد مسلماں از بروں

(زبان سے خدا پرستی کا دعویٰ کرنا خواہش پرستی کے سوا کچھ نہیں جب تک تمہارا باطن مسلمان نہیں ہوگا باہر سے تم مسلمان کہاں ہو سکتے ہو۔)

ہمت پاک ہوتا کہ لا الہ الا اللہ کی بارگاہِ قدس کے لائق ہو جاؤ۔

حضرت سلطان العارفین سے منقول ہے، انہوں نے فرمایا جب میرے دل میں دنیا کی یاد آتی ہے تو میں وضو کرتا ہوں اور جب بہشت کی یاد آتی ہے تو غسل کرتا ہوں۔ لوگوں نے پوچھا ایسا کیوں؟ فرمایا دنیا محدث ہے اس کی یاد حدث کے مانند ہے اور حدث سے وضو لازم آتا ہے۔ لیکن بہشت تکمیل شہوت کی جگہ ہے لہٰذا اس کی یاد جنابت کے مثل ہے اور جنابت کے بعد غسل کرنا ہے۔

عرفاء اصحاب ہمت ہیں۔ جہاں معرفت میں کمی ہوتی ہے وہیں ہمت میں خساست آتی ہے۔ ارباب ہمت نے مازاغ البصر ومَا طَغٰی (النجم / ۱۷) کے مکتب میں اس تختی کی مشق کرلی ہے۔

جب رسول اللہ ﷺ کے سامنے دونوں جہان پیش کئے گئے تو آپ ﷺ نے نظر اٹھا کر بھی اس طرف نہیں دیکھا اس وقت آپ کی یوں مدح سرائی کی گئی مازاغ البصر وماطغٰی یعنی ماما ل بصر محمد وماطغٰی ای وما تجاور عن الحد یعنی حضرت محمد ﷺ کی نگاہِ پاک نہ مائل ہوئی اور نہ حد سے آگے بڑھی۔ آپ نے رضاء ورغبت کے ساتھ خوش ہو کر اس طرف نہیں دیکھا۔

بزرگوں نے فرمایا اگر حضور ﷺ دنیا کی طرف سے اپنی آنکھیں بند نہیں کرتے تو عقبٰی تک نہیں پہنچتے اور اگر عقبٰی کی طرف سے آنکھیں نہیں پھیرتے تو قاب قوسین تک نہیں پہنچتے۔

چنانچہ کہتے ہیں لن یصل الی الکل اِلا من انقطع عن الکل جو کُل سے منقطع ہو جاتا ہے وہ کُل تک پہنچ جاتا ہے۔ جو جزو سے منقطع ہوتا ہے وہ جزو تک پہنچتا ہے۔

بزرگوں سے منقول ہے کہ مَن رضی بمقامہ حجب عن امامہ جو اپنے مقام سے راضی ہو گیا وہ اگلے مقام سے محجوب ہو گیا۔

دوسری بات یہ کہ مقام اور حال غیر ہیں۔ اور معرفت کی شرط یہ ہے کہ غیر سے رخ موڑ لیا جائے۔ اس لئے کہ مَن عرف اللّٰہ اعرض عما سواہ موجود ہے۔ جس نے اللہ کی معرفت حاصل کرلی اس نے ماسوی اللہ سے رخ موڑ لیا۔ جب تک غیر سے اعراض نہیں کرتا

معرفت حاصل نہیں ہوتی اور معرفت کے بغیر محجوب ہے۔

جب کوئی اپنے مقام سے راضی اور خوش ہو گیا تو گویا اس مقام سے اس کو اُنس پیدا ہوا اور غیر حق سے اُنس ہوگا تو حق سے وحشت ہوگی اور جس کو حق سے وحشت ہوگی وہ یقیناً محجوب ہوگا۔

قولہ: وقيل الهمة ما يبعثك من نفسك على طلب المعانی وقيمته كل مرئ همته.

(ارشاد شیخ ہے) اور کہا گیا ہے کہ ہمت وہ ہے جو تجھ کو تیرے نفس سے اعلیٰ کاموں کی طلب پر ابھارے اور انسان کی قیمت اس کی ہمت ہے۔

شرح: یعنی اگر اس کی ہمت دنیا ہے تو اس کی قیمت دنیا ہی ہے اور اگر اس کی ہمت عقبیٰ ہے تو اس کی قیمت عقبیٰ ہی ہے اور اگر اس کی ہمت مولیٰ ہے تو اس کی قیمت مولیٰ ہے۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ کون سعید ہے اور کون شقی یعنی کون نیک بخت ہے اور کون بد بخت یہ آج ہی ظاہر ہے۔ اور اسی عالم میں اس کو پہچانا جا سکتا ہے سنت الٰہی اسی حکم کے مطابق جاری ہے، یہ اور بات ہے کہ اس کی قدرت بہت وسیع ہے لیکن زیادہ تر ایسا ہی کہ سعید و شقی کی شناخت اسی عالم میں موجود ہے۔

بزرگوں نے فرمایا کہ ماں کے شکم میں آنے کا تعلق ہمت سے ہے اور شکم سے باہر آجانے سے اس کی قیمت لگ جاتی ہے۔ (یعنی دنیا میں آجانے کے بعد سعادت و شقاوت کا معاملہ کھل جاتا ہے۔ مترجم) اس آیت کریمہ **اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ** (الاعراف/۱۷۹) (وہ حیوانوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ) میں اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

حضرت عین القضاۃ ھمدانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہاں بھی کھانا پینا اور وہاں بھی کھانا پینا۔ ہرگز ہرگز ایسا نہ ہو۔

بزرگوں کا کہنا ہے کہ جس مرید کا اشہب ہمت بہشت سے آگے نکل جاتا وہ اس میدان کا مرد نہیں۔

سوال:- یہ جو کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت صرف اللہ کے لئے کی جائے کسی

لذت اور خواہش کی تکمیل کے لئے نہیں کی جائے۔ تو ایسا کیسے ہو سکتا۔ اس لئے کہ بندہ کا معاملہ تو لذت و خواہش اور حصہ و قسمت سے خالی نہیں ہوتا؟

جواب :- اس کا جواب یہ ہے کہ جماعتِ صوفیا کے نزدیک حظ و نصیب سے مراد اغراضِ مشہورہ ہیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے سوا نہ دنیا میں ان کا کوئی حظ و مطلوب ہو اور نہ آخرت میں۔ کہتے ہیں کہ فلاں شیخ کو کسی چیز سے لذت نہیں۔ اس سے وہی حظ و لذت مراد ہے جس کو لوگ سامانِ لذت سمجھتے ہیں۔

جو شخص بہشت کے لئے خدا کی عبادت کرتا ہے وہ خدا کی عبادت کو اپنے مطلوب کا ذریعہ بناتا ہے۔ حق سبحانہ و تعالیٰ اس کا مطلوب نہیں ہوتا۔ اس کا مطلوب و محبوب بہشت ہے اللہ رب العزت نہیں۔ اور جس کا محبوب و مطلوب حق تعالیٰ کے سوا اور کچھ نہیں اور اس کا مطلوب و محبوب اللہ تعالیٰ کے دیدار کی خوشی اور اس کے قرب کی مسرت ہے۔ ایسا شخص اللہ تعالیٰ کی پرستش و عبادت کسی غیر کی طلب و محبت میں نہیں کرتا بلکہ اللہ تعالیٰ ہی اس کا مقصود ہوتا ہے۔

قوله: سئل ابو بکر الواسطی عن مالک بن دینار و داؤد الطائی و محمد بن واسع و امثالهم من العباد فقال القوم ما خرجوا من نفوسهم اِلَّا الیٰ نفوسهم ترکو النعیم الفانی للنعیم الباقی فاین حال البقاء من الفناء.

(ارشاد شیخ ہے) حضرت ابو بکر واسطی، حضرت مالک بن دینار، حضرت داؤد طائی، حضرت محمد بن واسع اور ان جیسے دوسرے عابدوں و زاہدوں کے بارے میں جب پوچھا گیا تو کہا یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے نفوس سے نہیں نکلے مگر اپنے نفوس کی طرف۔ انہوں نے باقی رہنے والی نعمتوں کے لئے فانی نعمتوں کو چھوڑا ہے۔ فنا اور بقا کہاں ہے۔

شرح: یہ فنا کے بعد بقا کے حال سے متعلق بہت اہم مطالبہ کی گفتگو ہے۔

حضرت منصور جب حضرت ابراہیم خواص کو تلاش کرنے نکلے تو ایک جنگل میں ان کو گشت لگاتے دیکھا تو پوچھا یہاں کیا کر رہے ہیں؟

انہوں نے جواب دیا توکل میں اپنے کو پختہ کر رہا ہوں!

حضرت منصور نے فرمایا! اپنی زندگی کو برباد کردی! ذرا یہ تو بتائے کہ **الفنا فی التوحید** میں آپ کا کیا حال ہے؟

جماعت صوفیا کے نزدیک فنا کے معنی یہ ہیں کہ لذت وخواہشات اس سے فنا ہو جائے اور لذت وخواہشات کا فنا ہونا یہ ہے کہ بندہ کو کسی سے انس نہ ہو، کسی چیز میں لذت محسوس نہ وہ، انسیت دینے اور وحشت میں ڈالنے والی چیزوں کے درمیان، لذت بخش اور غم اندوز باتوں کے درمیان، خسیس اور نفیس اشیاء کے درمیان کوئی تمیز اور فرق نظر نہ آئے۔

سوال:- منکرین یہاں پر یہ سوال اٹھا سکتے ہیں کہ جب بندہ اپنی صفات سے فانی ہو جاتا ہے۔ تو پھر شریعت کے وظائف بھی اس سے ساقط ہو جائیں گے۔

جواب:- اس کا جواب یہ ہے کہ حق سبحانہ تعالیٰ اس بندہ کو اپنی خودی سے جدھر چاہتا ہے گھماتا ہے اور گھوم جاتا ہے۔ اسی طرح شریعت کے وظائف کی ادائیگی میں وہ اسی جانب سے متحرک ہوتا ہے۔ یعنی اس کا اس طرف مائل ہونا اپنی جانب سے نہیں ہوتا اور اپنی قوت کا اس میں دخل نہیں ہوتا بلکہ حق سبحانہ وتعالیٰ کی جانب سے ہوتا ہے۔ جب تک بندہ اپنی صفات کے ساتھ باقی رہتا ہے حق تعالیٰ حکم شریعت کے مطابق اوامر ونواہی پر نگاہ رکھتا ہے اور جب اپنی صفات کو فنا کر دیتا ہے تو حق تعالیٰ اس پر تصرف کرنے والا ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں خواہشات کے تصرف سے اس کے افعال پاک ہو جاتے ہیں۔ حق سبحانہ تعالیٰ اس کو اس حال میں خصوصی طور پر خصوص رکھتا ہے۔ شرعی اعمال ترک کرا کے اسے معیوب ہونے نہیں دیتا۔ جب بندہ کو حالِ فنا ہو جاتا ہے تو حالِ فنا کی درستگی یہ ہے کہ وہ بندہ محفوظ ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے جو ذمہ داریاں اس پر عاید ہوتی ہیں ان کو صحیح طور سے دقت پر ادا کرتا ہے۔ اوامر کے وقت اوامر کی ادائیگی کرتا ہے اور منہیات کے ترک کے وقت منہیات سے باز رہتا ہے۔ اور وہ ان حالات میں شرح کے موافق ہوتا ہے۔ جب اس کا یہ حال ہو جاتا ہے تو اس کی فنا صحیح و درست ہو جاتی ہے۔ اور اگر اس کا حال اس کے برخلاف ہوتا ہے تو اسے شیطانی غلبہ کہیں گے، یہ غلبۂ رحمانی نہیں ہوگا۔

ترک النعیم الفانی للنعیم الباقی = (انہوں نے فانی نعمتوں کو باقی نعمتوں کے لئے ترک کر دیا) یہ کسی چیز کا دینا اور کسی چیز کا لینا ہے، بلکہ بری چیز کو اچھی چیز کے عوض بیچنا ہے۔ فانی کو دنیا ہے اور باقی کو لینا ہے۔ تمام زاہدوں کا زہد یہی ہے۔

فأین حال البقاء من الفناء/فأین البقاء من البقاء = (فنا سے بقا کہا) عرفا کے نزدیک بقا سے ذات کی بقا مراد نہیں ہے بلکہ بقائے صفات مراد ہے اور فنا سے اشیا کی فنا نہیں بلکہ صفات کی فنا ہوتی ہے۔

اس معنی کے اعتبار سے ہر چیز سے مراد عین وہی چیز نہیں ہوتی ہے بلکہ معنی مراد ہوتا ہے کسی چیز کے اندر جب اس کا معنی موجود ہوتا ہے تو اس چیز کو بقا کے نام سے یاد کرتے ہیں باقی کہتے ہیں اور جب وہ معنی اس چیز سے معدوم ہو جاتا ہے تو اس چیز کو فانی کہتے ہیں۔ اس کی بہت ساری قسمیں ہیں۔

فناء اوصاف مذمومہ کے فنا کو کہتے ہیں اور بقا اوصاف محمودہ کے بقا کو۔ اسی طرح اور بھی تعریفیں آئی ہیں۔

فنا و بقا سے واللہ اعلم یہ مراد ہو کہ بندہ تمام اوصافِ بشریت سے فانی ہو جائے اور توحید میں بقا پالے۔

اور فنا کا معنی یہ ہے کہ ساری لذتیں اس سے فنا ہو جائیں۔ اس کو کسی چیز میں لذت و لطف حاصل نہ ہو۔ تمئیز اس سے ساتھ ہو جائے۔

فانی ہونے کے معنی یہ ہیں کہ بندہ کو کسی سے انسیت نہ رہے۔ کسی چیز میں لذت نہ ملے۔ انسیت دینے اور وحشت میں ڈالنے والی چیزوں کے درمیان، لذت بخش اور غم اندوز باتوں کے درمیان تمیز نہ رہ جانے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔

فنا کے صحیح و درست ہونے کی علامت اور شناخت یہ ہے کہ اس بندہ پر خدا کی جانب سے جو ذمہ داریاں ہیں اسے بجالائے۔ یعنی جن کاموں کا حکم دیا گیا ہے ان پر عمل کرے اور جن کاموں سے منع کیا گیا ہے ان سے پرہیز کرے تاکہ اوامر و نواہی میں وہ شرح کے موافق ہو

جائے۔ جب بندہ کا یہ حال ہو جاتا ہے تو اس کی فنا صحیح و درست ہو جاتی ہے۔ اور اگر بندہ کا حال اس کے برعکس ہوتا ہے تو اسے شیطانی غلبہ کہیں گے۔

حضرت خواجہ جنید رحمۃ اللہ علیہ کو لوگوں نے بتایا کہ حضرت امام ثوری رحمۃ اللہ علیہ چند روز سے مسجدِ شونیزیہ میں قیام فرما ہیں، نہ کچھ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں، نہ سوتے ہیں صرف اللہ اللہ کرتے ہیں اور وقت پر نماز پڑھ لیتے ہیں۔

حضرت خواجہ جنید نے فرمایا کہ اس بیان سے مقامِ فنا کی معنوی کیفیت کا اظہار ہوتا ہے۔ اگر بشری صفت پر قایم رہتی ہے تو آدمی کو کھانے پینے اور سونے کے بغیر چارہ نہیں ملتا۔ اور اگر اس کے بغیر بقا حاصل ہے تو یہ بات صحیح ثابت ہو رہی ہے کہ بشری معانی فنا ہو چکے اور وہ جوان کی زبان پر اللہ اللہ ہے وہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان کو اللہ میں فنائیت حاصل تھی۔ اس لئے کہ کوئی شخص اگر کسی چیز میں گم ہو جائے خوشی ہو یا غم خوف ہو یا امید یا مغلوب العقل ہو جائے۔ تو زوالِ عقل کی صورت میں اس وقت اس کی زبان پر وہی چیز آئے گی جس میں وہ گم ہوا ہے جیسے کوئی مست، حالتِ مستی میں وہی ساری باتیں بولنے لگتا ہے جس کو ایک ہوشیار چھپائے رکھتا ہے۔ جب حضرت امام ثوری رحمۃ اللہ علیہ کو حق سبحانہ تعالیٰ کی عظمت، جلالت، ہیبت، محبت یا خوف نے فانی کر دیا تھا تو اس بنا پر ان کو زبان مبارک پر ذکر اللہ اللہ جاری رہتا تھا۔ اگر ان کی فنائیت غیر حق تعالیٰ کے اندر ہوتی تو اللہ کا نام ان کی زبان پر نہیں آتا۔

لوگ حضرت کے بارے میں کہتے یہ تو ہوشیار ہیں، فانی کہاں ہیں اس لئے کہ یہ تو وقت پر نماز بھی پڑھ لیتے ہیں۔ فانی کیسے کہا جائے؟

فرمایا ایسی بات نہیں ہے۔ دراصل صاحبانِ وجد محفوظ ہوتے ہیں۔ اور اس وجد سے فنا مراد ہے۔ لہٰذا حضرت خواجہ جنید فرماتے کہ جب حق تعالیٰ کے ساتھ فنائیت درست ہو جاتی ہے تو یہ بندہ محفوظ ہو جاتا ہے اور بے ادبی کرنے سے بھی محفوظ رہتا ہے۔ اور یہ بات اس لئے ہے کہ پہلے ہی اگر مقامِ ریاضت میں رکھ کر ادب نہیں سکھاتے اور تمام بے ادب اوصاف سے پاک نہیں کر لیتے مقامِ قرب کے لائق نہیں ہوتے۔

قوله: سُئِلَ الْجُنَید عَن قَولِہٖ تعالیٰ لَا یَسئَلُونَ النَّاسَ الحافا فقالَ یمنَعُهُمْ عُلُوّ هِمَّتِهم عَن رَفع حَوائجِهِمْ اِلَّا اِلیٰ مَولٰهُم.

(ارشادِ شیخ ہے) حضرت خواجہ جنیدؒ سے پوچھا گیا اللہ تعالیٰ کے اس قول **لا یسالون الناس الحافا (البقرہ /۲۷۳)** (وہ لوگ کسی سے لپٹ کر یعنی منت وزاری کے ساتھ کچھ نہیں مانگتے) کا کیا معنی ہے۔ تو انہوں نے کہا ان کی بلند ہمتی ان کو اس بات سے روک دیتی ہے کہ وہ اپنی حاجتیں غیر اللہ کے پاس لے جائیں۔

شرح: حضرت خواجہ جنیدؒ سے اللہ تعالیٰ کے اس قول کے بارے میں جو فقرائے اہل صفہ کی مدح میں ہے کہ ''وہ لوگ کسی سے الحاح یعنی منت وزاری کے ساتھ کچھ مانگتے نہیں'' اس کی اصل کیا ہے تو حضرت خواجہ جنید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ان کی بلند ہمتی ان کی اپنی حاجتوں کو غیر اللہ کے پاس لے جانے سے روک دیتی ہے۔ یہاں تک کہ انتہائی بھوک کی حالت میں زمین پر لوٹنے لگتے ہیں تا کہ لوگ یہ سمجھ جائیں کہ یہ دیوانے ہیں اور یہ لوگ اپنی جانب سے ایسی بے نیازی ظاہر کرتے ہیں کہ لوگ ان کو مالدار سمجھتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام میں یوں جلوہ فرمائی کی **یَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِیَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ (البقرہ /۲۷۳)** (خیال کرتے ہیں انہیں ناواقف کہ مالدار ہیں)

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں پر ہمت کو بیان کیا ہے، ان لوگوں کو جو بلند ہمتی حاصل تھی اس کی وجہ سے غیر اللہ کے آگے نہیں جھکتے۔ چنانچہ کہتے ہیں **الهمةُ لا یکتفی بالمَخلُوقِ وَلَا لَها سَبِیْلٌ اِلَی الْخَالِقِ فَبَقِیَتِ الْهِمَّةُ غَرِیبَةً** (ہمت مخلوق پر قناعت نہیں کرتی اور نہ خالق کائنات تک پہنچنے کا اس کے پاس کوئی راستہ ہے چنانچہ ہمت غیر مانوس اور اجنبی ہو کر رہ گئی ہے)

جب کوئی کائنات پر اکتفاء نہیں کرتا اور خالقِ کائنات تک راہ نہیں پاتا تو یقیناً وہ بیچارہ غریب ہوگا۔

الحافا، الحاحاً کے معنی میں ہے۔ یعنی وہ لوگ الحاح وزاری نہیں کرتے۔ یہاں پر سوال کا

مطلق ترک کرنا ہے۔ اس لئے یہ کہ ان صاحب قناعت فقراء کی تعریف میں ہے جو سوال کا مطلق ترک کرتے ہیں۔

حضرت ابن عباس ﷺ اس آیت سے متعلق فرماتے ہیں **لا یسئلون الناس الحافاً ای الحاحا ولا غیر۔**

فقرائے صادق کی صفت یہ ہے کہ وہ اپنی بلند ہمتی کی وجہ سے کسی کے مرہون منت نہیں ہوتے۔ اسی نظریہ کو سامنے رکھتے ہوئے عالی ہمت بزرگوں میں سے کسی نے کہا ہے کہ کسی کے طفیل یا کسی کی سفارش پر بہشت میں جانا افسوس کی بات ہے ؎

سر در نیاورم بسلاطین روزگار　　　گر من ز بندگان تو باشم کمینہ

(اگرچہ میں تیرا کمینہ بندہ ہوں، لیکن اس کے باوجود میں سلاطینِ وقت کے سامنے سر نہیں جھکا سکتا)

ایک بزرگ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے آدمیوں کے ہاتھ میں ایک ایسی کمان دی ہے جس کو حضرت جبرائیل وحضرت میکائیل بھی نہیں جھکا سکتے۔

ایک بزرگ نے یہ بھی کہا کہ اگر حضرت ابراہیم خلیل اللہ کو **اتخذ اللہ ابراھیم خلیلا (النساء/۱۲۵)** (اور بنالیا ہے اللہ نے ابراہیم کو خلیل) کہا گیا اور حضرت موسیٰ کو **وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوسىٰ تكلِيمًا (النساء/۱۶۴)** (اور کلام فرمایا موسیٰ سے اللہ نے خاص کلام کہا گیا تو ہم لوگوں کو **یُحبُّهُمْ وَيُحِبونَهٗ (المائدہ/۵۴)** (اللہ ان سے محبت کرتا ہے اور یہ اللہ سے محبت کرتی ہیں) کے خطاب سے سرفراز فرمایا گیا۔

اٹھارہ ہزار عالم میں جو ہمت اس مٹی پانی کے پتلے کو عطا کی گئی وہ اور کہیں نہیں۔ اس مٹی پانی کے پتلہ میں ایک عظیم راز ہے۔ ورنہ صرف مٹی پانی کا یہ کام نہیں تھا۔ **انا لا انت و لا انت غیری** (میں نہیں، تو ہے اور تیرے سوا کوئی نہیں)

اس شعر میں اسی بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ؎

سریست بداں زلفِ تو سربستہ نگارا　　　اما چہ تواں کرد کہ باما نکشائی

(اے میرے محبوب! آپ کی زلف میں ایک راز پوشیدہ ہے، لیکن کیا کیا جائے کہ وہ راز آپ مجھ پر نہیں کھولتے)

قولہ: **قَالَ الحَصرِیُّ فِی حِکَایۃٍ اِذَا اَرفَرتُ جَھَنَّمَ زَفرَۃً کل یقُولُ نَفسِی نَفسِی لاَجل ولاَأدنیٰ اِلَّا مُحَمَّد صَلّی اللّٰہُ عَلَیہِ وسلم فَاِنَّہٗ یَرجِعُ اِلیٰ حَدِّ الشَّفَاعَۃِ فَیقُولُ اُمَّتِی اُمَّتِی.**

(ارشاد شیخ ہے) حصری نے اپنی حکایت میں بیان کیا ہے کہ جس وقت دوزخ کو جوش آئے گا اور اس کے جوش کو دیکھ کر ہر شخص خواہ وہ بڑا ہو یا چھوٹا، اعلیٰ ہو یا ادنیٰ نفسی نفسی پکارنے لگے گا مگر یہ سچ اور درست ہے کہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ شفاعت کے مقامِ بلند پر جلوہ افروز ہو کر امتی امتی کہیں گے۔

شرح: یعنی تمام لوگوں میں ہمت کے باوجود اپنی طلب مراد کا کچھ نہ کچھ حصہ باقی رہ گیا تھا۔ اس کے پیش نظر یقینی طور پر اپنا حصہ اور اپنی مراد طلب کریں گے اور اپنی مراد کا طلب کرنا دراصل حکم کے مطابق ہے۔ اس لئے کہ بارگاہِ خداوندی سے اپنے لئے رحمت طلب کرنے کا حکم بھی ہے۔ لیکن حضرت محمد ﷺ کی نہ اپنی کوئی غرض ہے اور نہ اپنی کوئی مراد باقی ہے۔ چونکہ آپ ﷺ تسلیم وتفویض کے جس مقامِ کمال پر فائز ہیں اس کا یہ تقاضا ہے کہ اپنی ذات سے رخ موڑ لیں (اپنے لئے کچھ نہ مانگ کر اُمت کے لئے فکر مند رہیں۔ مترجم) اور پھر حضور ﷺ یہ بھی جانتے ہیں کہ جب میں اپنے کمتروں کے لئے کچھ طلب کروں گا اور ان کو چاہوں گا تو اس چاہ میں خود بھی شامل رہوں گا۔ اس لئے کہ یہ محال ہے کہ اتباع کرنے والوں کی نجات ہو اور جس کی اتباع کی جائے اس کی نجات نہ ہو۔

کشف محجوب میں آیا ہے کہ مقام قرب میں قریب رہتے ہوئے دور والوں کی بات کی جائے تو یہ قرب کے لائق ومناسب نہیں۔

کہتے ہیں کہ حضور نبی کریم علیہ الصلوۃ والتسلیم قیامت کے دن دیکھی ہوئی

چیزوں کو دیکھیں گے۔ آپ ﷺ نے شبِ معراج میں انبیاء کے مقامات، ساتوں زمین اور ان کے عجائبات، ساتوں آسمان اور ان میں حق سبحانہ وتعالیٰ کی عظمت، بہشت اور اس کی نعمتوں کا کمال، دوزخ اور اس کی سزائیں لوح وقلم، قضاء وقسمت سب کا مشاہدہ کر چکے ہیں۔ اس لئے اپنی جگہ سے ذرا بھی نہ ہلیں گے اور دوسرے لوگوں نے نہیں دیکھا ہے۔ پہلی بار دیکھیں گے اس لئے خوف ودہشت اور رعب وداب سے کچھ نہ بولیں گے بولنا بھول جائیں گے۔

اسی لئے کہتے ہیں کہ معراج کی شب حضور ﷺ کو بلانے میں ایک حکمت یہ بھی تھی کہ پہلے ہی دیکھ لیں۔ اور قیامت میں دیکھی ہوئی چیز کو دیکھ کر اپنی جگہ سے نہیں ہلیں۔ دوسرے لوگ جس وقت نفسی نفسی کہیں گے آپ ﷺ امتی امتی فرمائیں گے۔

قوله: فَلاَ یبقیٰ لِاَحدٍ نفسٌ بِلاعِلَّةٍ فَیقُولُ رَبِّی رَبِّی لَیعلَمَ اِنَّ مَحَلَّ الُحَوَادِث لاَ یَخلُو عَنِ الُعِلَلُ.

(ارشادِ شیخ ہے) کسی ایک شخص کا بھی نفس بغیر علت کے باقی نہیں رہے گا تو وہ نادانستہ طور پر کہے گا ربی ربی۔ یہ سچ اور درست ہے کہ محل حوادث علتوں سے خالی نہیں۔

شرح: یعنی آدمی جب محل حوادث ہے (تغیر وتبدل قبول کرنے والا ہے) تو اس کے افعال اور اس کے اعمال یقیناً علت سے خالی نہیں ہوں گے۔ کیوں کہ آدمی کا کوئی کام علت سے خالی نہیں ہے۔ اس کا جو کام بھی ہوگا وہ یا تو منفعت کے لئے ہوگا یا نقصان کو دفع کرنے کے لئے ہوگا۔ بندہ کی صفت نیازمندی ہے اور اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے۔ اس کے کام حصول منفعت اور دفع مضرت سے منزہ وپاک ہیں وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ **یفعل اللہ مایشاء ویحکم ما یرید** (جو وہ چاہتا ہے کرتا ہے اور جس چیز کا ارادہ کرتا ہے اس کا حکم دیتا ہے) اللہ تعالیٰ کی محبت مخلوق کے ساتھ بغیر کسی علت اور سبب کے ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ سے بندوں کی محبت علت اور سبب کی بنا پر ہوتی ہے، جو محبت علت اور سبب کی بنا پر ہو وہ مجازی ہے اور جو محبت بغیر علت وسبب کے ہو وہ حقیقی ہے۔ کیونکہ مخلوقات کی محبت وعداوت معلول ہے۔ علت والی محبت (یعنی غرض وسبب والی

محبت) کے ساتھ منفعت معلول ہے اور علت والی عداوت میں مضرت معلول ہے۔
اسی لئے بندوں کی صفات میں تغیر وتبدل جائز ہے۔ جب منفعت، مضرت میں بدل جاتی ہے تو محبت، عداوت بن جاتی ہے اور جب مضرت منفعت سے بدل جاتی ہے تو مضرت، منفعت ہو جاتی ہے اسی کے برعکس اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کی عداوت کسی علت (وجہ اور سبب) کی بنا پر نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت ازلی ہے، جو محبت ہے وہ ازل سے ابد تک دوست ہے۔ اور جس کا دشمن ہے ازل سے ابد تک وہ دشمن ہے۔ آج اس دنیا میں وقت کی موافقت کی بنا پر محبت وعداوت میں کوئی تغیر نہیں ہوتا اور آج اس دنیا میں وقت کی مخالفت سے اس کی محبت وعداوت میں کوئی تغیر وتبدل نہیں ہوتا۔ جیسا کہ قول ہے الرضا وسخط لِلّٰهِ تَعَالیٰ صِفَتَانِ اَزْلِیَّتَان لَا یتغیران بِاَفعَالِ العِبَاد (خوشنودی اور ناخوشنودی، دوستی ودشمنی اللہ تعالیٰ کی یہ دونوں صفتیں ازلی ہیں۔ اس میں بندہ کے افعال سے کوئی تغیر وتبدل نہیں ہوتا)

بندہ کی اللہ تعالیٰ کے ساتھ جو موافقت ومخالفت کا معاملہ اس دنیا میں ہے وہ ازل میں جو کچھ ہو چکا ہے اس کی علامت ہے اس کی علت نہیں ہے۔

یہ بات تو ثابت ہے کہ کفر محل عداوت ہے اور ایمان محل محبت۔ اگرچہ کافر اپنے کفر کی وجہ سے اللہ کا دشمن ہے لیکن اللہ تعالیٰ اس کا دشمن ہے یہ بات ابھی ظاہر نہیں ہے اس کا حال پوشیدہ ہے اور اس کا حکم موقوف ہے۔ ہاں! اگر کفر ہی پر اس کا خاتمہ ہوتا ہے تو یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کا دشمن ہے اور کفر سے نکل آتا ہے یعنی ایمان لے آتا ہے تو یہ حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کا دوست ہے۔ اسی طرح مومن اگرچہ وہ اپنے ایمان کی وجہ سے اللہ کا دوست ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی محبت اس کے لئے ہے یہ بات ابھی ظاہر نہیں۔ یہ حال ابھی پوشیدہ ہے اور یہ حکم ابھی موقوف ہے۔ ہاں! اگر اس جہان سے ایمان کے ساتھ جاتا ہے تو یہ حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کا دوست ہے لیکن اگر ایمان سے خارج ہو جاتا ہے اللہ اپنی پناہ میں رکھے تو یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کا دشمن ہے۔

اب یہ بات بھی سمجھ لیجئے کہ ایسا شخص جس کا اللہ تعالیٰ دوست ہے اور اس میں دشمنوں کی صفت پائی جاتی ہے جیسے ساحرانِ فرعون۔ تو ایک وقت ایسا آیا جب سلطانِ محبتِ حق نے ان پر غلبہ حاصل کیا اور انہیں دوستوں کی صف میں لا کر کھڑا کر دیا۔ اور جس کا اللہ تعالیٰ دشمن ہے گرچہ دوستوں کی خوبیاں اس میں پائی جاتی ہیں جیسے ابلیس لعین۔ تو ایک وقت ایسا آیا کہ سلطانِ عداوتِ حق نے اس کو دوستوں کی صف سے نکال کر دشمنوں کی صف میں لا کر کھڑا کر دیا۔

یہ باتیں ایسی ہیں جن سے پتہ پانی ہو جاتا ہے اور جگر خون بن کر بہہ جاتا ہے۔ وہ دستار جو تمہارے سر پر ہے اگر کافر کے سر پر رکھ دیں اور وہ زنار جو کافر کی گردن میں ہے تمہاری گردن میں ڈال دیں تو کیا کر سکتے ہو۔ لَہُ الْملکُ الْمُطلق فَلَہُ التَّصرفُ الْمُطلق جب اس کی بادشاہت مطلق ہے تو اس کا تصرف بھی مطلق ہے۔ اس لئے جو چاہے کرے۔ ؎

ملک آن تست و فرماں، مملوک را چہ درماں

گر بے خطا برانی در بے گنہہ بگیری

(ملک آپ کا ہے نظام آپ کا۔ مالک کے حکم میں مملوک کو کیا دخل۔ بے گناہ کے نکال دیجئے یا بغیر خطا کے پکڑ لیجئے۔ آپ کو اختیار ہے۔)

فصل-۸

صوفیوں کے اخلاق وخصائل کے بیان میں

قولہ: وَاَجَلّ خِصَالِھِمْ اَخْلَاقھِم
(ارشادِ شیخ ہے) اس گروہِ صوفیا کی عظیم ترین خصلتیں، ان کے اخلاق ہیں۔

شرح: صوفیائے کرام وہ ہیں جنہوں نے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی سنت کو زندہ رکھا اور جاری کیا اور وہ اس طرح کی ابتدا میں رحمۃ للعالمین حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے اقوال کی حفاظت فرمائی اور اسی کو شریعت کہتے ہیں۔ درمیان میں آپ ﷺ کے اعمال کی پیروی کی اور اسی کو طریقت کہتے ہیں اور آخر میں جب احوال تک پہنچنے کی بات آئی تو آپ ﷺ کے احوال سے لگے رہے۔ اس حدیث کا یہی معنی ہے الشریعة أقوالی و الطریقة أفعالی و الحقیقة أحوالی۔ چوتھا رکن معرفة أشیاء کما ھی ہے۔ (یعنی اشیاء کی معرفت جیسی کہ وہ ہے) انسان کا کمال انہیں چاروں ارکان پر موقوف ہے۔ بہت سارے لوگ ایسے ہوئے جنہوں نے اعمال کو اختیار کیا مگر اخلاق میں پیروی نہیں کی۔ جیسے عابدوں کی جماعت ــــــ یہ لوگ اعمال کی پیروی کو قبول کرتے ہیں اور اخلاق سے سرکشی کرتے ہیں۔

ایک جماعت زاہدوں کی ہے ـــــ یہ لوگ بعض اخلاق کو اختیار کرتے ہیں اور بعض اخلاق سے سرکشی کرتے ہیں۔

لیکن ـــــ صوفیوں کی جماعت ـــــ یہ لوگ تمام اخلاق پسندیدہ اور اوصاف حمیدہ کو قبول کرتے ہیں۔ یعنی اختیار کرتے ہیں۔

بندگی اور سعادت مندی کا کمال یہی ہے کہ جہاں تک بندہ سے ہو سکتا ہے اپنے کو اللہ تعالیٰ کے اخلاق سے آراستہ اور اس کی صفات کے معانی سے پیراستہ کرلے۔

اس سعادت کا کمال تو مطلق طور پر حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو حاصل ہے آپ کے بعد یہ سعادت صوفیا کے حصہ میں آئی۔ اللہ تعالیٰ کی قربت صفت میں ہے نہ کہ مکان میں۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کی صفات سے جتنا زیادہ متصف ہے اتنا ہی زیادہ وہ اس سے قریب ہے۔ تخلقوا باخلاق اللہ کے مضمون میں یہی معنی پوشیدہ ہے۔

بزرگوں نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم ﷺ کو جن چیزوں کے لئے مخصوص کیا وہ تو کیا ہی ـــــ لیکن ـــــ آپ کے دوسرے خصائص کی ویسی مدح نہیں کی جیسی کہ وَاِنَّکَ لَعَلیٰ خُلُقٍ عَظِیم (القلم /۴) (اور بے شک آپ عظیم الشان خُلق کے مالک ہیں) فرما کر آپ ﷺ کے اخلاق کی مدح وستائش کی۔

قوله: سُئِلَتْ عَائشة رَضِیَ اللّٰه عَنها عَنْ خُلِق رَسُول اللّٰه صلی اللّٰه عَلیه وسلم فقالت کانَ خُلقُه فِی القران جب حضرت ام المومنین بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا سے آپ ﷺ کے اخلاق کے بارے میں دریافت فرمایا تو انہوں نے کہا آپ ﷺ کا اخلاق قرآن میں ہے۔

حضرت امام قتادہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ وھو ما کانِ یا تمر مِن اَمرِللّٰه وَینتھِیَ مَانھی اللّٰهُ حضور ﷺ کا اخلاق یہ تھا کہ آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجا آوری کی اور جن کاموں سے منع کیا ان سے باز رہے۔

حضور رحمت للعالمین علیه الصلوة و التسلیم کی ذات مقدس ظاہر میں بھی

اور باطن میں بھی اللہ تعالیٰ کے آداب (اخلاق) کا مجموعہ تھی۔ اللہ رب العزت نے آپ کے حسنِ آداب کا اعلان مازاغ البصر وماطغی کے ذریعہ کی۔ اور یہ آداب کے وہ نکات ہیں جن کے لئے حضور ﷺ ہی مخصوص ہیں۔ یعنی حضور ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے سوا جو کچھ ہے ان سے اعراض فرمایا ان سے رخ موڑ لیا، صرف اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رہے۔ ساتوں زمین، ان کی دنیاوی سرائے ان کی لذتوں کو، ساتوں آسمان، ان کی اخروی سرائے اور ان کی لذتوں کو پسِ پشت ڈال دیا۔

ایک جماعت کا کہنا ہے کہ اخلاق میں اگر کامل مرد تھے تو حضور ﷺ ہی تھے جن کے سامنے ساری کائنات پیش کی گئی مگر گوشۂ چشم سے بھی ادھر نہیں دیکھا۔

عوارف میں آیا ہے کہ اماالمؤمنین کا یہ فرمانا خلقہ فی القرآن بعید از عقل نہیں۔ حضور ﷺ اللہ تعالیٰ کے اخلاق سے متصف تھے۔ اس سے متعلق یہ ایک باریک راز اور لطیف ترین پوشیدہ اشارہ ہے۔

حضور رحمۃ للعالمین محمد رسول اللہ ﷺ کو اخلاق کی جو حشمت حاصل تھی وہ بارگاہِ رب العزت سے ملی تھی جیسا کہ فرمایا کان متخلقاً باخلاق اللہ تعالیٰ (آپ ﷺ اللہ کے اخلاق سے آراستہ تھے) اسی معنی کو اس جملہ میں بیان کیا کان خلقہ فی القران استحیاءً من سبحان الجلال وستراً للحال بلطف المقال (آپ ﷺ کے اخلاق قرآن میں ہیں۔ یعنی آپ ﷺ اللہ کی عظمت وکبریائی کو بیان کرنے میں بڑے محتاط اور احوال وکیفیات کو پردۂ راز میں رکھنے والے تھے) اور یہ ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے وفورِ علم کا کمال تھا۔

قولہ: قال اللّٰہ تعالیٰ خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْنَ (الاعراف/۱۹۹)

(ارشاد شیخ ہے) اللہ تعالیٰ نے فرمایا عفو کو اختیار کیجئے نیک کاموں کا حکم دیجئے اور جاہلوں سے رخ پھیر لیجئے۔

شرح: نادانوں سے مراد کفار ہیں۔

یعنی ان کافروں کے ظلم وستم کا بدلہ نہ لیجئے۔ یہ تینوں باتیں اس بات کی دلیل ہیں کہ لوگوں کا بوجھ اٹھایئے اور دوسروں کے لئے بوجھ نہ بن جایئے۔ جب حضور رحمتِ عالم ﷺ نے ان احکام پر عمل کرنے میں پیش رفت دکھایا تو اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیم کے ذریعہ آپ ﷺ کے خلقِ عظیم کی مدح وثنا کی گئی۔

حضرت امام واسطی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ حضور ﷺ کا خلق عظیم یہ تھا کہ دونوں جہاں دوسروں پر ایثار کر دیا اور خود مکونِ کون یعنی خالق کائنات کے دامن سے لگے رہے۔

حضرت خواجہ ابوسعید خرازی نے فرمایا چوں کہ آپ ﷺ کی ہمت کا معاملہ حق سبحانہ وتعالیٰ کے سوا اور کسی دوسری چیز کے ساتھ نہیں تھا اس لئے انک لعلی خلق عظیم کی مدح وثنا سے متصف ہوئے۔

اسی طرح دوسروں نے کہا کہ جن کی مدح سرائی اور ثنا خوانی اللہ رب العزت فرمائے ان کی تعریف وتوصیف دوسرا کیا بیان کر سکتا ہے۔

حضرت امام واسطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے کہ حضور ﷺ کا خلق عظیم یہ تھا کہ ذاتی منفعت کے لئے نہ آپ ﷺ کو کسی سے دشمنی تھی اور نہ کسی کو آپ ﷺ سے۔

حضرت امام حسین رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ حضور ﷺ کا خلق عظیم یہ تھا کہ مشاہدۂ حق میں ایسا مشغول رہتے کہ لوگوں کے جور وجفا کا آپ ﷺ پر کوئی اثر نہ ہوتا۔

بعض لوگوں نے کہا ہے کہ خلق عظیم تقویٰ کا لباس ہے اور اللہ تعالیٰ کے اخلاق سے متصف ہونے کا نام ہے۔

حضرت ابن عطا رحمۃ اللہ علیہ فرماتے کہ حضور ﷺ کے خلق عظیم یہ تھا کہ آپ ﷺ نے فناء نفس اور فنائے لذات کے حکم کے تحت تمام اختیارات کو پسِ پشت ڈال دیا تھا۔

قوله: وقال النبی ﷺ ألا اخبرکم بأحبکم الی وأقربکم منی مجلسا یوم القیامة قالوا بلی ایارسول الله قال احسنکم اخلاقا الموطون اکنافاً الذین یالفون ویولفون.

(ارشاد شیخ ہے) رسول خدا ﷺ نے فرمایا جانتے ہو اور باخبر ہو یا میں تمہیں بتاؤں کہ تم لوگوں میں میرا سب سے زیادہ محبوب اور دوست کون ہے اور قیامت کے دن میری ہم نشینی میں مجھ سے سب سے زیادہ قریب کون ہوگا؟ صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ فرمایا جائے۔ آپ ﷺ نے فرمایا تم میں جس کا اخلاق سب سے اچھا ہوگا، جو لوگوں کے لئے اپنے کو بچھا دے گا جو لوگوں سے الفت رکھے گا اور جس سے لوگ الفت رکھیں گے۔

شرح: ''التوطیة'' الوطی سے ماخوذ ہے جس کے معنی قدموں میں بچھ جانا ہے۔

''الأکناف'' کنف کی جمع ہے جو طرف اور جانب کے معنی میں ہے۔

یہ عبارت دل سے تواضع کرنے کے بیان میں ہے۔

حضرت خواجہ فضیل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جس نے اپنے نفس کی طرف نگاہ کی اس کی نہ کوئی قیمت ہے اور نہ تواضع میں اس کا کوئی حصہ ہے۔

ایک بزرگ نے فرمایا حق کے سامنے حق کے لئے گردن جھکا دینے اور اس کے احکام پر ہر طرح کے اعتراض کو ترک کر دینے کا نام تواضع ہے۔

حضرت حکیم لقمان رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہر چیز کا بوجھ اٹھانے والا ہوتا ہے اور عمل کا بارکش تواضع ہے۔

حضرت خواجہ اسباط رحمۃ اللہ علیہ سے لوگوں نے پوچھا کہ تواضع کی آخری حد کیا ہے؟ فرمایا اس وقت تک گھر سے باہر نہ نکلو جب تک ہر ایک آدمی کو تم اپنے سے بہتر نہ سمجھ لو۔ (یعنی ایک آدمی بھی تمہاری نظر میں برا نہ ہو)

حضرت سلطان العارفین بایزید بسطامی سے کسی نے پوچھا کوئی آدمی تواضع شعار کب ہوتا ہے؟ فرمایا اس وقت جب کسی مقام اور کسی حال میں بھی اس کی نگاہ اپنے نفس پر نہ ہو۔ جب انسان اپنے نفس کی شرارتوں اور اس کی ذلت و خواری کو پیش نظر رکھے گا تو وہ اپنے سوا کسی کو بھی برا نہیں سمجھے گا۔

کہتے ہیں کہ صوفیوں کے تمام اخلاق میں سب سے بہتر اور اشرف اخلاق تواضع ہے۔

شیخ الشیوخ شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ نے عوارف میں لکھا ہے کہ میں استاد اور شیخ حضرت ضیاءالدین ابونجیب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ شام کے سفر پر تھا۔ کسی دنیا والے نے چند حبشی قیدیوں کے سروں پر طشت میں کھانا بھیجا۔ دستر خوان لگایا گیا۔ قیدی جو کھانا لے کر آئے تھے برتن خالی ہونے کا انتظار کرنے لگے کہ حضرت شیخ نے اپنے خادم سے فرمایا ان قیدیوں کو بلاؤ اور درویشوں کے ساتھ ان کو بھی دستر خوان پر بیٹھاؤ۔ حکم کے مطابق خادم نے ان لوگوں کو بلایا دستر خوان پر سب لوگوں کے ساتھ ایک صف میں بیٹھا دیا۔ حضرت شیخ اپنے سجادہ سے اٹھے ان کے پاس گئے اور انہیں کی طرح ان کے درمیان بیٹھ گئے اور ان قیدی غلاموں کے ساتھ کھانا کھایا۔

اس واقعہ سے مجھ پر وہ بات ظاہر ہوگئی جو تواضع للہ کے سلسلہ میں حضرت کے قلب انور پر گذری تھی نفس کو شکست دینا اور تکبر سے نفس کو باہر نکال لینا اس ایمان اور علم کی وجہ سے تھا جو حضرت شیخ کو حاصل تھا۔ دوسروں کو علم وایمان کے باوجود یہ دولت کہاں حاصل ہے کہ لوگوں کے ساتھ موافقت، مساوات اور میل جول کا یہ معاملہ کریں یعنی لوگوں کے ساتھ وہ موافقت سے پیش آئیں اور لوگ بھی ان کے ساتھ اسی موافقت ومساوات کا معاملہ کریں۔ یہ باتیں بھی حسن اخلاق ہی کے ضمن میں ہیں۔ اس لئے کہ بدخوئی کے ساتھ موافقت درست ہو ہی نہیں سکتی۔ لہٰذا جو شخص جتنا زیادہ نیک خو ہوگا وہ اتنا ہی زیادہ لوگوں کے ساتھ موافقت کرنے والا ہوگا۔ اور لوگوں کے بوجھ کو اٹھانے والا ہوگا۔

اسی لئے کہتے ہیں **الصوفی کالارض** صوفی زمین کی طرح ہوتا ہے۔ زمین کی یہ خوبی ہے کہ سارے لوگ اس کو پاؤں سے روندتے ہیں لیکن وہ دشمنی نہیں کرتی۔ اور ساری گندگیاں اسی زمین پر ڈالتے ہیں مگر ناراض نہیں ہوتی۔

حاصل کلام یہ کہ اخلاق نبوی ﷺ سے متصف ہونا بہت اہم کام ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت جو سب کا مطلوب ومقصود ہے وہ محبت رحمۃ اللعالمین حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی اتباع پر موقوف ہے اور اس کے لئے حسنِ اخلاق کی شرط ہے۔ حسن اخلاق تمام اعمال وافعال کا

منبع و سر چشمہ ہے اور تمام مقامات و احوال کی اصل و جڑ ہے۔ لہٰذا حسن اخلاق کو اپنایا جائے تا کہ حضور ﷺ کی اتباع حاصل ہو جائے۔ اس لئے کہ مشروط کا وجود شرط کے وجود کے بغیر محال ہے۔

قوله: وَقَالَ النّبِی صَلّی اللّٰه عَلَیه وَسَلَّم سُوءُ الْخُلق شُومٌ وَشِرَارُکُمْ اَسْوَءُکُمْ خلقًا.

(ارشاد شیخ ہے) نبی کریم ﷺ نے فرمایا بدخوئی نحوست ہے اور تم میں برا آدمی وہ ہے جس کے اخلاق برے ہیں۔

شرح: بزرگوں نے فرمایا کہ ہر طرح کی الجھنیں، پریشانیاں بری خصلتوں کی وجہ سے ہیں اسی طرح تمام آرام و عافیت اچھی عادتوں اور نیک خصلتوں کی بنا پر ہے۔ بری عادتیں دوزخ کی طرف لے جاتی ہیں اور نیک عادتیں بہشت کی طرف۔ یہ بات اس معنی میں ہے کہ اچھے اخلاق ہوں یا برے اخلاق، یہی تمام افعال و کردار کے سر چشمہ اور منبع ہیں۔ اچھے افعال اچھے اخلاق سے مرتب ہوتے ہیں اسی طرح برے افعال، برے اخلاق سے وجود میں آتے ہیں۔ اسی لئے اہلِ تصوف کے نزدیک دل کو بری صفات سے پاک کرنا بڑا کام ہے اور اہلِ سلوک کے نزدیک بہت اہم کام ہے۔ اس لئے کہ ہر بری صفت ان کی راہ کا بت و زنار ہے۔

قوله: قَالَ اَبُوبَکرٌ الکتَانِی رَحمةُ اللّٰه اَلتَّصوّف کُلُّه خُلُقٌ فَمَنْ زَادَ عَلَیکَ فِی الخلق زَادَ عَلَیکَ فِی التَّصوُّف.

(ارشاد شیخ ہے) حضرت ابوبکر کتانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تصوف اچھی عادتوں اور نیک خصلتوں کا نام ہے جو اپنے اخلاق کو جتنا بڑھاتا ہے وہ تصوف میں اتنا ہی آگے بڑھتا ہے۔

شرح: یعنی جو اخلاق میں زیادہ ہے وہ تصوف میں زیادہ ہے اور ان سب کی بنیاد اُسی اصول پر ہے جیسا کہ میں نے پہلے کہا کہ نیک خوئی اچھے اعمال و افعال کا سر چشمہ ہے اور بدخوئی برے اعمال و افعال کا سر چشمہ ہے۔ چنانچہ یہ بات یقینی ہے کہ جس میں نیک خوئی

زیادہ ہوگی اس کے اچھے اعمال وکردار بھی زیادہ ہوں گے۔

خوش اخلاقی کے ایک ذرہ کی وہ قدرو قیمت ہے جو عمل کے بڑے بڑے پہاڑوں کو حاصل نہیں۔

حضرت خواجہ احنف رحمۃ اللہ علیہ سے لوگوں نے پوچھا کہ خوش اخلاقی آپ نے کس سے سیکھی؟ فرمایا قیس بن عاصم مقری سے۔ ایک روز میں ان کے گھر میں بیٹھا تھا ایک لونڈی گرما گرم بریاں پیالہ میں لے کر آرہی تھی۔ وہ پیالہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور قیس مقری کے بچہ کے سر پر گر پڑا۔ بچہ اسی وقت مر گیا۔ اب تو وہ لونڈی ڈر سے کانپنے لگی۔ قیس مقری نے اس سے کہا خوفزدہ نہ ہو، جاؤ، میں نے خدا کے لئے تمہیں آزاد کیا۔ ہے کوئی عمل ایسا جو اُس حُسنِ خُلق کا مقابلہ کرسکے۔

قوله: وَمِن اَخلا قِهِم اَلحِلمُ وَالتَّوَاضِعَ وَالنَّصِيحَة والشَّفُقَةُ وَالاِحتمالُ وَالُموافقة وَالاِ .سَانُ والمَدارةُ وَالاِيثارُ وَالُخِدمَةُ وَالُالفَةُ وَالبَشاشَةُ وَالكرمُ وَالُفُتُوَّةُ وَالُبَذل الجاه وَالُمُروَّةُ وَالجُودُ والتَّوددُ وَالعَفو وَالصَّفحُ وَالسَّخاءُ وَالحَياءُ وَالوَفَاءُ وَالتَّلَطُّفُ وَالبشرُ والطلاقة والسكينة والوقار والدعاء والثناء وحسن الظن وتصغير النفس وتوقير الاخوان و تبجيل المشائخ رحمة الله والترحم عَلى الصَغِير والكَبِيرو اِستصغَار مَا مِنهُ وَاِستِعظام مَا اِلَيه.

(ارشاد شیخ ہے) صوفیوں کے اخلاق میں حلم، تواضع......تا آخر شامل ہیں۔

شرح:

حِلم: دوسروں کا بوجھ خود اٹھا لینا اور اپنا بوجھ کسی پر نہ ڈالنا حلم ہے۔

شاہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا مخلوق کی پریشانیوں کو اٹھا لینا اور ان کی ضرورتوں کو پوری کرنا حُسنِ اخلاق کی علامت ہے۔

تواضع: اپنی قدر و قیمت نہ جاننا اور ہر شخص کو اپنے سے بہتر سمجھنا تواضع ہے۔
حضرت خواجہ فضیل رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا جو شخص اپنی قدر و قیمت سمجھتا ہے اسے تواضع نصیب نہیں۔ نقل ہے کہ ایک روز حضرت ابوذر اور حضرت بلال رضی اللہ عنہما میں کسی بات پر بحث ہوگئی اور حضرت ابوذرؓ نے حضرت بلالؓ کو سیاہ فام ہونے کا طعنہ دیتے ہوئے یہ کہہ دیا کہ تم تو کالے ہو۔ حضرت بلالؓ نے یہ بات رسول اللہ ﷺ تک پہنچادی۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا اے اباذر! سمجھتے ہو! تمہیں شرم نہیں آتی۔ ابھی تک زمانۂ جاہلیت کا تکبر تمہارے اندر موجود ہے۔ یہ سن کر حضرت ابوذرؓ زمین پر لیٹ گئے اور قسم کھالی کہ اس وقت تک اپنا سر نہیں اٹھاؤں گا جب تک بلالؓ میرے چہرہ پر اپنا پاؤں نہ رکھ لیں۔ اور واقعی انہوں نے سر نہیں اٹھایا۔ یہاں تک کہ حضرت بلالؓ آئے اور انہوں نے جب اپنا قدم حضرت ابوذرؓ کے رخسار پر رکھ دیا تو حضرت ابوذرؓ نے اپنا سر زمین پر سے اٹھایا۔

نصیحت: ہر شخص کے لئے خیر خواہ رہنا نصیحت ہے۔ یعنی جو چیز اپنے لئے پسند کرو وہی دوسروں کے لئے پسند کرو اور جس چیز کو اپنے لئے درست نہیں سمجھتے اس کو دوسروں کے لئے بھی درست نہ سمجھو۔ مسلمانی کی نصیحت یہی ہے۔

اور ایک دوسری نصیحت بھی ہے وہ یہ کہ اطاعت گذاروں کو بزرگ سمجھا جائے اور گنہگاروں پر شفقت کی جائے۔

شفقت: تمام لوگوں کے ساتھ مہربانی کا سلوک کرنا شفقت ہے۔ چاہے وہ عالم ہوں یا جاہل، اطاعت شعار ہوں یا گنہگار سب کے ساتھ مہربانی کی جائے۔

فرماں بردار اور اطاعت شعار پر شفقت ان کی طاعت و فرماں برداری کی تعظیم میں کی جائے۔ اور گنہگاروں پر اس لئے شفقت کی جائے کہ تمہاری شفقت و برکت کے سبب نیکی کی طرف واپس آجائے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ رحمت عالم رسول اکرم ﷺ نے احد کے روز اپنی قوم کے ظلم وستم کے مقابلہ میں یوں ارشاد فرمایا اَللّٰھُمَّ اھۡدِ قَوۡمِی فَاِنَّھُم لَا یَعۡلَمُوۡن (اے میرے اللہ! میری قوم کو ہدایت دیجئے، بیشک وہ نہیں جانتے)

بزرگوں نے فرمایا ہے کہ جو شخص صنعت میں صانع کو نہیں دیکھتا وہ شفقت سے خالی ہے۔ لوگوں کے درمیان دشمنی جو ہوتی ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ ہر چیز کو اور ہر شخص کو عیب کی نظر سے لوگ دیکھتے ہیں، ہنر کی اور خوبیوں کی نظر سے نہیں دیکھتے، اسی بنا پر دشمنی پیدا ہو جاتی ہے۔ ہاں! جو شخص صنعت میں صانع کو دیکھتا ہے وہ سب کے ساتھ شفقت سے پیش آتا ہے اور اس کو ہر چیز میں خوبیاں نظر آتی ہیں۔ کسی سے اگر تکلیف پہنچتی ہے تو وہ اس تکلیف کو اللہ تعالیٰ کے حکم اور تقدیر پر محمول کر کے تکلیف دینے والے کو معاف کر دیتا ہے (اور بدلہ لینے کا) مضبوط و مستحکم اختیار رہتے ہوئے بھی شفقت سے پیش آتا ہے۔ یہ بات اسی نظر سے پیدا ہوتی ہے جس نظر سے صنعت میں صانع کو دیکھتا ہے۔

احتمال: حق سبحانہ وتعالیٰ کے لئے لوگوں کی تکلیف وہ باتوں کو برداشت کرنا احتمال ہے حضرت خواجہ ابراہیم ادہم رحمۃ اللہ علیہ سے لوگوں نے پوچھا کبھی دنیا میں آپ کو خوشی بھی ملی ہے؟

فرمایا: ہاں! دو بار خوشی کے لمحات آئے ہیں۔

ایک تو اس وقت جب میں بیٹھا ہوا تھا ایک شخص آیا اور وہ میرے سر پر پیشاب کرنے لگا اور دوسری بار اس وقت جب ایک شخص آیا اور مجھے تھپڑ مارنے لگا۔

موافقت: شرعی اور جائز حدود میں رہتے ہوئے مسلمانوں کے کاموں میں مدد کرنا موافقت ہے۔

احسان: حد شرع میں رہتے ہوئے لوگوں کے ساتھ بھلائی سے پیش آنا احسان ہے۔

مدارات: شریعت کے مطابق لوگوں کے کاموں میں آسانی اور سہولت پیدا کرنا مدارات ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے مدارات کے سلسلہ میں روایت آتی ہے کہ آپ ﷺ نے کبھی بھی کسی کھانے کی برائی نہیں کی۔ اگر پسند آ گیا تو تناول فرمالیا اور پسند نہیں آیا تو چھوڑ دیا۔ اسی طرح کبھی

بھی کسی خادم کو کسی کام کے لئے نہیں ڈانٹا۔ چنانچہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ میں نے بارہ سال تک حضور ﷺ کی خدمت کی۔ لیکن آپ ﷺ نے کبھی بھی یہ نہیں فرمایا کہ یہ کام کیوں کر دیا یا یہ کام کیوں نہیں کیا۔ اگر کوئی کام پسند آ گیا تو دعائیں دیں اور ناپسند ہوا تو فرمایا **کان امر اللہ قدرا مقدورا (الاحزاب / ۳۸)** (اور اللہ کا حکم ایسا فیصلہ ہے جو طئے پا چکا ہوتا ہے)

ایثار: اپنی ضرورت و حاجت رہتے ہوئے کسی دوسرے کو وہ چیز دے کر اس کی ضرورت پوری کرنا ایثار ہے ایثار کی حقیقت یہ ہے کہ اپنے ساتھ رہنے والوں یعنی ساتھیوں کے حقوق کا خیال رکھا جائے۔ اپنا حصہ ان کو دے دیا جائے اور ان کو آرام و عافیت پہنچانے کے لئے خود تکلیف اٹھالے۔

خدمت: مسافر ہوں یا مقیم سب کے ذوق اور طبیعت کے مطابق خدمت کرنا خدمت ہے۔ یعنی لوگوں کی تسکین وطمانیت کا ایسا انتظام کرو کہ وہ سکونِ دل اور اطمینانِ قلب کے ساتھ اپنے اوراد وظائف اور معمولات میں لگے رہیں۔ یہاں تک کہ انہیں ریاضت ومجاہدہ سے جو ثواب اور نعمت حاصل ہو وہ تمہیں ان کی خدمت کے صلہ میں مل جائے **الدال علی الخیر کفاعله** (خیر کا راستہ دکھانے والا بھی خیر پر عمل کرنے والے کے جیسا ہوتا ہے)

خانقاہیں اور اوقاف کے قیام کا مقصد خدمت ہی ہے

الفت: حد شرع میں رہتے ہوئے ایک دوسرے کے ساتھ موافقت کرنا الفت ہے یہاں پر حد شرح کی بات اس لئے کہی گئی ہے نہ بت پرستوں کو اپنا دوست بناؤ اور ان کی موافقت میں کسی چیز کو اپنا بنالو۔ ہاں! جس طرح تمہارے رفقاء کرتے ہیں تم بھی کرو۔ ہر وہ کام جو مباح ہے اس کے کرنے اور نہ کرنے میں کوئی نقصان نہیں۔ جائز کاموں میں رفقاء کا ساتھ دینا اور رفاقت کا معاملہ کرنا کرم اور مروت ہے۔

بشاشت: ہر شخص کے ساتھ خوش دلی اور خندہ پیشانی سے ملنا، ترش روئی اور بدمزاجی نہیں دکھانا بشاشت ہے۔

کرم: ہر ایک کے ساتھ کوئی بڑا کام کرنا اور کج خلقی سے دور رہنا کرم ہے۔

کرم آدمی کے اندر ایک ایسی عادت وخصلت ہے کہ جب کوئی (بری چیز) کسی غیر سے پہنچتی ہے تو وہ اس پر اس طرح خوش ہوتا ہے جیسے کوئی اچھی چیز اسے مل گئی ہو۔

لفظ کرم ایک عام اسم ہے، ہر وہ کام جو دوسروں کی منفعت کے لے ہو اس کو کرم کہتے ہیں۔ ہاں! یہ اور بات ہے کہ یہی لفظ ''کرم'' الگ الگ صورتوں اور الگ الگ حالات میں مختلف ناموں سے موسوم ہوتا ہے۔ مثلاً..................................

اگر مال ودولت کے ذریعہ کرم کیا جائے تو اسے سخاوت کہتے ہیں۔

اگر لوگوں سے اچھی گفتگو کی جائے تو اسے زبان کے اعتبار سے لطف کہتے ہیں۔

اگر کسی کے وعدہ کو پورا کرتا ہے اور ایفائے عہد میں پختہ ہے تو اس کرم کو وفا کہتے ہیں۔

اگر دکھ اور مصیبت میں گھرے لوگوں کے ساتھ دردمندی کی جائے تو اس کرم کو شفقت کہتے ہیں۔

اس طرح کے کاموں پر جب نگاہ ڈالو گے تو کرم کی حقیقت روشن ہو جائے گی اور یہ واضح ہو جائے گا کہ ہر کام میں کرم ہی کرم ہے۔ اس طرح کہ معناً ہر ایک صفت انہیں مذکورہ صفتوں میں سے ہے۔ یعنی اگر کوئی شخص تمہارے ساتھ ان میں سے کسی ایک صفت کے ذریعہ پیش آتا ہے تو تمہارے دل کو خوشی حاصل ہوتی ہے۔ لہٰذا جب تمہاری طرف یا کسی دوسرے کی طرف سے کسی دوسرے کو ان میں سے کوئی فائدہ حاصل ہو اور تمہارا دل اس سلوک سے خوشی محسوس کرے تو یہ عمل کرم کے اصول اور ضابطہ کے مطابق ہوا۔

اور اسی کے برعکس اگر عمل ہوتا ہے تو اسے کنجوسی اور نالائقی کہیں گے اور ایسے شخص کو لئیم کہیں گے۔ لئیم کے معنی کنجوس ونالائق ہوتا ہے۔

فتوت: ہمیشہ دوسرے کے کاموں میں لگے رہنے کو فتوت کہتے ہیں۔ یعنی ہر وہ کام جس میں دوسروں کا فائدہ ہو اس کو انجام دینا فتوت ہے۔ جیسا کہ رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا لَا یزال اللہ فی حاجۃ العبد مادام العد فی حاجۃ اخیہ المسلم۔ (جو بندہ اپنے مسلم بھائی کی حاجت روائی میں لگا رہتا ہے اس کی حاجتوں کو اللہ تعالیٰ ضائع نہیں کرتا۔)

حضرت ابوعلی دقاق رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ فتوت ایک ایسی صفت ہے کہ یہ صفت کامل واکمل طور پر سوائے رسول اللہ ﷺ کے اور کسی میں نہیں پائی گئی۔ تمہیں معلوم ہے نا کہ کل قیامت کے دن سب لوگ نفسی نفسی کہیں گے اور ہمارے نبی امتی امتی فرمائیں گے۔

حضرت خواجہ جنید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا فتوت شام میں ہے، زبان کا لطف عراق میں اور صدق خراسان میں۔

بذل جاہ: اگر کسی کو کوئی حاجت اور مشکل درپیش ہو اور اس کا وہ کام تمہاری کوشش سے حل ہو جائے اس کوشش میں اگر تم اپنے عزت ووقار کو داؤ پر لگا دو تو اس کو بذل جاہ کہتے ہیں۔

نقل ہے کہ ایک شخص نے مونس بے کساں حضور نبی کریم ﷺ کو اپنی نادانی سے کسی کام کا حکم دے دیا اور آپ ﷺ نے بھی فوراً اس کا کام کر دیا پورا واقعہ اس طرح ہے کہ ایک روز رسول اللہ ﷺ اپنے صحابہ کے ساتھ تشریف فرماتھے کہ گلی سے ایک عورت آئی، آپ ﷺ کا دامن پکڑ کر اپنے ساتھ لے چلی۔ لیکن آپ ﷺ نے یہ نہیں پوچھا کہ کہاں لے جا رہی ہو؟ یہاں تک کہ وہ آپ ﷺ کو لے کر بازار پہنچی، آپ ﷺ کو وہاں کھڑا کر دیا، پھر اپنی آستین سے تھوڑا دھاگا نکالا، آپ ﷺ کے دست مبارک پر رکھ دیا اور عرض کیا اے اللہ کے رسول! میرے پاس کوئی آدمی نہیں ہے، آپ ہی تو بے کسوں کے ماں باپ ہیں، اس لئے اس دھاگے کو بیچ کر جو خرید دیجئے اور میری جھونپڑی تک پہنچا دیجئے۔ رسول اکرم ﷺ نے اپنے ہاتھ سے اس دھاگے کو فروخت کیا، جو خریدا اور اپنے کندھے پر رکھ کر لے چلے۔ صحابہ نے عرض کیا حضور! ہم لوگوں میں سے کسی کو دے دیجئے۔ ہم لوگ پہنچا دیں گے۔ حضور ﷺ نے فرمایا اس عورت نے اپنی حاجت مجھ سے پیش کی ہے۔ تم لوگوں سے نہیں کہی ہے اس لئے تم لوگ اپنے کام میں لگے رہو۔

مروت: جہاں تک ہو سکے ہر شخص کے ساتھ نیکی اور بھلائی کا سلوک کرنا مروت ہے۔ حضرت امام نصر آبادی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا مروت، فتوت کی ایک شاخ ہے۔ اور یہ دونوں جہان سے رخ موڑ لینا ہے اور دونوں جہاں کی خواہش کو عار وشرم سمجھنا ہے۔

تودہ: اللہ تعالیٰ کے لئے سب سے دوستی رکھنی تودہ ہے۔

جود: کسی کو کچھ دینے میں فرق نہ کرنا جود ہے۔ یعنی داد و دہش کے وقت مومن و کافر اور مستحق و غیر مستحق میں تفریق نہ کی جائے، اسی لئے بعض لوگوں نے کہا ہے الجود ترک التمئیز۔ جود تمیز کے ترک کا نام ہے۔ جو اپنے مال کا کچھ حصہ دوسروں کو دیتا ہے وہ صاحبِ سخا ہے۔ جو زیادہ حصہ دوسروں کو دے دیتا ہے اور تھوڑا اپنے لئے رکھ لیتا ہے وہ صاحبِ جود ہے۔ اور جو اپنی ضرورت رہتے ہوئے سب کا سب دوسروں کو دے دیتا ہے وہ صاحبِ ایثار ہے۔

تودت: اللہ تعالیٰ کے لئے مومن کو دوست رکھنا تودت ہے۔

عفو: گنہگاروں کے گناہ کو درگذر کرنا اور گناہ پر ان کی گرفت نہ کرنا عفو ہے۔

صفح: گنہگار کو معاف کر دینا اور ان کے ساتھ احسان کا سلوک کرنا صفح ہے۔

سخا: اپنے مال کا کچھ حصہ دوسروں کو دینا اور کچھ احصہ اپنے لئے محفوظ رکھنا سخا ہے۔

حیا: اللہ تعالیٰ سے شرم کرنا حیا ہے۔

ایک روز رسول اکرم ﷺ نے اپنے صحابہ سے فرمایا اللہ تعالیٰ سے شرم کرو جیسا کہ شرم کرنے کا حق ہے۔ صحابہ نے عرض کیا الحمدللہ! ہم لوگ اللہ تعالیٰ سے شرم کرتے ہیں۔

حضور ﷺ نے فرمایا شرم یہ نہیں ہے۔ جو اللہ تعالیٰ سے شرم رکھتا ہے اور پورے طور پر شرم کرنے کا حق ادا کرنا چاہتا ہے اس سے کہہ دیجئے کہ اپنے سر اور جو کچھ سر سے متعلق ہے اس کی حفاظت کرے۔ اور یہ بھی کہہ دیجئے کہ اپنے شکم (پیٹ) اور جو کچھ اس سے متعلق ہے اس کی حفاظت کرے اور اس کو موت کے لئے تیار رکھے۔ یہی معالات.................................۔

وَفا: اسی (رب تعالیٰ) کے ہو کر رہو جیسا کہ اس کے لئے ہونا چاہیئے۔ وفاداری اپنی ذات سے نہ ہو۔ یہی وَفا ہے۔

تلطف: لوگوں کے ساتھ سختی کے بجائے نرمی سے پیش آنا تلطف ہے۔ روایت ہے کہ حضرت امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ نے اپنے غلام کو آواز دی۔ اس نے جواب نہیں دیا۔ دوبارہ پکارا، پھر تیسری بار آواز دی مگر اس نے جواب نہیں دیا۔ حضرت اٹھے، اس کے پاس گئے۔ دیکھا

کہ وہ غلام لیٹا ہوا ہے۔ فرمایا تجھے بلا رہا ہوں۔ کیا تو نے نہیں سنا؟ اس نے عرض کیا جی! میں نے سنا تھا۔ فرمایا تجھے کس نے ورغلایا تھا کہ جواب نہیں دیا۔ اس نے عرض کیا مجھے آپ سے اطمینان ہے کہ خفگی نہیں ہوگی۔ اسی لئے اپنی کاہلی سے جواب نہیں دیا۔ امیر المؤمنین نے فرمایا جا! میں نے تجھے آزاد کیا۔

بشر: اندرونی طور پر افسردہ اور غمگین رہتے ہوئے بھی لوگوں کے سامنے ہنستا چہرہ رکھنا اور خندہ روئی سے پیش آنا بشر ہے۔

طلاقت: لوگوں کے ساتھ نرم گفتار رہنا طلاقت ہے۔ یعنی ایسے برے الفاظ کا استعمال نہ کیا جائے جن سے کسی کو تکلیف پہنچ جائے۔

سکینہ: اطمینان اور آرام وسکون کے ساتھ رہنا سکینہ ہے۔

وقار: کاموں میں آہستگی اختیار کرنا اور عجلت پسندی سے دور رہنا وقار ہے۔

دعاء: مسلمانوں کے لئے دعائے خیر کرنا دعاء ہے۔

ثنا: سب کو اچھا کہنا اور سب کی تعریف کرنا ثنا ہے۔

حسنِ ظن: سب کے حق میں اچھا گمان رکھنا حُسنِ ظن ہے۔

اور ایسا کرنا اس لئے ضروری ہے کہ دوسروں کے احوال تم پر افشا نہیں ہیں۔

تصغیر نفس: اپنے کو دوسروں سے چھوٹا سمجھنا تصغیر نفس ہے۔

توقیر اخوان: بھائیوں کو بڑا سمجھنا اور ان کا احترام کرنا توقیر اخوان ہے۔

تجلیل مشائخ: پیرانِ طریقت کو بزرگ سمجھنا اور واجبی طور پر ان کی عزت کرنا تجلیل مشائخ ہے۔

نقل ہے کہ حضرت خواجہ شفیق بلخی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت ابوتراب نخشبی رحمۃ اللہ علیہ ایک روز حضرت سلطان العارفین رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں مہمان بن کر آئے۔ کھانا پیش کیا گیا۔ ایک جوان کھڑا ہو کر خدمت انجام دے رہا ہے۔ دونوں بزرگوں نے اس جوان سے کہا آؤ۔ ہم لوگوں کے ساتھ تم بھی کھاؤ۔ اس جوان نے کہا میں روزہ دار ہوں۔ یہ سن کر حضرت خواجہ ابوتراب

نخشی نے فرمایا۔ آؤ، کھالو، میں تمہیں ایک مہینہ کے روزہ کا ثواب دیتا ہوں۔ مگر اس نے نہیں کھایا۔ پھر خواجہ شفیق نے فرمایا، کھالو، میں تمہیں ایک سال کے روزہ کا ثواب دیتا ہوں۔ پھر بھی وہ کھانے میں شریک نہیں ہوا۔ اس پر خواجہ سلطان العارفین رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اسے چھوڑ دیجئے۔ یہ اللہ کی حفاظت سے نکل چکا ہے۔

اس واقعہ سے ایک سال کے بعد وہ جوان چوری کے الزام میں گرفتار ہو گیا اور اسی جرم میں اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔

ترحم: ہر چھوٹے اور بڑے پر بخشش اور رحم کرنا ترحم ہے۔

استصغار مامنه وَ استعظام ما اليه: تمہاری طرف سے دوسروں کے لئے نوازش و کرم کا جو معاملہ ہوا سے کمتر و حقیر سمجھنا اور دوسروں کی طرف سے تمہارے حق میں حسنِ سلوک کا جو معاملہ ہوا سے اعلیٰ و ارفع و قابلِ قدر سمجھنا استصغار مامنه و استعظام ماالیه ہے۔

صوفیائے کرام کے یہ وہ اخلاق ہیں جنہیں حضرت شیخ نے اپنی کتاب میں تحریر فرمائے ہیں۔ یہی حضرات وہ ہیں جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کی اتباع و پیروی کی۔ حضور ﷺ کی سنت کو جاری و زندہ رکھنے کی وجہ سے لائق ستائش ہوئے۔ (خود کو اور دوسروں کو) حضور ﷺ کے اخلاق سے آراستہ کرنا انہیں بزرگوں کا کام ہے۔ اور یہ تمام اخلاق و صفات حمیدہ جن کا ذکر حضرت شیخ نے کیا ہے حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ سے لئے ہیں۔ سنتِ نبوی کو زندہ و جاری رکھنے میں مشائخ درجہ کمال پر ہوتے ہیں اور ان تمام صفاتِ پسندیدہ و اخلاقِ حمیدہ سے خود کو متصف رکھتے ہیں اور اسی رنگ میں خود کو رنگ لیتے ہیں، فالقریب بالقریب ۔ قربت کی دولت انہیں حضرات کے حصہ میں آتی ہے۔

واللہ الموفق لمن یشاء (اللہ جسے چاہتا ہے توفیق بخش دیتا ہے)۔

قوله: سئل سهيل بن عبدالله عن حسن الاخلاق فقال أدناه الاحتمال وترك المكافات والرحمة للظالم والدعاء له

(ارشاد شیخ ہے) سہیل بن عبداللہ سے پوچھا گیا حسنِ اخلاق کیا ہے؟ فرمایا ادنیٰ درجہ کا حسن خلق یہ ہے کہ صرف اللہ کے لئے مخلوق کا رنج سہے کسی سے بدلہ نہ لے، ظالم کے

ساتھ مہربانی سے پیش آئے اور اس کے لئے دعائے خیر کرے۔

شرح: یعنی جو رنج و تکلیف تمہیں مخلوق کی طرف سے پہنچے اسے معاف کر دیا کرو۔ اس ظالم سے بدلہ نہ لو، بلکہ اس کے حق میں دعائے خیر کرو۔

نقل ہے کہ حضرت خواجہ ابراہیم ادہم رحمۃ اللہ علیہ ایک روز باہر نکلے ہوئے تھے۔ ایک ترک سے ملاقات ہوگئی۔ اس نے دریافت کیا آبادی کی طرف جانے کا راستہ کدھر ہے۔ حضرت نے قبرستان کی طرف اشارہ کر دیا۔ اس ترک نے حضرت کے سر مبارک پر ایسا مارا کہ سر کھل گیا اور خون بہنے لگا۔ جب وہ ترک آگے بڑھا تو کسی نے اس سے کہا وہ شخص خراسان کے زاہد بزرگ حضرت خواجہ ابراہیم ادہم ہیں۔ یہ سن کر وہ ترک اپنی حرکت پر نادم و شرمسار ہوگیا۔ حضرت کی خدمت میں واپس آیا، معافی مانگنے لگا۔ حضرت نے فرمایا معذرت کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس لئے کہ جس وقت تو نے مجھے مارا میں نے اللہ تعالیٰ سے تیرے لئے بہشت کی درخواست کی، اس ترک نے پوچھا ایسا کیوں؟ حضرت نے فرمایا مجھے معلوم ہے کہ تمہارے مارنے اور زخمی کرنے میں میرے لئے اجر ہے۔ تو پھر یہ کیسے درست و جائز ہوگا کہ تمہاری وجہ سے اجر و ثواب ملے اور میری طرف سے تم کو برائی ملے۔

یہ تو حضرت نے ان تمام بلند اخلاق میں سے سب سے کمتر حسن خلق کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ اگر کوئی حقیقت کی نظر سے غور و فکر اور تامل شافی کرے تو یہ بات واضح اور روشن ہو جائے گی کہ صوفیا کے جو حسن اخلاق بیان ہوئے ہیں انہیں میں یہ حسنِ خلق بھی داخل ہے۔

ایک بزرگ سے منقول ہے انہوں نے فرمایا مَن لم یطق احتمال الاذی فعلیه ان ینزع ثوب العمالین۔

حضرت خواجہ حاتم اصم رحمۃ اللہ علیہ سے لوگوں نے پوچھا مردانِ خدا ہر ایک کے جور و ستم کو اللہ تعالیٰ کے لئے برداشت کرتے ہیں؟ فرمایا ہاں! برداشت کرتے ہیں۔ مگر اپنے نفس کے جور و ستم کو برداشت نہیں کرتے بلکہ اس کی تنبیہ کرتے ہیں۔

حضرت خواجہ معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ وضو کے ارادہ سے دجلہ کے کنارے تشریف

لائے۔ قرآن شریف اور اپنا کپڑا وہیں رکھ دیا اور وضو میں مشغول ہو گئے۔ اتنے میں ایک عورت آئی اور قرآن شریف اور کپڑا لے کر جانے لگی۔ حضرت نے دیکھ لیا اور فرمایا اے بہن! مَیں معروف ہوں۔ تجھے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ بتا تیرا کوئی بیٹا ہے جو قرآن پڑھتا ہو، اس نے کہا نہیں۔ پھر حضرت نے پوچھا تیرا شوہر ہے؟ کہا نہیں! حضرت خواجہ معروف کرخیؒ نے فرمایا اے بہن! قرآن مجھے دے دو اور کپڑا لے جاؤ۔

قوله: هٰذه اخلاق المتصوفين.

(ارشادِ شیخ ہے) یہ صفات جو ہم نے بیان کیے اہلِ تصوف کے اخلاق ہیں۔

شرح: صوفیائے کرام نے اپنے نفس کو مجاہدے، مشقتوں اور ریاضتوں میں لگانے کے بعد ہی ان تمام اخلاق حمیدہ اور اوصاف...۔

اسی کے برخلاف زاہدوں نے تمام اوصاف و اخلاق کو اختیار نہیں کیا بلکہ ان میں سے بعض ہی کو اختیار کیا۔ تمام اخلاقِ حسنہ کو اختیار کرنا عارفوں کا کام ہے۔ یہ عرفا معرفت کے اعتبار سے ترقی کرتے رہتے ہیں۔

لیکن آج تو یہ حال ہے کہ ہر شخص یہی دعویٰ کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور دنیا و آخرت کی معرفت اسی کو حاصل ہے۔ حالانکہ معرفت دل کی صفت ہے اور حس کی پہنچ دل کے صفات تک نہیں ہے۔ لہٰذا ہم حس کے ذریعہ یہ پتا نہیں لگا سکتے کہ کس کو معرفت حاصل ہے اور کون معرفت سے خالی ہے۔ معلوم ہونا چاہیئے کہ ہر چیز کی معرفت کے لئے علامت ہوتی ہے۔ جب وہ علامت اس شخص میں پائی جائے تو ہمیں یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ اس کو اس چیز کی معرفت حاصل ہے اور اگر علامت نہیں پائی جائے تو ہم سمجھ جاتے ہیں کہ اس چیز کی معرفت اسے حاصل نہیں۔ مثلاً اگر کوئی یہ کہے کہ میں لوہار ہوں یا درزی ہوں اور اس فن میں اس کی عملداری بھی ہے تو وہ اپنے قول میں سچا ہے اور اگر عملداری نہیں ہے تو وہ اپنے دعویٰ میں جھوٹا ہے۔

جب یہ بات معلوم ہو گئی تو اب یہ بھی جان لو کہ اہلِ معرفت جنہوں نے دنیا و آخرت اور اللہ رب العزت کی معرفت حاصل کر لی ہے ان کی علامت اور پہچان ترک ہے۔

جب کسی میں ترک کی صفت وعلامت پائی جائے گی تو یہ معلوم ہو جائے گا کہ اسے دنیا آخرت اور اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہے اور جس میں ترک کی صفت نہیں ہوتی تو ہم یہ سمجھ جاتے ہیں کہ اسے دنیا آخرت اور اللہ تعالیٰ کی معرفت نصیب نہیں۔

قولہ: **لاما قال له المدعون وارتكبه المتشبهون فانهم سمّوا الطمع ارادة وسوء الأدب اخلاصاً والخروج عن الحق شطحاً والتلذذ بالمذموم طِيبة واتباع الهوى ابتلاءً والرجوع الى الدنيا وصولاً وسوء الخلق صولة والبخل ذكاءً و بذاذة اللسان ملامةوما كان هذا طريق القوم.**

(ارشاد شیخ ہے) (صوفیوں کے اخلاق وہ ہیں جو اوپر گذرے) نہ وہ جس کو یہ دعویداران بیان کرتے ہیں یا صوفیوں کی مشابہت اختیار کرنے والے جس کا ارتکاب کرتے ہیں، یہ سچ اور درست ہے کہ ان دعویداروں اور صوفیوں کی شکل وصورت اختیار کرنے والوں نے طمع کو ارادت، بے ادبی کو اخلاص، راہِ حق سے نکل آنے کو شطح (شطح کا معنی انشاء اللہ نیچے بیان ہوگا) مذموم اور خلافِ شرع کاموں سے لذت حاصل کرنے کو پاکیزگی، نفس کی پیروی کو ابتلاء، دنیا کی طرف رجوع ہونے کو وصول، بداخلاقی کو صولت، زور اور طاقت بخل کا دانائی اور فحش کلامی کو ملامت کا نام دے رکھا ہے، حالانکہ جماعتِ صوفیاء کے لوگوں کا ہرگز یہ طریقہ نہیں۔

شرح: البذاذة الفحش يقال رجل بذيذ اللسان مردانِ باصفا میں بری خصلتیں اور بد زبانی نہیں ہوتی۔ یعنی اس جماعتِ صوفیا کے لوگوں کا ہرگز یہ طریقہ نہیں۔ جس کا دعویٰ یہ جاہلانِ قوم اور نقلی صوفیاء کرتے ہیں۔

جاہلوں کی ایک جماعت ایسی بھی ہے جو ان پاکباز صوفیا پر لعن طعن کرتے ہیں۔ خوب خوب زبان درازی سے کام لیتے ہیں اور ان کے بعض آداب وروش کا انکار بھی کرتے ہیں۔ حالانکہ صوفیائے باصفا کے طور طریقے پاک وصاف ہوتے ہیں، جھوٹے دعویداروں نے بدگمانی

کر رکھی ہے۔ وہ خود پاک ہیں اور ان کا مذہب بھی سچا ہے۔ کج روی تو مدعیوں کے اندر ہوتی ہے۔ وہ ان کے مذہب کو جانتے ہیں نہیں، اور جماعتِ صوفیا کے بزرگوں کی صحبت اٹھائی نہیں، خدمت کی سعادت حاصل کی نہیں۔ اور گمان یہ کر بیٹھے کہ ان کے مذہب کی کوئی اصل نہیں ہے۔ عیب تو مدعیوں میں ہوتا ہے۔ مذہب میں عیب نہیں ہوتا۔ اس کو یوں سمجھئے کہ اگر کسی تاجر میں خیانت پائی گئی تو خیانت کرنے والے کو برا کہا جائے گا نہ کہ اصل تجارت ہی کو برا کہیں گے۔ اسی طرح اگر میدانِ جنگ میں غلطی جنگ کرنے والے سے ہو جائے تو اس مجاہد کو برا کہیں گے نہ کہ اصل جہاد ہی کی برائی کی جائے گی۔ اور اگر کوئی بادشاہ ظلم کرتا ہے تو اس بادشاہ کی شکایت ہوگی نہ کہ اصل سلطانی ہی کو برا کہیں گے اور اگر کسی عالم میں حیلہ بہانہ دیکھیں تو اس حیلہ اور مکر کرنے والے عالم کی برائی کی جائے گی نہ کہ علمِ شریعت کی دھجی اڑائی جائے گی۔

شطح = وہ کلمہ ہے جو جماعت صوفیا کے بعض حضرات کی زبان سے نکلا ہے۔

لغت کے رو سے کھلے الفاظ میں بات کرنے کو شطح کہتے ہیں۔ یہاں بھی یہی مراد ہے۔ یعنی غلبۂ حال اور سکر کی حالت میں بے باک طور پر کھلے الفاظ وکلمات کا استعمال کرنا۔ جیسا کہ ایک بزرگ نے فرمایا مَن تحتَ خضراءِ السَّمآءِ مِثلِی کون ہے اس سبز گوں آسمان کے نیچے میرے جیسا اور ایک دوسرے بزرگ نے فرمایا قَدَمِی عَلیٰ رِقَابِ جَمِیعِ الْاَولِیاء یعنی میرا حال اور میرا کام تمام اولیاء کے حال اور کام سے برتر و اعلیٰ ہے۔

قوله: **حُکِیَ اَنَّ اَبَایَزِید البُسطَامِی رَحمَۃُ اللّٰه قَالَ لِبَعضِ اَصحَابِهٖ قُم بِنَا اِلیٰ هٰذَا الَّذِی قَدْ شَهَّرَ نَفسَهُ بِالزُّهدِ فَقَصَدَّهٗ فَوَجدَهٗ خَارِجًا مِنْ دَارِهٖ اِلَی الْمَسْجِدِ فَنظَرَ اَبُویَزِید اِلَیهِ وَقَدْ رَمِی نخَامَتِهٖ اِلیٰ جَانِبِ القِبلَةِ فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ هٰذا لَیسَ بِمَا مُونَ عَلیٰ اَدَبٍ مِنْ اٰدَابِ الشَّرِیعَةِ فَکَیفَ یَکُونَ مَأ مُونًا عَلَی ما یدعیهِ مِن مَقَامَاتِ الْاَولیاءِ فَرَجَعَ وَلَم یُسلِّم عَلَیه.**

(ارشادِ شیخ ہے) حکایت بیان کی گئی ہے کہ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے

اپنے رفقا میں سے کسی سے کہا اٹھو، چلو میرے ساتھ اس شخص کے پاس جس نے اپنے کو زہد کے ساتھ مشہور کر رکھا ہے۔ دونوں یعنی حضرت بایزید بسطامیؒ اور ان کے وہ رفیق اس شخص سے ملنے کے لئے چل پڑے۔ وہاں پہنچے، دیکھا کہ وہ شخص اپنی قیام گاہ سے نکل کر مسجد کی طرف جا رہا ہے۔ حضرت نے جب اس کی طرف نظر اٹھائی تو دیکھا کہ اس زاہد نے قبلہ کی طرف رخ کر کے ناک چھینکی۔ یہ دیکھ کر حضرت نے اپنے رفیق سے فرمایا یہ زاہد نہیں ہے۔ جب آداب شریعت میں۔ ایک (معمولی) ادب کا لحاظ نہیں رکھتا تو پھر وہ اولیاء کے مقامات کی کیا حفاظت کر سکتا ہے جس کا دعویٰ کرتا ہے۔ اس کے بعد حضرت بایزید واپس ہو گئے اور اس کو سلام بھی نہیں کیا۔

شرح: اولیاء اللہ تعالیٰ کے وہ مخصوص بندے ہیں جن کے آداب، ظاہری آداب سے کہیں زیادہ محترم و معزز ہوتے ہیں۔ جیسا کہ حضرت عبداللہ رازیؒ نے حضرت خواجہ حریریؒ سے روایت کی ہے انہوں نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے ساتھ مجھے جو ادب حاصل ہے اس کی بنا پر میں نے بیس سال سے خلوت میں بھی دھونے کے وقت پاؤں دراز نہیں کئے۔

اور حضرت خواجہ یحییٰ معاذ رازیؒ نے فرمایا جب کوئی عارف اپنے معروف کے ساتھ ادب نہیں برتتا تو وہ ہلاک ہونے والوں کے ساتھ یقیناً ہلاک ہو جاتا ہے۔

ادب کا ترک کرنا بے حرمتی ہے۔ جب بے حرمتی کرنے والا دنیاوی بادشاہوں کے لائق نہیں تو وہ اللہ کی صحبت اور اس کی ولایت کے قابل کیسے ہو سکتا ہے۔

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ظاہر جتنا زیادہ پاک اور باادب ہوگا باطن اتنا ہی زیادہ درست ہوگا۔ اگر ایسا ہوتا کہ ظاہری صحت و پاکیزگی کے بغیر باطن صحیح و پاکیزہ ہو جائے تو پھر رسول ﷺ اور شریعت نافذ کرنے کی ضرورت ہی کیوں پڑتی اور اس کا فائدہ ہی کیا تھا اور اگر رسول آتے بھی تو صرف باطنی صحت و پاکیزگی کا حکم دیتے، حالانکہ باطنی صحت کا عقیدہ مستحکم کرنے کے لئے توحید اور ظاہری شریعت کے قیام کی دعوت کو اس کا جوڑا بنا دیا۔ اسی لئے لوگوں کو ظاہری صحت و پاکیزگی کے ترک کی چھوٹ نہیں دی گئی۔ اور شریعت کی خلاف ورزی کرنے پر آخرت کی پکڑ کو

لازمی قرار دے دیا۔اس سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ باطن کی صحت و پاکیزگی کے لئے ظاہری صحت و پاکیزگی ضروری ہے اور ظاہری درستگی شریعت پر ثابت قدم رہنے ہی سے حاصل ہوگی۔ اس کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔اگر کسی کے ظاہری معاملات پاک ہیں اور وہ اپنے باطن میں کچھ چیزیں دیکھتا ہے یا پاتا ہے اور اسے یہ گمان ہوتا ہے کہ مجھے یہ کرامت حاصل ہوئی ہے تو وہ اپنے معاملات کو شریعت کی کسوٹی پر جانچ کر دیکھے۔اگر اس کے معاملات اللہ تعالیٰ کے ساتھ صحیح و درست ہیں اور شریعت نے جن باتوں کو واجب کیا ہے ان کی ادائیگی کر رہا ہے تو باطن میں نظر آنے والی چیزیں واقعی کرامت ہیں اور اگر شریعت کی کسوٹی پر خالص نہیں ہیں تو سمجھ لینا چاہیئے کہ کہیں نہ کہیں اپنا قصور ہے اور آداب شریعت سے غفلت ہو رہی ہے۔جسے کرامت سمجھ رکھا ہے وہ غرور و شیطانی مکر ہے، جس نے ظاہر کو خراب کر کے باطن کو خراب کرنے کا ارادہ کر لیا ہے کہ ظاہر کو خراب کر ہی دیا ہے اب باطن کو بھی تباہ و برباد کر دیں۔

چنانچہ جس شخص کو ہم ظاہری آداب برتنے میں اول درجہ پر دیکھتے ہیں اسی کو باطنی صفائی میں بھی آگے پاتے ہیں۔

کیا تم نے یہ نہیں دیکھا کہ پیغمبران علیہم السلام کا باطن تمام لوگوں کے باطن سے زیادہ پاکیزہ ہونے کے ساتھ ساتھ ان کا ظاہر بھی اسی قدر باادب ہے اور یہ سب سے زیادہ خردمند ہیں۔

صوفیا کی جماعت جب آداب شریعت میں سے کسی ایک ادب کو بھی ترک کرنا جائز نہیں سمجھتی تو واجب اور فرض کا ترک کیسے کر سکتی ہے۔

آداب شریعت کی رعایت سے متعلق مشائخ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی بہت ساری حکایتیں اور واقعات کتابوں میں موجود ہیں اور اکثر زبانوں پر مشہور ہیں۔

ایک بزرگ کا واقعہ سنئے!انہوں نے اللہ تعالیٰ سے عمر ابدی کی درخواست کی ہے۔وہ اللہ تعالیٰ سے حیاتِ جاوداں مانگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میں عمر ابدی یعنی ہمیشہ کی زندگی اس لئے چاہتا ہوں کہ سارے لوگ جب بہشت کی ناز و نعمت سے مستفید اور مستفیض ہونے میں لگے رہیں تو میں دنیا کی بلاؤں کو سہتا رہوں اور آداب شریعت کو قائم کرنے میں لگا رہوں۔

شریعت کی قدر تو یہی صوفیائے کرام جانتے ہیں اس لئے کہ ان حضرات نے جو کچھ پایا ہے وہ شریعت کی اتباع کے ذریعہ پایا ہے۔ ان کا جو مقصود و مطلوب ہے وہ سید المرسلین حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی اتباع میں موجود ہے۔ اور حضور ﷺ کی سنت کی موافقت پر موقوف ہے۔ انہوں نے فاتبعونی یحببکم اللہ کے حکم کو اپنی زندگی کا لائحہ عمل بنالیا ہے، اللہ رب العزت کی محبت کے ادراک کے بعد کوئی دوسرا مقام ہی نہیں۔ ہاں! اس کے ثمرات ہوتے ہیں جیسے شوق، انس، رضا وغیرہ۔ محبت سے پہلے بھی کوئی مقام نہیں۔ ہاں! محبت کے پیش خیمے ہیں جیسے توبہ اور زہد وغیرہ۔ یہ سب محبت پر موقوف ہیں اور محبت شریعت کی اتباع میں ہے، آدابِ شریعت میں سے اگر کوئی ایک ادب بھی ان سے چھوٹ جاتا تو انہیں نہ قرار ملتا نہ سکون ہوتا۔

حضرت خواجہ ابوسعید ابوالخیر رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے۔ انہوں نے فرمایا رسول اللہ ﷺ کی جو سنت بھی مجھ تک پہنچی ہے میں نے ان سب کو اپنا لیا۔ مگر ایک سنت پر عمل نہیں کرسکا وہ یہ کہ حضرت ﷺ نے خربوزہ تراش کر کھایا یا پھاڑ کر کھایا یہ مجھے معلوم نہ ہوسکا۔ اس لئے میں نے کھایا ہی نہیں۔

حضرت امام شبلی رحمۃ اللہ علیہ کی نقل ہے کہ سکراتِ موت کے وقت ایک شخص آپ کو وضو کرا رہے تھے، ریش مبارک میں خلال کرنا بھول گئے، آپ نے ان کا ہاتھ پکڑ کر خلال کروایا اور اس طرح سنت کی ادائیگی کی۔

فصل-۹

مقامات کے بیان میں

أما المقامات فإنهامقامُ العَبْدِ بینَ یَدَی اللّٰہِ تعالیٰ قالَ اللّٰہُ وَمَامِنَا اِلاّ لَہٗ مَقَامٌ مَّعلومٌ.

(ارشاد شیخ ہے) بندہ کا اللہ تعالیٰ کے آگے کھڑے ہونے کو مقامات کہتے ہیں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے اور فرشتے کہتے ہیں کہ ہم میں سے کوئی ایسا نہیں مگر اس کے لئے مقام متعین ہے۔

شرح: پس یہ سچ اور درست ہے کہ بندہ کا بارگاہِ خداوندی میں کھڑے ہونے کی جگہ کو مقام کہتے ہیں اور یہ مرتبہ کے اعتبار سے ہے، مقام سے مرتبہ مراد ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول سے ماخوذ ہے جس میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کی زبانی خبر دی گئی ہے کہ وَمَامِنَّا اِلاَّ لَہٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ (الصافات:۱۶۴) ہم فرشتوں میں کوئی ایسا نہیں جس کو اس کا مقام معلوم نہیں۔ یہاں مقام سے مرتبۂ معین مراد ہے۔

مقام العبد: یعنی موضع قیامه فی درجته۔ راہِ حق میں بندہ کے محل قیام کو مقام کہتے ہیں۔ بندہ اس مقام کے حق کو ادا کرتا رہے تا کہ اس مقام کے کمال کو حاصل کر لے جیسا کہ آدمی کے لئے تصور کیا گیا ہے۔

بزرگان دین نے اپنی کتابوں میں مقامات واحوال کو جو بیان کیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر کوئی صاحبِ مقام اور صاحبِ حال نہ ہو سکے تو کم از کم مقام اور حال کے علم سے آشنا تو

رہے۔ تاکہ اپنی جہالت اور نادانی کی وجہ سے حق کا انکار نہ کرے صحیح کو باطل نہ سمجھے ایمان کو کفر کا نام نہ دے۔ ہاں! اپنی عاجزی وکمتری کا اقرار کرتا رہے اور یہ سمجھتا رہے کہ ہم وہاں تک نہیں پہنچ سکے، حق کا انکار تو ضلالت وگمراہی ہے اس لئے اپنی عاجزی وکمتری کے احساس واعتراف کے ساتھ ان چیزوں کے حق ہونے کا اقرار ہوتا رہے۔

جب احوال ومقامات کے حق ہونے کا علم ہوگیا تو پھر اس مقام وحال کو حاصل کرنے کی کوشش اور نیت ہر وقت ہوتی رہے تاکہ اگر اس کی طلب میں موت آگئی تو پھر اس کا شمار رد کرنے والوں میں نہ ہو بلکہ یہ سمجھا جائے کہ یہ شخص اس کو پانے کے ارادہ میں لگا رہا اور اسی حالت میں اس کی موت ہوئی ہے۔

قولہ: اولها الانتباه وهو خروج العبد من حد الغفلة.

(ارشاد شیخ ہے) ان میں سے پہلا مقام "انتباہ" ہے اور یہ بندہ کا بیدار ہونا اور حد غفلت سے نکلنا ہے۔

شرح: یعنی جب بندہ خواب غفلت سے بیدار ہوگیا، حال کے متعلق اس نے جو کچھ سمجھا اس کو دیکھ لیا تو اس چکر اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے ملنے والے اجر نے دل میں وہ اثر پیدا کیا جس کے بارے میں کہا گیا ہے واعظ اللہ فی قلب کل امرء مسلم (ہر مسلمان شخص کے دل میں اللہ کا واعظ موجود ہے)

جب بندہ کے دل میں توبہ کا ادب ظاہر ہوتا ہے تو تمام اسباب توبہ کے ساتھ نیت اور ارادہ کی درستگی میں اللہ تعالیٰ کی مدد اس بندہ کے ساتھ ہوتی ہے۔

قولہ: ثم التَّوبَةُ وَهِيَ الرُّجُوعُ اِلَى اللهِ تَعالىٰ مِنْ بَعدِالذَّهَابِ مَعَ دَوامِ النَّدامَةِ وَكَثرَةِ الاِستِغفارِ ثُمَّ الاِنابَةُ وَهِيَ الرُّجُوعُ مِنَ الْغَفْلَةِ اِلَى الذِّكرِ وَقِيلَ التَّوبَةُ رَهبَةٌ والاِنابَةُ رَغْبَةٌ وَقِيلَ التَّوبَةُ فِي الظَّاهِرِ وَالاِنابَت فِي الباطِنِ.

(ارشاد شیخ ہے) پھر توبہ ہے اور یہ گناہ کے بعد ہمیشہ کی ندامت اور استغفار کی کثرت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہونا ہے، بعض لوگوں نے کہا

ہے توبہ خوف ہے اور انابت رغبت ہے، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ توبہ ظاہر میں ہے اور انابت باطن میں ہوتی ہے۔

شرح: اس کے بعد مقام ''توبہ'' ہے۔ طاعت سے معصیت کی طرف جانے کے بعد ہمیشہ کی شرمندگی اور کثرت استغفار کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرماں برداری کی طرف رجوع ہونے کا نام توبہ ہے۔

یہ بھی معلوم رہے کہ توبہ سالک کی پہلی منزل اور طالب کا پہلا مقام ہے۔ حدیث میں آیا ہے اَلنَّدَمُ تَوبَۃٌ (ابن ماجہ/الزھد) ندامت توبہ ہے اہل سنت کے ارباب اصول کا کہنا ہے کہ تین چیزیں توبہ کے لئے شرط ہیں۔

۱. ماضی میں جو نافرمانی ہو چکی اس پر شرمندگی۔

۲. جو وقت گذر رہا ہے اس میں گناہوں کا ترک۔

۳. مستقبل میں گناہوں سے باز رہنے کا ارادہ۔

ان تینوں ارکان کی ادائیگی ہونے پر ہی توبہ صحیح اور درست ہوگا۔ ''ندامت'' توبہ کا ایک بڑا رکن ہے۔ اسی کی صراحت ووضاحت کے لئے حدیث میں ''الندم توبة'' آیا ہے۔ یہ اسی طرح ہے جیسے ''الحج عرفة'' ہے۔ یعنی حج کا ایک معظم رکن عرفہ ہے، اسی طرح توبہ کا ایک عظیم رکن ندامت ہے۔

محققین کہتے ہیں کہ صرف ندامت ہی کافی ہے اس لئے کہ توبہ کے باقی دونوں ارکان کے بغیر ندامت نہیں ہو سکتی۔ یعنی اگر ندامت ہوگی تو پھر ماضی پر پشیمانی اور مستقبل میں اس کام کے ترک پر اصرار ہوگا۔

اور یہ جو کہا گیا ثم الانابة وھی الرجوع من الغفلة الی الذکر (الیٰ آخرہ) اس کے بعد مقام ''انابة'' ہے اور یہ غفلت سے ذکر کی طرف لوٹنا ہے۔

بعض لوگوں نے کہا ہے کہ توبہ خوف ہے اور انابت رغبت۔ یعنی عذاب اور دوزخ کی سزاؤں کا خوف اور بہشت کی نعمت وراحت کی امید۔

بعض لوگوں نے کہا ہے کہ توبہ ظاہر میں اور انابت باطن میں ہوتی ہے۔ یعنی توبہ ظاہری اعمال میں ہوتا ہے اور یہ معصیت سے طاعت کی طرف، نافرمانی سے فرماں برداری کی طرف آنا ہے۔ اور انابت باطن میں ہوتی ہے اور یہ بندہ اور خدا کے درمیان کا معاملہ ہے۔

حضرت خواجہ ابوعلی دقاق رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے انہوں نے فرمایا: توبہ کی تین قسمیں ہیں۔

سب سے پہلے توبہ ہے، پھر انابت اور آخر میں اویت ہے۔ توبہ کو شروع میں رکھنا، انابت کو درمیان میں اور اویت کو آخر میں۔ جو عذاب اور گرفت کے خوف سے توبہ کرتا ہے وہ صاحب توبہ ہے۔ جو ثواب کی لالچ میں توبہ کرتا ہے وہ صاحب انابت ہے۔

جو اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری کو ملحوظ رکھتے ہوئے توبہ کرتا ہے یعنی وہ ثواب کی لالچ اور عذاب کے خوف سے توبہ نہیں کرتا وہ صاحب اویت ہے۔

بعض لوگوں نے کہا ہے توبہ مومنوں کی صفت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تُوبُوا اِلَی اللّٰہِ جَمِیعاً اَیُّھَا الْمُؤ مِنُونَ (النور:۳۱) (رجوع کرو۔ اللہ کی طرف سب کے سب، اے ایمان والو)

انابت اولیا اور مقربین بارگاہ کی صفت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَجَاءَ بِقَلْبٍ منیب (ق:۳۳) (اور ایسا دل لئے ہوئے آیا جو یاد الٰہی کی طرف متوجہ تھا)

اور اویت انبیاء اور رسولوں کی صفت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا نِعمَ العَبْدُ اِنَّهٗ اَوَّابٌ (ص:۳۰) (بڑی خوبیوں والا بندہ، بہت رجوع کرنے والا)

قولہ: ثم الورع وھو ترک ما أشتبہ علیہ

(ارشاد شیخ ہے) اس کے بعد "ورع" ہے اور وہ مشتبہ چیزوں کے چھوڑنے کا نام ہے۔

شرح: اس کے بعد مقام "ورع" ہے اور یہ ان چیزوں کو چھوڑ دینا ہے جن میں یہ شبہ ہو کہ یہ حلال ہیں کہ حرام۔

اس کی دو قسمیں ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ مقام ورع کی طلب کرنے والا صاحب دل ہے یا صاحب دل نہیں ہے۔

اگر صاحب دل ہے تو اسے چاہئے کہ فتویٰ اپنے دل سے لے۔ مفتیوں کے فتویٰ پر عمل کرنا اس کے لئے جائز نہیں۔

بصورتِ دیگر اگر وہ صاحب دل نہیں ہے تو مفتیوں کے فتوی پر عمل کرے اس کے لئے ورع یہی ہے۔

قوله: ثم محاسبة النفس وهي تفقد زيادة من نقصانها ومالها وما عليها.

(ارشاد شیخ ہے) اس کے بعد نفس کا محاسبہ ہے اور وہ نفس کی کمی وزیادتی کو تلاش کرنا ہے یعنی اس بات کی جستجو میں رہنا ہے کہ اسے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے۔

شرح: کہتے ہیں کہ اس وقت تک توبہ پر استقامت نہیں ہو سکتی جب تک توبہ کرنے والا اپنے نفس کا محاسبہ نہ کرتا رہے۔ نفس کا یہی محاسبہ اس کو وہاں تک پہنچادے گا جہاں پہنچ کر اسے جو کرنا چاہئے وہ رہ جائے گا اور جن سے بچنا چاہئے تھا وہ پورے طور پر دور ہو جائے گا۔ یعنی ساری کمی دور ہو جائے گی اور ساری زیادتی (خوبیاں) رہ جائیں گی۔ پھر تو بندہ اپنے کمال کو حاصل کرلے گا اور یہ محض اللہ تعالیٰ کے فضل پر منحصر ہے وہ جسے چاہے نواز دے **ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَاءُ** (الحدید:۲۱)

قوله: ثُمَّ الارَادة وَهِيَ اسْتِدَامَةُ الكَدِّ وَتَرکُ الرَّاحَةِ.

(ارشاد شیخ ہے) پھر "ارادت" ہے۔ ہمیشہ کی سختی ومشقت کو برداشت کرنے اور راحت وآسائش کو ترک کرنے کا نام "ارادت" ہے۔

شرح: اسی لئے کہتے ہیں کہ مرید کے لئے آسانی اور سہولت کا مہیا ہونا زہر قاتل ہے۔ چوں کہ اس میں طرح طرح سے راحت کی طلب ہوتی ہے۔

ایک بزرگ کا قول ہے کہ اگر دیکھئے کہ مرید آرام وآسائش یا کمائی کی طرف مشغول ہے تو سمجھ لیجئے کہ اس سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ کسب وکمائی سے ممانعت اس مرید کے لئے ہے جس نے اپنے اوقات کو دن رات میں تقسیم کر رکھا ہے یعنی اگر وہ حق میں مستغرق ہوتا ہے تو پھر اس کے

پاس اتنا وقت نہیں کہ کسب میں مشغول ہو۔ اور کسب میں مشغول ہوتا ہے تو مشغولی حق میں خلل پڑتا ہے۔ لہٰذا ایسی صورت میں اس کے لئے کسب واجب ہے۔

قوله: ثُمَّ الزُّهد وَهُوَ ترکُ الحَلال مِنَ الدنیا وَ العُروف عَنها وَ عَن شَهُو تها۔

(ارشادِ شیخ ہے) اس کے بعد ''زہد'' ہے۔ زہد دنیا کی حلال چیزوں کا ترک کرنا ہے۔ دنیا اور دنیا کی شہوتوں سے روگردانی کرنا ہے۔

شرح: دنیا سے روگردانی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بندہ دنیا سے نکل جائے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ دنیا سے لذت وراحت حاصل نہ کرے۔ دنیا سے اپنی مرادوں کو پوری نہ کرے اس لئے کہ جو کسی چیز کا طالب ہوتا ہے وہ اس سے دور ہوتے ہوئے بھی اسی کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور جس کو کسی چیز کی طلب نہیں ہوتی وہ اس چیز کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی اس سے دور رہتا ہے۔

دنیا اس کے دل میں اس طرح ہو کہ سونا چاندی اور اینٹ پتھر دونوں اس کی نظر میں برابر ہوں۔ جیسا کہ حضرت حارثہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں مشہور و منقول ہے، اور اس کی وضاحت پہلے ہو چکی ہے۔

قوله: ثُم الفَقر وَهُوَ عَدمُ الاَمِلاک و تخلیة القَلبُ مِمَّا خَلَت عَنه الیَد،

(ارشادِ شیخ ہے) اس کے بعد ''فقر'' ہے اور وہ کسی چیز کا مالک نہ ہونا ہے۔ دل کا ہر اس چیز سے خالی ہونا ہے جس سے ہاتھ خالی ہو۔

شرح: اگر کسی شخص کا ہاتھ املاک سے خالی ہے لیکن دل اس چیز کی طلب سے خالی نہیں ہے تو اس شخص کو مقامِ فقر حاصل نہیں۔ اس لئے کہ ہر چیز کی طلب اپنے مطلوب کے ساتھ ہوتی ہے۔ اگر طلب ہے تو گویا مطلوب بھی طالب کے ساتھ ہے۔

حضرت امام شبلی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے فقر کی حقیقت دریافت کی۔ فرمایا فقر کی حقیقت یہ ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی سے غنا (منفعت) نہ ہو۔

قوله: ثم الصدق وهو استواء السرو العلانية.

(ارشادِ شیخ ہے) پھر ''صدق'' ہے اور یہ ظاہر و باطن، عیاں و نہاں کی

یکسانیت کا نام ہے۔

شرح: صدق وہ مقام ہے جس میں ظاہر و باطن یکساں ہوتا ہے۔

لوگوں نے کہا اَلصِّدْقُ عِمَادُ الْاَمر وَبِهٖ تَمامُهُ وَ فِيهِ نِظَامُهُ وَهُوَ ثانی دَرَجَةُ النُّبُوَّة (سچائی تمام معاملہ کی بنیاد ہے اور اسی سے معاملہ کی تکمیل و تنظیم ہوتی ہے اور نبوت کے درجہ ومقام کا دوسرا نام ہے)

قوله: ثُمَّ التَّصبر وَهُوَ حمل النفس على المكاره وتجرع المرارات وهو آخر مقامات المريدين .

(ارشاد شیخ ہے) پھر صبر کرنا ہے اور وہ نفس کو مکروہات (ناپسندیدہ باتوں) پر رکھنا اور تلخ گھونٹ پینا ہے۔ یہ مرید کا آخری مقام ہے۔

شرح: تصبر کا معنی بتایا گیا ہے **التصبر وهو السكون مع البلاء مع وجدان اثقال المحنة** (صبر آزمائش کی حالت میں اس کی مشقتوں کو برداشت کرتے ہوئے سکون واستقلال کی وہ کیفیت ہے جو صبر کرنے والا اختیار کرتا رہے)

قوله: ثُمَّ الصَّبرُ وَهُوَ ترك الشِكوىٰ

(ارشاد شیخ ہے) ''صبر'' شکوہ کے ترک کا نام ہے۔

شرح: اس کے بعد مقامِ صبر ہے اور یہ مخلوق سے شکایت کا ترک کرنا ہے ہاں اگر یہ لفظ بندہ کی طرف سے خدا کے لئے ہو تو اس کو شکایت نہیں کہیں گے۔ بلکہ یہ تو اپنی بے چارگی اور عاجزی کا اظہار ہے اور یہ شرع میں محمود ہے۔

قوله: ثُمَّ الرِضَاء وَهُوَ الِالتِذَاذ بِالْبَلْوىٰ

(ارشاد شیخ ہے) پھر ''رضا'' ہے اور یہ بلاؤں سے لذت حاصل کرنا ہے۔

شرح: اگر کوئی قضائے الٰہی پر راضی نہیں ہوتا تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے جو مقدر میں لکھ دیا گیا ہے وہ تو ہو کر رہنا ہے۔ لہٰذا اضطراب اور بے چین ہونے میں گناہ کے سوا اور کچھ نہیں۔ جو اللہ تعالیٰ کے حکم پر راضی ہوتا ہے وہ حق سبحانہ وتعالیٰ کے نظارہ میں گم ہوتا ہے بلکہ اس

کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور جو اپنے نظارہ میں کھویا رہتا ہے وہ اپنے ساتھ ہوتا ہے۔ چنانچہ جب بندہ اپنے ساتھ ہوتا ہے تو پھر بلاؤں کو برداشت کرنے کی طاقت اس میں ذرہ برابر نہیں ہوتی اور جب بندہ حق سبحانہ وتعالیٰ کے ساتھ ہوتا ہے تو پھر دونوں جہان کی بلاؤں کو برداشت کر لیتا ہے اور اسے کچھ خوف نہیں ہوتا۔

رِضاء سے متعلق بزرگوں کے بہت سارے اقوال ہیں۔ لیکن جتنا بھر جانا ضروری ہے اور اس کے بغیر چارہ نہیں وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو مقدر میں لکھ دیا ہے اس پر جو اعتراض نہیں کرتا وہی راضی برضاء ہے۔

حضرت خواجہ عثمان رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے۔ انہوں نے فرمایا چالیس برسوں سے میرا یہ حال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ایسے کاموں میں لگا رکھا ہے جن کو میں پسند نہیں کرتا تھا۔

بندہ پر یہ واجب ہے کہ وہ قضائے الٰہی سے راضی رہے جہاں جہاں راضی رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس لئے کہ یہ درست نہیں کہ بندہ قضائے الٰہی کی تمام چیزوں سے راضی وخوش رہے۔ جیسے گناہ اور مسلمانوں کی طرح طرح کی تکلیفیں ومشقتیں وغیرہ۔

قولہ: ثُمَّ الاِخْلَاصُ وَهُوَ اِخْرَاجُ الْخلق مِنْ مَعَامَلَةِ الْحَق

(ارشاد شیخ ہے) پھر اخلاص ہے اور وہ خلق کو حق کے معاملہ سے نکالنا ہے۔

شرح: مقام ''اخلاص'' یہ ہے کہ خلق کو ان معاملات سے باہر نکال لیا جائے جو حق کے لئے ہیں یعنی خلق کے اعتبار وجہت سے بندہ کا اپنا کوئی مقصد اور اپنی کوئی غرض نہ ہو۔ ہاں! صرف ایک ہی غرض ہو یعنی اللہ کی قربت۔

حضرت خواجہ عثمان رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا خالق پر ہمیشہ ہمیشہ کی نظر رکھتے ہوئے مخلوق کو فراموش کر دینا اخلاص ہے۔

حضرت خواجہ ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اخلاص کے صحیح ہونے کی تین علامتیں ہیں۔

۱۔ لوگوں کی طرف سے تعریف ہو یا تذلیل دونوں کو برابر سمجھنا۔

۲. اپنے کاموں کے وقت اعمال پر سے نگاہ کا اٹھالینا۔

۳. ثواب کی لالچ نہیں رکھنا۔

اہل خراسان کے فقرامیں سے ایک فقیر کا واقعہ ہے کہ وہ حضرت ابوبکر قحطبی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آئے اور پوچھا آپ کے شیخ نے آپ کو کیا حکم دیا ہے؟ انہوں نے فرمایا میرے شیخ کا حکم ہے کہ اطاعت وفرماں برداری میں خوب لگے رہو۔ اور کثرتِ عبادت کے باوجود یہی سمجھو کہ مجھ سے بہت کمی ہو رہی ہے۔ یہ سن کر انہوں نے کہا۔ واہ یہ بھی خوب رہی۔ آپ کے شیخ نے آپ کو یہ کیوں نہیں کہا کہ اس میں گم ہو جاؤ جس نے تم کو طاعت وعبادت میں لگا رکھا ہے۔

یہی بزرگ فرماتے مومن کو توحید چاہئے اور توحید ایک دیکھنا ہے مومن کو اخلاص چاہئے اور اخلاص یگانہ ہو جانا ہے۔

اگر چاہتے ہو کہ موحد مخلص ہو جائیں تو اپنے کو اور اپنی طاعت کو نہ دیکھو بلکہ اس کو حق سبحانہ وتعالیٰ کی عنایت سمجھو۔ جس نے تم پر احسان کیا کہ ازل ہی میں تمہارے حصہ میں یہ لکھ دیا۔ اور جب عالمِ وجود میں آئے تو اس کا اہل بنا دیا اور اس کی توفیق عطا فرمادی جب اس کے احسان کے نظارہ میں لگ گئے تو مخلص ہو گئے۔

تیسری بات یہ کہ آخرت میں عمل کے ثواب کی طلب ہو۔ ثواب کے طلب کی خواہش زاہدوں کا اخلاص ہے۔

قوله: ثُمَّ التَّوَكُّلُ عَلَى اللّٰهِ تَعَالَىٰ وَهُوَ الاعتماد عليه بَازالة الطَّمعِ عَمَّنْ سَوَاهُ.

(ارشادِ شیخ ہے) پھر اللہ تعالیٰ پر "توکل" ہے اور اس پر اعتماد کرنا ہے اور ماسوا سے لالچ کو دور کرنا ہے۔

شرح: پھر توکل علی اللہ کا مقام ہے۔ اور یہ اس پر یعنی اس کے وعدوں پر اعتماد کرنا ہے اور اس کے ماسوا سے ہر طرح کے طمع کو دور کر دینا ہے۔ توکل کی تین علامتیں ہیں۔

۱. کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہ کرے۔

۲. اگر بغیر مانگے کوئی دیدے تو رد نہ کرے۔

۳.   اگر کہیں سے کچھ آجائے تو اس کو جمع نہ کرے۔

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ اگر کوئی ایک درم بھی حرام لیتا ہے، تو وہ متوکل نہیں ہے۔ اور دوسرے بزرگوں نے بھی فرمایا ہے: **الطمع ام الخبائث** (لالچ تمام برائیوں کی جڑ ہے)

❁❁

فصل-۱۰

احوال کے بیان میں

قولہ: **وَاَمَّا الْاَحْوَالُ فَاِنَّهَا مَعَامَلَاتُ الْقَلْبِ وَھِیَ مَا تَحُلُّ بِهَا مِنْ صَفَاءِ الْاَذْكَارِ.**

(ارشاد شیخ ہے) احوال قلب کے معاملات میں سے ہے اور یہ اذکار کی صفائی سے قلب پر طاری ہوتا ہے۔

شرح: یہ سچ اور درست ہے کہ احوال دل کے معاملات ہیں جو ذکر کی صفائی سے دل پر نازل ہوتے ہیں۔ یعنی احوال کا تعلق دل سے ہے جوارح سے نہیں ہے۔ اور یہ وہ معانی ہیں جو اذکار کی صفائی کے بعد عالمِ غیب سے دل پر ظاہر ہوتے ہیں۔ احوال سراسر بخششیں ہیں اور مقامات کسبی ہوتے ہیں۔ احوال کا حصول عین بخشش ہے اور مقامات کا حصول کسب و کوشش کے ذریعہ بخشش کا ہونا ہے، بعض لوگوں نے کہا ہے کہ حال اس معنی کو کہتے ہیں جو حق کی جانب سے دل پر طاری ہو اور جس کو اپنی طرف سے دور نہ کر سکیں۔ اور جب غائب ہو جائے اور لانا چاہیں تو بمشکل لا سکیں۔ لہٰذا مقام سے مراد طالب کی وہ راہ اور وہ قدم گاہ ہے جو راہِ حق میں اس کے سلوک کے مطابق ہو۔ اور حال سے مراد اللہ تعالیٰ کا وہ فضل اور وہ لطف و کرم ہے جو بندہ کے دل پر بغیر مجاہدہ کے حاصل ہو، چنانچہ مقام سراسر اعمال ہے اور حال سراسر افضال۔ احوال و مقامات کے درمیان یہی فرق ہے۔

قولہ: قال الجُنید الحال نَازِلَۃٌ تَنْزِلُ بِالْقَلْبِ وَلَا تَدُومُ۔

(ارشادِ شیخ ہے) حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا حال وہ کیفیت ہے جو دل پر بنتی ہے اور ہمیشہ نہیں رہتی۔

حضرت خواجہ جنید رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب یہ ہے کہ حال نوازلات میں سے ہے جو دل پر نازل ہوتا ہے۔ اور وہ ہمیشہ نہیں رہتا۔ اگر اس کو بقا حاصل ہو تو اس کو حال نہیں بلکہ "حدیث نفس" کہیں گے اسی لئے کہتے ہیں کہ **الاحوال کا سمھا** (احوال اپنے ناموں کی طرح ہیں)

یعنی جس طرح وہ دل میں حلول کرتا ہے اسی طرح وقت کے اعتبار سے وہ دور بھی ہو جاتا ہے، زیادہ تر مشائخ کا یہی خیال ہے لیکن بعض مشائخ کے نزدیک احوال کو بقا و دوام حاصل ہے، وہ کہتے ہیں کہ اگر اس کو ہمیشگی اور بقا حاصل نہ ہو تو وہ احوال نہیں بلکہ لوائح ہے۔ اور ابھی اس کا حامل احوال تک نہیں پہنچا ہے۔ ہاں! جب ان صفات کو دوام حاصل ہو گیا تو اس کو حال کہیں گے۔

حاصل کلام یہ کہ حضرت خواجہ جنید رحمۃ اللہ علیہ نے حال کو برق یعنی بجلی سے مثال دی ہے جو آتی ہے چمکتی ہے اور پھر چلی جاتی ہے۔ بہت سارے مشائخ کا یہی کہنا ہے۔

حضرت حارث محاسبی رحمۃ اللہ علیہ نے حال کے لئے دوام کو جائز قرار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ محبت، شوق، قبض، بسط یہ سب احوال ہی تو ہیں۔ اگر ان کو دوام حاصل نہ ہو تو پھر نہ محبت ہوگی نہ کوئی مشتاق، مشتاق رہے گا۔ اور جب تک حال بندہ کی صفت نہ ہو جائے تو اس نام کا اطلاق اس پر کیسے ہوگا۔

قولہ: فَمِنْ ذٰلِکَ الْمُرَاقِبَۃُ وَھِیَ النَّظْرُ بِصَفَاءِ الْیَقِیْنِ اِلَی الْمُغَیَّبَاتِ۔

(ارشادِ شیخ ہے) احوال کی ایک قسم "مراقبہ" ہے اور وہ یقین کی صفائی سے غیب کی چیزوں کا نظر آنا ہے۔

شرح: احوال میں سے ایک حال مراقبہ ہے اور یہ یقین کی صفائی کے ذریعہ ان چیزوں کو دیکھنا ہے جو نظروں سے اوجھل اور غائب ہیں۔ اس حدیث شریف میں اسی کی طرف

اشارہ کیا گیا ہے۔ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ (صحیح بخاری جلد اول کتاب الایمان۔ صحیح مسلم جلد اول کتاب الایمان) (اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو، اگر ایسا نہیں تو یقین رکھو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے)

اور مراقبہ یہ ہے کہ بندہ اچھی طرح جان لے کہ اللہ تعالیٰ حاضر و ناظر ہے اور تمام اسرار ورموز سے واقف وباخبر ہے۔ یہ معنی تمام خیر کی اصل ہے۔ اس مرتبہ پر اس وقت تک کوئی نہیں پہنچ سکتا جب تک محاسبہ سے فراغت نہ ہو جائے۔ اور دوسری بات یہ کہ بندہ کو یہ علم رہے کہ اللہ تعالیٰ میرا رقیب (نگہبان) ہے۔ میرے دل سے زیادہ مجھ سے قریب ہے اور میرے احوال سے باخبر ہے، میرے افعال کو دیکھ رہا ہے اور میرے اقوال کو سن رہا ہے۔ جو ان باتون سے غافل ہے وہ ابتدائے وصل سے دور ہے پھر قرب کے حقائق سے کیسے قریب ہو سکتا ہے۔

قولہ: ثُمَّ الْقُرْبُ وَھُوَ جَمْعُ الْھِمَمِ بَیْنَ یَدَیِ اللّٰہِ تَعَالٰی بِالْغَیْبَۃِ عَمَّا سِوَاہُ۔

(ارشادِ شیخ ہے) احوال کی ایک قسم "قرب" ہے۔ حق کے سوا جو کچھ ہے اس سے غائب ہوتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے سامنے ہمت کو جمع کرنے کا نام "قرب" ہے۔

تشریح: یعنی اس کے تمام اندیشے ایک ہمت ہو جائیں۔ اور وہ ہمت حق ہے اور پھر ایک دن حالتِ قرب میں ساری ہمتیں جمع ہو جائیں۔ اس لئے کہ ھمم کے منتشر ہونے سے ہموم پیدا ہوتے ہیں اور ہموم بندہ کو حق سبحانہ وتعالیٰ کی بارگاہ سے روک دیتے ہیں۔

بین ید اللہ– یعنی فی طاعۃ اللہ واشتغالہ بہ بالغیبۃ عماسواہ۔

اس غیبت سے وہ غائب ہونا مراد نہیں ہے جو بول چال میں استعمال ہے بلکہ یہاں سر کی غیبت مراد ہے۔ جب کوئی معنی باطن پر غالب آتا ہے تو ظاہر میں حکم اسی معنی کا چلتا ہے۔ لہٰذا بندہ کو چاہئے کہ وہ ظاہر میں لوگوں کے درمیان ہو اور اس کا سر لوگوں سے غائب ہو۔ شریعت میں بندہ اور خدا کے درمیان جو قرب وبعد آیا ہے وہ نہ بعد مسافت ہے اور نہ قرب ملازمت۔ بندہ کا اللہ تعالیٰ سے قریب ہونا اس کی طاعت پر منحصر ہے۔ یعنی جو بندہ اللہ کا جتنا مطیع وفرماں بردار ہے

وہ اتنا ہی اللہ تعالیٰ سے نزدیک ہے اور جو جتنا خاطی و گنہگار ہے وہ اتنا ہی دور ہے۔

قولہ: ثُمَّ الْمَحَبَّةُ وَهِيَ مَوَافَقَةُ الْمَحبُوبِ فِي مَحْبُوبِهٖ وَمَكْرُوهِهٖ

(ارشادِ شیخ ہے) پھر ''محبت'' ہے اور وہ محبوب کی پسندیدہ و ناپسندیدہ چیزوں میں محبوب کی موافقت کا نام ہے۔

شرح: احوال میں سے ایک حال ''محبت'' بھی ہے۔ یعنی محب اپنے محبوب کے محبوب کو دوست رکھتا ہے اور محبوب کے دشمن کو دشمن۔

بعض جگہ محبت کی اس تعریف کو محبت کا ادنیٰ درجہ لکھا ہے۔

دیکھنا چاہئے کہ موافقت کس کے ساتھ ہے اور مخالفت کس سے ہے۔ اگر حق کے ساتھ موافقت ہے اور نفس سے مخالفت تو ایسا شخص محب حق ہے۔ اور اسی کے برعکس اگر نفس کے ساتھ موافقت ہے اور حق سے مخالفت تو وہ نفس کا دوست ہے۔

بزرگوں سے منقول ہے کہ جس شخص نے اپنی پوری زندگی میں نفس کی مراد پر ایک قدم بھی رکھ دیا تو وہ محبت میں جھوٹا ہے۔

قولہ: ثُمَّ الرِّجَاءُ وَهِيَ تَصْدِيقُ الْحَقِّ فِيمَا وَعْدَه

(ارشادِ شیخ ہے) پھر ''رجا'' ہے۔ جن چیزوں کا وعدہ کیا گیا ہے ان میں حق سبحانہٗ وتعالیٰ کی تصدیق کرنا رجاء ہے۔

شرح: رِجَـا (امید) بھی ایک حال ہے، بندوں کے لئے جو وعدہ کیا گیا ہے ان وعدوں میں اللہ کو سچا سمجھنا اور اس کی تصدیق کرنا رجا ہے۔ اور یہ دو طرح سے ہے۔

-علمی اور حالی-

علمی تصدیق تو ہر عام مومن کے لئے ہے۔ اور حالی تصدیق کا تعلق خواص سے ہے۔

قولہ: ثُمَّ الْخَوفُ وَهُوَ مُطَالِعَةُ الْقَلْبِ لِسطوَاتِ اللّٰهِ وَنَقْمَاتِهٖ.

(ارشادِ شیخ ہے) پھر ''خوف'' ہے اور یہ قلب کا اللہ تعالیٰ کی سطوت وغضب

کو مطالعہ کرنا ہے۔

شرح: ''خوف'' بھی ایک حال ہے اور خوف اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کے عذاب کو دل میں مطالعہ کرنا ہے یعنی بندہ اس بات سے خوفزدہ رہے کہ وہ دنیا میں بھی عذاب دے سکتا ہے۔ اور آخرت میں بھی۔

قولہ: ثُمَّ الْحَيَاءُ وَهُوَ حَصْرُ الْقَلْبِ عَنِ الانْبِسَاطِ وَ ذٰلِكَ لِاَنَّ الْقُرْبَ يَقْتَضِي هٰذِهِ الْاَحْوَالَ فَمِنْهُمْ مَنْ يَنْظُرُ فِي حَالِ قُرْبِهِ اِلٰى عَظْمَةِ اللّٰهِ تَعَالٰى وَهَيْبَتِهِ فَيَغْلِبُ عَلَيْهِ الْخَوْفُ وَالْحَيَاءُ وَمِنْهُمْ مَنْ يَنْظُرُ اِلٰى لُطْفِ اللّٰهِ تَعَالٰى وَ قَدِيْمِ اِحْسَانِهِ فَيَغْلِبُ عَلٰى قَلْبِهِ الْمُحَبَّةُ وَالرِّجَاءُ۔

(ارشاد شیخ ہے) پھر ''حیا'' ہے اور یہ قلب کو انبساط سے روکنا ہے اور بے شک قرب ان احوال کا متقاضی ہوتا ہے۔ لہٰذا جو حالتِ قرب میں اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کی ہیبت کو دیکھتا ہے اس پر خوف وحیا کا غلبہ ہوتا ہے اور جو حالت قرب میں اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم اور قدیم احسان کا مطالعہ کرتا ہے اس کے قلب پر محبت اور رجا غالب ہوتی ہے۔

شرح: حیا بھی ایک حال ہے یہ اللہ تعالیٰ سے شرم رکھنا اور شوخی کرنے سے اپنے کو باز رکھنا ہے۔ حیا کا حقیقتاً معنی یہ ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کی قدیم جلالت وعظمت، اور اپنی حقارت، بے مائیگی اور بندگی کا مشاہدہ کرتا رہے، دل میں ایسا خوف پیدا ہو اور یہ احساس جاگتا رہے کہ میں اس کی بارگاہ کے لائق نہیں۔ جب یہ خوف ہوگا تو پھر شوخی نہیں ہوگی۔ چنانچہ جو شخص رب ذوالجلال کی عظمت وجلال اور قادر مطلق کی قدرت کاملہ پر نظر رکھتا ہے، اور اپنی عاجزی و کمتری، بندگی و بے مائیگی کو مشاہدہ کرتا ہے وہ یقیناً اس سے شرم وحیا رکھتا ہے۔ گناہوں سے محفوظ رہتا ہے اور پسندیدہ خصائل کو اپناتا ہے۔

خلق سے حیا یہ ہے کہ جو کام ظاہراً برا نظر آئے ان سے رخ پھیر لے اور اس کی صورت یہ ہوگی کہ وہ لوگوں کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آئے، بداخلاقی سے پرہیز کرے، خالق

کائنات پر توکل کرے، لوگوں سے امید نہ رکھے، حاجت وضرورت کے وقت رب تعالیٰ کے در پر حاضر رہے۔

لوگوں نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے شرم وحیا کئی طریقے سے ہے۔ شرم جنایت، شرم تقصیر، شرم حشمت اور شرم جلالت وعظمت۔

وحصر القلب عن الانبساط : جب اپنی جنابت اور تقصیر پر نظر ہوگی تو اس وقت انبساط کیسے ہوگا۔ انبساط کی کیفیت تو جنایت اور تقصیر کو نہیں دیکھنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے **و ذالک لان القرب یقتضی** .... **الیٰ آخرہ**:- احوال میں اختلاف محض اس وجہ سے ہے کہ قرب ان مختلف احوال کا متقاضی ہوتا ہے۔ لہٰذا ان میں کوئی ایسا ہے جو اپنی قربت کی حالت میں اللہ تعالیٰ کی ہیبت اور اس کی سزاؤں پر نظر رکھتا ہے۔ چنانچہ اس نظر سے خوف وحیاء کا غلبہ ہوتا ہے۔

بندہ کی برائیوں اور خرابیوں سے مولیٰ تعالیٰ کے باخبر رہنے پر بندہ کا یہ حال ہو جاتا ہے کہ گویا اس کی رگیں پگھل رہی ہیں، بعض لوگوں نے حیا کی یہی تعریف کی ہے۔

ایک بزرگ سے منقول ہے انہوں نے فرمایا کہ مولیٰ تعظیم کے لئے دل کی گرفتگی کا نام حیا ہے۔

بعض لوگ وہ ہیں جو حالتِ قرب میں اللہ تعالیٰ کے لطف وکرم اور احسان قدیم پر نظر رکھتے ہیں۔ اسی نظر کا یہ اثر ہوتا ہے کہ اس کے دل پر اللہ تعالیٰ کی محبت کا غلبہ ہوتا ہے اور بندہ اس کا امیدوار بن جاتا ہے۔

قولہ: ثُمَّ الشَّوق وَهُوَ هَيجَانُ الْقَلبِ عِندَ ذِكرِ الْمَحْبُوب،

(ارشادِ شیخ ہے) پھر ''شوق'' ہے۔ محبوب کے ذکر کے وقت دل میں ہیجان کا پیدا ہونا شوق ہے۔

شرح: احوال کی ایک قسم شوق بھی ہے۔ محبوب کو یاد کرنے کے وقت دل میں جو شورش پیدا ہو اسی کو شوق کہتے ہیں۔ اور یہ کیفیت محبت کے انداز ے کے مطابق ہوتی ہے یعنی جیسی محبت ہوگی ویسی ہی شورش بھی ہوگی۔

شوق کی علامت یہ ہے کہ عافیت اور صحت کی حالت میں موت کی آرزو کی جائے۔

جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے کیا۔ یعنی جب کنواں میں ڈالے گئے تو اس وقت تَوَفَّنِیْ (مجھے وفات دے) نہیں کہا۔ اسی طرح جب قید کردئے گئے تو اس وقت بھی تَوَفَّنِیْ کی آرزو نہیں ہوئی۔ لیکن جب ماں باپ اور بھائیوں سے ملاقات ہوئی سارا ملک اور ساری نعمتیں ان پر نچھاور کردی گئیں تو اس وقت دعاء کی تَوَفَّنِیْ مُسْلِماً (یوسف/۱۰۱) (مجھے وفات دے اس حال میں کہ میں مسلمان ہوں)

قولہ: ثُمَّ الانْسُ وَهُوَ السُّكُون اِلَى اللّٰهِ وَالْاِسْتِكَانَةُ بِهٖ فِي جَمِيعِ الاُمُور،

(ارشاد شیخ ہے) پھر انس ہے اور وہ اللہ کی طرف سکون پانا اور تمام امور میں اس کے آگے اپنی عاجزی و مسکنی ظاہر کرنا ہے۔

شرح: احوال کی ایک قسم "انس" بھی ہے، اللہ تعالیٰ کی یاد سے دل کو آرام و سکون دینا انس ہے، انس کی معمولی صورت یہ ہے کہ اگر لہکتی ہوئی آگ میں ڈال دیا جائے تو بندہ کا انس مکدر نہ ہو۔ حضرت امام جنید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں نے خواجہ سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ سے سنا ہے کہ بندہ انس کے اس مقام پر پہنچ جائے کہ اگر اس کے رخسار پر تلوار کی ضرب لگائی جائے تو اسے خبر نہ ہو۔ اس بات سے میرے دل میں ایک کھٹک سی ہوتی تھی لیکن جب وہاں تک پہنچا تو یہ بات ظاہر ہوگئی کہ ایسا ہی ہے۔

والاستکانة به فی جمیع الامور جو کہا گیا، اس استکانت سے مراد یہ ہے کہ تمام کاموں میں رب تعالیٰ کے آگے اپنی عاجزی و انکساری، مسکینی و فقیری پیش کی جائے۔ **الاستکانة الافتقار** یہی ہے۔ یعنی جب بندہ کی صفت فقر ہے اس کے باوجود وہ اپنے کو اللہ تعالیٰ کے حضور میں اس صفت کے بغیر پیش کرتا ہے تو وہ گمراہ ہے اور جو شخص ایک لمحہ، ایک لحظہ، ایک ساعت، ایک سانس یا اس سے بھی کم کے لئے اپنے کو رب تعالیٰ سے بے نیاز سمجھتا ہے۔ اس نے گویا ابھی تک ایمان لایا ہی نہیں۔

قولہ: ثُمَّ الطَّمَانِيَةُ وَهِيَ السُّكُون اِلَى اللّٰهِ تَحتَ مَجَارِي الاِقْدَار.

(ارشاد شیخ ہے) پھر "طمانیت" ہے اللہ تعالیٰ نے جو مقدورات جاری کر

دئے ہیں ان کے تحت پُرسکون رہنا طمانیت ہے۔

شرح: احوال کی ایک قسم قرارِ دل بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو مقدر کر دیا ہے اور جو کچھ تقدیر میں لکھ دیا ہے چاہے وہ نعمت و راحت ہو یا رنج و بلا ان پر پُرسکون رہنے کا نام طمانیت ہے۔ بلاو مصیبت، رنج و تکلیف آنے کی حالت میں کسی طرح کا افسوس قلق اور اضطراب نہ ہو۔

قولہ: ثُمَّ الْيَقِين وَهُوَ التَّصْدِيق مَعَ اِرْتِفَاعِ الشَّكِّ.

(ارشادِ شیخ ہے) پھر ''یقین'' ہے۔ اور یقین اس تصدیق کو کہتے ہیں جو شک کے اٹھ جانے کے بعد پیدا ہو۔

شرح: احوال کی ایک قسم ''یقین'' ہے۔ جو کچھ وعدہ کیا گیا ہے اور جو خبر دی گئی ہے اس سے متعلق تمام شکوک و شبہات کے اٹھانے کے ساتھ اللہ اور اللہ کے رسول علیہ السلام کی تصدیق کرنا ان کو سچا ماننا یقین ہے۔

حضرت خواجہ عثمان رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا یقین یہ ہے کہ تمہیں غم فردا (کل کی فکر) نہ ہو۔

نقل ہے کہ ایک شخص نے حضرت امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ سے عرض کیا حضرت! مجھے کچھ وصیت کیجئے۔ امیر المومنین نے فرمایا بیوی اور بال بچوں کے ساتھ اپنی مشغولیت کو سب سے اہم مشغولیت نہ بنا لیجئے۔ اس لئے کہ یہ اگر اللہ کے دوست ہیں تو اللہ اپنے دوستوں کو ضائع نہیں کرے گا۔ اور اگر اللہ تعالیٰ کے دشمن ہیں تو پھر اس کے دشمنوں کے لئے تمہیں پریشان اور فکر مند ہونے کی کیا ضرورت۔

قولہ: ثُمَّ الْمُشَاهِدَةُ وَهِيَ فَضْلٌ مَابَيْنَ رُؤيةِ الْيَقِين وَرُؤيةِ الْعِيَان بِقَوْلِهِ عَلَيْهِ السَّلَام اُعْبُدِ اللّٰه كَانَّكَ تَرَاهُ فَاِن لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهُ يَرَاكَ وَهِيَ اٰخِرُ الْاَحْوَال۔

(ارشادِ شیخ ہے) پھر ''مشاہدہ'' ہے اور یہ رویت یقین اور رویت عیان سے الگ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو کہ اس کو دیکھ رہے ہو، اور اگر ایسا نہیں تو یقیناً وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔ اور ''مشاہدہ'' آخر احوال ہے۔

شرح: احوال کی آخری قسم ''مشاہدہ'' ہے۔ یہ رویت یقین اور رویت عیاں سے علحدہ حال ہے۔ یعنی مشاہدہ رویت یقین سے برتر اور رویت عیان سے کمتر ہے۔ مشاہدہ ان دونوں کے درمیان کا حال ہے۔ اس معنی اور دلیل میں رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو کہ تم اسے دیکھ رہے ہو اور اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ یقیناً تم کو دیکھ رہا ہے۔

حضرت خواجہ جنید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ ابلیس نے طاعت میں مشاہدہ حاصل نہیں کیا اور حضرت آدم نے معصیت میں مشاہدہ کو کم نہیں کیا۔ ابلیس بظاہر خدمت گذاری اور فرماں برداری کرتا رہا مگر اس کا باطن تعظیم و تحریم سے خالی تھا۔ اور حضرت آدم شوخی میں حکم کی خلاف ورزی کر گئے لیکن ان کا باطن تعظیم و تحریم سے آراستہ تھا۔ صحبت و وصل کی نعمت تعظیم و تحریم ہی سے باقی رہتی ہے صرف طاعت و خدمت سے باقی نہیں رہتی۔ ایسی طاعت جو عزت و حرمت سے خالی ہو نفع بخش نہیں۔ اور وہ زلت جو قصداً نہ ہو اور اس میں عزت و حرمت کا پاس و لحاظ بھی ہو ضرر رساں نہیں۔ ابلیس کی بے حرمتی کی دلیل اس کا انا خَیرٌ مِّنۡہُ کہنا ہے اور آدم علیہ السلام کی حرمت کی دلیل ربنا ظلمنا انفسنا کا اقرار ہے۔

قولہ: ثُمَّ یَکُونُ فَوَاتِحَ وَ لَوَائِحَ ومَنَابِح تَحفُو االعِبَارَۃُ عَنۡھَا وَاِنۡ تَعُدُّوا نِعۡمَۃَ اللّٰہِ لَاتُحۡصُوۡھَا

(ارشادِ شیخ ہے) پھر اس کے بعد فواتح، لوائح اور منائح ہوتے ہیں۔ جن کو عبارت میں نہیں لا سکتے اور اگر تم خدا کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو انہیں گن نہیں سکتے۔

شرح: ان تمام احوال کے بعد فتوح، لوائح اور منائح ہوتے ہیں جن کو عبارتوں میں بیان نہیں کر سکتے۔ جیسا کہ فرمایا اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو ان نعمتوں کا شمار نہیں کر سکتے اس لئے کہ نعمت در نعمت ہے اور راحت در راحت ہے۔ مصرع۔ ''هَنِیناً لِاَرۡبَابِ النَّعِیم نَعِیمُهَا'' (نعمت والوں یعنی جنتیوں کے لئے نعمتوں کی خوش خبری ہے)

فصل-۱۱

اختلاف مسالک کے بیان میں

قولہ: فی ذکر اختلاف المسالک والمقصود واحد والمقاصد مختلفة لا ختلاف حال القاصدین و مقامات السالکین.

(ارشادِ شیخ ہے) مقصود ایک ہے اور سالکین کے مقامات اور قاصدین کے احوال کے اختلاف کی وجہ سے مقاصد مختلف ہیں۔

شرح: یہ فصل مداخل یعنی سالکوں اور راہ طے کرنے والوں کے اختلاف کے بیان میں ہے سب کا مقصود ایک ہی ہے یعنی طلبِ حق۔ لیکن سالکوں کے مقامات اور راہ طئے کرنے والوں کے احوال الگ الگ ہیں اس لئے روشیں بھی الگ الگ ہوگئی ہیں۔ المسالک المداخل من السلوک وھو الدخول (مسالک، سلوک میں داخل ہونے کے ذرائع ہیں)

قولہ: فَمِنھم مَن سَلک طریق العبادة و لازم المآء والمحراب واشتغل بکثرة الذکر والنوافل و واظب علی الأوراد

(ارشادِ شیخ ہے) ان میں سے بعض نے عبادت کا طریقہ اختیار کیا پانی اور محراب (یعنی وضو اور مسجد) کے ہو رہے۔ کثرت ذکر اور نوافل میں مشغول ہوگئے اور اوراد و وظائف کو لازمی کرلیا۔

شرح: ان میں بعض وہ لوگ ہیں جو عبادت کی راہ سے اس میں داخل ہوئے۔

انہوں نے پانی اور محراب کو اپنے لئے لازم کرلیا، کثرت ذکر اور کثرت نوافل میں مشغول ہوئے اور اوراد میں لگ گئے۔

قولہ: ومنهم من سلک طريق الرياضات والمكائدات وقهر النفس في المخالفات.

(ارشاد شیخ ہے) ان میں سے بعض نے ریاضت ومشقت اور مخالفت نفس کے ذریعہ نفس کو مقہور کرنے کا طریقہ اختیار کیا ہے۔

شرح: ان میں بعض وہ لوگ ہیں جو ریاضت ومجاہدہ کی راہ سے داخل ہوئے۔ ایسے لوگوں نے نفس کی مخالفت کر کے اور شہوات کو ترک کر کے نفس پر قہر ڈھایا ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ نفس کی مخالفت تمام نفل عبادتوں سے بڑھ کر ہے۔ جب بزرگوں سے لوگوں نے پوچھا کہ اسلام کیا ہے؟ تو یہی فرمایا کہ مخالفت کی تلواروں سے نفس کو ذبح کر دینا اسلام ہے۔ کہتے ہیں کہ اس جماعت نے اپنے نفس سے ایسی جنگ کی جس میں قیامت تک کے لئے صلح نہیں۔ اپنی پوری عمر گذار دی مگر نفس کی ایک مراد اور خواہش بھی پوری ہونے نہیں دی۔

قولہ: وَمِنهُم مَن سَلکَ طَرِيق الْخَلوة وَالْعُزلَةَ طَلَباً لِلسَّلَامَةِ والمخالطة.

(ارشاد شیخ ہے) ان میں سے بعض نے لوگوں سے میل جول کم کرنے اور سلامتی کے خیال سے خلوت وعزلت کو اختیار کیا۔

شرح: ان میں بعض وہ لوگ ہیں جنہوں نے لوگوں سے میل جول کی آفتوں سے بچنے اور اپنے دین کو سلامت رکھنے کے لئے خلوت وعزلت کو سلوک کا ذریعہ بنایا۔

بزرگوں نے فرمایا ہے کہ جب کوئی خلوت اور گوشہ نشینی اختیار کرے تو اس کا اعتقاد یہ ہو کہ لوگ میرے شر سے محفوظ رہیں۔ یہ خیال نہیں رہے کہ میں لوگوں کے شر سے محفوظ رہوں۔ اس لئے کہ ایسا سوچنا اپنے حق میں خوش گمانی اور دوسرے کے حق میں بدگمانی سمجھی جائے گی۔

نقل ہے کہ ایک درویش نے کسی راہب کو دیکھا اور اس سے پوچھا کیا تو راہب ہے؟

اس نے کہا نہیں۔ میں تو پیٹ کا نگہبان ہوں۔ اس لئے کہ میرا نفس کتا ہے۔ یہ لوگوں کو کاٹتا ہے۔ چنانچہ میں نے اپنے کو لوگوں سے اسی لئے الگ کرلیا ہے تا کہ لوگ اس کتے سے محفوظ رہیں۔

عزلت دو طرح سے ہوتی ہے۔ ایک عزلت تو یہ ہے کہ لوگوں سے علیحدہ ہو کر کسی خالی جگہ میں قیام کیا جائے اور لوگوں کی صحبت سے کنارہ کش رہا جائے۔

دوسری عزلت یہ ہے کہ دل کا تعلق لوگوں سے منقطع رہے۔ جب کوئی لوگوں کے درمیان رہتے ہوئے لوگوں سے اپنے دلی تعلق کو منقطع کر لیتا ہے تو گویا وہ خلق سے جدا رہتا ہے اور اس کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ ہر شخص اس صفت سے متصف نہیں ہوسکتا۔

قولہ: وَمِنْهُم مَن سَلَکَ طَرِيقَ السِّيَاحَةِ وَالاسْفَارِ وَالاغْتِرَابِ عَنِ الْبُلْدَانِ وَخمول الذِّكر

(ارشاد شیخ ہے) بعض لوگوں نے سیاحت و سفر اور غربت و گم نامی کا راستہ اختیار کیا ہے۔

شرح: ان میں بعض وہ لوگ ہیں جنہوں نے سیر و سیاحت کا طریقہ اپنایا، شہروں میں غربت اختیار کی۔ اور گم نامی کو پسند کیا، یعنی لوگ اپنے وطن میں معزز ہوتے ہیں، اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کے درمیان عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ لیکن اس جماعت کے لوگ ذلت کو پسند کرتے ہیں کیوں کہ ذلت ہی میں عزت پاتے ہیں۔ غربت بہت اہم اور بڑا کام ہے۔ اس لئے کہ غربت (مسافرت) میں نفس ذلیل و مقہور ہوتا ہے۔ لوگوں کا نفس جتنا ذلیل و مقہور ہوگا اسی کا اخلاق اتنا ہی زیادہ پاک ہوگا کیوں کہ وطن میں رہنے پر عزت ملتی ہے، اور یہ حضرات عزت سے بھاگتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ وطن میں رہنے پر وطن سے الفت ہوتی ہے اور ان حضرات کو حق سبحانہ تعالیٰ کے علاوہ اور کسی سے الفت نہیں ہوتی۔ پھر یہ کہ وطن سے نکلنے میں پیغمبران علیہم الصلوٰۃ والسلام اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی موافقت بھی ہے۔

گم نامی اس لئے اختیار کرتے ہیں کہ شہرت میں آفت ہے اور گم نامی میں سلامتی۔

قولہ: وَمِنْهُم مَنْ سَلَکَ طَرِيقَ الخِدْمَةِ وَبَذْلِ الجاه للاخوان وَادخال السرور عليهم۔

(ارشادِ شیخ ہے) بعض لوگوں نے خدمت کرنے، اپنے بھائیوں کے لئے جاہ و مرتبہ کو ترک کرنے اور ان کو خوش کرنے کی روش اختیار کی ہے۔

شرح: ان میں بعض وہ لوگ ہیں جنہوں نے خدمت کا طریقہ اپنایا، بھائیوں کے لئے اپنے جاہ و مرتبہ کو قربان کیا اور ان کے لئے خوشیوں کے سامان مہیا کئے۔

خدمت اور جاہ و مرتبہ کا ترک دونوں بہت اہم اور بڑا کام ہے۔ اس لئے کہ خدمت میں جو فائدے اور خوبیاں پوشیدہ ہیں وہ کسی اور طاعت و عبادت کو حاصل نہیں۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ خدمت کرنے سے نفس مردہ ہو جاتا ہے، کبر و غرور اور نخوت کو یہ اکھاڑ پھینکتا ہے تواضع اور عجز کی صفت پیدا ہوتی ہے۔ نفس کی گرانی اور تیرگی دور ہوتی ہے، لطافت پیدا ہوتی ہے، یہ ساری صفتیں اور اس جیسی دوسری صفتیں خدمت کے ذریعہ حاصل ہوتی ہیں۔

حضرت خواجہ ابوسعید ابوالخیر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا موجودات کا ہر ایک ذرہ حق سبحانہ تعالیٰ تک پہنچانے کی راہ ہے۔ لیکن لوگوں کے دلوں کو راحت پہنچانے سے بہتر و نزدیک تر اور کوئی راہ نہیں۔ ہم نے جو کچھ پایا اسی راہ سے پایا اور اسی کام کی وصیت کی ہے۔

وادخال السرور علیھم جو کہا گیا اس کا معنی یہ ہے کہ ان حضرات کو اگر کسی چیز کے ہونے سے راحت حاصل ہوتی ہے اور دوسروں کی راحت اس میں ہے کہ اس چیز کو ترک کر دیا جائے تو یہ حضرات دوسروں کی خوشی کی خاطر اس راحت کو ترک کر دیتے ہیں۔ دوسروں کی تونگری اور نفع کے لئے اپنے کو فقیر رکھنا پسند کرتے ہیں۔ دوسروں کی شکم سیری کے لئے خود بھوکے رہتے ہیں، اپنی طرف سے غیروں کے حصے اور نصیب مہیا کرتے ہیں غیروں سے اپنے لئے کچھ طلب نہیں کرتے۔

قولہ: ومنھم مَن سلک طَرِیق المجَاھِدَات وَرکوب الاھوال ومباشرۃ الاحوال.

(ارشادِ شیخ ہے) بعض لوگوں نے مجاہدات اور خطرات جھیلنے اور احوال کو حاصل کرنے کا راستہ اختیار کیا

شرح: بعض وہ لوگ ہیں جنہوں نے مجاہدہ کا راستہ اختیار کیا، سخت اور مشکل کاموں کو اپنایا، احوال کے اسباب کو حاصل کرنے میں خود کو لگایا، یعنی ایسے کاموں میں خود کو مشغول رکھا جن سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندوں کے احوال صحیح و درست رہیں۔

حضرت امام ابوعثمان مغربی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جو شخص یہ گمان کرتا ہے کہ اس پر اس راہ (سلوک) کی کچھ چیزیں کھول دی گئی ہیں، اب مجاہدہ کی کیا ضرورت تو ایسا شخص غلطی پر ہے۔

قولہ: ومِنهم مَن سَلَکَ طرِیق اسقاط الجاه عند الخلق و قلت الالتفات الیهم وترک الاشتغال بخیر هم وشرهم.

(ارشاد شیخ ہے) بعض لوگوں نے جاہ و مرتبہ کو ختم کر دینے لوگوں سے رخ موڑ لینے اور ان کے خیر و شر سے کسی طرح کا تعلق نہیں رکھنے کی روش اختیار کی۔

شرح: بعض وہ لوگ ہیں جنہوں نے جاہ و مرتبہ کو گرا دینے کا راستہ اختیار کیا اس لئے کہ لوگوں کے نزدیک جاہ و مرتبہ زہر قاتل ہے۔ جو شخص مال سے دستبردار ہوتا ہے اسے چاہئے کہ جاہ و مرتبہ بھی چھوڑ دے، اگر ایسا نہیں کرتا تو وہ جاہ پرست کہا جائے گا خدا پرست نہیں ہوگا۔ خدا پرست اسی وقت ہوگا جب اس کے نزدیک لوگوں کی نگاہ میں مقبول ہونا اور مردود ہونا ایک ہو جائے۔ مخلوق کی طرف بہت کم توجہ دے ان کی اچھائی برائی کی طرف مشغول نہ رہے۔ لوگوں کی بھلائی برائی میں مشغول ہونا غیر حق کے ساتھ مشغولیت کہی جائے گی اور غیر کے ساتھ مشغولیت حجاب ہے یعنی اپنے جاہ و مرتبہ پر نگاہ بہت بڑی رکاوٹ اور بندھن ہے۔ اسی لئے تو جاہ و مرتبہ کو زنار سے منسوب کرتے ہیں۔

اس جماعت کے لوگوں کا کہنا ہے کہ جس طرح اپنے کو لوگوں کی نظر سے گرا دینا واجب ہے اسی طرح اپنے کو اپنی نظر سے بھی گرا دینا واجب ہے۔ اپنے کو لوگوں کی نظر سے گرا دینا تو آسان ہے لیکن اپنے کو اپنی نظر سے گرا دینا بہت بڑا کام ہے اور اس راہ میں مرد وہی ہے جو اپنے کو اپنی نظر سے گرا دے۔ بیت ؎

بت است نفس و قبول خلق زنار شریعت با حقیقت گفت یکبار

(شریعت نے حقیقت سے ایک بار کہا نفس بت ہے اور لوگوں میں مقبولیت زنار ہے)

اسی لئے کہتے ہیں کہ اپنے کو گرادو تا کہ اٹھالیں اور اپنے کو ذلیل وخوار سمجھو تا کہ قبول کرلیں۔

قولہ: مِنهم مَن سَلکَ طرِیق العجز و انکسار کما قال اللّٰہ تعالیٰ وَاٰخَرُونَ اعْتَرَفُوا بِذنُوبِھِم خَلَطُوا عَمَلاً صَالِحاً وَّاٰخَرَ سَیِّئاط عَسَی اللّٰہُ اَنْ یَّتُوبَ عَلَیْھِمْ ط

(ارشادِ شیخ ہے) بعض لوگوں نے عجز وانکسار کی راہ اختیار کی ہے جیسا کہ

(سورۂ توبہ کی آیت: ۱۰۲ میں) اللہ تعالیٰ نے فرمایا کچھ اور لوگ ہیں جنہوں نے اعتراف کرلیا ہے اپنے گناہوں کا۔ انہوں نے ملا جلا دیئے ہیں کچھ اچھے اور کچھ برے عمل۔ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے ان کی توبہ۔

شرح: بعض وہ لوگ ہیں جنہوں نے عاجزی وشکستگی کی راہ اختیار کی جیسا کہ مندرجہ بالا آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان کا حال بیان فرمایا۔

اس آیت کی شانِ نزول یہ ہے کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی غزوہ میں جانا تھا، جب فوج باہر نکلی تو بعض صحابہ نے یہ گمان کرلیا کہ اللہ کے رسول ﷺ مدینہ سے باہر تشریف لائیں گے۔ فوجی دستور کے مطابق سب لوگ جمع ہوں گے جب تک ہم لوگ آج کی رات گھر ہی میں آرام کرلیں، اور پھر صبح سویرے یہاں سے نکلیں گے۔ اور ان لوگوں سے جا کر مل جائیں گے۔

ادھر آنحضرت ﷺ نے دیر نہیں کی۔ رات کا انتظار نہیں کیا۔ اسی وقت نکل گئے۔ اور آگے بڑھ گئے۔ وہ چند صحابہ جو رہ گئے تھے جب صبح سویرے باہر آئے تو فوج جا چکی تھی۔ اور دشمنوں کی جماعت مدینہ کے اردگرد مسلمانوں کو قتل کرنے کے لئے کھڑی تھی۔ ان لوگوں کو ہمت نہیں ہوئی کہ آگے بڑھیں۔ مجبوراً واپس ہوگئے۔ یہاں تک کہ جب فوج واپس آئی اور مدینہ کے قریب پہنچی تو ان لوگوں نے ایک دوسرے سے کہا کہ آنحضرت ﷺ کو کیا منہ دکھائیں گے اور کیا جواب دیں گے۔ اسی اعتراف جرم میں صحابہ نے اپنے کو ایک ایک ستون میں باندھ لیا۔ تا کہ حضور ﷺ جب تشریف لائیں گے اور ہم لوگوں کو اس حال میں دیکھ کر ہمارے گناہ کو معاف کردیں گے۔ لیکن جب رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو ان لوگوں کی طرف متوجہ نہیں ہوئے۔

مسجد میں چلے گئے۔ ان لوگوں نے سمجھ لیا کہ حضور ﷺ ہم لوگوں سے خفا ہیں۔ اس احساس سے شکستہ دل اور مغموم ہو گئے۔ اللہ رب العزت جو عاجزوں اور ٹوٹے دلوں کا خریدار ہے اس نے ان کی عاجزی و شکستگی کو شرف قبولیت بخشا اور یہ آیت نازل فرمائی۔

حضرت ابن عباس ؓ فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے ان کی معافی اور بخشش کو واجب کر لیا، اور یہ آیت کریمہ نازل فرمائی تو رسول اللہ ﷺ نے کسی کو بھیجا کہ جا کر ان کی رسیاں کھول دو۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ ان لوگوں نے کہا مجھے حضور ﷺ کے سوا اور کوئی نہ کھولے۔ لہٰذا حضور ﷺ ازراہِ تواضع خود تشریف لائے اور ان لوگوں کا بندھن کھول دیا۔

حضرت محمد علی ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا میں نے بہت کوشش کی کہ نفس کو طاعت پر لگاؤں، لیکن میں ایسا نہیں کر سکا۔ اور اپنے آپ سے ناامید ہو گیا، پھر بارگاہ الٰہی میں عرضی پیش کی۔ کہ تو نے میرے نفس کو دوزخ کے لئے پیدا کیا ہے اس لئے میں دوزخی کی پرورش نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد میں جیجون (جیحون بلخ کی ایک نہر کا نام ہے) کے کنارے پہنچا ایک دوست سے کہا میرے ہاتھ پاؤں باندھ دو پھر اسی حال میں خود کو پانی میں ڈال دیا۔ تاکہ ڈوب جاؤں۔ لیکن پانی نے فوراً میرے بندھن کھول دئے۔ ایک موج آئی اور مجھے جلدی سے کنارے پر پھینک دیا۔ میں اس بار پھر اپنے آپ سے ناامید ہو گیا۔ اور کہنے لگا سبحان اللہ! وہ خدا پاک اور بے عیب ہے جس نے ایسے نفس کو پیدا کیا جو نہ دوزخ کے لائق ہے اور نہ بہشت کے لائق۔ جس وقت میرے اندر یہ ناامیدی پیدا ہوئی اس کی برکت سے میرے سر (راز) کی عقدہ کشائی ہو گئی۔ مجھے جو چاہئے تھا وہ میں نے دیکھ لیا۔ اور میں جو زندہ ہوں اسی ساعت کی برکت سے زندہ ہوں۔

اسی لئے لوگ کہتے ہیں کہ نیازمندی سے زیادہ قریب کوئی راہ نہیں اور دعویٰ سے مضبوط کوئی حجاب نہیں۔ آدم و ابلیس کے فرق کو دیکھئے۔

تمام ارباب طریقت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جس نے اپنے کو فرعون سے ذرہ برابر بھی بہتر سمجھا وہ فرعون سے بدتر ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزدیک سب سے پسندیدہ بات یہ تھی کہ لوگ ان کو مسکین کہہ کر پکاریں۔

قولہ: وَمِنهم مَن سَلَکَ طرِیق التَّعلّم وَالمَسئلة وَالمَجالسَة العلماء وَسَماع الاخبَار وَحِفظ العُلوم۔

(ارشاد شیخ ہے) بعض لوگوں نے تعلیم، سوالات کرنے، علماء کی مجلس میں بیٹھنے، احادیث سننے اور علوم کو یاد کرنے کا طریقہ اختیار کیا۔

شرح: ان میں سے بعض وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے کو علم سیکھنے سکھانے میں لگایا علمی سوالات کو مشغلہ بنایا۔ علماء کی صحبت اور مجلسوں میں رہے۔ احادیث کو سننے اور مختلف علوم کو یاد کرنے میں وقت دیا اور انہیں کاموں کو راہِ سلوک طئے کرنے کا ذریعہ بنایا۔

قولہ: وَلِکل طَرِیق یَحتاجُ فِیهِ اِلیٰ موقفٍ ودلیلٍ یَاخذ بِہٖ مِنهُ یَسلم مِنَ الحَیرة وَالفِتنَةِ۔ (بعض نسخوں میں ''معرف'' ہے۔)

(ارشاد شیخ ہے) اور ہر طریقہ سند اور دلیل کا محتاج ہے تا کہ اس کے مطابق اختیار کیا جائے اور حیرت وفتنہ سے محفوظ وسلامت رہا جائے۔

شرح: ہر راستہ اور طریقہ جس پر سالک چلنا چاہتا ہے کسی صاحب معرفت اور کسی مرشد کا محتاج ہے تا کہ اس کے نزدیک رہ کر سالک اپنی محنت وکوشش کے ذریعہ اپنی منزل حاصل کرلے، حیرت وسر گردانی اور فتنہ وفساد سے محفوظ رہے۔

اگر کوئی خود ہی اس راہ کو (بغیر مرشد کے) طئے کرنا چاہتا ہے تو وہ سرگرداں اور پریشان ہوتا ہے اور فتنہ وفساد کا شکار بن جاتا ہے اس لئے کہ مَن لا شیخ له فشیخہٗ ابلیس آیا ہے، جس کا کوئی پیر نہیں اس کا پیر شیطان ہے۔

قولہ: قیل لِبَعضُهم اِنَّ فلاناً قَد رَجعَ فَقالَ مَا اَراہ رَجعَ اِلَّا لوحشة الطَرِیق مِن قِلَّةِ سالکیه.

(ارشاد شیخ ہے) بعض لوگوں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ فلاں شخص پلٹ گیا ہے تو فرمایا جہاں تک میں سمجھتا ہوں راستہ کی وحشت کی وجہ سے اس نے ایسا کیا ہے اس لئے کہ سالکین کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔

شرح: اس جماعت کے بعض لوگوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص برگردد ہو گئے ہیں تو اس کا جواب یہ دیا کہ میں اس میں ایسی کوئی بات نہیں دیکھتا اور نہ ایسا کوئی کام ہی دیکھتا ہوں جس کی وجہ سے وہ برگردد ہو جائے۔ ہاں! صرف ایک بات سمجھ میں آتی ہے کہ اس راہ کی وحشت کی وجہ سے ایسا کیا ہو۔ کیوں کہ اس راہ میں چلنے والوں کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔

اس بات سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ جو شخص راہِ سلوک میں قدم رکھنا چاہتا ہے اس کو کسی صاحبِ معرفت مرشد کے بغیر چارہ نہیں۔ جو اس کو راہِ دین سے برگشتہ ہونے اور دوسرے آفات و واقعات سے بچا کر رکھے۔ اس لئے کہ اس راہ میں داخل ہونے کے بعد اس سے رجوع کرنا بہت اہم اور سخت بات ہے۔ آیۂ کریمہ اَلَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَاللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ ط اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ٥ (البقرہ:٢٧) (وہ جو توڑتے رہتے ہیں عہد خداوندی کو اسے پختہ باندھنے کے بعد، اور کاٹتے رہتے ہیں اسے حکم دیا اللہ نے جس کے جوڑنے کا، اور فساد مچاتے رہتے زمین میں، وہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں) کے سلسلہ میں بزرگوں نے فرمایا مَن کَفَر بَعد اِیمانه نقضَ عَهْدَ الاِسْلام فِی الظَّاهر وَمَن رَجعَ اِلیٰ احکام الْعادَة بَعد سلوک طَرِیقِ الارادة نَقض الْعهد فِی السر ، فَهُوَ مُرتَدٌ جِهراً وَهذا مُرتَدٌ سِرّاً فَالْمرتد جهراً عقوبَته قطع راسِهٖ وَالمرتد سِرّاً عقوبَته قطع سِره .(جو ایمان لانے کے بعد کافر ہو گیا اس نے ظاہر میں اسلام سے کئے ہوئے وعدے کو توڑ دیا اور جو ارادت کے ذریعہ راہِ سلوک میں داخل ہونے کے بعد دوسرے احکام کی طرف رجوع ہو گیا اس نے باطن میں عہد و پیمان کو توڑ دیا۔ وہ جہراً مرتد ہوا اور یہ سراً مرتد ہوا۔ جو ظاہراً مرتد ہوا اس کی سزا قتل ہے اور جو سراً مرتد ہوا اس کی سزا قطعِ سر ہے)

اسی لئے کہتے ہیں کہ شریعت میں جو مرتد ہوا وہ توبہ سے لوٹ سکتا ہے لیکن اسی کے برعکس جو طریقت کا مرتد ہے وہ توبہ سے بھی نہیں لوٹ سکتا۔ سنتِ الٰہی اسی طرح جاری ہے۔

فصل-۱۲

فضیلت علم سے متعلق صوفیا کے اقوال

یہ فصل فضیلتِ علم سے متعلق صوفیاء کے اقوال کے بیان میں ہے۔

حضرت محمد علی ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ اشیاء کے ظاہر کو جاننا علم ہے اور اشیاء کے باطن کو جاننا حکمت ہے۔ چنانچہ جو شخص اشیاء کے ظاہر کو جانتا ہے وہ عالم ہے اور جو اشیاء کے باطن کو جانتا ہے وہ حکیم ہے۔

حضرت ابو بکر دقاق رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ جب تم نے اشیاء کے نفع و نقصان کو معلوم کر لیا تو عالم ہو گئے اور جب اشیاء کی مضرت سے پرہیز کر لیا تو حکیم ہو گئے

قولہ: قال اللہ تعالیٰ شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ اُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًاۢ بِالْقِسْطِ (آل عمران: ۱۸) (گواہی دی اللہ نے کہ بے شک نہیں ہے کوئی معبود مگر وہی۔ اور فرشتوں نے گواہی دی اور علم والوں نے گواہی دی۔)

شرح: اور اولو العلم جو فرمایا گیا اس کے بارے میں لوگوں نے کہا ہے کہ مومن علماء نے گواہی دی کہ نہیں ہے کوئی خدا اس کے سوا- یہاں پر علماء کی تخصیص ان کی بزرگی اور شرف کی وجہ سے ہے۔ جیسا کہ خوف کے سلسلہ میں فرمایا اِنَّمَا یَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا (فاطر: ۲۸) (اللہ کے بندوں میں صرف علماء ہی اس سے ڈرتے ہیں)

بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اس سے عام مومن مراد ہیں۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے کافر کو جاہل مطلق کہا ہے۔ جب یہ بات ثابت ہے کہ کافر جاہلِ مطلق ہیں تو پھر یہ بات بھی ثابت ہے کہ عالم مومنِ مطلق ہیں۔

دوسری بات یہ کہ علماء کو ملائکہ سے قریب رکھا اور اس سے سارے فرشتے مراد ہیں۔ اسی طرح اولو العلم سے سارے مومن مراد ہیں۔

اور قَآئِمًا بِالْقِسْطِ جو کہا یہاں قائما اللہ تعالیٰ کی صفت ہے یعنی وہ انصاف کے لئے کھڑا ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ وہ مومنوں کی بھلائی کرنے والا اور کارساز ہے۔ اور یہ لوگوں کی عادت وسرشت کے عین مطابق ہے۔ جیسے وصی کو جو یتیموں کے کاموں کی دیکھ بھال کرتا ہے اسے قیم کہتے ہیں۔ اسی طرح کہتے ہیں فلاں فلاں کے کام میں کھڑا ہے یعنی اس کام کے لئے قائم ہے۔ اس کے سر پر کھڑا نہیں ہے بلکہ اس کے کام کے لئے تیار ہے۔ اور اس کا کام بنانے میں لگا ہے۔

قولہ: بداء بنفسه وثنى بملٰئكته وَثلث بأهل العلم۔

(ارشاد شیخ ہے) اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات سے شروع کیا درمیان میں اپنے فرشتوں کو لایا اور اس کے بعد اہل علم کا ذکر کیا

شرح: یعنی اللہ تعالیٰ نے شہادت و گواہی کی ابتدا اپنے آپ سے کی۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی گواہی فرشتوں کی گواہی سے پہلے ہے۔ اور فرشتوں کی گواہی مومنوں کی گواہی سے قبل ہے۔ خدمت اور وجود کے اعتبار سے فرشتے آدمی سے مقدم ہیں۔

اور ہاں! فرشتوں کا ذکر اسم علامت سے کیا اور مومنوں کا ذکر اسم کرامت سے یہ اس بات کی دلیل ہے کہ مومنوں کو فرشتوں پر فضیلت و بزرگی حاصل ہے۔

قولہ: وَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ اَلعلماءُ وَرَثَةُ الأنبياء۔

(ارشاد شیخ ہے) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا علماء انبیاء کے وارث ہیں۔

شرح: جب پیغمبروں کے پاس درم و دنیا نہیں ہوتا ہے تو پھر وراثت کس چیز کی۔ تو یہ معلوم رہے کہ پیغمبروں کے پاس علم کی جو دولت ہوتی ہے اسی کے وارث ہوتے ہیں۔ اور پیغمبروں کا سارا علم علم لدنی ہے جس نے کتابوں سے یا معلموں سے علمی استفادہ کیا وہ اپنے علم میں پیغمبروں کا وارث نہیں ہے۔

ہاں! بطریق مجاز اور عبارت میں لانے کے لئے بولا جائے گا۔ پیغمبران علم کا استفادہ

اللہ تعالیٰ سے کرتے ہیں۔ فقہی کتابوں اور معلموں سے نہیں کرتے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَم (العلق:۵) (اسی نے سکھایا انسان کو جو وہ نہیں جانتا) ایسا گمان نہیں کرنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کی تعلیم صرف پیغمبروں کے لئے مخصوص ہے۔ یہ سچ ہے اور درست ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام مقدس میں فرمایا وَاتَّقُوا اللّٰہَ وَیُعَلِّمُکُمُ اللّٰہُ (البقرہ:۲۸۲) (اور ڈرا کرو اللہ سے، اور سکھاتا ہے تمہیں اللہ تعالیٰ)

جو شخص اپنے سلوک میں تقویٰ کی حقیقت تک پہنچ جاتا ہے یقیناً اللہ تعالیٰ وعدہ کے مطابق اس کو وہ علم سکھا دیتا ہے جو وہ نہیں جانتا۔

علم لدنی اس علم کو کہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کتاب اور معلم کے واسطہ کے بغیر سکھا دیتا ہے۔

قولہ: وَقَالَ عَلَیہِ السَّلام فَضلَ العَالِم عَلی العَابد کفضلی عَلیٰ اَدنا کُم

(ارشاد شیخ ہے) رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی فرمایا عالم کی فضیلت عابد پر اس طرح ہے جس طرح میری فضیلت تم میں سے کمتر لوگوں پر ہے۔

شرح: آنحضرت ﷺ نے فرمایا جس طرح تمہارے کمتر لوگوں پر مجھے فضیلت ہے اسی طرح بے علم عابد پر عالم کو فضیلت حاصل ہے۔

اس علم سے بیع وشرا اور طلاق وعتاق کا علم مراد نہیں ہے بلکہ علم باللہ اور قوتِ یقین کی طرف اشارہ ہے۔ اس لئے کہ بندہ کو خدا شناس اور صاحبِ یقین کامل ہونا چاہئے اگر چہ وہ علم فرائض (شرع کے ضروری احکام) سے پورے طور پر واقفیت نہیں رکھتا پھر بھی اگر وہ خدا شناس اور صاحب یقین کامل ہے تو اس کے لئے نقصان دہ نہیں۔ بعض اصحاب رسول ﷺ حقیقت یقین اور دقایق معرفت میں ان علمائے تابعین سے زیادہ دانا اور واقف کار تھے جو علم فتویٰ اور احکامِ شریعت کے ماہر تھے۔

قوت القلوب میں آیا ہے کہ العلماء باللّٰہ هم ورثة الأنبیاء لأنهم ورثوا عنهم الدلالة علی اللّٰه والدعوة الیه والاقتداء بهم فی أعمال القلوب (اللہ تعالیٰ کا علم رکھنے والے علما حضرات انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں۔ اس لئے کہ ان علماء کو انبیاء سے اللہ تعالیٰ کی طرف رہنمائی اور اس کی طرف دعوت دینے کی دولت وراثت میں ملی ہے۔ چنانچہ دلوں

کے بنانے کے لئے انہی لوگوں کی اقتداء وپیروی ضروری ہے)

کسی بزرگ سے لوگوں نے پوچھا علماء کون ہیں؟ فرمایا جنہوں نے دنیا پر آخرت کو اور نفس پر خدا کو ترجیح دی وہی علماء ہیں۔

قولہ: وقَالَ ﷺ اَلنَّاسُ رَجُلَانِ عالمٌ و متعلمٌ و سائرهُم هَمجٌ.

(ارشاد شیخ ہے) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لوگ دو طرح کے ہیں ایک عالم اور دوسرے متعلم۔ باقی لوگ بے وقوف اور ذلیل ہیں۔

شرح: ارشاد نبوی ﷺ ہے کہ لوگ دو قسم کے ہیں: ایک وہ ہیں جو عالم ہیں اور دوسرے وہ ہیں جو متعلم ہیں۔ ان کے علاوہ جو ہیں وہ ھمج ہیں۔ والھمج جمع همجة وهی ذبابٌ صغيرٌ كالبعوض تسقط على وجوه الغنم والحمير وأعينها۔ ھمج چھوٹی مکھی ہے مچھروں کی طرح ہے۔ وہ مکھیاں جو بکریوں، گدھے کے منہ اور ان کی آنکھوں پر بیٹھتی ہیں۔

یہ حدیث بھی اس بات کی دلیل ہے کہ علم، عالم اور متعلم کو فضیلت حاصل ہے اور وہ عمل جو علم سے خالی ہے کچھ بھی فائدہ بخش نہیں۔ یہ بات بھی علم کی فضیلت کو ثابت کرتی ہے۔

قولہ: وَقِيلَ العِلم روحٌ وَالعمل جَسَدٌ.

(ارشاد شیخ ہے) کہا گیا ہے کہ علم روح ہے اور عمل جسم ہے۔

شرح: بعض لوگوں نے کہا ہے کہ علم جان کی طرح ہے اور عمل جسم کی طرح۔ جس طرح بے جان جسم سے کوئی کام نہیں ہو سکتا اسی طرح وہ عمل جو علم سے خالی ہو کسی کام کا نہیں۔

قولہ: وقيل العلم اصل والعمل فرع.

(ارشاد شیخ ہے) کہا گیا ہے کہ علم اصل ہے اور عمل فرع۔

شرح: علم اصل ہے اور عمل فرع۔ اس لئے کہ علم کے لئے عمل کی حاجت نہیں۔ لیکن عمل کے لئے علم کی ضرورت ہے۔ لہٰذا علم جڑ ہے اور عمل شاخ۔ یہ بات بھی فضیلت علم کی دلیل ہے۔

قولہ: وقد فضل الجمهور من مشائخنا رحمهم الله العلم على المعرفة والعقل، لان الله تعالىٰ يوصف بالعلم ولا يوصف بالمعرفة والعقل

ولان العلم حاکم علی العقل و لاحکم العقل علی العلم۔

(ارشاد شیخ ہے) ہمارے تمام مشائخ رحمہم اللہ نے علم کو معرفت اور عقل پر فضیلت دی ہے اس لئے کہ بے شک اللہ تعالیٰ کی توصیف علم سے کی گئی ہے، معرفت اور عقل سے نہیں کی گئی ہے۔اور بیشک علم عقل پر حکومت کرتا ہے۔ عقل کی حکومت علم پر نہیں چلتی۔

شرح: یہ سچ اور درست ہے کہ ہمارے سارے مشائخ رحمہم اللہ نے علم کو معرفت اور عقل پر فضیلت دی ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ علم سے موصوف ہے اور اللہ تعالیٰ کو عالم کہنا جائز ہے عارف یا عاقل کہنا جائز نہیں ہے۔ چنانچہ علم معرفت اور عقل سے زیادہ کامل ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفت کامل ہوگی۔ اور کامل کو ناقص پر بلاشبہ فضیلت ہوگی دوسری بات یہ ہے کہ علم، عقل پر حاکم ہے، عقل کی حکومت علم پر نہیں ہے۔ حاکم محکوم سے افضل ہوتا ہے محکوم حاکم سے افضل نہیں ہوگا۔ یہ بات بھی علم کی فضیلت کے لئے دلیل ہے۔

قولہ: **وَقیل لاینفع العلم الابالعقل و کذلک العقل لاینفع الابالعلم.**

(ارشاد شیخ ہے) بعض لوگوں نے کہا ہے کہ عقل کے بغیر علم نفع بخش نہیں اسی طرح عقل علم کے بغیر فائدہ بخش نہیں۔

شرح: اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ ایک کے بغیر دوسرے کا فائدہ نہیں۔ اور دونوں ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ ایک کو دوسرے پر فضیلت نہیں دی جاسکتی۔ یہ بات مخلوق کے حق میں کہی جائے گی۔ خالق کے حق میں نہیں کہی جائے گی۔ اگر خالق کے حق میں کہی جائے گی تو اس سے فساد پیدا ہوگا۔

قولہ: **وقیل لبعض الحکماء متی یکون الأدب اضرً قال اذا کان العقل أنقصَ.**

(ارشاد شیخ ہے) بعض حکماء سے دریافت کیا گیا کہ ادب ضرر رساں کب ہوتا ہے؟ انہوں نے فرمایا جب عقل کم ہوتی ہے۔

شرح: آداب لوگوں کے لئے بہت زیادہ زیاں کار کب ہوتے ہیں جب عقل میں بہت زیادہ کمی ہوتی ہے یہ اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ ایک کا نقصان (کمی) دوسرے کا نقصان (کمی) ہے۔ اور ایک کا کمال دوسرے کا کمال ہے۔ جب دونوں ایک دوسرے کے محتاج

ہیں تو پھر ایک کو دوسرے پر فضیلت نہیں۔

قولہ: وقیل الادب صورت عقلک فحسن عقلک کیف شئت

(ارشاد شیخ ہے) بعض لوگوں نے کہا ادب تمہاری عقل کی صورت ہے۔ جس طرح چاہو اپنی عقل کو اچھی بناؤ۔

شرح: یہ جملہ اس بات کی دلیل ہے کہ ہر شخص کا ادب اس کی عقل کے مطابق ہوتا ہے جیسا کہ پیغمبران علیہم السلام تمام لوگوں سے زیادہ عاقل ہوئے اسی لئے تمام لوگوں سے زیادہ باادب بھی ہوئے۔

قولہ: ومن فضل العلم ان الهُدهُد مع قلة خطره اَجابَ سُلَیمان علیه السلام مع عُلُوِّ مرتبته بصولته العلم وقوّته فی قوله تعالیٰ اَحطتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ مَعَ قِلَّةِ الاکتراث بتهدیدہٖ ووعیدہٖ.

(ارشاد شیخ ہے) اس سے بھی علم کی فضیلت ظاہر ہوتی ہے کہ ہدہد نے باوجود اس کے کہ اس کو کوئی قدر و منزلت حاصل نہیں تھی حضرت سلیمان علیہ السلام جیسے بلند مرتبہ اور شان و شوکت والے پیغمبر کو اپنے علم کے دبدبہ اور قوت علمی کی بنا پر یوں جواب دیا اور حضرت سلیمان کی تہدید و وعید کی پروانہ کی اس نے کہا اَحطتُّ بِمَالَمْ تُحِطْ بِهٖ (میں ایک ایسی خبر لے کر آیا ہوں جس کی اطلاع آپ کو نہ تھی)

شرح: جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے ہدہد کے غائب ہونے پر باز پرس کی تو اس نے کہا اَحطتُّ بِمَالَمْ تُحِطْ بِهٖ (النمل:۲۲) یعنی میں اس چیز تک پہنچ گیا جہاں آپ نہیں پہنچے۔ اس وقت ہدہد پر نہ کوئی خوف و ہراس تھا اور نہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی تہدید و وعید کی پروا تھی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی تہدید و وعید کے باوجود ایک معمولی جانور نے اپنی علمی قوت و صلاحیت کا ثبوت پیش کیا اور جرأت مندانہ جواب دیا۔

حضرت آدم علیہ السلام کو فرشتوں پر علم کی وجہ سے فضیلت بخشی اور فرمایا اے فرشتو! تم عبادت میں آگے ہو لیکن آدم علم میں تم سے افضل ہیں۔ تم اپنی عبادت گذاری کے باوجود اس آدم کو سجدہ کرو جو علم سے آراستہ ہے۔ اس بات سے بھی علم کی فضیلت پر دلیل ملتی ہے۔

فصل-۱۳

صوفیاء کے آدابِ گفتگو کے بیان میں

قولہ: فصل فی ذکر ادا بھم فی محاوراتھم

(ارشاد شیخ ہے) یہ فصل صوفیا کے ان آداب کے بیان میں ہے جو وہ اپنے محاورات میں استعمال کرتے ہیں۔

شرح: حضرت امام ثوری رحمۃ اللہ علیہ سے لوگوں نے پوچھا لوگ دوسروں کو نصیحت کرنے کے لائق کب ہوتے ہیں؟ انہوں نے فرمایا جب وہ اللہ تعالیٰ سے سمجھنے لگیں تو بندوں کو سمجھانے کے لائق ہو گئے۔

ان کا مطلب واللہ اعلم یہ ہوگا کہ عالم جب خود عمل کرنے لگے تو اس کے لئے حلال و جائز ہے کہ وہ علمی گفتگو کرے۔ جب علم اس عالم کے لئے فائدہ بخش ہوگا تو لوگوں کے لئے بھی نفع بخش ہوگا۔ اس لئے کہ علم کے برکات عمل کے اندر ہیں۔

اور اللہ تعالیٰ سے سمجھنے کا مفہوم شاید یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے جتنی چیزیں پیدا کی ہیں ان میں کوئی نہ کوئی حکمت ضرور رکھی ہے۔ بندہ جب اس میں دیکھتا ہے تو اپنے صاف سر سے اسے دیکھتا ہے۔ اور اس کو دیکھنا اللہ تعالیٰ سے سمجھنا ہے۔

یا پھر اللہ تعالیٰ سے سمجھنے کا معنی یہ ہو کہ اپنے صاف سر سے اللہ تعالیٰ سے بلاواسطہ مستفیذ ہو۔ اس کے بعد لوگوں تک پہنچائے۔ اسی کو کہتے ہیں **یستفید من اللہ ویفید** غیرہ

اللہ تعالیٰ سے استفادہ کرے اور لوگوں کو مستفید کرے۔ اہل کمال کے لئے یہ سب ممکن ہے۔

حضرت خواجہ جنید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جب تک تمیں ابدال نے مجھے اس بات کی طرف اشارہ نہیں کیا کہ اب تم لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف بلا سکتے ہو اس وقت تک میں نے دعوت کا کام نہیں کیا۔ اور ابدال تو وہ ہیں جو لوگوں کے درمیان سب سے سچے ہوتے ہیں۔

یہ بھی حضرت خواجہ جنیدؒ سے منقول ہے انہوں نے فرمایا کہ میں نے اپنے کو راست بازوں کے سامنے پیش کیا تا کہ وہ مجھے قبول فرمالیں۔ اور میرے لائق ہونے کی گواہی دے دیں۔ جب تک ایسا نہیں ہوا میں نے لوگوں کے درمیان کوئی بات نہیں کہی۔

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ دعوت کے لئے صرف علم کافی نہیں ہے بلکہ علم کے ساتھ ساتھ عمل بھی ہو۔

قولہ: وھو ان یقصد بکلامه النصح والارشاد وطلب النجاة ومایعود نفعه علی الکل۔

(ارشاد شیخ ہے) صوفیاء کی گفتگو کا اصل مقصد نصیحت، ارشاد اور طلب نجات ہے اور گفتگو ایسی کی جائے جس کا نفع سب کو پہنچتا رہے۔

شرح: جو شخص اس راہ میں قدم رکھے یعنی پند و نصیحت اور وعظ و تقریر کی روش اختیار کرے اس کے لئے لازم ہے کہ اس کا اور اس کی نیت کا دار و مدار لوگوں کی خیر خواہی، لوگوں کی رہبری اور لوگوں کی نجات و رہائی پر ہو۔ اور اس کا فائدہ سارے مسلمانوں کو بار بار ملتا رہے۔ اس سلسلہ میں جماعتِ صوفیا کا طریقۂ کار یہ رہا ہے کہ ان کا ہر حرکت و عمل دوسروں کے لئے ہوتا اپنی ذات کے لئے کچھ نہیں کرتے۔ یعنی ہر وہ کام جو ان کے اور دوسروں کے درمیان کا ہوتا ہے اس میں دوسروں کی بھلائی دیکھتے، اپنی بھلائی نہیں دیکھتے۔ اپنی بھلائی دیکھنا اپنے وجود میں خیانت ہے اور دوسروں کی بھلائی فضل و کرم اور امانت داری ہے۔ جو کام لوگوں کو پسند آتا وہ حق سبحانہ تعالیٰ کو پسند آتا۔ چنانچہ تعلیم یعنی درس و تدریس کا کام دوسروں کی بھلائی کے لئے کرتے۔ روپیہ کمانے کے لئے نہیں کرتے۔ بے لوث تعلیم بہترین عبادت ہے۔ اس لئے کہ یہ پیغمبروں کا عمل

رہا ہے۔ اور پیغمبروں نے یہی فرمایا ہے **لانسئالکم علیه اجرا** (ہم اس کے لئے کسی اجرت کا مطالبہ نہیں کرتے) اگر روپیہ کمانے کی نیت سے تعلیم دیتے تو یہ بدترین گناہ ہوتا۔ اس لئے کہ روپیہ لے کر تعلیم دینا، دین کو، خدا کو اور پیغمبروں کو رقم کے عوض بیچنا ہوتا۔

حضرت صالح حمدون قصار سے لوگوں نے دریافت کیا آخر کیا بات ہے کہ اگلے بزرگوں کی باتیں دلوں کے لئے زیادہ نفع بخش ہوتی تھیں۔ ہم لوگوں کی باتوں میں وہ اثر نہیں ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ وہ لوگ جو بات بھی کرتے تھے وہ اسلام کی عزت، لوگوں کی نجات اور خدا کی رضاء کے لئے کرتے تھے، اور ہم لوگ عزتِ نفس، طلبِ دنیا اور لوگوں میں اپنی مقبولیت کی غرض سے کرتے ہیں۔ اس لئے آج کی باتیں فائدہ بخش نہیں ہوتیں۔

قولہ: ولایکلم الناس علیٰ قدر عقولهم.

(ارشاد شیخ ہے) اور لوگوں کی عقل کے مطابق گفتگو کی جائے۔

شرح: یعنی بات ایسی کی جائے جس کو سننے کی طاقت سامع رکھتا ہے۔ گفتگو کرنے والا اپنے وفور علم کے مطابق گفتگو نہیں کرے۔ اس لئے کہ طاقتِ سماعت عبارت کی حامل ہوتی ہے اور فہم معانی عبارت کی حامل ہوتی ہے۔

چنانچہ اگر پیٹھ پر طاقت سے زیادہ وزن رکھ دو گے تو ہلاکت رکھی ہوئی ہے اسی طرح اگر قوتِ افہام پر اس کی طاقت سے زیادہ معانی کا بوجھ ڈال دو گے تو یہاں بھی ہلاکت ہے۔ ایسی صورت میں ہر ایک کی عقل کے مطابق ضروری گفتگو کی جائے گی۔ تاکہ بات بن جائے۔

اسی لئے بزرگوں نے اس کو غذا سے مثال دی ہے۔ اور فرمایا ہے کہ انسان کو زندہ رہنے کے لئے غذا چاہیئے۔ اگر مقدار سے کم غذا لے گا تو کمزور اور ہلاک ہو جائے گا۔ اور اگر مقدار سے زیادہ غذا لے گا تو بیمار ہو کر ہلاک ہو جائے گا۔

حدیث میں آیا ہے کہ حضرت امیر المؤمنین عمر خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا ایک روز ہم اور حضرت امیر المؤمنین ابوبکر رضی اللہ عنہ بارگاہِ رسالت میں حاضر تھے، اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت ابو بکر سے کچھ فرمایا میں نے سن لیا مگر کچھ سمجھ نہ سکا کہ حضور ﷺ نے کیا فرمایا، پھر دوبارہ حضور ﷺ

نے کچھ فرمایا جس کو میں نہ سمجھ سکا اور نہ سن سکا کہ کیا فرمایا۔ اس حدیث کے سلسلہ میں حضرت شیخ عین القضاۃ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کیا لوگوں نے یہ گمان کرلیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کوئی نفرت تھی۔ حاشا و کلا ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ لیکن ہاں! شیر خوار بچے کو بریانی اور میٹھا نہیں دیا جاتا اس لئے کہ اس کا معدہ برداشت نہیں کرسکتا۔ بڑا ہونے پر کھانے پینے کی چیزیں نقصان نہیں پہنچاتیں۔

حضرت شیخ علیہ الرحمہ (حضرت خواجہ ضیاء الدین ابو نجیب سہروردیؒ) نے اس حدیث کو دلیل بنائی ہے۔

قولہ: قال النبی ﷺ نحن معاشر الأنبیاء أمرنا أن نکلم الناس علیٰ قدر عقولھم.

(ارشاد شیخ ہے) نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہم لوگ پیغمبروں کی جماعت ہیں، ہم لوگوں کو حکم ہوا ہے کہ لوگوں سے ان کی عقل کے مطابق گفتگو کریں۔

شرح: اپنے علم کے مطابق گفتگو نہیں کریں۔ اسی کو نزول کہتے ہیں۔ **یقال نزل النبی علی مقام امتہ و نزل المعلم علیٰ مقام تلمیذہ** (گفتگو کے وقت نبی اپنی امت کے معیار کے مطابق اور معلم اپنے طلباء و شاگرد کے معیار کے مطابق نزول کر کے بات کرتے ہیں)

خداوند تعالیٰ کے کلام میں بھی نزول ہے اس نزول سے یہی نزول مراد ہے حقیقی نزول مراد نہیں ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے بندوں کی عقل و سمجھ کے مطابق فرمایا ہے اپنے کمالِ علم کے مطابق نہیں فرمایا ہے۔

قولہ: ولا یتکلم فی مسئلۃ الا ان یسئل عنھا.

(ارشاد شیخ ہے) صوفیا کسی مسئلہ میں اس وقت تک گفتگو نہیں کرتے جب تک اس مسئلہ کے بارے میں ان سے پوچھا نہ جائے

شرح: صحابہ اور سلف صالحین رضی اللہ عنہم کی عادت بھی یہی رہی ہے۔ اس لئے کہ جب بندہ لوگوں میں مشغول ہوگا تو وہ حق سے محجوب ہوگا۔ اور یہ حضرات اس بات سے ڈرتے ہیں کہ کہیں مشغول رہ گئے اور فرماں برداری جاتی رہی۔

نقل ہے کہ ایک مرید اپنے پیر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا اے پیر ومرشد! میں چاہتا ہوں کہ اعتبار کے طور پر بت خانہ جاؤں اور تھوڑی دیر ان لوگوں کا تماشا دیکھوں۔ پیر نے اپنے اس مرید سے فرمایا کہ اگر تم کو وہاں سے آنے نہ دیا اور تم کو وہیں چھوڑ دیا گیا تو پھر کیا کرو گے۔

ابدال کی صفت یہی ہے کہ جب تک لوگ ان سے سوال نہیں کرتے ہیں وہ گفتگو نہیں کرتے۔ اور جب لوگ کچھ دریافت کرتے ہیں تو اس وقت دیکھتے ہیں کہ سائل جواب کے لئے پریشان تو نہیں ہے۔ اگر پریشان نہیں ہے تو خاموش رہ جاتے ہیں اور اگر پریشان دیکھتے ہیں تو اس کی ضرورت بھر جواب دے دیتے ہیں۔

قولہ: واذاسئل عنها أجاب علىٰ قدر السائل.

(ارشاد شیخ ہے) اور جب ان سے پوچھا جائے تو سوال کرنے والے کی صلاحیت کے مطابق جواب دیتے۔

شرح: یعنی جواب سوال کرنے والے کی صلاحیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے دیتے اپنی علمی صلاحیت کے مطابق جواب نہیں دیتے۔ اس لئے کہ جس بچہ کی غذا دودھ ہے اس کو اگر روٹی حلوہ کھانے کو دے دیں تو وہ ہلاک ہو جائے گا۔

ایک بزرگ نے اس جماعتِ صوفیا کی صفت ان الفاظ میں بیان کی ہے و کـ انوا یُعدون الابتداء قبل السوال من شهوة الخفية للكلام (صوفیائے کرام اپنے شیوخ سے رازونیاز سے متعلق سوال کرنے سے پہلے تیاری کر لیتے کہ بات کس طرح شروع کریں گے)

قولہ: قيل حكى عن الجنيد ؒ انه قيل له يسئالك السائل عن مسئلة فتجيبه بجواب ثم يسئالك اخر عن تلك المسئلة فتجيبه بجواب اٰخر فقال علىٰ قدر السائل الجواب

(ارشاد شیخ ہے) بعض لوگوں نے حضرت جنید ؒ کے بارے میں یہ حکایت بیان کی ہے کہ ان سے کہا گیا کہ جب کوئی سائل آپ سے کسی مسئلہ پر سوال کرتا ہے تو آپ اس کو ایک

جواب دیتے ہیں۔اور جب دوسرا شخص آپ سے اسی مسئلہ کو دریافت کرتا ہے تو آپ دوسرا جواب دیتے ہیں۔خواجہ جنید نے فرمایا جواب سائل کی صلاحیت کے مطابق ہوتا ہے۔

شرح: اسی لئے کہا جاتا ہے کہ یہ صوفیا طبیب حاذق ہوتے ہیں جو ہر شخص کے مرض کے مطابق دوا اور معجون تیار کرتے ہیں۔اگر ایسا نہیں ہوتو پھر لوگوں میں پریشانیاں بڑھ جائیں گی۔

مسئلہ ایک اور جواب مختلف اس کی نظیر اور مثال موجود ہے کہ ایک بزرگ سے کسی نے پوچھا ما الزھد زہد کیا ہے؟ سوال کرنے والا مال کی محبت میں مبتلا تھا اس بزرگ نے اس کو جواب دیا الزھد ترک المال مال کا ترک کر دینا زہد ہے۔دوسرے نے یہی سوال کیا جو جاہ ومرتبہ کی محبت میں مبتلا تھا اس کو جواب ملا الزھد ترک الجاہ جاہ ومرتبہ کو چھوڑ دینا زہد ہے۔تیسرے نے بھی یہی سوال کیا ما الزھد زہد کیا ہے فرمایا الزھد ترک الشھوات ۔شہوات کو ترک کر دینا زہد ہے۔دیکھا! مسئلہ ایک،سوال ایک اور جواب تین طرح سے دیا گیا۔

قولہ: واذا سئال لا یسئال الاعن مقامه ولا یتکلف بمالم یبلغه ولا یتکلم فیما لا یبلغ استعماله

(ارشاد شیخ ہے) جب سوال کرنے والا سوال کرے تو اپنے مقام کے اعتبار سے سوال کرے جو مقام اس کو حاصل نہیں اس میں تکلف نہ کرے اور ایسے علم پر گفتگو نہ کرے جہاں تک اس کا معاملہ پہنچا نہیں۔

شرح: ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا۔ حدثنی یا رسول اللہ عن غرائب العلوم فقال النبی ما اعتددت للموت اے اللہ کے رسول! علوم کے عجائبات پر کچھ فرمایا جائے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا یہ تو بتاؤ کیا تم نے موت کی تیاری کی ہے۔حضور ﷺ کا یہ جواب اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ سائل کا سوال اس کے اپنے مقام کے اعتبار سے نہیں تھا۔اس لئے اس کے مقام کے لحاظ سے یہاں پر جواب دیا گیا۔

اگر اس طرح توجیہہ نہیں کریں گے تو شارع علیہ السلام کے جواب کو غلط کہنا پڑے گا اور یہ کسی طرح بھی درست نہیں۔

سوال علوم کے عجائبات کے بارے میں ہو رہا ہے اور جواب موت کی تیاری سے متعلق دیا جا رہا ہے۔ یہاں پر اُس جواب کا مطلب یہ بھی ہے کہ سائل کو متنبہ اور منع کیا جا رہا ہے کہ غرائب علوم کے بارے میں سوال نہ کرو اس لئے کہ یہ باتیں تمہاری سمجھ سے باہر ہیں۔ ہاں! اگر پوچھنا ہی ہے تو موت کی تیاریوں کے بارے میں سوال کرو جو تمہارے لئے مفید، سودمند اور تمہاری سمجھ کے عین مطابق بھی ہے۔

قولہ: وقد قیل یجوز ذلک فقد قال رسول اللہ ﷺ رب حامل فقه الی من هو افقه منه.

(ارشاد شیخ ہے) بعض لوگوں نے کہا ہے کہ ایسا سوال کرنا جائز ہے جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا اکثر فقیہ ایسے ہوئے ہیں جو اپنا علم ان لوگوں کو پہنچاتے ہیں جو ان سے زیادہ فقیہ ہوتے ہیں۔

شرح: یہ سچ اور درست ہے کہ بعض لوگوں نے کہا ہے ان چیزوں کے بارے میں سوال کرنا جائز ہے اگر چہ وہاں تک اس کے معاملات نہ پہنچے ہوں اور ان کاموں پر وہ کاربند نہ ہوا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی اسے وہاں تک پہنچا دے اور وہ اس پر کاربند ہو جائے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بہت سارے فقہی مسائل کے حامل ایسے ہوئے ہیں جو اس کو وہاں تک پہنچا دیتے ہیں جو اس سے زیادہ فقیہ ہے۔

رب حامل فقه..........الیٰ آخره..........ای رب صاحب روایة لایعلم الروایة فلو بلغه الی الفقیه کما سمعه فالفقیه یستنبط المعنی الذی یتعلق به الحکم (بہت سے راوی ایسے ہیں جو روایت تو کرتے ہیں مگر روایت سے متعلق حکم کو نہیں جانتے ہیں۔ جب اس روایت کو کسی فقیہ کے پاس لے جاتے ہیں اور اس کے پاس بیان کرتے ہیں جیسا کہ اس نے سنا ہے تو فقیہ اس روایت سے متعلق وہ معنی مستنبط کرتا ہے جس کے بارے میں حکم آیا ہے)

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اگر چہ سائل ایسا علمی سوال کرتا ہے جہاں تک اس کی رسائی

نہیں یا ایسی گفتگو کرتا ہے جہاں اس کا عمل دخل نہیں۔ تو یہ بعض لوگوں کے نزدیک جائز ہے۔

قولہ: ولا یبذل العلم الا لاهله وقیل یجوز ان یبذل العلم لاهله ولغیر اهله.

(ارشاد شیخ ہے) تعلیم انہیں کو دی جائے جو اس کے اہل ہیں، بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اہل اور نا اہل سب کو تعلیم دینا جائز ہے۔

شرح: جو نا اہل کو تعلیم دیتا ہے وہ علم پر ظلم کرتا ہے اور جو اہل کو تعلیم دینے میں کوتاہی برتتا ہے وہ اس شخص پر ظلم ڈھاتا ہے۔

البذل-العطاء- بذل عطاء و بخشش کو کہتے ہیں۔ احیاء میں آیا ہے کہ ایسی بھی جماعت ہے جس کے افراد کو تعلیم دی گئی تو وہ راہِ خدا کے رہزن ہو گئے۔ ان میں کا ہر ایک شخص اپنے شہر کا نائب دجال بن گیا۔ دنیا کی حرص میں مبتلا ہو گیا۔ خواہشاتِ نفسانی پر چلنے لگا۔ دوسرے لوگ ان کو دیکھ کر گناہ کرنے پر دلیر ہو گئے۔ اس وقت ان کا علم ان کے لئے مثال بن کر رہ گیا۔ ان لوگوں نے برائی اور خواہشاتِ نفسانی کی اتباع کے لئے اپنے علم کو وسیلہ بنالیا۔ اور اسی میں لگ کر رہ گئے۔ اس کا سارا وبال اس استاد کے سر گیا جس نے ایسے لوگوں کو تعلیم دی، وہ ایسے لوگوں کی نیت کے فتور اور ارادہ کو جانتے تھے، ان کے کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے، رہن سہن اور بول چال پر گناہوں کا غلبہ تھا، ان کو رات دن دیکھ رہے تھے، پھر بھی تعلیم دی، ایسے استاد اور معلم تو دنیا سے گذر گئے مگر ان لوگوں کی شرارتیں ہزار دو ہزار سال تک باقی رہیں۔

حیرت اور تعجب کی بات تو یہ ہے کہ ایسے معلم اپنی جہالت کی وجہ سے جواب دیتے ہیں کہ اعمال کا انحصار نیت پر ہے۔ میرا مقصد تو علمِ دین کو پھیلانا تھا۔ اب اگر وہ فتنہ وفساد میں لگا ہے اور گناہوں میں ملوث ہے تو اس میں میرا کیا قصور! میں تو یہ چاہ رہا تھا کہ اس کو خیر پر لگادوں۔

یہ جواب شیطانی مکر وفریب ہے۔ شیطانی علمی شان اور حب جاہ کے غرور و گھمنڈ کے ذریعہ مکر وفریب کے جال میں پھنسا دیتا ہے۔ یہ جواب تو ایسا ہی ہوا جیسے کسی رہزن کو کوئی تلوار دے دے اور غارت گری کے سامان مہیا کردے اور کہے کہ میں نے سخاوت اور بخشش وعطا کی نیت سے ایسا کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے اخلاق سے اپنے کو متصف کرنے کی نیت سے کیا ہے۔ اب

اگر کوئی اس تلوار سے رہ زنی کا کام لے تو گنہگار وہ ہوگا۔

فقہا کا اس بات پر اجماع ہے کہ یہ حرام ہے۔ اگر سخاوت اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے پسندیدہ اخلاق ہے۔ لیکن اس پر یہ کیسے واجب ہوگیا کہ اس کے احوال کا جائزہ نہیں لیا۔ جب اس کی عادت معلم پر روشن ہوگئی تو چاہئے کہ اس بات کی کوشش کرے کہ اس سے اسلحہ ضبط کرلے نہ کہ اس کے برعکس اس سلسلہ میں اس کی مدد کرے۔ علم بھی اسلحہ ہے۔ جس کے ذریعہ شیطان اور دشمنانِ خدا سے جنگ کرتے ہیں۔ لہٰذا جس نے دنیا کو دین پر فوقیت دی اور خواہشاتِ نفسانی کو آخرت پر فضیلت دی پھر یہ کیسے جائز ہوگا کہ علم کے ذریعہ اس کی مدد کی جائے کہ وہ اس کے ذریعہ اپنی خواہشات کی تکمیل کرے۔

علمائے سلف نے ہمیشہ طلباء کے احوال کے مطابق مہربانیوں کا سلوک کیا ہے اگر کسی طالب علم کو دیکھتے کہ نوافل کی ادائیگی میں کوتاہی کررہا ہے تو اس کو پڑھانے سے انکار کردیتے۔ اس پر نوازش و کرم نہیں کرتے۔ اسی طرح اگر فسق و فجور اور حرام کاموں میں ملوث پاتے تو اس کو اپنی مجلس سے نکال دیتے قطع تعلق کرلیتے اور اس سے بات چیت بند کردیتے۔ یہاں تک کہ وہ طالب علم علم کی طرف مائل ہوجاتا۔

اور بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اہل ہو یا نا اہل سب کو تعلیم دینا جائز ہے۔ جو اہل اور لائق ہیں ان کو تعلیم دینے پر تو سب متفق ہیں لیکن جو نا اہل اور نالائق ہے اس کو تعلیم دینے میں لوگوں کا الگ الگ خیال ہے۔

قولہ: **فالعلم امنع جانبا من ان یصل الی غیر اهله.**

(ارشاد شیخ ہے) علم میں وہ طاقت وقوت ہے کہ وہ خود نا اہل کے پاس پہنچنے سے اپنے کو روک لیتا ہے۔

شرح: امنع۔اقوی کے معنی میں ہے۔ یعنی علم کو جو عزت و عظمت حاصل ہے وہ خود اتنی مضبوط اور قوی ہے کہ نا اہل کے پاس ہرگز نہیں پہنچتا۔ اور اگر شاذ و نادر پہنچ بھی جائے تو دیر تک نہیں ٹھہرتا۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جو اس کے اہل ہیں علم ان ہی کو ملتا ہے۔ اہل

سے مراد وہ لوگ ہیں جو خالصاً ومخلصاً دین کے لئے علم حاصل کرتے ہیں تا کہ اس کے ذریعہ رضائے الٰہی نصیب ہو جائے۔ اور نا اہل سے مراد وہ لوگ ہیں جو لوگوں میں عزت ومرتبہ پانے کے لئے علم حاصل کرتے ہیں یا علم کو دنیا جمع کرنے کا ذریعہ بناتے ہیں۔

قولہ: ولایتکلم بین یدی من هو اعلم منه سئل ابن المبارک مسئلة بحضرة سفیان فقال انا لانکلم عندالاستاذ.

(ارشاد شیخ ہے) اور اپنے سے زیادہ علم ودانائی والے کے سامنے گفتگو نہ کرے۔ حضرت ابن مبارک سے حضرت سفیان ثوری کی موجودگی میں جب کوئی مسئلہ دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا ہم استاد کے سامنے کچھ نہیں بول سکتے۔

شرح: حاصلِ کلام یہ کہ مشائخ کی غیرت سے بچنا چاہئے۔

نقل ہے کہ ایک روز حضرت عمر بن عثمان مکی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت حسین منصورؒ کو دیکھا کہ کچھ لکھ رہے ہیں۔ پوچھا۔ کیا لکھ رہے ہیں؟ انہوں نے فرمایا قرآن سے معارضہ کر رہا ہوں۔ حضرت عمر بن عثمانؒ نے یہ سن کر ان کے لئے بددعاء کی اور ان سے الگ ہو گئے۔ بزرگوں نے فرمایا ہے کہ حضرت حسین منصور کے ساتھ جو معاملہ پیش آیا وہ حضرت عمر بن عثمان مکیؒ ہی کی دعائے بد کا اثر تھا۔

قولہ: وقال بعضهم لا یحسن هذا العلم الالمن یعبر عن وجده وینطق عن فعله.

(ارشاد شیخ ہے) جماعتِ صوفیا میں سے بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ اس علم پر گفتگو کرنا اسی کو زیب دیتا ہے اور اسی کے لئے بہتر ہے جس کی وہاں تک پہنچ ہے اور جو اپنے عمل کے مطابق گفتگو کرتا ہے۔

شرح: وجد اس بات کو کہتے ہیں جو دل تک پہنچ جائے دل کو اس کی خبر ہو جائے چاہے ہمی ہو یا غمی۔ یا اس جہان کے احوال کی کوئی بات دیکھنے سے اس کے سر میں افشاء ہو۔

نقل ہے کہ ایک روز حضرت ابوالحسن نوری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت خواجہ جنید رحمۃ اللہ علیہ کو

دیکھا کہ منبر پر تشریف فرما ہیں اور لوگوں کے درمیان تقریر کر رہے ہیں تو ان کو مخاطب کیا اور فرمایا اے ابا القاسم! اللہ تعالیٰ کسی عالم سے اس کے علم کی وجہ سے خوش نہیں ہوتا۔ ہاں! جب وہ عالم اپنے علم کے مطابق عمل بھی کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے راضی اور خوش ہوتا ہے۔ اس لئے اگر تم اپنے علم پر عمل بھی کرتے ہو تو پھر وعظ و تقریر کر سکتے ہو۔ اور اگر علم کے مطابق تمہارا عمل نہیں تو پھر منبر سے نیچے آ جاؤ۔ حضرت خواجہ جنیدؒ اسی وقت منبر سے اتر آئے۔ اور ایک مہینہ تک لوگوں سے مخاطب نہیں ہوئے۔ یعنی خواجہ جنید نے جب اپنے اندر غور کیا تو دیکھا کہ حضرت ابوالحسن نوریؒ نے جس بات کی طرف اشارہ کیا تھا وہ بات ان کے اندر نہیں ہے۔ لہٰذا ایک مہینہ تک گھر میں بیٹھ گئے۔ اس کے بعد باہر آئے۔ اور فرمایا اگر مجھ تک رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث نہ پہنچتی تو میں ہرگز تم لوگوں سے گفتگو نہیں کرتا۔ اور وہ حدیث یہ ہے کہ آخر زمانہ میں قوم کے پیشوا، رہبر سردار قوم کے سب سے ذلیل لوگ ہوں گے۔" حضرت کا یہ فرمانا اس بات کا اقرار تھا کہ میں اپنے کو عالم و فاضل سمجھ کر تقریر نہیں کر رہا ہوں بلکہ اپنی کمتری اور بے ادبی کی بنا پر کر رہا ہوں تا کہ اگر علم کا حق ادا کرنے میں راست باز نہ بن سکوں تو اپنی تقصیر کے اقرار میں تو سچا بن جاؤں۔

کہتے ہیں کہ عالم کو عامل ہونا چاہئے تا کہ علمی موضوع پر گفتگو کرنا اس کے لئے حلال و جائز ہو جائے۔ جب علم کا فائدہ عالم کو ہو گا تو دوسروں کو بھی ہو گا۔ اس لئے کہ علم کے برکات عمل میں ہیں۔ اگر عمل ضروری نہ ہوتا تو پھر آسمان سے علم کا نزول کیوں ہوتا۔

نقل ہے کہ حضرت امام احمد حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے ایک شاگرد کا واقعہ ہے کہ وہ برسوں سے حضرت کے پاس آیا جایا کرتے۔ ایک روز ایسا ہوا کہ حضرت نے ان سے رخ پھیر لیا۔ گفتگو بند کر دی اور اپنے سے دور کر دیا۔ یہ ہمیشہ اس فکر میں رہتے کہ آخر اس عتاب کی وجہ کیا ہے۔ برابر دریافت کرتے۔ آخر ایک روز حضرت نے فرمایا مجھے معلوم ہوا ہے کہ جدھر سے مسلمانوں کے گذرنے کا راستہ ہے ادھر سے تم نے اپنی دیوار کے لئے ایک انگلی بھر مٹی لے لی ہے۔ جب مسلمانوں کے راستہ سے مٹی لے لی تو تم اس لائق نہیں رہے کہ تمہیں علم سے آراستہ کیا جائے۔

اگلے بزرگ اپنے طلباء کو اس طرح تعلیم دیا کرتے تھے۔ یہ اور اس طرح کی بہت

ساری مثالیں موجود ہیں۔

اس زمانہ میں اپنے کاندھوں پر شال رکھنے والے اور چوڑی چوڑی آستین کے کرتے پہننے والے بہت سارے لوگ بڑی بڑی تقریریں کر کے فضیلت و بڑائی کی نظروں سے دیکھے جا رہے ہیں۔

قولہ: وقیل من لم ینتفع بسکوتہ لم ینتفع بکلامہ

(ارشاد شیخ ہے) اور کہا گیا ہے کہ جس نے خاموشی اور سکوت سے فائدہ نہیں اٹھایا اس نے اپنے کلام سے بھی کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔

شرح: یعنی جس کی خاموشی سے فائدہ نہیں پہنچے اس کی گفتگو بھی نفع بخش نہیں ہوتی۔ اس کی اصل یہ ہے کہ اگر خاموش رہے گا تو حق کے ساتھ ہوگا۔ اور اگر گفتگو کرے گا تو حق کی گفتگو کرے گا۔ جب دونوں صورتوں میں حق کے ساتھ ہوگا تو یقیناً خاموشی اور گویائی دونوں نفع بخش ہوگی۔

بعض مشائخ نے اپنے مریدوں کو عمل کے ذریعہ دعوت دی ہے گفتگو کے ذریعہ نہیں۔۔ یعنی جب مرید اپنے شیخ کے ساتھ ہوتا اور ان کی صحبت میں رہتا تو وہ ان کے اعمال صالحہ کو دیکھتا ان کو سیکھتا اور ان کو اپنا لیتا۔ کہنے اور زبانی حکم دینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ خاموش رہتے تو ان کی خاموشی حلم کی وجہ سے ہوتی، یا حیا کے سبب ہوتی یا فکر کی بنا پر ہوتی جو حیا کی وجہ سے خاموشی اختیار کرتا ہے اس کی باتیں دلوں کو حیات بخشتی ہیں۔ جو حلم کی وجہ سے خاموشی اختیار کرتا ہے اس کی گفتگو میں علم ہوتا ہے اس لئے کہ اس کی گفتگو دیدار سے متعلق ہوتی ہے۔ جو فکر کی وجہ سے خاموش رہتا ہے اس کی گفتگو ذکر کے موضوع پر ہوتی ہے۔ اس لئے کہ اس کی باتوں میں حضوری ہوتی ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے لوگوں نے پوچھا کہ دنیا میں آپ کے جیسا بھی کوئی ہے؟ انہوں نے فرمایا ہاں ہے وہ شخص جس کی خاموشی فکر میں اور جس کی گفتگو ذکر میں ہوتی ہے وہ میرے جیسا ہے اس لئے کہ وہ جب گفتگو کرے گا تو دیدار کے بارے میں گفتگو کرے گا۔

قولہ: ومن الأدب ان لایتکلم فی العلم قبل اوانه فیتولد منه أفات تقطعه عن الفوائد.

(ارشادِ شیخ ہے) اور علم کا ادب یہ ہے کہ وقت سے پہلے علم پر گفتگو نہ کرے۔ اگر وقت سے پہلے گفتگو ہوگی تو اس سے اتنی آفتیں پیدا ہوں گی کہ وہ اس کے فوائد کو ضائع کر دیں گی۔

شرح: اسی لئے کہتے ہیں کہ جس نے علم شریعت کو اولیت نہیں دی اور جماعتِ صوفیا کے علم میں داخل ہو گیا اس نے اپنے دین کو برباد کر دیا۔ اس لئے کہ جماعتِ صوفیاء کا علم اعمال کی تمام برائیوں کو جاننا ہے۔ جب علم شریعت سے اچھی طرح واقفیت نہیں ہوئی برے اعمال کی تمیز پیدا نہیں کی اور یہ سمجھ لیا کہ ہمارے اعمال صحیح و درست ہیں۔ یا پھر علم شریعت کو حاصل کیے بغیر صدیقوں اور مخلصوں کے ان کاموں پر عمل کرنا شروع کر دیا جن کی صلاحیت اس کو نہیں تھی تو ایسی صورت میں اس نے ترقی نہیں کی مقصد سے دور ہوتا گیا اور دین کو برباد کر دیا۔

قولہ: ویحذر کل الحذر أن یطلب الجاه والمنزلة عند الناس وحطام الدنیا فیکون ممن لّا ینفعه الله بعلمه وقد استعاذ النبی ﷺ من علم لاینفع وقال علیه السلام من طلب العلم لیباهی به العلماء اویماری به السفهاء اویصرف به وجوه الناس الیه فلیتبوّاء مقعده فی النار۔

(ارشادِ شیخ ہے) لوگوں کے درمیان عزت و مرتبہ حاصل کرنے اور حصولِ دنیا کی نیت سے علم حاصل کرنا غلط ہے اس سے پورے طور پر پرہیز کرنا چاہئے۔ ایسے علم سے اللہ تعالیٰ کوئی فائدہ نہیں پہنچاتا اور رسول اللہ ﷺ نے بھی اس علم سے پناہ مانگی ہے جو نفع بخش نہ ہو اور حضور ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ جس نے علم اس لئے حاصل کیا کہ اس کے ذریعہ علماء پر باعثِ افتخار بن جائے یا بے وقوف لوگوں پر اپنی فوقیت کا سکہ جمائے یا لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائے تو اس نے آتش دوزخ کو اپنا ٹھکانا بنا لیا۔

شرح: الحطام الفتات من الحطم وهو الکسر.

حطام، حطم سے نکلا ہے اور یہ توڑنے کے معنی میں ہے۔ یہ لوگ ایسے ہوتے ہیں

جن کوعلم سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔اوراس کی دلیل رسول اللہ ﷺ کی وہ حدیث ہے جس میں ایسے علم سے روکا گیا ہے جونفع بخش نہ ہو۔اور پناہ اسی چیز سے مانگتے ہیں جو بری ہوتی ہے۔اوراس کی دوسری دلیل حضور ﷺ کی حدیث پاک ہے جومندرجہ بالاعربی عبارت میں گذری،یعنی جس نے اس نیت سے علم حاصل کیا تاکہ اس علم کے ذریعہ علماء پرفخر حاصل کرے یا بےوقوفوں پراپنی برتری کارعب جمائے یالوگوں کی توجہ اپنی طرف کرے اورلوگوں کواپنی طرف مائل کرے تو ایسے شخص نے اپناٹھکانا آتش دوزخ کو بنالیا۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہرعالم کے پاس بیٹھا نہ کرو۔ہاں!اس عالم کے پاس بیٹھوجوتم کو پانچ چیزوں سے نکال کرپانچ چیزوں کی طرف بلائے۔

۱. شک سے نکال کریقین کی طرف۔

۲. ریاسے نکال کراخلاص کی طرف۔

۳. دنیا کی رغبت سے نکال کرزہد کی طرف۔

۴. تکبر سے نکال کرتواضع وانکساری کی طرف۔

۵. مسلمانوں کی عداوت ودشمنی سے نکال کرمسلمانوں کی ہمدردی وخیرخواہی کی طرف بلائے۔

حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ نے فرمایااس شخص پرایک بارویل (افسوس) ہے جوعلم نہیں رکھتا اوراس شخص پرسات بارویل (افسوس) ہے جوعلم رکھتے ہوئے عمل نہیں کرتا۔

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ علمائے امت جب تک بادشاہوں سے میل جول نہیں رکھتے اللہ کے بندوں کے لئے پیغمبروں کی طرح ہیں اورجیسے ہی انہوں نے بادشاہوں سے ربط بڑھالیاسمجھ لیجئے کہ انہوں نے پیغمبرانہ اصول وضوابط کے ساتھ خیانت کی۔ایسے لوگوں سے دورہو جایئے اورایسےلوگوں سے کنارہ کشی اختیارکرلیجئے۔

قولہ: **ویجتهد فی استعمال ما یسمعه و یتعلمه فقد قیل کل من سمع شیئا من علوم القوم فعمل به صار ذلک حکمه فی قلبه وینتفع به السامعون وکل من سمع ولم یعمل به کان ذلک حکایة یحفظها ایاما ثم ینساها.**

(ارشاد شیخ ہے) صوفی کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس نے جو کچھ سنا یا سیکھا ان پر پوری طرح عمل کرنے کی کوشش کرے۔ کہا گیا ہے کہ جس نے صوفیا کی علمی باتوں کو سنا پھر ان پر عمل کیا تو وہ علم اس کے دل میں حکمت ہو جاتا ہے اور اس علم وحکمت سے سننے والے مستفید ہوتے ہیں اور جو سن کر اس علم پر عمل نہیں کرتا تو اس علم کی حیثیت حکایت کی ہو جاتی ہے۔ جس کو لوگ چند روز یاد رکھتے ہیں پھر اس کو بھلا دیتے ہیں۔

شرح: اسی لئے لوگ کہتے ہیں کہ ساری باتوں کی بنیاد اچھی طرح سننے پر ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَلَو عَلِمَ اللّٰهُ فِيهِم خَيراً لَّأَسمَعَهُم (الانفال:۲۳) (اور اگر جانتا اللہ تعالیٰ ان میں کوئی خوبی تو انہیں ضرور سنا دیتا) اگر اللہ تعالیٰ ان کو دیکھتا ہے کہ سننے والے ہیں تو ان کے کانوں کو سننے کے لئے کھول دیتا ہے۔ یعنی جو وسوسہ والا ہو جاتا ہے یا جس کے باطن میں نفس کی باتوں کا غلبہ رہتا ہے اس کو حسنِ استماع پر قدرت نہیں ہوتی۔

حضرت خواجہ یحییٰ معاذ رازی نے فرمایا۔ کہ دل دو ہے۔ ایک دل وہ ہے جس نے دنیاوی مشاغل سے اپنے کو الگ کر لیا ہے۔ اس کے سامنے جب طاعت اور دین کا کوئی کام آتا ہے تو اس وقت اس کو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کرنا ہے اور دوسرا دل وہ ہے جس نے آخرت کے احوال سے اپنے کو علیحدہ کر لیا ہے۔ اس کے سامنے جب دنیا کا کوئی کام آتا ہے تو اس وقت اس کو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کرنا چاہئے۔ چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے اکثر اهل الجنة البله یعنی دنیاوی کاموں میں نادان ہوتے ہیں۔

قولہ: وقیل الكلام اذا خرج من القلب وقع فى القلب و اذا خرج من اللسان لم يجاوز عن الأذنين۔

(ارشاد شیخ ہے) کہا گیا ہے کہ دل سے جو بات نکلتی ہے وہ دل پر اثر ڈالتی ہے اور زبان سے جو بات نکلتی ہے وہ کان سے آگے نہیں جاتی اور دل تک نہیں پہنچتی۔

شرح: مصرعہ۔ سخن گر دل بروں آید نشیند لا جرم بر دل.

بات جب دل سے نکلتی ہے تو یقیناً دل پر بیٹھ جاتی ہے۔

یعنی جو بات صاحبِ دل کہتے ہیں وہ بات یقیناً سننے والے کے دل پر نقش ہو جاتی ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ سننے والا حضورِ قلب سے سنتا ہے۔ چنانچہ اگر گفتگو کرنے والا صاحبِ دل ہے اور سننے والا حضورِ قلب سے نہیں سنتا ہے تو وہ گفتگو دل پر اثر نہیں کرتی۔ اور ایسی گفتگو کا کوئی ثمرہ بھی نہیں ملتا۔

صاحبِ دل ان کو کہتے ہیں جو نفس کے حجاب سے باہر آ گئے۔ اور یہی علمائے آخرت ہیں۔ ان کی باتیں زبان سے نکلتی ہیں اور دل تک پہنچتی ہیں۔ اور اہل زبان علمائے دنیا ہیں۔ جنہوں نے لوگوں کے درمیان اپنے جاہ و مرتبہ کو عزت و وقار کو اپنا محراب بنا رکھا ہے اپنی بزرگی و برتری پر نازاں ہیں اور طرح طرح کی تاویلات و رخصت کے ذریعہ شریعت کی پابندی سے اپنے کو آزاد کر لیا ہے۔ شاہی دربار کو اپنا قبلہ بنا لیا ہے اور اسی کو اپنا دین سمجھ رکھا ہے۔ اس معنی میں کہا گیا ہے۔

یا معشر القراء ما ملح البلد

ما یصلح الملح اذا الملح فسد

(اے قاریوں کی جماعت! اس شہر کے نمک کا کیا فائدہ۔ جب نمک ہی خراب ہو جائے تو نمک کیا کام کرے گا)

قولہ: **حکی ان رویماً قال للجنید کم تنادی علی اللّٰہ تعالیٰ بین یدی العامه فقال انا انادی علی العامه بین یدی اللّٰہ تعالیٰ.**

(ارشادِ شیخ ہے) یہ حکایت بیان کی گئی ہے کہ حضرت خواجہ رویمؒ نے حضرت جنیدؒ سے پوچھا آپ لوگوں کے سامنے اللہ تعالیٰ کو کتنی مرتبہ پکارتے ہیں۔ حضرت جنید نے فرمایا میں تو لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے سامنے پکارتا ہوں۔

شرح: یعنی میں اللہ تعالیٰ کے حضور ہوتا ہوں اور لوگوں کو بلاتا ہوں۔

اس جملہ کا ماحصل یہ ہے کہ حضرت رویم اور حضرت جنید کے سوال و جواب میں دراصل وہی بات پوشیدہ ہے جو ایک بزرگ کے بارے میں آیا ہے، انہوں نے فرمایا برسوں گذر گئے کہ

میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ محو گفتگو رہتا ہوں اور لوگ یہ سمجھ رہے ہیں کہ میں ان سے باتیں کر رہا ہوں۔ اسی مقام کی یہ بات بھی ہے کہ **العارف کائن معھم و بائن عنھم** عارف وہ ہے جو جسمانی طور پر لوگوں کے ساتھ ہو اور دل ان سے جدا ہو۔ چنانچہ جب بندہ دل سے حق سبحانہ تعالیٰ کے ساتھ ہوگا تو وہ جو کچھ بولے گا حق کی بات بولے گا۔ اور جب مخلوق سے اس کا دل جدا ہوگا تو یقیناً اس کی بات لوگوں سے جدا ہوگی۔ واللہ اعلم اسی طرح کی بات ہو۔

''آپ لوگوں کے سامنے اللہ تعالیٰ کو کتنی مرتبہ پکارتے ہیں''، یعنی جس کو خود اللہ تعالیٰ دعوت دے رہا ہے وہاں تمہارا کیا کام اور تمہاری دعوت و پکار سے کسی کو کیا فائدہ پہنچے گا۔ اپنے کو درمیان میں بے کار لگا رکھا ہے۔

سوال. اب یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ جہت وسَمت سے پاک ومنزہ ہے تو پھر **بین یدی الله** (اللہ کے سامنے) کہنا کیا صحیح و درست ہے؟

جواب. اس سوال کا جواب یہ ہوگا کہ جہاں اور جس جگہ بھی اس طرح کی عبارت اور جملے آتے ہیں ان سے مراد **حضور العبد بحضرة الله تعالیٰ** ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی جناب میں بندہ کی حضوری مراد ہے۔

قولہ: **فقال قوم افشوا اسرارھم بالحظوظ و أبصارھم باللحوظ انی لھم الی الحق سبیل.**

(ارشاد شیخ ہے) اور لوگوں نے کہا کہ ان لوگوں نے اپنے حظوظِ نفسانی اور نگاہوں کی وجہ سے اپنے اسرار کو فاش کر دیا۔ ایسے لوگوں کو حق کی طرف راستہ کہاں مل سکتا ہے۔

شرح: جب جماعتِ صوفیا کے لوگوں کے سامنے ان دونوں بزرگوں کی اس گفتگو کا ذکر ہوا تو لوگوں نے کہا **ھم قوم اظھروا اسرارھم** (یہ ایسے لوگ ہیں جنھوں نے حظوظ نفسانی کے لئے اپنے راز کو فاش اور ظاہر کر دیا) یعنی ان کے اور اللہ کے درمیان جو راز تھا اس کو اپنی خوشی کی خاطر آشکارا کر دیا۔ اپنے مقام، اپنے حال اور اپنی ذات پر نگاہ کی۔ حالاں کہ یہ سب صوفیا کے نزدیک بت پرستی ہے۔ اور جب اپنے اسرار کو ظاہر و عیاں کر دیا تو پھر اللہ تعالیٰ تک ان کو راہ

کہاں مل سکتی ہے۔ یعنی اپنی صفتوں کی وجہ سے حق سے محجوب ہو گئے۔

قولہ: وقیل للنوری لم تتکلم علیٰ اخوانک فقال لا نهم فی سفر الوحشه

(ارشاد شیخ ہے) حضرت نوریؒ سے کہا گیا کہ آپ اپنے بھائیوں سے (معرفت) کی باتیں کیوں نہیں کرتے۔ تو انہوں نے فرمایا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ سفر وحشت میں ہیں۔

شرح: سفرِ وحشت میں ہیں۔ واللہ اعلم۔ اس سے حضرت نوری رحمۃ اللہ علیہ کی مراد یہ ہو کہ یہ لوگ طلبِ کمال سے گریزاں ہیں۔ اور اپنے نقصان پر راضی وخوش ہیں۔ لہٰذا جب لوگوں کو کجرو دیکھتے ہیں تو اپنے حال پر نظر کرتے ہیں کہ اگر ان کی طرف مخاطب ہوئے اور ان کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کی تو اس بات کا خطرہ ہے کہ کہیں وہ لوگ جن کو راہِ راست پر لانا چاہتے ہیں وہ انہیں کو بے راہ نہ کر دیں۔

دوسرے نسخہ میں **لا نهم فی سفر الوحشه** کی جگہ پر **لانی فی سفر الوحشة** آیا ہے جس کا معنی شاید یہ ہو کہ حضرت کو حق تعالیٰ کے ساتھ جو کمالِ انس حاصل تھا اسی کی وجہ سے لوگوں سے وحشت کرتے اس لئے کہ جس کو اللہ رب العزت سے اُنس ہو گا اس کو یقیناً لوگوں سے وحشت ہو گی۔

قولہ: وحکی أن الشبلی قال فی مجلس الجنید الله فقال ان کنت حاضراً فهو ترک الحرمة و ان کنت غائبا فالغيبة حرام.

(ارشاد شیخ ہے) حضرت شبلیؒ کے بارے میں یہ حکایت آئی ہے کہ ایک روز انہوں نے حضرت جنیدؒ کی مجلس میں (بلند آواز سے) اللہ کہا۔ اس پر حضرت جنیدؒ نے فرمایا اگر آپ حاضر ہیں تو پھر اس طرح اللہ کہنا عزت و احترام کو ترک کرتا ہے اور اگر آپ غائب ہیں تو غائب اور غافل رہنا حرام ہے۔

شرح: حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ کا بلند آواز سے اللہ کہنے پر حضرت جنیدؒ کا حضرت شبلیؒ سے سوال کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ اگر بندہ بارگاہِ رب العزت میں حاضر ہے تو پھر اس طرح اللہ کہنا ادب کے خلاف ہے۔ اس لئے کہ حضوری کا ادب خاموشی

ہے اور دوسری بات یہ کہ جب دوری اور عدم حضوری نہیں ہے تو پھر ذکر اور یاد کی حاجت کہاں رہی ۔جب غائب حضوری میں بدل جائے اور دوری قربت میں تبدیل ہو جائے تو پھر ذکر کی حاجت نہیں رہی۔اور اسی کے برعکس اگر کوئی حضوری سے غائب ہے تو ایسی صورت میں اللہ کہنا غیبت ہے اور غیبت حرام ہے۔

ان کنت حاضراً جو کہا گیا ہے اس سے مراد اس شخص کی حضوری نہیں ہے بلکہ سر، بارگاہِ الٰہی میں حاضر رہے۔یعنی لوگوں کے درمیان موجود رہتے ہوئے بھی لوگوں سے دور اور غائب رہے۔اور ان کنت غائباً سے مراد دل کا غائب اور دور ہونا ہے۔یعنی جو شخص اپنے آپ سے غائب ہوگا وہ رب تعالیٰ کے ساتھ ہوگا۔اور جو اپنے ساتھ حاضر رہے گا وہ حق تعالیٰ سے غائب و دور ہوگا۔

قولہ: وسال الشبلی الجنید عن مسئلة فقال له یا ابابکر بینک و بین اکابر الناس عشرة الالف مقام، اولها محوما بدائت به.

(ارشادِ شیخ ہے) ایک دفعہ حضرت ابوبکر شبلیؒ نے حضرت جنیدؒ سے ایک مسئلہ دریافت کیا۔حضرت جنید نے ان سے فرمایا اے شبلی تمہارے اور اکابر بزرگوں کے درمیان دس ہزار مقامات ہیں۔جن میں پہلا مقام اس چیز کا محو اور دور کرنا ہے جس سے تم نے ابتداء کی ہے۔

شرح: یہاں پر جو دس ہزار مقامات کی بات کہی گئی ہے اس دس ہزار سے کثرت مراد ہے۔گنتی اور عدد مراد نہیں ہے۔

حضرت خواجہ جنید رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ کو اس طرح جو جواب دیا اس کا مقصد دراصل یہ تھا کہ ان کا علاج کیا جائے۔ان کو جو نقد وقت حاصل تھا وہ اس جملہ کے بعد اٹھ جائے اور ان کا افلاس دکھا دیا جائے۔

اس کی مثال اور نظیر نبی اکرم حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے یہاں بھی ملتی ہے۔حضور اکرم ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا لو اتزن ایمان ابی بکر مع

ایمان امتی ارجح ۔اگر ابو بکر کے ایمان کو میری امت کے ایمان سے وزن کیا جائے تو ابو بکر کا ایمان وزنی ہو جائے۔

لیکن اس ارشاد گرامی کے باوجود جب حضرت ابو بکر صدیق ؓ نے عرض کیا حضور! مجھے کوئی ایسی دعا بتائی جائے جو فرائض کے بعد پڑھا کروں تو ارشاد ہوا رب انی ظلمت نفسی ظلما کثیراً فاغفرلی ذنبی فانه لایغفر الذنوب الا انت پڑھا کیجئے۔

خواجہ جنید نے حضرت شبلی کے ساتھ یہی کیا۔طبیب حاذق ایسا ہی ہوتا ہے۔وہ الگ الگ بیماریوں کا الگ الگ علاج کرتا ہے۔تاکہ مریض صحت یاب ہو جائے۔

شطحیات

قولہ: واما الشَطحَیات المحکیات عن ابی یزید وغیرہ فذلک عند غلبة الحال وقوت السکر وغلبات الوجد فلا قبول لها ولا ردَّ

(ارشاد شیخ ہے) اور وہ شطحیات جو حضرت بایزیدؒ کی جانب منسوب ہیں وہ غلبۂ حال قوتِ سکر اور غلباتِ وجد میں سرزد ہوئے ہوں۔لہٰذا ان کو نہ قبول کیا جائے اور نہ رد کیا جائے۔

شرح: شطح :صوفیا کی اصطلاح میں کسی بات کو کھول کر بیان کرنا اور اس کو بیان کرنے میں کسی کے اقرار و انکار کی پروانہ کرنا شطح ہے۔یا پھر یوں کہا جائے کہ بغیر کسی خوف و ڈر کے کسی بات کو بیان کر دینا شطح ہے۔

غلبة الحال : غلبۂ حال سے مراد وہ کیفیت ہے جو بندہ کے اندر پیدا ہو اور اس وقت اس کی نگاہ اسباب پر اور ادب کی نگاہداشت پر نہ ہو۔یعنی حق سبحانہ تعالیٰ کی عظمت و جلال سے اس پر ایسی ہیبت ہو کہ دوزخ جو تمام بلاؤں کا مجموعہ ہے۔اس لمحہ اس کے سر سے ساقط ہو جائے یا حق سبحانہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اس کی ایسی حالت ہو کہ بہشت کی ساری نعمتیں اس کے سیر سے ساقط ہو جائیں۔اور بندہ کا یہ حال ہو کہ مولیٰ کے فراق سے بڑھ کر کوئی دوسرا عذاب اور دوسری بلا اس کے سامنے باقی نہ رہے۔اسی طرح مولیٰ کے وصال سے بڑھ کر اس کے سامنے کوئی دوسری

نعمت باقی نہ رہے۔ چھوٹی بلاؤں کو بڑی بلا میں گم کردے اسی طرح چھوٹی نعمتوں کو بڑی نعمت میں فراموش کردے۔ جب بندہ کا یہ حال ہوگا تو اس وقت اسباب شرعی مغلوب ہو جائیں گے۔ یہاں تک کہ اس میں یہ کمی آجائے گی کہ آداب شریعت کی حفاظت کا دامن اس کے ہاتھ سے جاتا رہے گا۔ آدابِ شریعت کو ملحوظ و محفوظ رکھنے میں وہ معذور ہو جائے گا۔ اور یہ برا و مکروہ نہیں ہے اس لئے کہ شاید بندہ مخلوقات میں سے کسی ایسی چیز سے مغلوب ہو جائے جیسے انتہائی غم یا انتہائی خوشی یا کوئی بڑا خوف طاری ہو جائے اور اس وقت مغلوب العقل ہو جائے اور آداب شریعت ساقط ہو جائے تو معذور سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح شاید کسی ایسی بیماری میں مبتلا ہو جائے جس سے بے ہوشی طاری ہو جائے اور نماز جاتی رہے تو اس وقت بھی معذور سمجھا جاتا ہے۔ یا پریوں کا حملہ ہو اور اسے پاگل و دیوانہ بنادے تو اس وقت احکامِ شریعت ساقط ہو جائے اور وہ معذور سمجھا جاتا ہے جنوں کے حملہ کے وقت، خوشی و غم کے غلبہ کے وقت یا بیماری کی حالت میں بندہ سے آدابِ شریعت کا ساقط ہو جانا جائز ہے تو پھر غلبۂ حق کے وقت آداب کا ترک ہو جانا زیادہ جائز ہے اس لئے کہ غلباتِ حق تمام چیزوں کے غلبہ سے زیادہ بہتر و برتر ہے۔

سوال: اب یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پیغمبروں کا مقام سب سے اعلیٰ اور افض ہے۔ لیکن یہ مغلوب نہیں ہوتے۔ پھر دوسرے لوگ کیوں مغلوب ہو گئے؟

جواب: اس کا جواب واللہ اعلم یہی ہوگا کہ اس مقام میں لوگ معذور ہوتے ہیں اور بندہ معذور وہی ہوتا ہے جہاں قصور کا امکان ہو۔ پیغمبران علیہم السلام تقصیری سے پاک ہیں۔ یہ مشکور ہونے میں معذور نہیں ہوتے۔ ان کے علاوہ دوسرے لوگ معذور بھی ہوتے ہیں اور مشکور بھی ہوتے ہیں۔

یہ تو عام جواب ہوا لیکن حقیقت کی زبان میں یہ جواب دیا جائے گا کہ انبیاء علیہم السلام کا مقام سب سے اعلیٰ مقام ہے، دوسرے لوگ جن چیزوں سے مغلوب ہو جاتے ہیں انبیاء ان مقامات کو طئے کئے ہوتے ہیں، غیر انبیاء اپنی کمزوری اور قوت کی کمی کی وجہ سے مغلوب ہو جاتے ہیں اور انبیاء کی قوت تمام غلبات کو مغلوب کر لیتی ہے۔

وقوت السکر: جماعتِ صوفیا کے نزدیک سکر یہ ہے کہ بندہ پر ایک ایسا حال پیدا ہوتا ہے جس میں اشیاء کی تمیز ختم ہو جاتی ہے، وہ خیر و شر اور نفع و نقصان میں فرق نہیں کرتا۔ آرام و تکلیف اس سے غائب نہیں ہوتے۔ لیکن وہ اپنے میں ایسا گم رہتا ہے اور ایسی کیفیت اس پر طاری رہتی ہے جس کو صوفیا کی اصطلاح میں سکران کہتے ہیں۔ حقیقتاً ایسا نہیں ہوتا۔ ظاہر میں وہ کوئی نشہ آور چیز نہیں لیتا ہے لیکن اس کو سکران کہتے ہیں۔ اور شرع میں ایسی بہت ساری مثالیں موجود ہیں۔ جیسے کوئی سرسام (دماغی بخار) کی بیماری میں مبتلا ہو کر مغلوب العقل ہو جاتا ہے اور فضول باتیں بکنے لگتا ہے۔ اس کی باتوں کی گرفت نہیں ہوتی۔ ارام و تکلیف اس کو پہنچتی ہے مگر تمیز نہیں کر سکتا۔ اسی طرح چھوٹے بچے کو جو آرام و تکلیف پہنچتی ہے لیکن وہ اس کو تمیز نہیں کر پاتا۔

وغلبات الوجد: وجد اس کو کہتے ہیں جو عالمِ غیب سے دل پر طاری ہو۔ اور دل کو اس کی خبر بھی ہو۔ چاہے وہ خوف ہو یا اُس جہان کے احوال میں سے کوئی حال اس کے سِر میں افشاء ہو یا اس بندہ اور خدا کے درمیان کوئی حال منکشف ہو۔

فلاقبول لها ولا رد- وہ شطحیات جو مشائخ کے متعلق آئے ہیں ان کے بارے میں حکم یہ ہے کہ نہ ان کو قبول کیا جائے اور نہ رد کیا جائے۔

قبول اس لئے نہیں کیا جائے کہ انبیاء کے علاوہ جو بھی ہیں وہ معصوم نہیں ہیں۔ شاید ان کی بات غلطی پر محمول ہو۔ اور باطل کو قبول کرنا حق کو نقصان پہنچانا ہے اور رد و انکار اس لئے نہیں کیا جائے کہ یہ باتیں اربابِ علم اور اصحابِ معرفت کی زبان سے صادر ہوئی ہیں۔ شاید ان کی نگاہ معنی پر رہی ہو اور دوسروں کی نگاہ حجاب کی وجہ سے وہاں تک نہیں گئی ہو۔ لہٰذا یہاں پر انکار و رد حق کا انکار ہوگا۔ اور حق کا انکار دین کے لئے نقصان دِہ ہے۔ لہٰذا ایسی صورت میں سب سے محفوظ طریقہ یہ ہے کہ ہم نہ انکار کریں اور نہ قبول کریں۔ آدم بر سر مطلب۔

شطحیات کی دو قسمیں ہیں:

(۱) بعض اصحابِ تصوف نے جو کلمات ظاہر و پیدا کئے ہیں وہ عشقِ الٰہی اور وصالِ خداوندی کے معنی میں بڑے وسیع دعوے ہیں۔ ایسے لوگ اعمالِ ظاہری سے بے نیاز

اور بے پروا ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک جماعت ان دعووں کے ذریعہ اتحاد کی باتیں کرنے لگی، اور مشاہدہ ومشافہ کی گفتگو کرنے لگی کہ اس نے مجھ سے آج کی رات یہ کہا اور میں نے اس سے یوں کہا۔ اپنی باتوں کی تائید کے لئے حضرت منصور حلاج کو پیش کرتے ہیں جنہوں نے انا الحق کہا اور سلطان العارفین کی مثال دیتے ہیں جنہوں نے سبحانی ما اعظم شانی کا دعویٰ کیا۔

(۲) شطحیات کی دوسری قسم وہ کلمات ہیں جو اہل ظاہر کی سمجھ سے باہر ہیں۔ سننے میں وہ بہت اچھے لگتے ہیں لیکن اس کی عبارت بڑی خوفناک ہوتی۔ یعنی اس کے معانی دلوں کو تشویش میں ڈال دیتے عقل دہشت زدہ ہو جاتی۔ اور ذہن متحیر ہو جاتا۔ جیسے اسی قول کو لے لیجئے جو کسی نے فرمایا ہے لیس فی جبتی سوی الله

قولہ: قال سهيل بن عبدالله العلوم ثلثة علم من الله وهو علم الظاهر كالامر والنهي والأحكام والحدود. وعلم مع الله وهو علم الخوف والرجاء والمحبته والشوق وعلم بالله وهو علم بصفاته ونعوته.

(ارشاد شیخ ہے) حضرت سہیل بن عبداللہ نے فرمایا علوم تین طرح کے ہیں:

۱. علم من اللہ- یہ علم ظاہر ہے اور یہ امرونہی احکام وحدود وغیرہ کا علم ہے۔
۲. علم مع اللہ- یہ خوف ورجا اور محبت وشوق کا علم ہے۔
۳. علم باللہ- یہ اللہ تعالیٰ کے صفات واوصاف کا علم ہے۔

شرح: سہیل بن عبداللہ کا ارشاد ہے کہ علوم تین طرح کے ہیں:

(۱) علم من اللہ- یہ علم وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے اسے علم ظاہر کہتے ہیں۔ جیسے امرونہی اور احکام وحدود کا علم۔ یہ علم، علم شریعت ہے۔ اس میں احکام بھی ہیں اور فرائض کی ذمہ داریاں بھی۔ جو لوگ اس علم سے آراستہ ہیں انہیں علمائے ظاہر کہتے ہیں۔ اور علم ظاہر اس لئے بھی کہتے ہیں کہ اس کا معاملہ جوارح سے ہے۔

(۲) علم مع اللہ - دوسرا علم وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے اور وہ خوف ورجاء اور محبت

وشوق کا علم ہے۔اس علم میں روشِ حق کے تمام مقامات اور اولیاء کے احوال و درجات کا بیان ہوتا ہے جو لوگ اس علم کے حامل ہوتے ہیں انہیں علمائے باطن کہتے ہیں۔ اس علم کو علمِ باطن اس لئے بھی کہتے ہیں کہ یہ علم بندہ اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہوتا ہے یعنی یہ علم دراصل بندہ اور خدا کے درمیان باطنی معاملات ہیں۔

(۳) علم باللہ - تیسرا علم اللہ تعالیٰ سے متعلق ہے۔اس علم کا تعلق اللہ تعالیٰ کی صفات اور اس کے اوصاف سے ہے۔یہ علم، تمام علوم سے برتر اور شریف تر ہے۔علم کی بڑائی کا انحصار معلوم کی بڑائی پر ہے۔اور یہاں معلوم اللہ تعالیٰ کی صفات اور اس کے اوصاف ہیں۔اسی کو علمِ معرفت کہتے ہیں۔تمام اولیاء نے اسی علم کے ذریعہ اس کو جانا ہے لہٰذا معرفت، شریعت کو اپنائے بغیر درست نہیں۔اور شریعت، مقامات کے اظہار کے بغیر صحیح نہیں۔

نقل ہے کہ ایک روز حضرت امام احمد حنبل رحمۃ اللہ علیہ مدرسہ سے واپس آرہے تھے۔ دیکھا کہ شیبان راعی کسی مکروہ یعنی ناپسندیدہ جگہ پر اپنی عادت کے مطابق بیٹھے ہیں۔حضرت امام احمد حنبل آگے بڑھے ان کو سلام کیا اور مؤدب انداز میں وہیں پر بیٹھ گئے۔لوگوں کو یہ بات پسند نہیں آئی کہ مسلمانوں کے امام کو یہ زیب نہیں دیتا کہ کسی دیوانہ کے پاس کراہیت والی جگہ پر زانوئے ادب تہہ کریں اور مؤدب ہوکر بیٹھ جائیں۔چنانچہ جب وہاں سے اٹھے تو لوگوں نے اپنی بات عرض کی۔حضرت نے فرمایا جی ہاں! اگر میں اللہ کو خوب جانتا ہوں تو وہ اللہ کو خوب پہچانتے ہیں۔

قولہ: وقیل علم الظاهر علم الطريق وعلم الباطن علم المنزل.

(ارشاد شیخ ہے) اور بعض لوگوں نے کہا ہے کہ علم ظاہر راستہ کا علم ہے اور علم باطن منزل کا علم ہے۔

شرح: علم ظاہر جسے علم راہ کہتے ہیں وہ معاملات کا علم ہے اور علم باطن جو علم منزل ہے وہ مکاشفات کا علم ہے۔اس پر گفتگو کرنے کی اجازت نہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ جس علم کا رخ

آخرت کی طرف ہو اس کی دو قسمیں ہیں:

(۱) علم معاملة

(۲) علم مکاشفة

علم معاملہ وہ علم ہے جس کا مطلوب عمل ہے۔

علم مکاشفہ وہ علم ہے جس کا مطلوب معلوم کا کشف ہے۔

قولہ: وقیل علم الباطن مستبط من علم الظاهر و کل باطن لایقیمه الظاهر فهو باطل.

(ارشاد شیخ ہے) علم باطن، علم ظاہر سے نکلا ہے اور ہر وہ علم باطن جس کی بنیاد علم ظاہر پر نہ ہو باطل ہے

شرح: علم باطن، علم ظاہر سے نکلا ہے، یہ جملہ اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ علم وراثت، علمِ دراست سے متخرج ہے۔ علم دراست خالص دودھ کی طرح ہے اور علم وراثت اس مکھن کی طرح ہے جو خالص دودھ سے نکالا گیا ہے۔ اگر دودھ ہی نہیں ہوتا تو مکھن کہاں سے آتا **کل باطن یقیمه الظاهر فهو باطل** یعنی ہر وہ باطن جس کا ظاہر درست اور قائم نہ ہو باطل ہے۔ اس سے مراد واللہ اعلم یہ ہو کہ جس کے ظاہری معاملات پاک نہ ہوں گے اس کے باطنی احوال بھی درست نہیں ہوں گے۔ اگر کسی کے ظاہری معاملات پاک ہوں اور اپنے باطن میں بھی اسی چیز کو پائے یا اسی چیز کو دیکھے اور اس گمان میں مبتلا ہو جائے کہ یہ میرے رب کی طرف سے مجھ پر نوازش و کرم ہے تو ایسے شخص کو چاہئے کہ وہ اس چیز کو اپنے معاملات کی کسوٹی پر جانچ کر دیکھے اگر اس کے معاملات حق سبحانہ وتعالیٰ کے ساتھ درست ہیں اور شریعت کی جو پابندیاں واجب ہیں ان کو بھی وہ پوری کر رہا ہے تو ایسا شخص اپنے باطنی احوال کو حق اور سچ سمجھے اور اگر شریعت کی ادائیگی میں کمی ہو رہی ہے اور شریعت کے آداب برتنے میں کوتاہی کر رہا ہے تو ایسی صورت میں اپنے باطنی معاملات کو غرور اور شیطانی مکر و فریب سمجھنا چاہئے۔ جو ایسا نہیں کرتا وہ ظاہر کو ویران کر چکا ہے اب باطن کو بھی ویران کرنا چاہتا ہے۔ ظاہر و باطن دونوں ایک دوسرے کے لئے

لازم وملزوم ہیں ظاہر بغیر باطن کے نفاق ہے اور باطن بغیر ظاہر کے زندقہ ہے۔ باطن کی درستگی کے بغیر ظاہر شریعت میں نقص ہے۔ اور ظاہر کی درستگی کے بغیر باطن ہوس ہی ہوس ہے۔

سلطان العارفین قدس اللہ روحہ العزیز سے منقول ہے انہوں نے فرمایا میں نے تیس سال مجاہدہ کیا مگر علم اور اس پر عمل سے زیادہ سخت کوئی دوسرا کام نظر نہ آیا۔

تمام بزرگوں نے یہی فرمایا ہے کہ طبیعت کے لئے علم کے مطابق عمل کرنے سے زیادہ آسان آگ پر چلنا ہے۔ جاہلوں کے لئے کوئی ایک علمی مسئلہ سیکھنے سے زیادہ آسان ہزار بار پل صراط سے گذرنا ہے۔ گنہگاروں اور فاسقوں کے لئے کسی ایک علمی مسئلہ پر عمل کرنے سے زیادہ آسان اور پسندیدہ دوزخ میں خیمہ لگانا ہے۔

قولہ: وقيل من سمع بأذنه حكى ومن سمع بقلبه وعىٰ ومن عمل بما سمع فقد اهتدىٰ وهَدَىٰ.

(ارشاد شیخ ہے) اور کہا گیا ہے کہ جس نے کانوں سے سنا وہ قصہ کہانی ہے، جس نے دل سے سنا وہ اس کے دل میں رہا اور جس نے سن کر عمل کی اس نے ہدایت پائی۔ اور دوسروں کو ہدایت دی۔

شرح: جس نے علمی باتوں کو سنا اور سننے ہی تک رکھا اس کے لئے وہ قیمتی بات قصہ کہانی تک ہو کر رہ جاتی ہے جس طرح وہ دوسری کہانیوں کو اپنی عادت کے مطابق سنتا ہے اسی طرح وہ علمی باتوں کو بھی سنتا ہے۔ نہ اس کے پاس دل ہوتا ہے اور نہ سنکر دل میں اتارنے والی صلاحیت ہوتی ہے یعنی وہ حضورِ دل کے ساتھ نہیں سنتا۔

حضرت امام شبلی سے منقول ہے انہوں نے فرمایا قرآن کی نصیحتیں اسی کے لئے ہیں جس کا دل حاضر ہو اور چشم زدن کے لئے بھی وہ خدا سے غافل نہ رہا ہو۔

ومن سمع بقلبه وعى - جو اپنے دل سے سنتا ہے وہ بات اس کے دل پر بیٹھ جاتی ہے۔

الوعی: الحفظ کے معنی میں ہے یعنی حفاظت کرنا۔ یہ اسی طرح کی بات ہے جیسا کہ رب تعالیٰ نے فرمایا اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ (ق: ۳۷) (یا کلام الٰہی کو سنے کان لگا کر اور

متوجہ ہو کر)

دوسری بات یہ کہ حسنِ استماع، فرشتوں کے دروازے کو کھٹکھٹانا ہے یعنی جو غفلت کے ساتھ نہیں بلکہ دل سے سنتا ہے وہ گویا فرشتوں کے دروازے پر دستک دیتا ہے اور یہ بات یقیناً طئے ہے کہ جو دروازہ کھٹکھٹاتا ہے اس کے لئے دروازہ کھول دیا جاتا ہے۔

من عمل بما سمع فقد اهتدی وهدی - اور جس نے علم وحکمت کی باتوں کو سنا اوران پر عمل بھی کیا یقیناً اس نے ہدایت بھی پائی۔ اور دوسروں کو بھی راہِ راست دکھایا اهتدیٰ یعنی رشد وہدایت پائی اور هدیٰ یعنی ارشد رہ نمائی کی۔ ایسا شخص عالم بھی ہے اور عامل بھی۔ جس کا عمل علم کے مطابق ہے وہی رہنما ہے۔

قولہ: وقیل العلم یهتف بالعمل فان لم یجبه ارتحل.

(ارشادِ شیخ ہے) اور بعض لوگوں نے کہا ہے علم، عمل کی طرف پکار پکار کر متوجہ کرتا ہے اگر اس کی بات نہ سنی جائے تو علم اس سے رخصت ہو جاتا ہے۔

شرح: علم، عالم کو عمل کرنے کی پکار پکار کر آواز دیتا ہے۔ صدا دیتا ہے اور باخبر کرتا ہے اگر عالم، علم کی بات نہیں مانتا تو وہ علم اس سے رخصت ہو جاتا ہے۔

یهتف - یخبر کے معنی میں ہے یعنی خبر کرتا ہے۔

ارتحل - ذهب کے معنی میں ہے یعنی چلا جاتا ہے۔

علم، عالم سے کہتا ہے مجھ پر عمل کیجئے۔ مجھے استعمال میں لائیے۔ اگر وہ عالم، علم کی اس آواز اور دعوت کو قبول نہیں کرتا تو جیسا کہ پہلے کہا گیا وہ علم ترکِ عمل کی نحوست کی بنا پر اس عالم کے دل سے رخصت ہو جاتا ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ علم کا قائم رہنا عمل پر منحصر ہے اور علم کا رخصت ہو جانا ترک عمل پر موقوف ہے۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ علم کو اٹھا لیا جائے گا اور آخر وقت میں قرآن کو بھی اٹھا لیا جائے گا اس سے مراد یہی ہے کہ جب کوئی شخص اس پر عمل نہیں کرے گا تو وہ علم دنیا سے اٹھا لیا جائے گا۔ یہاں پر کتاب اور کاغذ مراد نہیں ہے۔

قولہ: وقیل العلم ادراک الشیٔ علی ماهو به.

(ارشاد شیخ ہے) اور کہا گیا ہے کہ علم کسی چیز کے جاننے کو کہتے ہیں جیسی کہ وہ ہے۔

شرح: علم کی حد میں رہتے ہوئے کسی چیز کے بارے میں جاننا علم ہے۔ اور علم کی ضد جہل ہے۔ یعنی علم اشیاء کے ادراک کو کہتے ہیں جیسی کہ وہ ہے۔

قولہ: والعقل بصیرة وقوةٌ فی القلب بمنزلة البصر من العین یفرق بھابین الحق والباطل والحسن والقبح.

(ارشاد شیخ ہے) اور عقل دل کی بینائی وقوت کو کہتے ہیں اور ظاہری آنکھ کی طرح ہے اس کے ذریعہ حق و باطل اور حسن وقبح میں فرق کیا جاتا ہے۔

شرح: جس طرح لوگوں کی نظر میں فرق ہے یعنی کسی کو دور نظر آتا ہے کسی کو قریب نظر آتا ہے اسی طرح دل کی بصیرت ہے جس کو عقل کہتے ہیں۔ لوگ مختلف ہیں کوئی نزدیک دیکھتا ہے اور کوئی دور دیکھتا ہے۔ یہ جو کہا گیا کہ عقل دل کی قوت و بینائی ہے یہ اس بات کی دلیل ہے کہ عقل نہ عرض ہے اور نہ جوہر۔ لیکن بعض فقہا عقل کو عرض کہتے ہیں اور بعض جوہر۔ ہم ایسا نہیں کہتے۔ ہم تو کہتے ہیں کہ عقل حصولِ معرفت اور اشیاء کی دریافت کا ایک ذریعہ اور آلہ ہے۔

تمہیدات ابو شکور سالمی میں آیا ہے کہ عقل ایک ایسی لطیف چیز ہے جس کی کیفیت اوہام کی پہنچ سے باہر ہے۔ عقل سے متعلق فقہا کا کوئی صحیح قول ہم تک نہیں پہنچا ہے۔

اور یہ جو کہا گیا کہ اس کے ذریعہ حق و باطل اور نیک و بد میں فرق کیا جاتا ہے یہ بھی بعض فقہاء کی اصل پر محمول ہے۔ لیکن بعض فقہا اور ظاہر مذاہب کے قول کے مطابق حسن وہ ہے جس کا شریعت میں حکم دیا گیا اور قُبح وہ ہے جس سے شرعاً روکا گیا۔ اس کو یوں سمجھئے کہ کسی بے گناہ بکری کو ذبح کر دینے کا حکم ہے اس لئے یہ عمل صحیح و درست ہے اور ذمی یہود و آتش پرست کو قتل کرنا ممنوع ہے اس لئے یہ برا ہے۔ یہاں پر گناہِ کفر کے باوجود قتل کرنا برا ہے اور وہاں بغیر کسی گناہ کے بکری کو ذبح کرنا جائز ہے۔ غرض یہ کہ فرق جو ہے وہ امر و نہی کا فرق ہے۔ اس سے یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ جو اچھا ہے اور جس کام کے کرنے سے منع کیا گیا وہ اس ممانعت کی وجہ سے برا ہے۔

قولہ: وقیل العالم یقتدی به و العارف یهتدی به.

(ارشاد شیخ ہے) اور بعض لوگوں نے کہا ہے عالم وہ ہے جس کی پیروی کی جائے اور عارف وہ ہے جس سے ہدایت لی جائے۔

شرح: یعنی عالم وہ ہے جس کی پیروی کی جاتی ہے احکام شریعت میں جن کا تعلق ظاہر سے ہے اس لئے کہ عالم اللہ تعالیٰ کے اوامر ونواہی کی راہ دکھاتا ہے، عالم جو باتیں بتائے ان کو سننا چاہئے اور ان پر عمل کرنا چاہئے تاکہ مطیع وفرماں بردار کی فہرست میں شمار ہو جائے اور دوسری بات یہ بھی ہے کہ عالم علم دین کا اچھا واقف کار ہوتا ہے اس لئے بھی دینی معاملات میں اس کی اقتداء اور پیروی کرنی چاہئے۔

عارف وہ ہے جو رہنمائی کرتا ہے احکامِ طریقت میں جن کا تعلق باطن سے ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف رہنمائی اس لئے کرتا ہے کہ اس نے خود اس راہ کو طئے کیا ہے۔ اور اللہ رب العزت تک رسائی حاصل کر لی ہے۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ دین کی راہ طئے کر چکا ہے۔ ہر چیز کو جیسی کہ وہ ہے عارف دیکھتا ہے۔ عالم سنی ہوئی باتوں کی خبر دیتا ہے اور عارف دیکھی ہوی باتوں کو بتاتا ہے۔ **ولیس الخبر کالمعائنة**

علم اور معرفت کے بیان کے سلسلہ میں علمائے ظاہر کہتے ہیں کہ علم اور معرفت دونوں ایک ہی ہے۔ ہر علم معرفت ہے اور ہر معرفت علم ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو عالم کہنا چاہئے عارف نہیں کہنا چاہئے۔

جماعت صوفیاء کے نزدیک معرفت اس شخص کی صفت کو کہتے ہیں جس نے اللہ تعالیٰ کو اس کے اسماء اور صفات کے ساتھ پہچانا اور اپنے تمام معاملات میں حق سبحانہ وتعالیٰ کی تصدیق کی اور تمام برے اخلاق اور اعمال کی آفتوں سے پرہیز کیا جب ان صفتوں سے متصف ہو گیا تو حق تعالیٰ کے در پر مدتوں پڑا رہا اور اس میں ہمیشگی حاصل کی یعنی دل سے وہ بارگاہِ الٰہی کے در پر معتکف رہا اور نفسانی خواہشات سے منقطع ہو گیا دل سے ماسوا اللہ کی طرف مائل نہیں ہوا۔ جب اس مقام پر پہنچ گیا تو لوگوں سے بیگانہ ہو گیا۔ نفس کی آفتوں سے نکل آیا اس کے مقامات واحوال ہر طرح کی

آلائش سے پاک ہو گئے۔ ایسا شخص اپنے سر سے ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے محوِ گفتگو رہتا۔ وہ اس لائق ہو گیا کہ ہر لحظہ اسی کی جانب مائل رہے۔ اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنے کی بنا پر بارگاہِ حق میں اسے جو قبولیت حاصل ہوتی اس کی وجہ سے اب وہ اپنے ان اسرار کو بیان کرنے والا ہو گیا جو تقدیر کی گردشوں سے اس کے لئے جاری ہوئے ہیں۔ ایسے شخص کو عارف کہتے ہیں اور اس کی اس حالت کو معرفت کہتے ہیں۔

فقہاء وغیرہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ علم کی صحت و درستگی کو معرفت کہتے ہیں اور مشائخ صوفیا اللہ تعالیٰ کے ساتھ حال کی صحت و درستگی کو معرفت کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ معرفت، علم سے زیادہ افضل ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ حال اسی وقت صحیح و درست ہو گا جب علم صحیح و درست ہو گا۔ یعنی حال کی صحت علم کے بغیر نہیں۔ لیکن علم کی صحت حال کی صحت کے بغیر ہو سکتی ہے۔ عارف وہی ہو سکتا ہے جو حقیقت میں عالم بھی ہو اور ہاں! عالم، عارف بھی ہو یہ ضروری نہیں۔

قولہ: وقیل الورع لایخدع والعاقل یخدع.

(ارشاد شیخ ہے) اور بعض لوگوں نے کہا ہے کہ متقی و پرہیز گار کسی کو دھوکا نہیں دیتا ہے اور عاقل دھوکا دیتا ہے۔

شرح: یعنی پرہیز گار کسی چیز پر فریفتہ نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ اس کے معاملات ایسے ہوتے ہیں اور وہ اس مقام پر ہوتا ہے جہاں شبہات کی گذر نہیں۔ وہ طمع اور لالچ سے دور رہتا ہے۔ اس لئے کہ تمام بلاؤں اور آفتوں کی اصل اور جڑ لالچ ہی ہے۔

اور عاقل فریفتہ ہو جاتا ہے چوں کہ اس کی نظر اصلاحِ معیشت پر ہوتی ہے اور یہاں طمع ہی طمع ہے۔ طمع کو تمام برائیون کی جڑ کہا گیا ہے الطمع ام الخبائث ہے۔ لہٰذا یقیناً فریفتگی ہو گی۔

الخداع: اس کے معنی دھوکا دینا ہے۔

قولہ: وقیل العلم ماشاھدتہ خبراً والعقل ماشاھد تہ حساً.

(ارشاد شیخ ہے) اور بعض لوگوں نے کہا ہے کہ علم وہ ہے جس کا مشاہدہ خبر کے ذریعہ ہو اور عقل وہ ہے جس کا مشاہدہ حس کے ذریعہ ہو۔

شرح: یعنی جس کی معلومات خبر سے ہو وہ علم ہے اور جس کی معلومات حس سے ہو وہ عقل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے علماء نے عقل کی کوئی صحیح حد مقرر نہیں کی ہے ہر شخص نے اپنی سمجھ اور علم کے مطابق حد مقرر کر دی ہے۔ عقل سے متعلق جو اختلاف ہے اس کی وجہ یہی ہے۔

قولہ: **وقيل العقل مایباعدک عن مواقع الهلكات.**

(ارشاد شیخ ہے) اور بعض لوگوں نے کہا ہے عقل وہ ہے جو تمہیں ہلاکت خیز جگہوں سے دور رکھے۔

شرح: یعنی جب عقل اور سمجھ ہوگئی تو یہ بات طئے ہے کہ یقیناً اس کے ذریعہ ہلاکت میں ڈالنے والی جگہوں سے دور رہے گا، عقل وخرد اور سمجھ بوجھ کا تقاضا یہی ہے۔

الهلكات جمع الهلكة -**هلكة** کی جمع **هلكات** ہے۔

قولہ: **وقيل أصل العقل الصمة وباطنه كتمان السر وظاهره الاقتداء بالسنة۔**

(ارشاد شیخ ہے) اور بعض لوگوں نے کہا ہے عقل کی اصل خاموشی ہے عقل کا باطن سر کا چھپانا ہے اور عقل کا ظاہر سنت کی اقتداء ہے۔

شرح: اصل العقل الصمت - اس سے مراد یہ ہے کہ جب فتنہ وفساد کا انحصار گفتگو پر ہے تو یقیناً عافیت اور سلامتی خاموشی میں ہوگی۔ جیسا کہ اس شعر میں بھی ہے۔

احفظ لسانک لاتقول فتبتلی

ان البلا موكل بالمنطق

(اپنی زبان کی حفاظت کرو۔ اور اتنا نہ بولو کہ فتنہ پیدا ہو جائے بے شک مصیبتیں بولنے پر موقوف ہیں)

اسی لئے لوگ کہتے ہیں کہ **المريد ناطق والعارف اخرس**۔ مرید بولنے والا ہوتا ہے اور عارف گونگا ہوتا ہے۔

جس کا وقت آباد ہے اس کی سانس بند ہے۔ خبر ونشر گفتگو کا مطالعہ کرتی ہے اور دیدار ولقا میں خاموشی رہتی ہے۔ جو تلاش وجستجو میں رہتا ہے وہ بولتا ہے اور جو پالیتا ہے وہ گنگ ہو جاتا ہے۔

گفتگو ایسا شربت ہے جس میں زہر ہی زہر ہے اور خاموشی ایسا زہر ہے جس میں شہد ہی شہد ہے۔

ایک بزرگ نے گفتگو بند کردی لوگوں نے اس کی وجہ دریافت کی انہوں نے فرمایا خالقِ کائنات احاطۂ بیان میں نہیں آسکتا اور گفتگو سے کائنات میں اضافہ نہیں ہوسکتا۔

سلطان العارفین حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ نیاز مندی سے بہتر کوئی شکار نہیں ملا اور خاموشی سے زیادہ روشن کوئی چراغ نہیں دیکھا۔

باطنہ کتمان السر -عقل کا باطن سِر کا چھپانا ہے۔ سر کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) حق کا سِر بندہ کے ساتھ

(۲) بندہ کا سِر حق کے ساتھ

دونوں سروں کو پوشیدہ رکھنا عقل کا تقاضا ہے۔ اس لئے کہ اگر سِر کو ظاہر کردیا جائے تو سَر نہیں رہے گا۔ سِر کو ظاہر کرنا عقل کے خلاف ہے ظاھر الاقتداء بالسنۃ -عقل کا ظاہری تقاضا یہ ہے کہ سنت کی پیروی کی جائے اس سنت سے مراد وہی ہے جس کی اقتدا کرنا واجب ہے اور وہ قرنِ مشہور ہے یعنی وہ قرن جس کی بہتری اور اچھائی کی گواہی رسول اللہ ﷺ نے دی ہے۔ اور وہ خلفائے راشدین ہیں جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کا زمانہ پایا ہے۔ ان کے بعد تابعین کا دور ہے اور تابعین کے بعد تبع تابعین ہیں۔ ان کے بعد ان کی روش اور طریقت کے خلاف لوگوں نے جو نئی نئی باتیں پیدا کیں وہ سب کی سب بدعت اور ضلالت ہیں۔ ظاہری عقل یہ ہے کہ سنت کی اتباع اور پیروی کی جائے ایک قدم بھی سنت سے باہر نہ ہو۔ اگر ایک قدم بھی سنت سے باہر ہوتا ہے تو یہ عقل نہیں ہے بلکہ خواہشات نفس ہے۔

قولہ: وقیل اذاغلب الھویٰ تواری العقل.

(ارشاد شیخ ہے) بعض لوگوں نے کہا ہے جب نفس غالب ہوتا ہے تو عقل چھپ جاتی ہے۔

شرح: ھواء کے معنی نفس کی خواہش اور اس کی مراد ہے یہاں کہنے والا یہ کہتا ہے کہ عقل ایسی چیز ہے جو خواہشاتِ نفس سے پوشیدہ ہوجاتی ہے اور جب عقل چھپ جائے گی تو آدمی ہلاکت میں پڑ جائے گا۔

توارى: استتر کے معنی میں ہے یعنی چھپ جاتی ہے۔

قولہ: وقيل اذا اردت ان تعرف العاقل أو الأحمق فحدثهٔ بالمحالْ فان قبله فاعلم انه احمق.

(ارشاد شیخ ہے) اور بعض لوگوں نے کہا کہ اگر تم یہ جاننا چاہتے ہو کہ فلاں شخص عقلمند ہے یا احمق؟ تو اس کے سامنے محال باتیں بیان کرو۔ اگر وہ اس بات کو قبول کرلے تو سمجھ جاؤ کہ وہ یقیناً احمق ہے۔

شرح: اس لئے کہ عقل ہرگز محال بات کو قبول نہیں کرتی اور یہاں اگر وہ عقلمند ہوتا تو ہرگز محال بات کو قبول نہیں کرتا۔ جب محال بات کو قبول کرلیا تو یہ معلوم ہوگیا کہ وہ احمق ہے۔

قولہ: وقيل من احتجت الى شئ من علومه فلاتنظر الى عيوبه فان نظرت الىٰ عيوبه حرمت بركة الانتفاع بعلومه .

(ارشاد شیخ ہے) اور بعض لوگوں نے کہا کہ اگر تم کسی کے علم کے محتاج ہوتو اس کے عیوب پر نظر نہ ڈالو۔ اگر تم نے اس کے عیوب پر نظر کی تو اس کے علوم سے فائدہ اٹھانے کی برکت سے محروم رہ گئے۔

شرح: یعنی اگر تم کسی عالم سے اس کے علم کے حاصل کرنے کے محتاج ہوتو اس کی برائیوں کو نہ دیکھو۔ اگر اس کی برائیوں پر نظر کی تو سمجھ جاؤ کہ حصولِ علم کے ثمرات و برکات سے تم محروم رہ گئے۔

ایک روز حضرت خواجہ سہیل رحمۃ اللہ علیہ کسی نانبائی کی ولایت کی تعریف کر رہے تھے اور فرما رہے تھے کہ بصرہ میں ایک نانبائی ہے جس میں یہ، یہ خوبیاں ہیں۔ حضرت کے ایک ہمنشیں کی خواہش ہوئی کہ اس نانبائی سے ملاقات کی جائے۔ جب وہ بصرہ پہنچے اس نانبائی کی دکان پر گئے تو دیکھا کہ وہ روٹی پکا رہا ہے اور روٹی پکانے والوں کی عادت کے مطابق اپنی داڑھی پر کپڑا باندھے ہے۔ اس شخص نے اپنے دل میں کہا کہ اگر یہ ولی ہوتا اور اس کو ولایت حاصل ہوتی تو پھر اس کی داڑھی جلنے سے محفوظ رہتی اس کے بعد سلام کیا اور کچھ سوالات کئے۔ اس نانبائی نے

کہا تو مجھے برا بھلا کہہ چکا، میری تحقیر کر چکا۔ اب میری گفتگو سے تجھے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اس شخص نے بہت کوشش کی کہ وہ کچھ بھی اپنی زبان سے کہہ دے مگر اس نے نہیں کہا۔

اس واقعہ کا ما حاصل یہ ہے کہ اگر تم کسی عالم کی کوئی ایسی بات سنو یا دیکھو جو ظاہری اعتبار سے قابلِ انکار اور تمہارے لئے نقصان دہ ہو حالاں کہ وہ بات بنفسہٖ حقیقت کے رو سے حق اور درست ہو اس لئے اعتراض اور جھگڑا نہیں کرنا چاہئے۔ کیوں کہ عالم اور استاد کامل کو یہ بات ناگوار گذرتی ہے۔ اور ایسی صورت میں صحبت سے دور کر دیئے جانے کا ڈر ہے۔ اور اگر صحبت سے دور کر دیئے گئے تو یقیناً اس عالم کے علم کی برکت سے محروم کر دیئے گئے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور خواجہ خضر صلوٰۃ اللہ علیہما کا واقعہ اس سلسلہ میں شاہد ہے۔ وہ قصہ بہت مشہور ہے اس لئے یہاں پر دہرانے کی ضرورت نہیں۔

فصل-۱۴

اُن آداب کے بیان میں جو ابتدائے حال میں پیش آتے ہیں

یہ فصل جماعتِ صوفیا کے ان آداب کے ذکر میں ہے جو ابتدائے حال میں پیش آتے ہیں۔ یعنی مرید جب کسی پیر کی خدمت میں زانوئے ادب تہہ کرے تو ان کی خدمت میں کس طرح حاضر رہے اور پیر بھی اس مرید کے ساتھ کس طرح سلوک کرے تا کہ اس مرید کو راہِ حق مل جائے۔ یہ ساری باتیں اس فصل میں تحریر کی جارہی ہیں تا کہ حقیقتِ معاملات کا علم ہو جائے۔

قولہ: **اول مایلزم المرید بعدالانتباہ من غفلة ان یقصد شیخا من أھل زمانه مؤتمنا علی دینه معروفاً بالنصح والامانة .**

(ارشاد شیخ ہے) غفلت سے بیدار ہونے کے بعد مرید پر لازم ہے کہ وہ اپنے زمانہ کے کسی ایسے شیخ کی طرف قصد کرے جو اپنی دینداری میں امین ہوں لوگوں کی خیر خواہی اور امانت کی ادائیگی میں مشہور و معروف ہوں۔

شرح: حضرت امام ابوالحسن نوری رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ وہ اپنی مناجات میں عرض کرتے تھے کہ خداوندا اگر دوزخ کو لوگوں سے بھر دے گا تو تو اس بات پر قادر ہے کہ دوزخ اور اس کے طبقات کو مجھ سے بھر دے اور سارے لوگوں کو بہشت میں بھیج دے۔

اولیاء کے اخلاق کی تین نشانیاں ہیں:

۱۔ نیک اور صالح بندوں کی مدد کرنا۔

۲. گنہگار اور بدکار کو معاف کرنا۔

۳. سب کے لئے خیر خواہ رہنا۔

یعنی اپنے لئے جو پسند کرنا اس سے زیادہ اچھا دوسروں کے لئے پسند کرنا اسی کو کسی نے ان اشعار میں پیش کیا ہے ۔

انا نکہ خدائے گان دین اند   در راہِ حقیقت ایں چنین اند
باخلق ولے ز راہِ صورت   با خویش و لیکن از ضرورت

(جو دین والے ہیں وہ حقیقتاً ایسے ہوتے ہیں کہ اپنے کو دوسروں کے لئے وقت کر دیتے ہیں۔اور صرف ضرورتاً اپنے لئے ہوتے ہیں)

معروفاً بالنصح والامانة جو کہا گیا یہاں امانت سے مراد یہ ہے کہ **الشیخ امین فی الالهام کجبرئیل امین فی الوحی فکما لایخون جبرئیل فی الوحی کذلک لایخون الشیخ فی الالهام** شیخ کو الہام کا امانت دار ہونا چاہئے۔جیسے حضرت جبرئیل وحی پہنچانے میں امین تھے۔انہوں نے پیغمبروں تک بغیر کم وبیش وحی پہنچائی اور وحی پہنچانے میں کوئی کمی نہیں کی۔اسی طرح شیخ بھی الہام میں کوئی خیانت نہیں کرتے۔

حاصل کلام یہ کہ شریعت کے جو بھی احکام بندہ پر نافذ ہیں وہ امانت ہیں۔لہٰذا جو کوئی اس امانت کو بعینہ پہنچا دیتا ہے وہ امین ہے۔اور اگر اس میں کوئی کمی بیشی کرتا ہے تو وہ خائن ہے۔

اس عبارت میں بھی یہی بات کہی گئی ہے کہ **الشیخ یستفید من الله ویفید غیره** شیخ اللہ تعالیٰ سے استفادہ کرتا ہے اور اپنے علاوہ دوسروں کو مستفید کرتا ہے۔یعنی اللہ تعالیٰ سے لیتا ہے اور مرید کو دیتا ہے۔اس میں کوئی کمی بیشی نہیں کرتا۔اگر کرتا ہے تو وہ خائن ہے۔

اگر مرید کا کوئی پیر یا استاد نہ ہو تو اسے نجات نہیں ۔

تا رہبر تست عادت خویش
شیطان و منافقی نہ درویش

(اگر تو نے عادت کو اپنا رہبر بنالیا ہے تو شیطان ومنافق ہے درویش نہیں)

اسی لئے کہتے ہیں کہ جس کا کوئی استاد نہیں اس کا استاد شیطان ہے حضرت خواجہ ابو علی دقاق رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ خودرَو درخت میں پتے تو ہوتے ہیں لیکن پھل نہیں ہوتے اگر پھل دیتے بھی ہیں تو ان میں مزہ نہیں ہوتا۔ اسی طرح ایسا مرید جس کا کوئی پیر نہ ہو خواہش پرست ہے ایسے شخص سے کچھ کام نہیں ہو سکتا۔

خواھی کہ شود مراد حاصل

پیری طلب ای جوان عاقل

(اے جوان عاقل! اگر حصولِ مقصد کی تمنا ہے تو کسی کو اپنا پیر بنالے)

حدیث میں ہے **الشیخ فی قومه کا لنبی فی امته** ۔ شیخ اپنی قوم میں دین حق کے اسی طرح رہ نما ہیں جیسے انبیاء اپنی امت میں۔ امت کو دین حق کی راہ میں شیخ کے بغیر گذر نہیں جو پیغمبروں کے خلیفہ ہیں۔ کلمات مشائخ میں آیا ہے **لادین لـه لـمن لاشیخ لـه** جس کا کوئی شیخ نہیں۔ اس کا دین نہیں۔ جیسا کہ اس شعر میں ہے۔

خود را برکاب رہبری بند

تا باز رہا ندت ازیں بند

(اپنے کو کسی رہبر کے قدموں سے وابستہ کرلے تاکہ تجھے اس "شیطانی" قید و بند سے نجات مل جائے)

انسان کو اپنے لئے کسی کو اپنا شیخ بنانا بہت ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں بہت ساری عقلی دلیلیں بھی مشائخ کی کتابوں میں موجود ہیں۔

قولہ: عارفا بالطریق.

(ارشاد شیخ ہے) اس راہ سے واقف بھی ہوں۔

شرح: یعنی وہ شیخ ایسے ہوں جو اس راہ کو طئے کئے ہوں۔ راہ کے نشیب و فراز سے واقف ہوں اور طیب حاذق ہوں۔

روشن تر از آفتاب باید رائی

تا بشناسد مزاج ھر سو دائی

(حاکم کوسورج سے زیادہ روشن دماغ ہونا چاہئے تاکہ وہ ہر سودائی کے مزاج کو سمجھ لے)

سارے مشائخ طریقت کا اس بات پر اجماع ہے کہ ایسا شخص جس کا کوئی پیر نہیں اس کے احوال، اعمال اور افعال کے ثمرات اس کی طبیعت کے مطابق ہوتے ہیں۔ اور مشائخ نے فرمایا ہے کہ جو طریقت میں اپنے ہی مقصد میں گم رہے اور اپنی ہی صحبت پر قناعت کرے وہ مغرور اور گھمنڈ والا بت پرست ہے۔

کور ھرگز کی تواند رفت راست

بی عصا کش کور را رفتن خطا ست

(نابینا سیدھے راستے پر ہرگز نہیں چل سکتا۔ بغیر کسی سہارا کے نابینا کا چلنا غلطی ہے)

قولہ: ویسلم نفسه بخدمته.

(ارشادِ شیخ ہے) اور مرید اپنے آپ کو پیر کی خدمت کے لئے حوالہ کر دے۔

شرح: یعنی جب مرید کو ویسے شیخ مل گئے تو وہ مرید اپنے آپ کو پیر کی خدمت کے لئے مستعد اور تیار کر لے۔ یہاں تک کہا گیا ہے کہ شیخ کے حقوق پیغمبر کے حقوق کی طرح ہیں۔ اور شیخ کے حقوق ماں باپ کے حقوق سے کم نہیں ہیں۔ اس ولادتِ معنوی کو ولادت صوری (ظاہری) پر قیاس کرتے ہیں۔ جس طرح ظاہری ولادت میں مدتِ رضاعت اور مدتِ فطام ہے اسی طرح ولادتِ معنوی میں بھی مدت رضاعت (بچہ کو دودھ پلانے کی مدت) اور مدت فطام (دودھ چھڑانے کی مدت) ہے۔ چنانچہ اگر شیر خوار بچے کا دودھ مدتِ فطام سے پہلے چھڑا دیا جائے تو وہ ہلاک ہو جائے گا اسی طرح اس ولادتِ معنوی میں مدتِ فطام سے پہلے اگر مرید اپنے پیر سے الگ ہو جائے تو ہلاکت یقینی ہے۔ جس طرح ماں ظاہری ولادت میں دودھ پلانے اور دودھ چھڑانے کی مدت کو جانتی ہے اسی طرح پیر ولادت معنوی میں مدت رضاعت اور مدتِ فطام کا علم رکھتے ہیں۔

اگر مرید ابھی مدت رضاعت ہی میں ہے مدتِ فطام کی حد کو نہیں پہنچا ہے اور پیر پردہ فرما لیتے ہیں تو اب مرید کیا کرے گا جو اس کے کام میں کسی طرح کا خلل پیدا نہ ہو؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ مرید اپنے کو اس پیر کی تربیت میں ڈال دے گا جو اس کے پیر کے قایم مقام (جانشیں) ہیں۔ اس طرح وہ ہلاک ہونے سے محفوظ رہے گا۔ جس طرح وہ پیر کے ذریعہ منزل مقصود کو پہنچتا اسی طرح اپنے پیر کے جانشیں کے ذریعہ بھی منزل مقصود تک پہنچ جائے گا۔ اس کو یوں سمجھئے کہ اگر کوئی بچہ ابھی شیر خوارگی کے عالم میں ہے اور اس کی ماں کا انتقال ہو جاتا ہے تو وہ بچہ فوراً اس کی تربیت میں دے دیا جاتا ہے جو اس کی ماں کی قایم مقام ہے یعنی ماں کی جگہ پر ہے۔ ایسی صورت میں وہ ہلاک ہونے سے بچ جاتا ہے جو ضرورتیں ماں سے پوری ہوتیں وہ اس سے حاصل ہوں گی لیکن اگر اس میں کسی طرح کا خلل ہو جائے اور تاخیر سے دوسرے کی تربیت میں جائے تو پھر یہ اصولاً غلطی ہوگی۔ اور ایسی صورت میں بچے کی ضرورت کی تکمیل نہیں ہوگی۔ اسی بات کو اس طرح بھی سمجھئے کہ اگر کوئی مرغی انڈے سینے میں لگی ہے اور وہ مرغی مر جاتی ہے تو فوراً اور اسی وقت وہ انڈے دوسری مرغی کے پیٹ کے نیچے رکھ دئے جاتے ہیں اور بچے نکل آتے ہیں۔ اگر اس کام میں تھوڑی دیر بھی کر دی جائے تو پھر سارے انڈے خراب اور گندے ہو جائیں گے۔

قولہ: ویعتقد ترک مخالفتہ.

(ارشاد شیخ ہے) اور اس بات پر پورا اعتقاد رکھے کہ پیر کی مخالفت نہیں ہوگی۔

شرح: یعنی جہاں تک ہو سکے پیر جو حکم دیں ان پر عمل کرے اور جن کاموں سے منع کریں ان سے باز رہے۔ اس لئے کہ پیر مرید کے لئے اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی یادگار ہوتے ہیں۔ شیخ پر اعتماد اسی طرح ہو جس طرح رسول پر ہوتا ہے۔ اگر مرید عہد رسالت ماب میں ہوتا تو رسول اکرم ﷺ پر اعتماد رکھتا اسی طرح اپنے پیر پر اعتماد رکھے ظاہر اور باطن دونوں حال میں پیر کے احکام کی موافقت کرے اور یہ تصور کرے کہ پیر کا فرمان ویسا ہی ہے جیسے وحی۔ اگر کوئی مرید پیر کی روش پر چلتا ہے، پیر کی فرماں برداری کرتا ہے تو وہ مرید ہے اور اگر اپنی مرضی پر چلتا ہے تو وہ خود پرست ہے مرید نہیں ہے۔ پیر کے فرمان پر ظاہر میں بھی اعتراض نہ ہو اور باطن میں بھی اعتراض نہ ہو۔

ایک روز حضرت خواجہ ابوالقاسم گرگانی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک مرید نے خواب دیکھا کہ ان کے شیخ کچھ فرما رہے ہیں اور یہ کہہ رہے ہیں کہ ''ایسا کیوں؟''

انہوں نے یہ خواب اپنے شیخ سے عرض کیا۔ شیخ نے ان کی طرف سے رخ پھیر لیا اور فرمایا اگر یہ ''چون و چرا'' تمہارے باطن میں نہیں ہوتا تو پھر ایسا خواب تمہاری زبان پر نہیں آتا۔

پیری و مریدی میں چون و چرا (کیوں اور کیسا) درست نہیں۔ اسی معنی کو حضرت عین القضاۃ رحمۃ اللہ علیہ نے ان الفاظ میں فرمایا ہے کہ مریدی پیر پرستی ہے اور حضرت نے یہ بھی فرمایا ہے کہ مرید کو پیر پرست ہونا چاہئے تاکہ وہ کام کے لائق ہو سکے۔ ایک دوسری جگہ یوں فرمایا کہ مریدی کو پیر پرستی جو کہا گیا ہے وہ اسی معنی میں ہے اور اسی نظر سے کسی نے کہا ہے کہ آج نہ پیری ہے اور نہ مریدی ؎

ای گشتہ مرید رسم و عادت　　　یک ذرہ نہ بینمت ارادت

پیر رہ کبریت احمر آمدہ است　　　سینۂ او بحر اخضر آمدہ است

(تو رسم و عادت کا مرید ہو گیا ہے۔ تیرے اندر ارادت کا ایک ذرہ بھی نہیں پایا جاتا پیر تو سرخ گندھک ہو گئے ہیں)

قولہ: ویکون الصدق حالته.

(ارشاد شیخ ہے) اور صدق مرید کا حال ہو جائے۔

شرح: یعنی مرید کو چاہئے کہ وہ کام میں صادق اور سچا رہے، تاکہ اس راہ میں اس کی بنیاد صحیح و درست ہو۔ چنانچہ مشائخ نے فرمایا ہے کہ مرید جب اصول کو ضائع کر دیتے ہیں تو وصول الی اللہ سے محروم ہو جاتے ہیں۔ اور انہیں اصول میں ایک صدق بھی ہے قول، فعل اور اعتقاد تینوں میں صداقت ہو۔ اسی لئے کسی نے کہا ہے ؎

این رہ نہ بخرقۂ و گلیم است

اول قدم از دلِ سلیم است

(یہ خرقہ اور کمبل کی راہ نہیں۔ یہاں تو پہلا قدم قلبِ سلیم سے رکھا جاتا ہے)

قولہ: ثم یلزم الشیخ ان یعرفه کیفیة الرجوع الی الله وید له علی طریق یسهل علیه سلوکها و یعلمه شرائع الاسلام مماله وعلیه۔

(ارشاد شیخ ہے) پھر شیخ پر لازم ہے کہ وہ مرید کو اللہ کی طرف رجوع ہونے کی کیفیت سے آشنا کرائیں اسے وہ راستہ دکھائیں جس پر چلنا اس کے لئے آسان ہو۔ اسے شریعت اسلام کی تعلیم دیں اور ان تمام باتوں سے واقف کرائیں جن کا شریعت میں حکم دیا گیا ہے اور جن سے منع کیا گیا ہے۔

شرح: یعنی شیخ پر یہ لازم ہے کہ وہ مرید کو یہ بتائیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف کس طرح رجوع ہوں گے۔ اللہ کی نافرمانی سے نکل کر اس کی طاعت وعبادت میں کیسے داخل ہوں گے۔ مرید کو ویسے راستے پر چلائیں جن پر چل کر سلوک کو طئے کرنا اس کے لئے آسان ہو جائے۔ شیخ جو کچھ حکم دیں وہ مرید کی قابلیت اور استعداد کو سامنے رکھتے ہوئے دیں۔ اور حکم دینے میں نرمی اختیار کریں۔ سختی نہ برتیں۔ شریعت اسلامی کی تعلیم سے آراستہ کریں۔

مماله: سے مراد یہ ہے کہ فرائض وواجبات اور خیر وحسنات جو اجر وثواب کا ذریعہ ہے مرید کو ان کاموں پر لگائیں تا کہ وہ مستحق ثواب اور لائق اجر ہو۔

وعلیه: سے مراد یہ ہے کہ شریعت کے تمام منہیات ومنکرات اور شہوت وخواہشات سے مرید کو دور رکھیں تا کہ وہ عذاب اور گرفت سے محفوظ رہے۔ اسی لئے لوگ کہتے ہیں کہ مشائخ دلوں کے طبیب ہیں۔ اگر طبیب مریض کی بیماری کو نہیں جانتا اور اس کا علاج کرنے لگتا ہے تو اس مریض کی موت رکھی ہے۔ اس لئے کہ وہ نہ مرض کو سمجھ رہا ہے نہ نقصانات کو جانتا ہے اور مرض کے برعکس دوا دیتا ہے تو مریض کی جان کو خطرہ ہے۔ ہر مرض کی دوا الگ الگ ہے۔ ہر جنون کا معجون علیحدہ علیحدہ ہے۔ ہر مرض کی خصوصیت جداگانہ ہوتی ہے جس کو طبیب حاذق ہی سمجھتے ہیں، جاہل اطباء کیا جانیں۔

قولہ: واولی الاشیاء به تصفیة المطعم والمشرب والملبس لانه بذلک یجد زیادة فی حاله۔

(ارشاد شیخ ہے) اور مرید کے لئے سب سے اچھی بات یہ ہے کہ وہ کھانے پینے کی چیزوں کو اور کپڑے کو صاف رکھے۔ کیوں کہ اس سے اس کے حال میں زیادتی ہوگی۔

شرح: یعنی جو کھانا، پانی اور کپڑا کھانے پینے اور پہننے کے لئے استعمال کرے وہ حلال اور پاک طریقے سے حاصل ہو۔

حلال ذریعہ وہ ہے جس کے حلال ہونے پر مفتیوں کا فتویٰ ہو اور پاک ذریعہ وہ ہے جس کے پاک ہونے پر دل فتویٰ دے۔ حال میں زیادتی اور اضافہ کے لئے یہ چیزیں شرط ہیں۔ اگر یہ تینوں چیزیں حلال طریقے سے حاصل نہیں کی گئیں تو زیادتی اور اضافہ بھی نہیں ہوگا۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ اس کام کی بنیاد حلال کھانے پینے اور حلال پہننے پر رکھی گئی ہے۔

نقل ہے کہ حضرت خواجہ ابو بکر وراق رحمۃ اللہ علیہ پندرہ روز تک تیہہ بنی اسرائیل میں سرگرداں رہے اور جب راستہ ملا تو ایک سپاہی سے ملاقات ہوئی۔ اس نے حضرت کو پانی پلایا۔ حضرت فرماتے ہیں کہ اس پانی کے پینے سے دل میں جو سختی پیدا ہوئی وہ تیس سال تک موجود رہی۔ یہ واقعہ اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ پانی کا وہ کوزہ ضرور کسی مشکوک ذریعہ سے حاصل ہوا تھا۔

جب ایک بار مشکوک کوزہ سے پانی پی لینے پر یہ حال ہوا تو جو شخص دن رات حرام کھانے پینے اور حرام کپڑا استعمال کرنے میں لگا ہے اس کا کیا حال ہوگا۔

قولہ: **وقد قال النبی ﷺ طلب الحلال فریضة بعد الفریضه.**

(ارشاد شیخ ہے) نبی اکرم ﷺ نے فرمایا فرض نمازوں کے بعد حلال کا طلب کرنا فرض ہے۔

شرح: نبی اکرم ﷺ کی اس حدیث سے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ پانچوں وقت کی فرض نمازوں کی ادائیگی کے بعد حلال (رزق) کا طلب کرنا فرض ہے۔

قولہ: **وقال بعضھم طلب الحلال فریضة علی الکل وترک**

الحلال فریضة علی هذه الطائفه الاعلی حد الضرورة۔

(ارشادِ شیخ ہے) اور بعض لوگوں نے کہا ہے حلال کا طلب کرنا سب پر فرض ہے اور حلال کا ترک کرنا اس جماعت پر فرض ہے۔ مگر بقدرِ ضرورت ہو۔

شرح: اس جماعت (صوفیا) کے بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ حلال کا طلب کرنا سارے مسلمانوں پر فرض ہے۔ اور علمائے آخرت کے فتوٰی کے مطابق حلال کا ترک کر دینا جماعتِ صوفیا پر فرض ہے۔ علمائے ظاہر کے فتوی کے مطابق فرض نہیں ہے۔ اس لئے کہ علمائے ظاہر قربِ مولیٰ اور مقامِ محمود کے طالب نہیں ہیں جو صدیقوں کا مقام ہے۔ یہ تو اپنے کو صرف دوزخ سے بچانے اور بہشت میں جانے کی طلب رکھتے ہیں۔

جس طرح مال کا ترک کرنا اس جماعت پر فرض ہے اسی طرح لوگوں کے درمیان عزت و مرتبہ کا ترک بھی فرض ہے۔ عزت و مرتبہ پر نظر رکھنا بھی زہرِ قاتل ہے۔

دوسری بات یہ کہ جب اس جماعت کے لوگوں نے پہلے ہی مقام میں حلال کو ترک کر دیا تو پھر حرام اور مشکوک کے استعمال کی گنجائش کہاں رہی۔ اس معاملہ میں حضرت صدیق اکبر ﷺ امام کا درجہ رکھتے ہیں کہ جو کچھ مال و منال تھا سب کچھ قدمِ مبارک میں لا کر رکھ دیا اور ایک کمبل اوڑھ کر رہ گئے۔

چنانچہ جو کچھ خواص کے لئے فرض ہے عوام کے لئے وہ فرض نہیں ہے۔ جیسا کہ کہتے ہیں کہ نفل نماز کے لئے طہارت فرض ہے یعنی جو نماز (کی حقیقت) تک پہنچنا چاہتا ہے اس کے لئے طہارت فرض ہے۔ لیکن جو شخص نفل نماز کی فضیلت کی محرومی و نقصان سے فکرمند نہیں ہے اس کے لئے طہارت فرض نہیں ہے۔

اور یہ بھی کہتے ہیں کہ آدمی کے وجود کے لئے آنکھ، کان، پاؤں شرط ہے یعنی اس شخص کے لئے شرط ہے جو مکمل آدمی ہونا چاہتا ہے۔ لیکن جو اصل حیات پر قانع ہے۔ اس کے لئے گوشت دسترخوان پر ہو یا خرقہ زمین پر پڑا ہو کوئی فرق نہیں۔ ایسی زندگی کے لئے آنکھ کان ہاتھ

پاؤں شرط نہیں ہے۔

الاعلی حدالضرورت: حدضرورت کی جو بات کہی گئی اس سے مراد یہ ہے کہ اتنی مقدار میں ہو جس سے زندگی قایم رہے تاکہ فرائض و واجبات کی ادائیگی ہوتی رہے اس کا ترک کرنا درست نہیں ہے۔ لیکن حاجت اور فضولی کا ترک کرنا فرض ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا گیا۔

فضولی، حاجت اور ضرورت تینوں میں فرق ہے۔

ضرورت اس مقدار کو کہتے ہیں جس کے بغیر آدمی کو بقا حاصل نہیں۔

حاجت اس مقدار کو کہتے ہیں جس کے بغیر آدمی زندہ رہ سکتا ہے جیسے پیراہن کے اوپر کوئی اور کپڑا یا پاؤں میں چپل کا ہونا۔

فضولی ان دونوں یعنی ضرورت و حاجت سے آگے کی چیز ہے۔ جس کی کوئی حد نہیں۔

اسی لئے کہتے ہیں کہ جو فضولیات میں پڑ گیا وہ ھاویہ (دوزخ کے آخری درجہ) میں گر گیا اور ھاویہ کی گہرائی کی انتہا نہیں۔

قولہ: ثم قضاء ماضیع من الفرائض.

(ارشاد شیخ ہے) پھر ان فرائض کو ادا کرے جن کو ضائع کر دیا ہے۔

شرح: یعنی بالغ ہونے کے دن سے توبہ کے دن تک جو روزہ، نماز، حج، زکوۃ کو ترک کر دیا تھا جہاں تک ممکن ہو سکے ان کو ادا کرے۔

قولہ: ثم ردا المظالم علی اھلھا لقول النبی ﷺ رد دانق من حرام بعدل عنداللہ سبعین حجۃ.

(ارشاد شیخ ہے) جن پر ظلم ہوا ان کے ظلم کی تلافی کرنا۔

حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا ایک دانگ بھی جو حرام طریقہ سے حاصل کیا گیا ہو اسے واپس کر دینا اللہ کے نزدیک ستر حج کے برابر ہے۔

شرح: یعنی بندگانِ خدا کے جو حقوق عاید ہوتے ہیں ان کو ادا کرے اور ان کو خوش رکھے اس لئے کہ جماعتِ صوفیا کا کہنا ہے کہ جو اپنے دشمنوں کو خوش نہیں کرتا اس پر اس راہ کی کوئی

بات کھولی نہیں جاتی۔

بعض مشائخ سے منقول ہے کہ بندوں کے حقوق اس راہ میں ان کانٹوں کی طرح ہیں جو محسوس کیے جاتے ہیں۔ یعنی جس طرح راستے کے کانٹے کی چبھن جب محسوس ہوتی ہے تو آگے جانے میں رکاوٹ ہوتی ہے اسی طرح اس راہ میں بندوں کے حقوق ہیں۔

قولہ: وما کان علیه من ضرب او قطع او جرح فالقصاص.

(ارشادِ شیخ ہے) اور اگر کسی کو مارا ہے یا کسی کے عضو کاٹ دیئے ہیں یا کسی کو زخمی کیا ہے تو اس کا قصاص پورا کرالے۔

شرح: یعنی دشمن سے کہے کہ وہ اپنا بدلہ لے لے یا معاف کر دے۔ یہ بات تو اس صورت میں ہوگی جب وہ دشمن زندہ ہے۔ اور اگر اس کا انتقال ہو گیا ہے تو پھر اس معاملہ کو اس کے وارثوں کے سامنے رکھے۔ اور ان سے کہے کہ اس پر جو حقوق ہیں ان کو وہ لوگ ادا کروالیں۔ اگر ورثا بھی موجود نہیں ہیں تو اس (مظلوم) کی طرف سے خوب خوب صدقات و خیرات کرے اور مغفرت کی دعائیں مانگے۔

قولہ: وما کان من غیبة او نمیمة او شتیمة فالاستحلال والاستغفار لصاحبها

(ارشادِ شیخ ہے) اور اگر کسی کی غیبت کی، چغلی کھائی، گالی دی تو اس کا معاوضہ ادا کرے اور معاف کروالے۔

شرح: اگر اپنے دشمن کو گالی دی، یا چغلی کھائی یا غیبت کی تو اس سے معاف کروالے اور اس کے لئے اللہ تعالیٰ سے مغفرت چاہے۔ یعنی اس سے کہے کہ مجھے معاف کر دیجئے۔ اور یہ بھی اسی صورت میں ممکن ہے جب وہ زندہ ہے۔ اگر زندہ نہیں ہے تو پھر اللہ تعالیٰ سے اس کے لئے مغفرت کی دعاء کرے۔

قولہ: ثم معرفة النفس وتادیبها بالریاضات ولها صفتان انهماک فی الشهوات وامتناع عن الطاعات فیروضها بالمجاهدات.

(ارشادِ شیخ ہے) پھر اپنے نفس کی معرفت حاصل کرے اور ریاضتوں کے

ذریعہ اس کو مؤدب بنائے نفس کی دو صفتیں ہیں۔ وہ شہوتوں میں منہمک اور طاعتوں سے دور رہتا ہے اس لئے مجاہدے میں اس کو لگائے رکھے۔

شرح: انهمک الرجل فی الامر. یعنی جدولج و اسرع.

یعنی نفس کو جانے اور پہچانے کہ نفس کیا ہے اور اس بات سے واقف رہے کہ نفس کو کس طرح ریاضت میں ڈالیں گے۔

اس لئے کہ جب کوئی علم حاصل کر لیتا ہے تو اس کا نفس سر افتخار بلند کرتا ہے۔ عزت و وقار کا تاج اپنے سر پر رکھ لیتا ہے۔ چنانچہ نفس کو نرم کرنا تمام چیزوں سے زیادہ آسان ہے۔ مگر اس سے عزت و مرتبہ کی خواہش کا دور کرنا آسان نہیں۔ حالاں کہ عزت و مرتبہ سے دین حاصل نہیں ہوتا۔

اسی لئے بزرگوں نے فرمایا ہے کہ عزت و مرتبہ انسان کے لئے آہنی زنار ہے جس کو مختصر قوت سے توڑ نہیں سکتے۔ اس کو توڑنے کے لئے ہر شخص کے پاس قوت بازو نہیں۔ کہتے ہیں کہ سالک کے لئے عزت و مرتبہ کا دور کرنا سب سے آخری اور اہم کام ہے۔

تادیبها بالریاضات - نفس کو ریاضتوں کے ذریعہ مؤدب بنانا ہے۔ اس لئے کہ نفس پیدائشی طور پر بے ادب ہے اور بندہ ادب کی بجا آوری پر مامور ہے۔ نفس جب بھاگتا ہے تو میدانِ مخالفت کی طرف بھاگتا ہے۔ بندہ کو چاہئے کہ اپنی طاقت سے نفس کو اس کی خواہش پر چلنے سے روک دے۔ چنانچہ جو شخص اپنے نفس کی لگام کو اس کی خواہش پر چلنے کے لئے چھوڑ دیتا ہے وہ بھی اس کے فساد میں شامل ہے۔

اور ہم نے جو یہ کہا کہ نفس مجبول ہے اس سے مراد یہ ہے کہ اس کی جبلّت ہی میں یہ شامل ہے کہ ریاضت و مجاہدے میں ڈال کر ہی اس کو پسپا کیا جا سکتا ہے۔

نفس لذات، شہوات اور مباحات کی طرف بلاتا ہے اور شیطان حرام چیزوں کی طرف دعوت دیتا ہے جس میں نفس بھی شامل رہتا ہے۔

نفس کی خواہش اور شیطان کی خواہش میں فرق یہ ہے کہ نفس کی دو صفت ہے۔ شہوات

میں کوشش کرنا اور ہاتھ پاؤں مارنا۔ یعنی وہ جس چیز کی آرزو کرتا ہے اس میں اس وقت تک ہاتھ پاؤں مارتا ہے اور کوشش مین لگا رہتا ہے جب تک وہ آرزو پوری نہ ہو جائے۔ لیکن شیطان کا حال یہ ہے کہ وہ کوئی حرام چیز بندہ کے سامنے پیش کرتا اور جب دیکھتا ہے کہ وہ بندہ اس حرام چیز میں مبتلا نہیں ہو رہا ہے تو پھر دوسری اور تیسری چیز سامنے لاتا ہے۔ جب تک حرام میں مبتلا نہیں کر دیتا وہ چین سے نہیں بیٹھتا۔ اس کا مقصد کسی مخصوص گناہ میں مبتلا کرنا نہیں ہے بلکہ حرام میں مبتلا کرنا ہے۔

امتناعه عن الطاعات -اس کو روکنا ہے۔ یعنی نفس کی سرکشی کو طاعت وعبادت کے ذریعہ روکنا ہے۔

مرید کو چاہئے کہ مجاہدے کے ذریعہ اس کو نرم بنائے۔ جب نفس مجاہدے اور ریاضتوں کے ذریعہ نرم ہو جاتا ہے تو اس مرید کا طاعت وعبادت میں لگنا آسان ہو جاتا ہے اور خلوص سے نزدیکی ہو جاتی ہے۔

قولہ: وهي فطم النفس عن مالوفها وحملها على الخلاف اهويتها.

(ارشاد شیخ ہے) اور اس کے لئے مجاہدہ یہ ہے کہ نفس کو جن چیزوں میں الفت حاصل ہوان سے روک دے اور جن چیزوں سے وہ گریز کرتا ہے ان میں لگائے رکھے۔

شرح: نفس کی مخالفت تمام عبادتوں کا سر ہے۔

الفطم، **القطع** کے معنی میں ہے۔

نقل ہے کہ مشائخ سے جب سوال کیا گیا کہ اسلام کی صفت کیا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا **ذبح النفس بسيوف المخالفة** -نفس کو مخالفت کی تلواروں سے ذبح کرنا ہے اسی لئے کہتے ہیں آدمی کے لئے خواہشاتِ نفس کی مخالفت کرنے سے زیادہ آسان پہاڑ کو ناخن سے کھودنا ہے۔

قولہ: ويمنعها عن الشهوات ويا خذها بالمكابدات۔

(ارشاد شیخ ہے) شہوتوں سے اس کو باز رکھے اور ہر طرح کی سختیاں اس پر

کرتا ہے۔

شرح: نفس کی مخالفت اس کی خواہشات کے ترک میں ہے۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ اساس الکفر قیامک علی مراد نفسک کفر کی بنیاد اپنے نفس کی مراد پر قایم رہنا ہے۔ یاخذھا بالمکابدات - نفس کو ہر طرح کی سختیوں میں مبتلا رکھے۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ اگر کسی مرید کا میلان شروع ہی سے ایسی چیزوں کی طرف ہو جائے جن میں اس کے نفس کو لذت حاصل ہو تو وہ ہر گز فلاح نہیں پا سکتا۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ مرید کو کاموں میں چھوٹ دینا اس کے لئے زہر قاتل ہے، اس لئے کہ اس رخصت میں نفس کو آسانی و سہولت حاصل ہوتی ہے۔

قولہ: وتجرع المراراة وکثرة الاورادو استدامة الصوم والنوافل من الصلوة مع الندم علی المخالفات۔

(ارشاد شیخ ہے) اس کو تلخ گھونٹ پلائے، اوراد کی کثرت ہو، روزے اور نوافل نمازوں کی پابندی کرے۔ ساتھ ہی ساتھ جو لغزشیں ہوئی ہیں ان پر ندامت بھی ہو۔

شرح: نفس کو تلخ گھونٹ پلانا یہ ہے کہ اس کی مرادوں کو پوری ہونے نہ دے۔ وکثرة الاوراد.......... الیٰ آخرہ۔ یعنی دن رات اوراد ووظائف کی کثرت میں لگا رہے اور ہمیشہ روزہ دار رہے۔

پوری تفصیل وہی ہے جس کا بیان اوپر گذرا کہ حملھا علی الخلاف اھو یتھا یعنی خواہشاتِ نفس کی مخالفت ہی اصل ہے اور اس پر مزید یہ کہ جو لغزشیں ہوئی ہیں ان پر ندامت بھی ہو۔ چنانچہ توبہ کرنے سے پہلے جو گناہ ہوئے ہیں ان پر ہمیشہ نادم رہے اس لئے کہ گناہ سے ندامت بھی توبہ ہے۔

قولہ: ونقلھا عن قبیح العادات.

(ارشاد شیخ ہے) اور بری عادتوں کو دور کرتا ہے۔

شرح: یعنی نفس کی بری عادتوں کو اچھی عادتوں میں بدلتا رہے۔ جیسے اگر کسی کی

نفسانی خواہش یہ ہے کہ وہ موٹا اور کھردرا کپڑا پہنے یا کسی کی نفسانی خواہش نرم پہننے کی ہے تو اس شخص کو چاہئے کہ نفس کو اس عادت سے باہر نکالے۔ اس جماعت کا کہنا ہے کہ عادت پرستی، بت پرستی ہے۔ یعنی عادت کے مطابق کام کرنا بت پرستی ہے۔ دو چیزوں کے ذریعہ عادت سے نکل سکتا ہے۔ شریعت میں نیت کے ذریعہ عادت سے باہر آئے گا اور طریقت میں پیر کے حکم کی بجا آواری کے ذریعہ عادت سے نکل سکتا ہے۔

قولہ: ویجتهد أن یتعوض عن النوم سهرا وعن الشبع جوعا وعن الرفاهیة بؤسا۔

(ارشاد شیخ ہے) نیند سے بیداری کو، شکم سیری سے بھوک کو، آسانی و کشادگی سے تنگی وسختی کو بدلنے میں کوشاں رہے۔

شرح: الرفاهیة۔عیش وعشرت کی فراخی کو کہتے ہیں۔

جب مرید نفس کو ریاضت میں ڈالے گا تو اس وقت نہ ذلت کا خوف ہوگا اور نہ ملامت کا وہ تو اس بات کی طلب میں لگا رہے گا کہ اس کے اور رب تعالیٰ کے درمیان رابطہ صحیح ودرست رہے۔ ہاں! اگر ریاضت نہیں کرے گا اور لوگوں کی ملامت کو دور کرنے کے لئے علمی تاویل سے کام لے گا۔ یا عزت ومرتبہ کو حاصل کرنے کے لئے حیلے وبہانے تلاش کرے گا تو وہی علم جو حصولِ دین کا سبب بنا زوالِ دین کی وجہ بن جائے گا۔

قولہ: فیکون حینئذ من جملة التائبین المختصین بمحبة الله تعالیٰ قال الله تعالیٰ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَیُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِیْنَ وقال النبی علیه السلام، الشاب التائب حبیب الله۔

(ارشاد شیخ ہے) اس وقت وہ تائبین کی فہرست میں داخل ہوگا اور اللہ کی محبت کا تاج اس کے سر پر ہوگا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَیُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِیْنَ (البقرہ:۲۲۲) اللہ تعالیٰ دوست رکھتا ہے توبہ کرنے والوں کو اور دوست رکھتا ہے پاک رہنے والوں کو اور بنی کریم

ﷺ نے بھی فرمایا توبہ کرنے والا نوجوان اللہ کا دوست ہے۔

شرح: یہاں پاک رہنے سے مراد یہ ہے کہ گناہوں سے پاک رہے۔

یہ دلیلیں توبہ کی فضیلت کو ثابت کر رہی ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کی محبت ساری دولتوں کا راز ہے جیسا کہ وعدہ کیا گیا ہے۔ جو اللہ کی محبت کے لائق ہو گیا وہ اس کے قرب و کرامت کے لائق ہو گیا۔ اور نہ صرف اللہ تعالیٰ کے ولیوں کے مقامات واحوال کا حقدار ہو گیا بلکہ مقصود تک پہنچ گیا۔ اور رسولِ خدا ﷺ نے جو فرمایا **الشاب التائب حبیب اللّٰہ** ۔توبہ کرنے والا نوجوان اللہ کا دوست ہے۔ یہ حدیث شریف بھی توبہ کی بڑائی وفضیلت کی دلیل ہے۔

حبیب اللّٰہ ہونے کی دولت توبہ سے حاصل ہوتی ہے۔ لہٰذا تمام مقامات میں بہترین مقام توبہ ہے۔ اور طالب کے لئے مقامِ توبہ کو درست کرنا سب سے اہم کام ہے۔

جوانی کی حد تیس (۳۰) سال ہے اور مکمل طور پر اس کی مدت چالیس (۴۰) سال ہے۔

قولہ: **ویکون من جملة من یبدل اللّٰہ سیاتھم حسنات روی ابو ھریرہ ؓ عن النبی ﷺ انہ قال لیتمنن اقوام انھم اکثروا من السیئات قیل منھم یا رسول اللّٰہ قال الذین یبدل اللّٰہ سیأتھم حسنات۔**

(ارشاد شیخ ہے) اور ان لوگوں میں وہ شامل ہو جاتا ہے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا **فَاُولٰٓئِکَ یبدل اللّٰہ سیاتھم حسنات (الفرقان / ۷۰)** یہ وہ لوگ ہیں بدل دے گا اللہ تعالیٰ ان کی برائیوں کو نیکیوں سے۔ حضرت ابو ہریرہ ؓ نبی اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ بعض لوگ قیامت کے دن تمنا کریں گے کہ کاش وہ بہت زیادہ گناہ کرتے۔ لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! وہ کون لوگ ہیں؟ فرمایا جنکی برائیاں اللہ تعالیٰ نیکیوں سے بدل دے گا۔

شرح: اب یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قیامت کے دن جس پر ہم نے ایمان لایا اور جس کی تصدیق کی ہے ایسا دن ہوگا کہ سارے مومن اپنے اپنے گناہوں سے شرمندہ و

سرگرداں ہوگے اور اپنی معصیت پر شرمسار ہوں گے یہ تصور کیسے کیا جائے کہ اس روز وہ مزید گناہوں کی آرزو کریں گے۔

اس سوال کا جواب یہی ہے کہ اس سے نفس برائی کی آرزو مراد نہیں ہے بلکہ نیکیوں میں اضافہ کی آرزو ہوگی۔ اس لئے کہ جو نیکیاں ان کے دامن میں جمع ہوئیں وہ برائیوں کے ذریعہ ہوئیں چنانچہ گناہ زیادہ ہوتے تو نیکیاں بھی زیادہ ملتیں۔ چوں کہ زیادہ سے زیادہ نیکیاں حاصل کرنے کی تمنا رکھتے اسی لئے کہیں گے کہ کاش ہم زیادہ گناہ لے کر آتے۔ تاکہ زیادہ نیکیاں ملتیں۔ اس تمنا میں یہی بات پوشیدہ ہے۔ زیادہ سے زیادہ گناہ کرنے کی تمنا نہیں ہے۔

قولہ: ویکون من جملة المختصین بدعوة حملہ العرش لقولہ تعالیٰ فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُو وَاتَّبَعُوْا سَبِيْلَکَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيْم ط (المومن / ۷)

(ارشاد شیخ ہے) ایسا شخص ان مخصوص لوگوں میں شمار ہوگا جن کے لئے حاملانِ عرش دعاء کریں گے کہ بخش دے انہیں جنہوں نے توبہ کی ہے اور پیروی کی ہے تیرے راستے کی اور بچالے انہیں عذاب جہنم سے۔

شرح: ایسا مرید ان مخصوص لوگوں میں ہو جاتا ہے جن کی معرفت اور بخشائش کے لئے حاملانِ عرش یعنی وہ فرشتے جو عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں دعا گو رہتے ہیں۔

قولہ: فقد عظم اللّٰہ اقدارهم اذجعل حملة العرش داعين لهم.

(ارشاد شیخ ہے) اللہ تعالیٰ نے حاملین عرش کو ان کے لئے دعا کا حکم دے کر ان تائبین کی قدر و منزلت بڑھادی۔

شرح: یعنی کسی کے کام کے لئے معظم مکرم فرشتوں کو دعاء کا حکم دینا اس بات کی علامت ہے کہ توبہ کرنے والوں کی قدر و منزلت دوسروں سے افضل و برتر ہے۔

قولہ: لِمِثْلِ هٰذا فَلْيَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ وَفِي ذٰلِکَ فَلْيَتَنَا فَسِ الْمُتَنَا فِسُوْنَ ط (الصافات:۶۱)(مطففین: ۲۶)

(ارشاد شیخ ہے) یہ بھی فرمانِ الٰہی ہے ایسی ہی عظیم الشان کامیابی کے لئے

عمل کرنے والوں کو عمل کرنا چاہئے اور اس کے لئے سبقت لے جانے کی کوشش کریں سبقت لے جانے والے۔

شرح: اس طرح کی بہترین نعمت کو حاصل کرنے کے لئے ہمت والے ہمت کریں اور عبادت میں کوشش کرتے رہیں تاکہ ہمیشہ رہنے والی اس نعمت کے اہل اور حق دار بن جائیں۔

قولہ: والتوبة فرض علیٰ جمیع المؤمنین لقوله تعالیٰ وَتُوبوا اِلی اللّٰه جَمِیعاً اَیُّهَ الْمُومِنُونَ وقوله تعالیٰ وَمَن لَّم یَتُبْ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الظّٰلِمُونَ ط

(ارشاد شیخ ہے) اور توبہ تمام مومنین پر فرض ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا توبہ کرو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سب کے سب اے ایمان والو (النور: ۳۱)

اور یہ بھی فرمایا جو لوگ توبہ نہیں کریں گے تو وہ ظالموں میں سے ہے (الحجرات: ۱۱)

شرح: یعنی توبہ سارے مومنوں پر فرض ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے توبہ کرنے یعنی خدا کی طرف لوٹنے کا حکم ان تمام لوگوں کو دیا ہے جو ایمان والے ہیں۔ یہ حکم عام ہے۔ اور کوئی صورت ایسی نہیں ہے کہ ایک آدمی بھی توبہ سے بے نیاز ہو۔ اس لئے کہ توبہ سے حضرت آدم علیہ السلام ہی بے نیاز نہیں تھے۔

بزرگوں نے فرمایا ہے کہ جب باپ ہی پیدائشی طور پر توبہ سے بے نیاز نہیں رہے تو ان کی اولاد کو بھی توبہ سے بے نیاز ہونے کی پیدائشی طور پر گنجائش نہیں ہے۔

توبہ ہمیشہ اور ہر حال میں واجب ہے اس لئے کہ کوئی آدمی بھی گناہ سے مبراء نہیں۔ یہاں تک کہ قرآن وحدیث میں پیغمبروں کے زلات اور ان کے توبہ و گریہ وزاری کا ذکر موجود ہے۔

اگرچہ بعض لوگوں کے جوارح گناہوں سے پاک ہوں لیکن شیطانی وسوسہ سے جو دل میں پیدا ہوتا ہے، دل کو پراگندہ کر دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل کر دیتا ہے وہ خالی نہیں ہوتے، اور اگر اس سے بھی خالی ہوں تو اللہ کی معرفت اور اس کی صفات میں غفلت اور کمی سے خالی نہیں ہوں گے۔

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ توبہ سب پر فرض ہے۔ ہاں! جیسا حال ہوگا توبہ اسی کے مطابق فرض ہوگا۔

اور یہ آیت کریمہ۔ وَمَن لَّمْ يَتُبْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ بھی توبہ کی فرضیت پر ایک دوسری دلیل ہے۔ اس میں ارشاد خداوندی ہے کہ جو شخص توبہ نہیں کرتا وہ ظالموں میں ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آدمی گناہ کرے گا اسی لئے کہا گیا کہ جو گناہ کرتا ہے اور توبہ نہیں کرتا وہ ظالموں میں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ توبہ سب لوگوں پر فرض ہے تا کہ اس وعید سے نکل آئیں۔

بزرگوں نے فرمایا ہے آدمی سے گناہ کا ہونا یہ کوئی حیرت اور تعجب کی بات نہیں ہے۔ اس کی فطرت میں گنہگاری پوشیدہ ہے۔ انسان کی فطرت وطینت میں اچھائی و برائی کی آمیزش ہے اور اس کی فطرت خیر وشر کا مجموعہ ہے۔ شروع سے آخر تک گناہ سے پاک رہنا فرشتوں کا کام ہے، اول سے آخر تک گناہ میں ملوث رہنا شیطان کا فعل ہے، گناہ کرنا اور گناہ سے توبہ کرنا آدمی کا عمل ہے، جب گناہ ان کا عمل ہے تو توبہ بھی ان کا عمل ہوگا۔ کیا یہ نہیں دیکھا کہ فرمایا گیا جو توبہ نہیں کرتا وہ ظالم ہے۔ جو آدمی بھی ہے اس کا انتساب فرشتہ کی طرف ہوگا یا آدمؑ کی طرف یا شیطان کی طرف۔ لہٰذا جس نے ارتکاب گناہ کیا اور اس کے بعد توبہ کر لی اس نے حضرت آدم علیہ السلام سے اپنے نسب کی صحت پر دلیل قایم کر دی۔ اور جو گناہ پر اصرار کرتا رہا اس نے اپنی نسبت شیطان سے درست کر لی۔ لیکن فرشتوں سے اپنی نسبت قایم کرنا جو سراپا خیر ہی خیر ہیں۔ آدمی کے امکان سے باہر ہے۔ اس لئے کہ آدمی کی فطرت میں خیر وشر دونوں ہے۔ اور خیر کو شر سے آگ ہی کے ذریعہ الگ کر سکتے ہیں۔ اب وہ ندامت وشرمندگی، حسرت و پشیمانی کی آگ ہو یا اُس جہان کی آگ ہو۔

حضرت امام تستری (بعض نسخہ میں امام قشیریؒ ہے) رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا حرکات مذمومہ کو حرکات محمودہ سے بدلنے کا نام توبہ ہے۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب خلوت ہو خاموشی ہو اور حلال رزق ہو۔ اس لئے کہ تمام گناہوں کی جڑ حرام رزق ہے۔ چنانچہ جو شخص حرام کھانے پر مصر ہے۔ اور حرام لقمہ ہی اس کی غذا ہے وہ کیسے تائب ہو سکتا ہے۔ اس کو طاعت و

عبادت اور خیر وصلاح کی توفیق ہی نہیں ہوگی۔اور اگر توفیق بھی ہو جائے تو قبولیت نہیں۔

قولہ: وقال بعض المشائخ غفلتک عن التوبة لذنب ارتکبته شرمن ارتکابه.

(ارشاد شیخ ہے) اور بعض مشائخ نے فرمایا جس گناہ کا تم نے ارتکاب کیا اس سے توبہ کرنے میں غفلت برتنا ارتکابِ گناہ سے زیادہ برا ہے۔

شرح: یہ بات اس لئے کہی گئی کہ بندہ صرف گناہ کرنے سے عذاب اور پکڑ میں نہیں آئے گا اس لئے کہ اس کی فطرت ہی میں گناہ داخل ہے۔عذاب وعتاب، گرفت و پکڑ کی وجہ ترک توبہ ہے یعنی توبہ نہیں کرنے کی وجہ سے عذاب ہوگا۔اسی لئے توبہ سے غفلت کو ارتکابِ گناہ سے زیادہ برا کہا گیا ہے۔

قولہ: ومن اخترمته المنية قبل التوبة فأمره الى الله .

(ارشاد شیخ ہے) اگر توبہ سے قبل کسی کی موت آجائے تو اس کا معاملہ اللہ پر ہے۔

شرح: یعنی توبہ کرنے سے پہلے اگر کسی کا انتقال ہو جائے تو اس کا معاملہ اللہ کی مرضی پر ہے اگر وہ چاہے تو بغیر کسی کی شفاعت کے اور بغیر عذاب میں مبتلا کئے بخش دے اور یہ محض اس کا فضل وکرم ہی ہوگا۔اگر اس کی مرضی ہو تو کسی کی شفاعت سے بخش دے اور اگر اس کی رضا ہو تو گناہ کے مطابق عذاب میں ڈال کر پھر باہر نکال لے۔اس لئے کہ مومن کتنا ہی گنہگار ہو وہ ہمیشہ دوزخ میں نہیں رہے گا۔دوزخ میں ہمیشہ رہنا کافروں کے لئے ہے اور یہ ان کے کفر کی سزا ہے۔مومن کتنا ہی گنہگار ہو اس کے لئے کفر کی سزا نہیں ہے۔**اخترمهم الدهر ای اقتطعهم فاستاصلهم المیتة الموت** (یعنی انہیں جڑ سے اکھاڑ کر موت کی نیند سلا دیا ہے)

قولہ: قال اللّٰه تعالیٰ وَاِنَّ رَبَّکَ لَذُو مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰی ظُلْمِهِم (الرعد:٦)

(ارشاد شیخ ہے) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اور بے شک آپ کا رب بخشنے والا ہے لوگوں کو ان کے ظلم کے باوجود۔

شرح: نقل ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہمیشہ اپنی امت کے حالات سے ڈرتے تھے۔ یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی اور حضور ﷺ اس وقت تک راضی نہیں ہوں گے جب تک ساری امت کی بخشائش نہ ہو جائے۔ لہٰذا گنہگار امت کے لئے یہ امید بھری آیت ہے۔

قولہ: ووقتها باقٍ مالم يبلغ الروح الحلقوم.

(ارشاد شیخ ہے) اور توبہ کا وقت اس وقت تک باقی ہے جب تک روح حلق تک نہ پہنچ جائے۔

شرح: حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب ابلیس کی گردن میں لعنت کا طوق ڈال دیا تو اس نے مہلت مانگی اور بارگاہِ خداوندی سے قیامت تک کے لئے اس کو مہلت دے دی گئی۔ ابلیس نے عرض کیا تیرے عزت وجلال کی قسم! جب تک آدم کی اولاد میں جان باقی رہے گی میں اس کے دل سے نکلنے والا نہیں۔ ابلیس کا یہ جملہ سن کر اللہ رب العزت نے بھی اپنے عزت و جلال کی قسم کھا کر کہا جب تک آدم کی اولاد میں جان باقی رہے گی میں اس پر توبہ کا دروازہ بند کرنے والا نہیں ہوں۔

قولہ: اویات وقت علق باب التوبة.

(ارشاد شیخ ہے) یا آجائے باب توبہ کے بند ہو جانے کا وقت۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا یَومَ یَاتِی بَعضُ ایات رَبِّکَ لَایَنفَعُ نَفساً اِیمَانُهَا لَمْ تکنْ آمَنَتْ مِن قَبلُ اَو کَسَبَت فِی ایمَانِهَا خیرا (انعام/ 159)

(جس روز آئے گی کوئی نشانی آپ کے رب کی تو نہ نفع دے گا کسی کو اس کا ایمان لانا جو نہیں ایمان لا چکا تھا اس سے پہلے یا نہ کی تھی اپنے ایمان کے ساتھ کوئی نیکی)

شرح: ایمان نہیں لانے کی بات کافروں کے لئے ہے اور اپنے ایمان کے ساتھ کوئی نیکی نہیں کی یعنی خلوص نہیں برتا یہ منافقوں کے حق میں ہے۔

یعنی پچھم سے سورج نکلنے کے بعد نہ کافروں کا ایمان قبول ہوگا اور نہ منافقوں کا اخلاص قبول ہوگا۔

اب رہی یہ بات کہ پچھم سے سورج نکلنے کے بعد گنہگار مومن کے لئے توبہ کا دروازہ کھلا رہے گا یا نہیں؟

اس مسئلہ میں اختلاف ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ توبہ کو شرفِ قبولیت حاصل ہوگا۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ جس طرح کافر و منافق کی توبہ قبول نہیں ہوگی اسی طرح ان کی توبہ بھی قبول نہیں ہوگی۔ لیکن بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہ اس کی مرضی پر منحصر ہے۔ چاہے قبول کرلے چاہے رد کردے۔

تفسیر دینوری میں اسی آیت کے ضمن میں لکھا ہے کہ پچھم سے سورج نکلنے کے بعد بھی اگر مومن گنہگار توبہ کرلے تو اس کی توبہ قبول ہوگی اور یہ بھی ارقام فرمایا ہے کہ اگر صغیرہ ہے تو طلوع سے پہلے قبول ہوگی۔

قولہ: ثم یلازم الورع فی جمیع أحواله ویعلم أن اللّٰہ تعالیٰ محاسبة علی الاستقصاء قال اللّٰہ تعالیٰ اِن کَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَردَلٍ اَتَینا بِهَا وَکَفیٰ بِنَا حَاسِبِین ط (الانبیاء: ۴۷)

(ارشاد شیخ ہے) پھر اس (مرید) پر لازم ہے کہ وہ اپنے تمام احوال میں پرہیز گاری کو اختیار کرے اور اس بات کو سمجھ لے کہ اللہ تعالیٰ اس کا پوری طرح حساب لینے والا ہے جیسا کہ اس نے فرمایا۔ اگر (کسی کا عمل) رائی کے دانے کے برابر بھی ہوگا تو ہم اسے بھی لا حاضر کریں گے اور ہم کافی ہیں حساب کرنے والے۔

شرح: اور جیسا کہ میں نے کہا توبہ کرنے کے بعد اپنے تمام احوال میں ورع (پرہیز گاری) کو اپنے اوپر لازم کرلے۔ ورع کا معنیٰ شبہات کا ترک ہے۔

امیر المومنین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں نے ستر قسم کی حلال چیزوں کو چھوڑ دیا صرف اس ڈر سے کہ کہیں حرام نہ ہو۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ جو کھانے پینے اور پہننے میں مشتبہ چیزوں کو ترک نہیں کرتا وہ مشتبہ چیزوں کو چھوڑنے اور حلال کی کھانے میں بھی احتیاط نہیں کرسکتا۔

ویعلم أن اللہ تعالیٰ .... الیٰ اخرہ ۔اوراس بات کو جاننا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ بندہ کا پورا پورا حساب لینے والا ہے اگرچہ اس کا عمل رائی کے دانے کے برابر کیوں نہ ہو۔ پھر بھی وہ چھوڑنے والا نہیں اور وہ تبارک وتعالیٰ اپنے بندوں کو خود اس بات کی خبر دے رہا ہے کہ ہم کافی ہیں حساب لینے والے۔

کفی بنا-کفینا کے معنی میں ہے۔

قولہ: فاذا اصح لہ مقام التوبة والورع و شرع فی مقام الزهد فقد آن له لبس المرقعة۔

(ارشادِ شیخ ہے) جب اس نے مقام توبہ اور مقامِ ورع درست کرلیا تو وہ مقامِ زہد میں قدم رکھے اب مرقعہ (خرقہ) پہننے کا وقت اس کے لئے آگیا۔

شرح: جب اس نے مقام توبہ کو پورے شرائط واحکام کے ساتھ جیسا کہ میں نے کہا صحیح کرلیا اور مقامِ ورع کو درست کرلیا اگرچہ مقامِ ورع ظاہراً ایک دوسرا مقام ہے مگر مقامِ توبہ ہی میں داخل ہے اس لئے کہ مقامِ توبہ، ورع کے بغیر صحیح و درست نہیں ہوسکتا۔ اب وہ مقامِ زہد میں قدم رکھے۔ اس کے لئے مرقعہ (خرقہ) پہننے کا اب وقت آگیا اگر اس کا حق ادا کرسکے۔

بعض لوگوں نے کہا ہے کہ خرقہ پہننا دو جماعت کے لئے صحیح و درست ہے۔

ایک ان لوگوں کے لئے جنہوں نے دنیا کو ترک کردیا۔ اور دوسرے وہ لوگ جو مولیٰ کے مشتاق ہیں۔

اور بزرگوں نے یہ بھی فرمایا ہے کہ جب تک مقامِ توبہ درست نہیں ہوتا کسی بھی دوسرے مقام میں قدم نہیں رکھنا چاہئے۔ اس لئے کہ توبہ تمام مقامات کے لئے اسی طرح ہے جیسے بنیاد کے لئے زمین ہوتی ہے۔ بغیر زمین کے کوئی بنیاد نہیں رکھی جاسکتی اسی طرح کوئی مقام بھی مقامِ توبہ کے بغیر درست نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ کہتے ہیں **التوبہ للمقامات کا الارض للبناء۔**

حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا زہد کی تین قسمیں ہیں:

۱. عوام کا زہد حرام کا ترک کرنا

۲. خواص کا زہد حلال چیزوں میں فضول کا ترک کرنا

۳. عارفوں کا زہد ان مشاغل کا ترک کرنا جو بندہ کو اللہ تعالیٰ سے دور کردیں

اسی لئے کہتے ہیں **ما شغلک عن الحق فھو طاغوتک** جو چیز تجھ کو اپنی طرف مشغول کرلے یعنی حق سبحانہ وتعالیٰ سے دور کردے وہی تمہارا بت ہے۔

قولہ: **وان رغب فیھا فلیراع ما یلزمہ فی لبسھا لئلا یصیر ھجینا اویخرج بھرجاً۔**

(ارشاد شیخ ہے) اور اگر مرقعہ (خرقہ) پہننے کی طرف رغبت ہو تو اس بات کی عایت کرے کہ مرقعہ پہننے کے جو حقوق عاید ہوتے ہیں ان کو ادا کرے تاکہ وہ عیب سے پاک رہے اور اس پر کھوٹا و ناقص ہونے کا الزام نہ لگے۔

شرح: ھجینا۔عیب دار کے معنی میں ہے۔ بھرجاً۔ردی و کھوٹا کے معنی میں۔

اگلے بزرگوں کے یہاں بھی خرقہ پہننے کی یہی شرط تھی جو حضرت شیخ نے تحریر فرمائی ہے۔اکابرین نے لکھا ہے کہ مرقعہ اولیا کا لباس ہے اور اس کو پہننے کی وہی شرط ہے جو کفن پہننے کی ہے۔ پہلے زندگی اور زندگی کی تمام لذتوں سے امید اٹھالے زندگی کی راحتوں سے دل کو پاک کرلے اور اپنی زندگی کو پورے طور پر حق سبحانہ وتعالیٰ کی خدمت کے لئے وقف کردے۔

حضرت شیخ (ضیاء الدین ابونجیب سہروردی رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں کہ ایک شخص حضرت شیخ احمد غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے خرقہ کی فرمائش کی۔ حضرت غزالی نے اس شخص کو میرے پاس بھیج دیا تاکہ میں اس کو خرقہ کے حقوق بتادوں (یعنی خرقہ پہننے سے جو ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں وہ سمجھادوں) وہ شخص میرے پاس آیا میں نے اس کے سامنے خرقہ پہننے کے تمام حقوق بیان کردیئے۔یعنی خرقہ پہننے کے جو حقوق واجب ہوتے ہیں تفصیل کے ساتھ اس کو بتادئے۔ حقوق خرقہ سے متعلق میری باتیں سن کر خرقہ پہننے سے وہ ڈر گیا اور میرے پاس سے چلا گیا۔

جب یہ بات حضرت شیخ احمد غزالی کو معلوم ہوئی تو مجھے بلایا۔ تنبیہ کی اور فرمایا میں نے اس شخص کو آپ کے پاس اس لئے بھیجا تھا کہ آپ اس کو ایسی باتیں بتائیں گے جن کو سن کر خرقہ پہننے کی طرف اس کی رغبت اور بڑھے لیکن آپ نے اس سے ایسی گفتگو کی جس کی وجہ سے جو رغبت بھی تھی وہ جاتی رہی۔ آپ نے جو باتیں کہیں وہی صحیح و درست ہیں اور خرقہ کے حقوق کی ادائیگی واجب ہے لیکن اگر یہ باتیں مبتدی کے لئے لازم کر دی جائیں تو وہ راہِ فرار اختیار کر لے گا اور ان شرائط پر نہیں ٹھہر سکے گا۔ ہم تو خرقہ اس لئے پہنا دیتے ہیں تا کہ جماعتِ صوفیا کی مشابہت ہو جائے اور ان کے لباس سے آراستہ و پیراستہ ہو کر ان کے محفلوں و مجلسوں میں داخل ہونے کے لائق ہو جائے۔ ان کی صحبت و میل جول کی برکت سے ایسی نظر پڑ جائے جس سے احوال بدل جائیں اور معاملات میں ایسی تبدیلی آجائے کہ اللہ تعالیٰ انہیں حضرات میں اس کو بھی شامل فرمالے۔

قولہ: وقد وهنت هذه القاعدة وارتفع التميز وانحل النظام ووقع الرضا من جُنبة الاتباع بالارفاق ومن جنبة المتبوعين بالاتباع ومن ذلك ينتشر الفساد و يظهر العناد۔

(ارشاد شیخ ہے) اور اب یہ قاعدہ سست پڑ گیا، تمیز اٹھ گئی، تنظیم میں انتشار آگیا۔ اب تو اپنی خواہش و مرضی باقی رہ گئی کہ لوگ میری اتباع کریں۔ میری اتباع کرنے والوں کی تعداد بڑھے۔ یہی وجہ ہے کہ فساد پھیل رہا ہے اور دشمنی بڑھ رہی ہے۔

شرح: حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ گویا فرماتے ہیں کہ اگلے بزرگوں کے یہاں خرقہ پہننے کے لئے اسی طرح کی شرطیں تھیں جو کتابوں میں مرقوم ہیں۔

مگر اب تو یقیناً یہ قاعدہ سست پڑ گیا۔ صادق و کاذب حق و باطل، رسم و حقیقت اور عالم و جاہل کے درمیان فرق و تمیز باقی نہیں۔ اپنے بنائے ہوئے قانون کا عمل دخل ہے۔ لوگ میری اتباع کریں اس خواہش نے سر اٹھالیا ہے۔

ارفاق - نفع اٹھانے اور نرمی کرنے کے معنی میں ہے۔ لیکن یہاں پر پہلا معنی مراد ہے یعنی جو لوگ اس کام میں داخل ہوتے ہیں اور جماعت صوفیا سے اپنا تعلق قایم کرتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ کھانا پینا اور خرقہ میری مرضی سے ہو۔ اور پیروی کرنے والے میری اتباع میں لگے رہیں۔ چنانچہ جو افراد اپنے کو مقتدا سمجھتے ہیں وہ اسی فکر اور خواہش میں رہتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ اصحاب ان کی اتباع و پیروی کریں۔ اسی وجہ سے فساد پھیلتا ہے اور دشمنی بڑھتی ہے۔

اس جماعت کے دشمنوں اور منکروں کو یہ بدگمانی ہو جاتی ہے کہ اس میں سب کے سب ایسے ہی لوگ ہیں، اسی لئے لوگ کہتے ہیں کہ اس زمانہ میں جماعتِ صوفیا کا کوئی فرد باقی نہیں ہے۔ صرف ان کے اثرات باقی ہیں۔

قولہ: **فلبس المرقعة يجب أن يكون لمن قد ادب نفسه بالاداب وراضها بالمجاهدات والمكابدات وتحمل المشاق وتجرع المرارات فيكون قد جاوز المقامات وتأدب بالمشائخ الذين يصلحون للاقتداء وصحب رجال الصدق وعرف أحكام الدين وحدوده وأصول المذهب وفروعه فمن لم يكن بهذه الصفة فحرام عليه التصدى للمشخية والارادة.**

(ارشاد شیخ ہے) مرقعہ پہننا اس شخص کے لئے واجب ہے جس نے اپنے نفس کو تمام آداب سے مؤدب بنالیا۔ اس کو مجاہدے میں ڈال کر، مشقتوں اور سختیوں میں مبتلا کر کے اور تلخ گھونٹ پلا کر اسے نرم کرلیا، اور اس شخص کے لئے بھی واجب ہے جس نے مقامات کو طئے کرلیا۔ پیروں کے آداب سے اپنے کو آراستہ کرلیا، مقتدائی کے لائق ہو گیا ارباب صدق کی صحبت اٹھائی، دین کے احکام وحدود اور مذہب کے اصول وفروع سے واقفیت حاصل کرلی۔

جس شخص میں یہ سب اوصاف نہ ہوں اس کے لئے شیخ بن کر سامنے آنا اور پیری

مریدی حرام ہے۔

شرح: حضرت سعید میتب ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اس بات کو نہیں سمجھتا اور نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ کے اس پر اور اس کے نفس پر کیا کیا حقوق ہیں اور اوامر و نواہی کے آداب نہیں برتتا اس نے ادب کو کنارے ڈال دیا ہے یعنی ادب سے دور ہے۔

جماعتِ صوفیا کے افراد نے برسوں خدمت کی سعادت سے بہرہ ور ہو کر اور ریاضت و مجاہدے میں لگ کر ہر ایک ادب کو حاصل کیا ہے، لیکن ہمارے زمانے میں نہ ویسی ہمت ہے اور نہ ویسی ارادت ہے اسی وجہ سے پیر نہ مقامِ پیری پر نظر آتے ہیں اور نہ مریدوں کی خوب خوب تربیت ہو رہی ہے۔ یہ دیکھ کر جاہلوں کو اعتراض کا موقع ہاتھ آگیا طعن کرتے اور کہتے ہیں کہ پیروں نے ایسا نہیں فرمایا اور ایسی باتیں نہیں کہی ہیں۔

راضھا بالمجاھدات و المکابدات.................. الیٰ آخرہ

یہ جو فرمایا گیا اس سے مراد یہ ہے کہ نفس کو مجاہدے میں ڈال کر، سختیوں اور مشقتوں میں مبتلا کر کے، تلخ گھونٹ پلا کر نرم کر لیا جائے۔ جس نے بھی ایسا کیا اور مقامات و ادب کی راہ طئے کی وہ اس لائق ہو گیا کہ لوگ اس کی اتباع کریں۔ وہ ان مردانِ حق کی صحبت میں بیٹھنے کے لائق ہو گیا۔ جو اربابِ صدق ہیں۔ اب اس نے احکامِ دین اور حدودِ دین کو سمجھ لیا۔ مذہب کے اصول و فروع سے واقف ہو گیا۔ جو ان صفات سے متصف نہیں ہوا اس کے لئے مقتدا اور شیخ بن کر سامنے آنا اور پیری و مریدی کرنا حرام ہے۔ جیسا کہ حضرت رسول اکرم ﷺ نے فرمایا ہے الشیخیۃ خلافۃ النبوۃ ای فی دعوۃ الخلق الی الحق (مخلوق خدا کو حق کی طرف دعوت دینے میں مشیخت و پیری نبوت کی خلافت ہے)

اور قرآن میں بھی اس معنی کی طرف اشارہ موجود ہے، قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ؕ (یوسف:۱۰۸) (آپ فرما دیجئے یہ میرا راستہ ہے میں تو بلاتا ہوں صرف اللہ تعالیٰ کی طرف، واضح دلیل پر ہوں میں اور وہ بھی جو میری پیروی کرتے ہیں) یعنی جو میری پیروی کرتے ہیں وہ بھی دلیل و برہان پر ہیں۔

قولہ: وقیل من لم یتادب برویۃ عیوب افعالہ ورعونات نفسہ ولم یعمل فی ازالتھا بجھدہ لم یجز الاقتداء بہ .

(ارشادِ شیخ ہے) اور بعض لوگوں نے کہا ہے کہ جو معاملات میں اپنی برائیوں پر اور نفس کی رعونت پر نظر نہیں رکھتا اور ان کو دور کرنے کے لئے جد وجہد نہیں کرتا بلکہ ان تمام آداب سے خالی ہے اس کی اقتدا و پیروی جائز نہیں۔

شرح: یعنی جو شخص اپنے فعل وعمل کے بعد اپنے اعمال کی آفتوں اور افعال کی برائیوں اور اپنے نفس کی آرائش وزیبائش کو خوب اچھی طرح نہیں جانتا اور اپنے اعمال وافعال کو برائیوں اور خرابیوں سے پاک نہیں کرتا نفس کو تمام آرائش سے صاف وشفاف نہیں کرتا وہ ساری طاقتوں یعنی تمام صلاحیتوں کے باوجود اس لائق نہیں کہ اس کی اقتداء کی جائے۔

نفس کی رعونت خود پرستی ہے اور جو شخص خود پرستی سے بیزار نہیں ہوتا وہ خدا پرست نہیں ہوسکتا۔

عوارف میں آیا ہے کہ اہم ترین ادب یہ ہے کہ صادق (یعنی جو کمالِ صدق پر فائز ہیں) کو قوم کا پیشوا بننے کے لئے جھگڑا نہیں کرنا چاہئے۔

جب کوئی یہ دیکھے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے مریدوں ومسترشدوں کے دل میں اس کے لئے حسنِ ظن بڑھا دیا ہے اور سچی ارادت پیدا کردی ہے تو اس وقت ڈرنا چاہئے اس لئے کہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے لئے امتحان اور آزمائش ہے۔ اور جہاں تک نفس کی بات ہے تو اس کی پیدائش ہی اس بات پر ہوئی ہے کہ اس کو لوگوں کے درمیان مقبول ہونا اور مشہور ہونا پسند ہے۔

ہاں! جب شیخ اپنے حال کے اعتبار سے مقامِ تمکین پر پہنچ جائے اور اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوجائے جو اس کی مراد ہے تو وہ مریدوں اور مسترشدوں کے رشد وہدات کی طرف توجہ دے۔ اور اس طرح تعلیم وتلقین کرے جس طرح خیر خواہ اور مشفق لوگ کرتے ہیں بلکہ

ان سے اس طرح گفتگو کرے جس طرح باپ اپنے بیٹے سے کرتا ہے اور جس میں دین و دنیا کی بھلائی ہوتی ہے۔

قولہ: ثم یاخذ نفسه بالمجاهدات ویتفقد من زیادتها و من نقصانها ومالها وما علیها.

(ارشادِ شیخ ہے) پھر نفس کو مجاہدے میں لگائے اور اس بات پر نظر رکھے کہ کہاں زیادتی ہو رہی ہے اور کہاں کمی ہے۔ کیا اس کے لئے مفید ہے اور کیا مضر ہے۔

شرح: مقام توبہ اور ورع اختیار کرنے کے بعد زہد کو اپنائے۔ اور زہد کیا ہے؟ اپنے نفس سے جنگ کرنا یہی زہد ہے۔ اور نفس سے جنگ دراصل اس کی مخالفت ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ نفس کی موافقت یعنی اس کی مرضی پر چلنا - یہی کفر کی بنیاد ہے - اور نفس کی موافقت ہی حقیقت میں خدا کی مخالفت ہے۔

اور اس بات کی تلاش و جستجو میں رہے کہ نفس کی طرف سے کیا زیادتی ہو رہی ہے اور کیا کمی ہے یعنی جب دن مکمل ہو جائے تو اپنا محاسبہ کرے کہ زندگی کا ایک دن گذر گیا، میں نے کیا حاصل کیا۔ اسی طرح جب رات بیت جائے تو اپنا حساب اور جائزہ لے کہ زندگی کی ایک رات کم ہو گئی اور میں نے اس رات میں کیا حاصل کیا۔ اس طرح اپنی زیادتی و کمی یعنی فائدے اور نقصان پر غور و فکر کرے۔

مالها اور ما علیها جو کہا گیا اس کا مفہوم یہ ہے کہ بندہ اس فکر میں رہے کہ اس کے لئے اجر و ثواب کس میں ہے۔ اور عذاب و گرفت کا سبب کیا ہے۔ یعنی خواہشات اور ہوا و ہوس کو اچھی طرح سمجھنا چاہئے۔

قولہ: یعرض حاله علی شیخه فیما یعرض له وعلیه فی کل وقت فقد قیل لیس بلبیب من لم یصف مابه الی الصبیب.

(ارشادِ شیخ ہے) اپنا حال اپنے شیخ کے سامنے پیش کرے جو کچھ اور جس

وقت پیش آئے اسے عرض کرے کہا گیا ہے کہ وہ شخص عقلمند نہیں ہے جو اپنی حالت کو طبیب کے سامنے بیان نہ کرے۔

شرح: یعنی کرامت واجابت، نوازش وکرم اور قبولیت سے متعلق جو حال بھی مرید کے سامنے آئے اسے اپنے شیخ سے کھول کر بیان کرے۔ جب اللہ تعالیٰ سے کچھ جان رہا ہے تو اپنے شیخ کے حضور پیش کرنے میں شرم سے کام نہ لے۔ اگر کوئی بری کیفیت پیش آئے تو اسے بھی عرض کرے۔ وضاحت کے ساتھ بیان نہیں کر سکتا تو اشارے میں عرض کردے۔ اس لئے کہ اگر مرید کسی بات کو اپنے دل میں پوشیدہ رکھ لیتا ہے۔ اپنے شیخ سے بیان نہیں کرتا۔ نہ وضاحت و تصریح کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ اور نہ اشارے میں عرض کرتا ہے تو وہ بات اس کی راہ کے لئے رکاوٹ بن جائے گی۔ عقدہ یعنی گرہ پڑ جائے گا۔ عقدہ اس چیز کو کہتے ہیں جو سالک کو راہ میں حائل ہوتی ہے اور اس کو سلوک سے روک دیتی ہے۔ اور فقد قیل لیس بلبیب .... الی آخرہ جو کہا گیا اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ شخص عقل سے خالی ہے جو اپنی تکلیف، مرض اور اسبابِ مرض کو طبیب سے بیان نہیں کرتا۔ اگر وہ بیان کرتا تو طبیب مرض کے مطابق اس کا علاج کرتا اور دوائیں دیتا۔ یہی مثال پیر و مرید پر صادق آتی ہے۔ مرید مریض ہے اور شیخ طبیب۔ اگر طبیب، حکمت کی باریکیوں کو جانتا ہے اور مشفق و مہربان بھی ہے تو اپنے کو اس کے حوالہ کردے۔ کسی طرح کا اعتراض نہ کرے اگر طبیب میٹھی دوا دے تو اسے قبول کرے اور استعمال کرے اسی طرح اگر تلخ دوا دے تو اسے بھی قبول کرے اور کھائے۔ اور اس بات کو اچھی طرح سمجھ لے کہ جس طرح وقت پر میٹھی دوا تلخ دوا سے زیادہ مفید ہے اسی طرح وقت پر تلخ و کڑوی دوا میٹھی دوا سے زیادہ فائدہ مند ہے۔

اگر مرید اپنی ایک سانس بھی پیر سے پوشیدہ رکھتا ہے تو سچ بات یہ ہے کہ وہ صحبت پیر کے جو تقاضے ہیں ان میں خیانت کر رہا ہے جس طرح ظاہری مریض اگر طبیب کے سامنے اپنی بیماری کو بیان نہیں کرتا یا اپنی کیفیت کو بیان کرنے میں غلط بیانی و دروغ گوئی سے کام لے رہا ہے تو ایسی صورت میں وہ بیمار ہی رہے گا بلکہ شاید ہلاک بھی ہو جائے۔ اسی طرح بلا فرق باطنی مریض

بھی ہے۔ مرید کو چاہئے کہ وہ کسی حال میں بھی اپنے شیخ پر اعتراض نہ کرے۔ جو حکم دیا جائے اسے بلا تاخیر عمل میں لائے۔ شیخ کے حکم پر اپنے علم اور عقل کو مسلط نہ کرے۔

اگر مرید سے کسی وقت پیر کے حکم وارشاد کی خلاف ورزی ہو جائے تو اس پر واجب ہے کہ وہ فوراً پیر کے سامنے اقرار کرلے۔ اور پیر سزا و تنبیہ کے طور پر جو حکم دیں اس کے آگے سر جھکا دے۔

ہاں! پیر کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ مرید کی لغزش سے زیادہ سزا دیں۔ اس لئے کہ بھول اور لغزش کے ہونے کا ثبوت و جواز شریعت میں موجود ہے۔

فصل-۱۵

قوله: حکی عن الشیخ أبی محمد بن سلمة رضی الله عنه قال کل مرید لایصح له فی الیوم کذا و کذا مسئلة فانه ما سلک الطریق.

وحکی عن جماعة من المریدین حضروا عندالشبلی فوجدهم غفلة لم یذکروا

مسئلة فانشد

کفی حزنا بآله الصیب أن یری منازل من یهوی معطلة قفرا

(ارشاد شیخ ہے) حضرت شیخ ابی محمد سلمہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہر وہ مرید جو روزانہ اپنے مسائل کو (اپنے شیخ سے) صحیح و درست نہیں کر لیتا وہ یقیناً طریقت کا سالک نہیں۔ کہا گیا ہے کہ مریدوں کی ایک جماعت حضرت شبلیؒ کی خدمت میں حاضر آئی اور آپ نے ان لوگوں کو غافل پایا۔ اس لئے کہ ان مریدوں نے کسی مسئلہ پر گفتگو نہیں کی۔ اور کچھ دریافت نہیں کیا۔ اس پر حضرت نے یہ شعر پڑھا ؎

والہ شیفتہ (عاشق زار، زار) کے لئے یہ حزن و ملال کی بات ہے کہ وہ اپنے محبوب کے منازل (دلوں) کو خالی اور ویران دیکھے

شرح: یعنی مرید پر لازم ہے کہ وہ احکام سے متعلق روزانہ اپنے پیر سے دریافت کرتا رہے، وقتاً فوقتاً اپنی بیماریوں اور علتوں کو، اپنے اقوال وافعال کو شیخ کے سامنے عرض کرتا رہے تاکہ پیر اس کی بیماریوں اور علتوں کے مطابق اس کا علاج کریں، دوائیں تیار کریں اور اس کے سوالوں کا جواب دیں۔ اگر مرید ایسا نہیں کرتا تو یقیناً وہ سلوک کی راہ طے نہیں کر رہا ہے۔

اور **حکی عن جماعة من المردین** .... **الیٰ آخرہ**۔ جو فرمایا گیا اس میں یہ کہا گیا ہے کہ حضرت شبلی علیہ الرحمۃ کی خدمت میں مریدوں کی جماعت آئی۔ اور چوں کہ ان لوگوں نے حضرت سے کسی مسئلہ کو دریافت نہیں کیا اس لئے حضرت نے ان کو غافلوں میں شمار کیا۔

اَلْغَفَلَة - الغفلة کی "ف" متحرک ہے اور یہ غافل کی جمع ہے۔ یعنی جب وہ لوگ حضرت شبلی کے مریدوں میں تھے اور اس کے باوجود نہ اپنا کچھ حال بیان کیا اور نہ سلوک کے مسائل دریافت کیے تو حضرت نے ان کی تعریف نہیں کی بلکہ مندرجہ بالا شعر کے ذریعہ اُن پر ملامت کی۔

قولہ: ثم یطالب نفسه بالمنازل و المقامات علی ترتیبها ولا ینتقل من مقام الابعد تصحیح ادا بها

(ارشادِ شیخ ہے) پھر اپنے نفس سے منازل ومقامات کا ترتیب وار مطالبہ کرے اور جب تک ایک مقام کے آداب کو صحیح و درست نہ کرلے دوسرے مقام کی طرف منتقل نہ ہو۔

شرح: یعنی مقامات اور منازل کو اپنے آپ سے طلب کرے اور اس بات کا خیال رکھے کہ وہی ترتیب قائم رہے جس کو اس راہ کے واقف کاروں نے بیان کیا ہے۔ ایسا کرنے ہی پر فائدہ حاصل ہوگا اور سلوک کی سیدھی راہ طے ہوگی۔

اس کو یوں سمجھئے کہ مقامات میں پہلا مقام توبہ ہے پھر مقام ورع ہے۔ جب تک مقام توبہ کو کماحقہٗ طے نہیں کرتا مقامِ ورع میں قدم نہیں رکھے۔ مقامِ توبہ کو طے کیے بغیر مقام ورع میں قدم رکھنا صحیح نہیں ہوگا۔ اسی طرح تمام مقامات میں ترتیب اور ادب کو ملحوظ خاطر رکھے جب تک نیچے کے مقامات طے نہیں ہو جاتے بلند تر مقام کی طرف رخ نہ کرے۔

قولہ- ولا یشتغل بالزهد الا بعد الفراغ من الورع وماأشبه ذلک الى أن تصير المعاملات الى القلوب.

(ارشاد شیخ ہے) اور مقام زہد کو صحیح و درست کرنے میں اس وقت تک مشغول نہ ہو جب تک مقام ورع سے فارغ نہ ہو جائے۔ اسی طرح اور مقام کو سمجھے۔ یہاں تک کہ معاملاتِ ظاہر سے معاملات قلوب تک پہنچ جائے۔

شرح: یعنی معاملات ظاہر سے معاملاتِ دل تک رسائی ہو جائے۔ اس لئے کہ اصل کام دل ہی کا معاملہ ہے۔ جو دل تک پہنچ گیا اسے راستہ مل گیا۔

قولہ: وقال بعضهم العمل بحركات القلوب اشرف من العمل بحركات الجوارح.

(ارشاد شیخ ہے) جماعتِ صوفیا کے بعض حضرات نے کہا ہے کہ دل کی حرکتوں سے کام کرنا جوارح کی حرکتوں کے عمل سے زیادہ اشرف و اعلیٰ ہے۔

شرح: اگر اس عمل سے فکر، مراقبہ اور احوال باطن مراد ہیں تو یہ کوئی انوکھی بات نہیں۔ اس لئے کہ ایک لمحہ کا تفکر برسوں کی عبادت سے بہتر ہے۔ تفکر ساعة خير من عبادة سنة موجود ہے۔ اور اگر اس عمل سے خوف، امید، توکل، صدق اور اخلاص وغیرہ مراد لیں تو یہ بھی ظاہر اُدرست ہے۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ جس نے دل کا طواف کیا اس نے مراد پالیا۔ اور جس نے دل کی راہ گم کر دی وہ اس غلطی کی وجہ سے اتنی دور پھینک دیا گیا کہ پھر خود کو پانا ممکن نہیں۔ اور یہ جو کہتے ہیں کہ طالب کو چاہئے کہ خدا کو جہت و سمت میں اور دنیا و آخرت میں تلاش نہ کرے۔ بہشت میں بھی طلب نہ کرے بلکہ طالب اس کو اپنے اندر تلاش کرے۔ اس کی راہ خود اس کے اندر ہے۔ وَفِیْ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (الذاریات ر ۲۱) (خود تم میں ہے کیا تم دیکھتے نہیں) میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے۔

قوله: قال علیه السلام لو اتزن ایمان أبی بکر مع ایمان اُمتی أهل الأرض لرجح و قال علیه السلام مافاق ابو بکر بکثرة الصلوٰة و الصیام ولکن بشی وقر فی قلبه.

(ارشاد شیخ ہے) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر ابو بکر کے ایمان کو روئے زمین پر بسنے والی میری تمام امت کے ایمان کے ساتھ وزن کیا جائے تو یقیناً ابی بکر کے ایمان کا وزن بھاری رہے گا اور آنحضرت ﷺ نے یہ بھی فرمایا ابو بکر کو کثرت نماز اور کثرت روزہ کی وجہ سے برتری حاصل نہیں ہے بلکہ اس چیز کی وجہ سے وہ افضل و برتر ہیں جو ان کے دل میں ڈال دی گئی ہے۔

شرح: حضرت شیخ رحمتہ اللہ علیہ نے مندرجہ بالا احادیث کو اس بات کے لئے بطور دلیل پیش کیا ہے کہ ظاہری اعضاء کے حرکات سے جو اعمال ظہور میں آتے ہیں ان سے بہتر دل کے حرکات سے وجود میں آنے والے اعمال ہیں۔

الوقر: لغت کے اعتبار سے اس کا معنیٰ کان کا بہرا ہونا ہے اور اصلاحی معنی اونچا سننا ہے۔ بعض نسخہ میں وَقَّرَ قاف کی تشدید کے ساتھ بھی آیا ہے۔

یعنی حضرت ابو بکرؓ انبیاء و رسل کے بعد تمام لوگوں پر بہت زیادہ نماز پڑھنے اور بہت زیادہ روزہ رکھنے کی وجہ سے فضیلت ماب نہیں ہوئے۔ بلکہ اس بزرگ چیز کی وجہ سے فضیلت حاصل ہوئی جو اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں ڈال دی۔ لہٰذا یہ بات ثابت ہوگئی کہ دل کے حرکات سے ظہور میں آنے والے اعمال ظاہری اعضاء کے حرکات سے ظہور میں آنے والے اعمال سے بہتر و اعلیٰ ہیں۔ جہاں تک ظاہری اعضاء کے ذریعہ وجود میں آنے والے اعمال کا تعلق ہے تو اس میں محمد رسول اللہ ﷺ کے تمام صحابہ برابر ہیں۔ جس طرح حضرت ابو بکرؓ ظاہری اعمال کی ادائیگی کرتے دوسرے صحابہ بھی اسی طرح کرتے۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ کے دل میں جو بات بیٹھی ہوئی تھی اور جس کی وجہ سے ان کو تمام

لوگوں پر فضیلت و برتری حاصل تھی اس کی تائید میں حضرت شیخ قدس سرہ فرماتے ہیں۔

قولہ: لهذا ظهر من حاله بعد وفات رسول الله ﷺ مالم يظهر من حال غيره حين صعد المنبر فحمدالله وأثنى عليه ثم قال من كان منكم يعبد محمداً فان محمداً قدمات ومن كان منكم يعبد رب محمد فان رب محمد حيٌّ لايموت.

(ارشاد شیخ ہے) چنانچہ یہ بات اس وقت ظاہر ہوئی جب رسول اکرم ﷺ نے وفات پائی یہ بات کسی اور صحابی کے حال سے ظاہر نہیں ہوئی۔ جب کہ حضور ﷺ کی وفات کے وقت تینتس ہزار صحابہ موجود تھے۔ لیکن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی منبر پر آئے۔ سب سے پہلے اللہ تبارک وتعالیٰ کی حمد وثنا کی۔ پھر فرمایا جو لوگ محمد رسول اللہ ﷺ کی عبادت کرتے تھے وہ سن لیں کہ محمد ﷺ وفات پا گئے۔ اور جو محمد رسول اللہ ﷺ کے رب کی عبادت کرتے تھے وہ یہ سمجھ لیں کہ محمد ﷺ کا رب زندہ ہے اور اسے کبھی موت نہیں آئے گی۔

شرح: یہاں پر بزرگوں کا کہنا ہے کہ کون سمجھ سکتا ہے کہ صدیق اکبرؓ نے کیا دیکھا تھا جوان کے سر نے ایسی مشغولی اختیار کر لی کہ کوئی چیز بھی ان کو اپنی جگہ سے ہٹا نہ سکی۔

ثنتان مابين التوقيرين یہیں سے یہ بات نکلتی ہے کہ دونوں تعظیم میں فرق ہے۔ یعنی اہل ظاہر کی تعظیم کچھ ہے اور اہل باطن کی تعظیم کچھ اور۔ اہل ظاہر کا دعویٰ تعظیم دوست یا اولاد کے انتقال (کے صدمہ) سے مجروح ہو جاتا ہے اور اہل باطن کا انداز تعظیم یہ ہے کہ سید دو جہاں ﷺ کی وفات پر بھی پائے استقامت میں لرزش نہیں آئی۔

ممکن ہے کوئی کوتاہ نظر یہ سمجھ بیٹھے کہ اس سے تو شریعت کی (ظاہراً) تصغیر ہو رہی ہے حالانکہ ایسی بات نہیں۔ کیونکہ بندوں کی عزت وذلت (کی پرواہ جو بظاہر ہے) کا اللہ کی طرف سے عزت وذلت (کی پرواہ جو پوشیدہ ہے) کے مقابلے میں ہر طرح سے ہیچ ہونا حقیقت اور ثابت ہے۔

قولہ: وقاتل أهل الردة حتى حفظ الاسلام.

(ارشاد شیخ ہے) اور حضرت ابو بکر نے مرتد سے قتال کیا تا کہ اسلام کی حفاظت ہو سکے۔

شرح: حضرت ابو بکر کا اہل ردہ سے جنگ وقتال کرنے کی بات بھی حضرت شیخ رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت ابو بکر کی فضیلت و برتری کی تائید میں کہی ہے اور یہ قتال حضور نبی کریم ﷺ کے انتقال کے بعد ہوا تھا۔

حدیث میں آیا ہے کہ ایک روز حضرت صدیق اکبرؓ مسجد میں آئے رحمتہ اللعالمین حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آگے آؤ وہ آگے آئے۔ دوسری بار فرمایا قریب آؤ وہ قریب آئے پھر ارشاد ہوا اور قریب آؤ وہ اور قریب آئے۔ اسی طرح چند بار قریب آنے کا حکم دیتے رہے اور وہ قریب ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ صدیق اکبرؓ کا زانو سرکار دو عالم ﷺ کے زانو سے مل گیا۔ وہاں پر ایک اعرابی بھی موجود تھے وہ کھڑے ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ! صدیق اکبرؓ کو یہ مقام جو حاصل ہوا وہ اسی وجہ سے حاصل ہوا ہے کہ انہوں نے چالیس ہزار دینار پوشیدہ طور پر اور چالیس ہزار دینار کھلے عام پیش کیا ہے۔ اگر میں بھی اسی ہزار دینار حاضر کر دوں تو کیا مجھے بھی یہ مرتبہ و مقام مل جائے گا؟

حضور ﷺ نے فرمایا۔ نہیں۔ اعرابی نے عرض کیا اگر اسی ہزار کا دو گنا پیش کر دوں؟

حضور ﷺ نے فرمایا۔ پھر بھی نہیں۔ اگر تم اسی ہزار کا دس گنا بھی پیش کرو گے تو اس مقام کو نہیں پہنچ سکتے۔

اعرابی نے عرض کیا۔ حضور! ایسا کیوں؟

ارشاد ہوا ابو بکر بزرگی و عظمت کے جس مقام پر فائز ہیں وہ سرفرازی مال و دولت ایثار کرنے کی وجہ سے انہیں حاصل نہیں ہے بلکہ اس چیز کی وجہ سے ہے جو ان کے دل میں ڈال دی گئی ہے۔ اور وہ جلال خداوندی و عظمت الٰہی ہے جو ان کے سر میں موجود ہے۔

ان باتوں سے یہ ظاہر ہو گیا کہ حضر ابو بکر صدیق ﷺ کو جو مقام خاص حاصل تھا وہ دوسروں کو نصیب نہیں تھا۔

قولہ: وقال بعض المشائخ اذا صارت المعاملات الی القلوب استراحت الجوارح فحینئذ یشتغل بعمارۃ الباطن و مباشرۃ الأحوال ومراعات الأسرار وعدالانفاس کما قیل عبادۃ الفقیر نفی الخواطر.

(ارشاد شیخ ہے) اور بعض مشائخ نے فرمایا ہے کہ جب ظاہری معاملات دلوں تک پہنچ جاتے ہیں تو ظاہری اعضاء کو آرام مل جاتا ہے۔ اس وقت صوفی باطن کو آباد کرنے، احوال کو درست کرنے، اسرار کی حفاظت کرنے، اور انفاس کو شمار کرنے میں مشغول ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ کہا گیا فقیر کی عبادت خطرات کا دور کرنا ہے۔

شرح: یعنی جب ظاہری معاملات کی رسائی باطنی معاملات تک ہو جاتی ہے اور ظاہری مشغولیت کا مجاہدہ باطنی مشغولی تک پہنچ جاتا ہے تو ظاہری اعضاء کو ظاہری مجاہدہ سے فرصت مل جاتی ہے اس لئے کہ اسرار کی حفاظت اور باطن کی آراستگی جس کے مقاصد ہوتے ہیں اس کو ظاہری مجاہدات سے فرصت نہیں ملتی۔ وہ طرح طرح سے نفس کی مخالفت میں لگا رہتا ہے اس کے بعد وہ باطن کو آباد کرنے میں مشغول ہو جاتا ہے اور یہ صفاتِ مذمومہ کو صفاتِ محمودہ سے بدلتا ہے احوال کی درستگی اور اسرار کی حفاظت ایسی نعمت ہے جس کے لئے خواص مخصوص ہیں۔ ان کو ایسے اسرار عطا کر دیئے جاتے ہیں جن سے عوام محروم ہیں۔ اگر ایسا نہیں ہو تو پھر عمومیت اور خصوصیت میں کیا فرق رہ جاتا ہے۔ اور خصوصیت کا فائدہ بھی حاصل نہیں ہوتا۔

وعدالانفاس — ان سانسوں کا گننا ہے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ لی جائیں۔ یعنی آدمی جتنے بلند مرتبہ پر فائز ہوتا جائے گا اور اس کے اندر دانشمندی بڑھتی جائے گی اسی قدر اس میں التجاو التماس اور عرضی و درخواست کی کیفیت بڑھتی جائے گی۔ اور خوف غالب ہوتا جائے گا۔ سرکار ذی وقار محمد رسول اللہ ﷺ کے فرمان أنا أعلمکم باللہ و أخشکم للہ (میں اللہ تعالیٰ کو تمہارے مقابلہ میں زیادہ جانتا ہوں اور اس سے زیادہ ڈرتا ہوں) میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے۔

نفس کی محافظت کا معنی یہ ہے کہ اپنے ظاہر و باطن پر نگاہ رکھے۔ تاکہ اس کا کوئی ایسا عمل، ایسی گفتگو اور ایسی سوچ و فکر نہ ہو جو ادب واحترام کے منافی ہو۔ جو شخص جتنا قریب ہوتا ہے اور جتنا زیادہ قربت سے سرفراز ہوتا ہے وہ نفس کی محافظت اتنا ہی زیادہ کرتا ہے۔ نفس کی محافظت میں اس حد تک کوشش ہو کہ اس کو ہمیشہ حضوری حاصل رہے۔ ایک سانس بھی حضوری کے بغیر نہیں گذرے۔ اگر ایک چشم زدن بھی غائب رہا، ایک لفظ بھی حضوری کے بغیر زبان سے نکالا یا بغیر حضوری کے ایک عمل بھی صادر ہوا تو گرفت رکھی ہوئی ہے اور عتاب میں پڑتا ہے۔ ایسا اس لئے کہ پلک مارنے بھر بھی خداوند تعالیٰ سے دور رہنا عذاب سے بھری لاکھوں دوزخ سے بھی زیادہ سخت ہے۔ جس کے دل پر جلال حق کی عظمت جلوہ فگن ہوتی ہے اس سے کوئی بھی ایسا عمل صادر نہیں ہوتا جو دل کی حضوری کے بغیر ہو اور وہ شخص غیر کے ساتھ اپنی مشغولی سے اتنا خوفزدہ رہتا ہے کہ گویا اُس کی گردن ماری جارہی ہے اور اس کی ایسی حالت ہوتی ہے کہ حلال اشیاء کھانے کے وقت وہ بیمار جیسا ہو جاتا ہے اور سونے کے وقت نیند اُس سے کوسوں دور چلی جاتی ہے۔

اور جو حق سے غافل نہیں ہوتا اس کی ہر سانس اور اُس کے ہر عمل کے وقت اُس کے دل پر اللہ تعالیٰ کی ہیبت غالب رہتی ہے۔ اور اللہ رب العزت کی ہیبت سے اُس کے دل کا یہ حال ہوتا ہے کہ گویا ہر عمل کے وقت حق سبحانہ تعالیٰ اس کے سامنے ہے۔ اہل تصوف کے نزدیک حضوری یہی ہے اور یہی مقام خشیت ہے۔ **المخلصون علیٰ خطرٍ عظیم** (اہل خلوص بڑے خطروں میں ہوتے ہیں)

مرد کو اس راہ میں ہوشیار رہنا چاہئے۔ اس لئے کہ یہ راہ کعبہ کی راہ نہیں ہے۔ جس میں مرد و عورت دونوں برابر ہوتے ہیں۔ یہ تو مردوں کی راہ ہے اور اس میں خطرے ہی خطرے ہیں۔ اس راہ میں جو خواہشات اور آرزو و تمنا کے ذریعہ داخل ہوتا ہے وہ خواہشات کی نذر ہو جاتا ہے اور جو مرد ہیں وہ اس راہ کو ہمت کے ذریعہ طے کرتے ہیں۔ لیکن ہزاروں مرد میں کوئی ایک ہی مقصود تک پہنچتا ہے جہاں تک دعویٰ کا سوال ہے دعویٰ تو سب کرتے ہیں کہ ہم اس مقام تک پہنچ چکے ہیں۔

کما قیل عبادۃ الفقیر نفی الخواطر - یہ جو کہا گیا کہ فقیر کی عبادت خطرات کا

دور کرنا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے سامنے جو معاملہ بھی آئے اس میں وہ غور وفکر کرے اور تلاش وتحقیق سے کام لے کر یہ دیکھے کہ اس میں حق (کی رضا) ہے یا نہیں۔ اگر حق ہے تو اس پر عمل کرے اور اگر اس میں حق کی رضا نہیں ہے تو چھوڑ دے۔ اس لئے کہ جو معاملہ بھی سامنے آیا ہے کوئی ضروری نہیں کہ وہ الہام ہی ہو، ہوسکتا ہے کہ وہ شیطانی وسوسہ یا نفس کی پیداوار ہو۔

ہر وہ کام جس کی اتباع کر رہا ہے یا جس سے قلبی لگاؤ پیدا کر لیا ہے یہ سمجھتے ہوئے کہ توحید پر عمل کر رہے ہیں تو اس میں غلطی کا امکان بھی موجود ہے۔ ہوسکتا ہے کہ توحید پر عمل نہ کر کے کفر میں پڑ جائے۔ لہٰذا جو بات دل میں آئے اس کو اچھی طرح سمجھ لے کہ اس کا مطالبہ کہاں سے ہو رہا ہے۔ اگر حق سبحانہٗ تعالیٰ کے حکم کی تعظیم یا شریعت کا قیام یا غیروں کی اصلاح مقصود ہے تو اس کو حق سمجھے اور اس پر عمل کرے۔ جیسا کہ ایک بزرگ نے فرمایا **لی قلب ان عصیته عصیت اللّٰہ**۔

میرے پاس دل ہے اگر اس کی نافرمانی کرتا ہوں تو یہ اللہ کی نافرمانی ہوگی۔ یہ اس دل کی بات ہے جو راہ مستقیم پر لگ چکا ہے۔ اور ایسا بھی کہتے ہیں کہ عام لوگوں کے دل پر جو چیز بے فکر آتی ہے وہ خاطر ہے۔

جماعت صوفیا کے نزدیک جو حق کی جانب سے آئے وہ خاطر ہے، جو شیطان کی جانب سے آئے وہ وسوسہ ہے، اور جو نفس کی طرف سے آئے وہ ہواجس ہے۔

کہتے ہیں کہ خاطر، وسوسہ اور ہواجس میں فرق وہی کر سکتا ہے جس کی غذا حلال ہے۔ جو حرام کھانے والا ہے اس کے لئے سب وساوس ہی ہے، خاطر نہیں ہے۔ اور جس کی غذا مشتبہ ہوتی ہے اس کے لئے خاطر اور وساوس ملے جلے ہوتے ہیں اور نفس کی لذتیں جب اسے اپنی طرف مائل کرتی ہیں تو وہ اپنی جگہ اٹل رہتا ہے اور وہ حق سے دور نہیں ہوتا۔ اور اگر خاطر کی طرف سے حظ کا مطالبہ ہو جائے تو یہ گناہ اس کا حال ہو جاتا ہے۔ ایسے گناہ سے معافی کا طلب گار رہنا چاہئے۔ جس طرح اور دوسرے گناہوں سے معافی مانگتا ہے۔

اگر اس کے سامنے خاطر کی طرف سے کوئی مشکل معاملہ آجائے تو اس کو اللہ تعالیٰ کی کتاب (قرآن کریم) میں تلاش کرے۔ اگر وہاں نہیں ملے تو رسول اللہ ﷺ کی سنت (احادیث

نبوی) میں دیکھے۔ اگر وہاں بھی نہیں ملے تو اجتہاد سے کام لے اور اجتہاد کا جدھر زیادہ میلان ہو اسی کو اختیار کرے۔

جو حقیقت کا دعویدار ہے اور شریعت سے اس کا کوئی تعلق نہیں وہ مدعی اور جھوٹا ہے۔ مرد کو چاہئے کہ اپنے تمام احوال میں اپنا پاسبان رہے اور اپنی ضمیر کی سانسوں کو صدق کے معیار اور کسوٹی پر پرکھتا رہے۔ یہاں پر دو باتیں سامنے آئیں گی۔ یا تو اس کو حقیقت پر پائے گا یا شریعت پر۔

عبادة الفقير نفي الخواطر کا معنیٰ شاید یہ ہو کہ فاسد خیالات کو اور ان اندیشوں کو جو راہ دل کے لئے حجاب ہوتے ہیں اپنے سے دور کرتا رہے اور اپنے پاس ان کو بھٹکنے نہ دے۔ جیسے کرامات کی فکر کہ دریا سے گذر جاتے، ہوا میں اڑتے، پانی پر چلتے، درخت میں ہاتھ لگاتے اور پھل آجاتا۔ یا حق سبحانہ تعالیٰ کے خاص بندوں میں شمار ہو جاتے یا وہ اپنے خزانے سے مجھ کو حکمت دے دیتا۔ یا قوم کے رہبر و مقتدا بن جاتے اس طرح کی آرزو و تمنا سالک کے لئے دل کا حجاب ہے۔

لیکن جب محبت قوی ہوتی ہے اور استغراق کی ایسی کیفیت پیدا ہوتی ہے کہ اس وقت کسی غیر کی آواز سنائی نہیں دیتی اور اس کے سر میں کسی غیر کی جگہ نہیں ہوتی تو اس وقت تمام خاطر اس کے سر کے لئے محبوب ہوتی ہے اور اس کا یہ عالم ہو جاتا ہے کہ وہ ہمیشہ دوست کو دیکھتا ہے، دوست سے گفتگو کرتا ہے، دوست کی باتیں سنتا ہے۔ اس کی زبان خاموش رہتی ہے اور اس کا دل بولتا ہے۔ پھر اس کا یہ حال ہو جاتا ہے کہ وہ باطن میں محبوب کا مشاہدہ ایسے کرتا ہے جیسا کہ ظاہر میں دیکھ رہا ہے۔ اس وقت کسی غیر کا خطر کیا بگاڑ لے گا۔

قوله: وليحذر كل الحذر أن يفسد بدايته بقول المثنين ومدح المادحين بل يرجع الى مايعرف من نفسه كما قيل ليس سماع الألفاظ كمشاهدة الالفاظ.

(ارشاد شیخ ہے) اور اس بات سے اچھی طرح ڈرنا چاہئے کہ لوگوں کی تعریف و توصیف سے اس کے ابتدائی احوال تباہ و برباد نہ ہو جائیں۔ بلکہ

جب اس کی تعریف ہو رہی ہو تو اس وقت اس کو اپنے نفس کی معرفت حاصل رہے جیسا کہ کہا گیا ہے الفاظ کا سننا آنکھ سے دیکھنے کے جیسا نہیں۔

شرح: ان یفسد بدایته - یہاں بدایت اس لئے کہا گیا کہ منتہی مقام تمکین پر ہوتا ہے اور جب کوئی مقام تمکین پر پہنچ گیا تو اس وقت مدح وثنا اور تعریف وتوصیف سے اس کو کسی طرح کا نقصان نہیں پہنچتا۔

لیس سماع الالفاظ کمشاهدة الالفاظ - یعنی الفاظ کا سننا الحاظ یعنی مشاہدہ کے جیسا نہیں۔

الحاظ - حظ کی جمع ہے اور یہ دیکھنے کے معنی میں ہے۔

سالک جب دل کی آنکھ کھولتا ہے اور اسی چشم دل سے اپنے آپ کو دیکھتا ہے تو توحید کے دعوے اور وصول حق کی خوش گمانی کے باوجود سر سے پاؤں تک زنار ہی زنار نظر آتا ہے۔ اور اپنے نفس کو ہزاروں بت کے سامنے سجدہ ریز پاتا ہے۔ جب سالک اس عالم میں ہوتا ہے تو پھر مدح وثنا کرنے والوں کے تعریفی اور توصیفی کلمات پر کیسے فریفتہ ہو سکتا ہے۔

لیس سماع الالفاظ کمشاهدة الالفاظ

اہل سلوک کے یہاں مثل کے طور پر استعمال ہوتا ہے جیسے شریعت میں کہتے ہیں لیس الخبر کا لمعائنه (سننا دیکھنے کے جیسا نہیں ہو سکتا)

قوله: ویعود نفسه صیام النهار و قیام اللیل و خدمة الأخوان.

(ارشاد شیخ ہے) اور نفس کو اس بات کا عادی بنائے کہ وہ دن کو روزہ رکھے، رات کو قیام کرے اور اپنے بھائیوں کی خدمت میں لگا رہے۔

شرح: یہ تینوں باتیں ایسی ہیں جو نفس کے لئے مصیبت بنتی ہیں اس لئے کہ دن کے وقت کھانے پینے اور رات کے وقت سونے میں نفس کو لذت ملتی ہے جب کوئی دن میں روزہ دار رہے گا اور شب بیداری کرے گا تو اس طرح نفس کو دن اور رات کی لذتوں سے روک دے گا۔

روزے کا فائدہ بھوک ہے اور بھوک دل کے خون کو کم کرتی ہے۔ دل کو سفید کرتی ہے اور دل کی سفیدی اس کا نور اور روشنی ہے۔ بھوک دل کی چربی کو پگھلا دیتی ہے۔ دل کی چربی پگھلنے کی علامت رِقّت ہے اور دل میں رقت کا پیدا ہونا مکاشفہ کی کنجی ہے۔

شب بیداری کا فائدہ یہ ہے کہ دل ظلمات بشری سے صاف ہو جاتا ہے۔ اس سے دل کو صفائی اور روشنی حاصل ہوتی ہے۔ جب بیداری کا تعلق بھوک سے حاصل ہونے والی صفائی کے ساتھ ہو جاتا ہے تو اس وقت دل ستارہ کے طرح چمکنے لگتا ہے اور آئینہ کی طرح مجلد ہو جاتا ہے پھر جمال حق کی جلوہ گری ہونے لگتی ہے اور سالک کے اپنے دل میں آخرت کے بلند ترین درجات اور دنیا کی حقارت و آفات کا مشاہدہ کرنے لگتا ہے۔

شب بیداری بھی بھوک سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ بات سچ اور درست ہے کہ شکم سیر بھی رہیں اور شب بیداری بھی کریں یہ ناممکن ہے۔

نیند سے دل سخت اور مردہ ہو جاتا ہے۔ ہاں! جتنی ضرورت ہے اتنا سونا چاہئے۔

شب بیداری سے غیبی اسرار کا انکشاف ہوتا ہے جیسا کہ ابدالوں کی صفت بیان کی گئی ہے کہ فاقہ ان کی غذا ہے۔ غلبہ ان کی نیند ہے اور ان کی گفتگو ضرورتاً ہے۔ دنیا نامرادی کی جگہ ہے، مراد کی جگہ تو بہت ہے مرید کی اپنی کوئی مراد نہ ہو جس طرح دوسرے لوگ مراد کے پیچھے دوڑتے ہیں اسی طرح مرید کے سامنے اس کی بے مرادی ہو۔ مرید کا کام دوسروں کے برعکس ہوتا ہے۔ مرید کے کام دوسروں کے کام کے جیسے نہیں ہوتے۔ دوسرے لوگ تو اپنی مراد پر خوش ہوتے ہیں ہر مرید جو اپنے کھانے کپڑے کی آرزو میں لگا رہتا ہے وہ ارادت کی شرط سے باہر ہے۔

مرید کا سرمایہ تو بوجھ اٹھانا ہے جو دکھ درد، مصیبت و پریشانی اس کے سامنے آتی ہے وہ رضا ورغبت کے ساتھ اس کا استقبال کرتا ہے۔ رنج وغم اور فقر میں صبر سے کام لیتا ہے۔ کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتا اپنے حصے اور فائدے میں زیادتی وکمی کے لئے کسی سے جنگ وجدال نہیں کرتا۔

ہاں! جو ان باتوں پر صبر نہیں کر سکتا اس کو کہہ دیا جائے کہ وہ بازار جائے جہاں لوگ محنت ومشقت کرتے ہیں اور پسینے بہاتے ہیں وہیں جا کر اپنی خواہشات کی تکمیل کرے۔

بھائیوں کی خدمت کی جو بات کہی گئی اس سلسلے میں یہ معلوم رہے کہ بھائیوں کی خدمت کرنے میں بہت سارے فائدے ہیں اور وہ فائدے ایسے ہیں جو خدمت ہی کے لئے مخصوص ہیں۔ کسی سے لوگوں نے پوچھابم سدت قال خدمت فسدت. آپ بڑے کیسے بنے؟ انہوں نے فرمایا میں نے خدمت کی اور بڑا بن گیا۔ کہا بھی جاتا ہے من خدم خدم. جو خدمت کرتا ہے وہ مخدوم ہوتا ہے۔

اس جملے میں جمع کی شرط اس لئے لگائی گئی کہ ہر شخص خدمت کے لئے مستعد و تیار رہے۔ جو بوڑھے ہیں ان سے تو خدمت نہیں ہو سکتی لیکن جو جوان ہیں ان کو تو خدمت کرنی چاہئے۔ حضرت شیخ ابوالعباس رحمتہ اللہ علیہ سے منقول ہے انہوں نے فرمایا مرید کا کسی ایک خدمت میں لگے رہنا سو رکعت نفل نماز سے بہتر ہے۔ جو اپنی مراد اور خواہش پر عمل کرتا ہے وہ نفس کی فرمانبرداری کر رہا ہے چاہے وہ کام اپنی نوعیت کے اعتبار سے مشکل اور سخت ہی کیوں نہ ہو۔

ہاں! جو اس کے حکم پر عمل کرتا ہے وہ حق کی فرماں برداری کر رہا ہے۔ چاہے وہ کام دیکھنے میں مختصر ہی کیوں نہ ہو۔

مرید کو چاہئے کہ شیخ کے ساتھ ظاہر و باطن دونوں حال میں راست باز رہے تاکہ اصول صدق کے مطابق شیخ کی وہ شفقت اس پر ہوتی رہے جو بیس سال اور تیس سال کے مجاہدے سے بھی حاصل نہیں ہوتی۔

اگر مرید کو حکم دیا جائے کہ آگ میں کود جاؤ یا دریا میں ڈوب جاؤ۔ تو بغیر سوچے سمجھے اور بغیر کسی فکر و تردد کے فوراً عمل کرے اس لئے کہ شیخ بغیر دیکھے و سمجھے کوئی بات نہیں کرتے۔

خادم پر لازم ہے کہ ہر شخص کی خدمت میں لگا رہے۔ بزرگوں کے تسکین قلب اور طمانیت خاطر کا سامان بہم کرتا رہے تاکہ وہ اوراد و وظائف اور اپنے معمولات میں لگے رہیں اور اطمینان کے ساتھ اپنا کام کریں۔

ایسا کرنے پر خدمت کرنے والوں کو وہ نعمت حاصل ہوگی جو مجاہدے و ریاضت سے حاصل ہوتی ہے اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب ان کی دشمنی اپنے نفس سے ہو اور یہ اچھی طرح سمجھنا

چاہئے کہ دوسروں کے حقوق اس پر واجب ہیں۔اس کے حقوق دوسروں پر واجب نہیں ہیں۔

قوله: قال الجنید رحمة الله کل مرید لا یعود نفسه صیام النهار و قیام اللیل فکأنه تمنی مالا یصلح له.

(ارشادِ شیخ ہے) حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہر وہ مرید جو اپنے نفس کو دن میں روزہ رکھنے اور رات کو جاگنے کا عادی نہیں بناتا تو گویا وہ ایسی چیز کی تمنا کرتا ہے جو اس کے لئے صحیح و درست نہیں۔

شرح: یعنی ہر چیز کے لئے سبب اور شرط ہے جب کسی کو کسی چیز کی طلب ہو تو اس کے سبب اور شرط کو عمل میں لائے۔ اگر ایسا نہیں کرتا تو اس سبب کی طلب بغیر سبب کے اور مشروط کی طلب بغیر شرط کے ہوگی۔ اس کو صرف تمنا کہیں گے طلب نہیں کہیں گے۔ **ولیس الدین بالتمنیٰ** (دین تمنا کا نام نہیں ہے)۔

لوگوں نے کہا ہے کہ بندہ کا نفس کی مراد پر قائم رہنا کفر کی بنیاد ہے۔ نفس کی پیروی سب سے بڑا حجاب ہے۔ اس لئے کہ نفس کی اتباع حق کی مخالفت ہے اور حق کی مخالفت ہی تمام حجابات کا راز ہے۔ جب نفس کی مخالفت ہوتی تو اس وقت اپنی آرزو و تمنا باقی نہیں رہتی جو نفس کی مخالفت کرتا ہے۔ وہ شیطان کی مخالفت کرتا ہے اور شیطان کی مخالفت وہی کرتا ہے جس کی نگاہوں کے سامنے موت، قبر اور قیامت ہو۔ بندہ کو چاہئے کہ وہ اپنے آپ سے حق کے حقوق کا مطالبہ کرتا رہے اور بندہ کو اپنے آپ سے ایسی دشمنی ہو جیسی کہ انسان کو اپنے ماں باپ کے قاتل سے ہوتی ہے۔

قوله: ثم یراعی اوقاته بضرب من الخیر فان الوقت اذا فات لم یدرک.

(ارشادِ شیخ ہے) مرید کو چاہئے کہ وہ اپنے اوقات کا خیال رکھے ان کو خیر میں لگائے بے شک وقت جب گذر جاتا ہے تو اس کو لوٹایا نہیں جا سکتا۔

شرح: اس جملہ کا مقصد و مفہوم بس ایک ہی ہے کہ جو دن گذر گیا اس کو دوبارہ حاصل کرنا محال ہے اور جو دن آنے والا ہے اس میں اس بات کا شک پایا جا رہا ہے کہ وہ دن نصیب

ہوگا کہ نہیں۔ایسی صورت میں وہ بھی حاصل زندگی نہیں ہے۔لہٰذا جو دن حاصل اور موجود ہے اس وقت کو طاعت، عبادت اور قربت سے خالی نہ رکھے اگر خالی اور بے کار رکھ دیا تو عمر کو ضائع کر دیا۔ زندگی کا حاصل وہی وقت ہے جس میں وہ سانس لے رہا ہے اس وقت کو آخرت کے کاموں میں لگائے رکھے اور آخرت کی فکر سے خالی نہ جانے دے۔ جو وقت گذر گیا اس کو پانا محال ہے اور جو وقت آنے والا ہے اس میں یہ شک ہے کہ وہ وقت حاصل ہوگا یا نہیں۔اسی طرح جو سانس گذر گئی وہ اب واپس آنے والی نہیں۔اور جو سانس آنے والی ہے اس میں اس بات کا شک موجود ہے کہ وہ سانس حاصل ہوگی یا نہیں۔ ایسی صورت میں حاصل زندگی وہی ایک سانس ہے جو وہ لے رہا ہے۔لہٰذا اس سانس کو آخرت کی فکر سے خالی نہ جانے دے۔جیسا کہ کسی نے کہا ہے:

مامضی فات والمامل غیب ولک الساعۃ التی انت فیھا

ایک دوسرے نسخہ میں یہ شعر اس طرح آیا ہے ؎

مامضی فات ما سیاتک کَائِنٌ اغتنم الفرصۃ بین العدمین

(جو گذر گیا وہ ختم ہوا جو آنے والا ہے عنقریب آ کر رہے گا۔اس گھڑی کو غنیمت جانو جو دو عدمین کے درمیان ہے)

اور یہ جو کہا گیا ہے **وقتک بین النفسین نفس مضی و نفس یستقبل** میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے۔تمہارا وقت دو سانسوں کے درمیان ہے۔ایک سانس جو گذر گئی اور دوسری سانس جو آنے والی ہے۔

قولہ: وقال النبی ﷺ لا ینبغی للعاقل أن یکون شاخصاً الافی ثلث مرۃ لمعاش او تزود لمعاد او لذۃ فی غیر محرم.

(ارشاد شیخ ہے) نبی کریم ﷺ نے فرمایا عقلمند کو زیب نہیں دیتا کہ وہ ان تین چیزوں کے علاوہ کسی اور چیز کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے۔

(1) ضروری معاش کے حصول کے لئے۔

(2) آخرت کی تیاری کے لئے۔

(3) اپنی زوجہ کے ادائیگی حقوق کے لئے۔

شرح: شاخصاً۔ آنکھ کھولنے کے معنی میں ہے۔

غیر محرم کے ساتھ محبت اختیار کرنے کو بطور کنایہ استعمال کیا ہے۔ اس سے مراد یہی ہے کہ اپنی زوجہ کے حقوق کو ادا کرے۔

حضرت شیخ رحمتہ اللہ علیہ نے اس حدیث کو بطور دلیل پیش کیا ہے۔ جاننا چاہئے کہ جس کو آخرت کی طلب ہے وہ اپنے وقت کو کسی نہ کسی چیز میں لگائے رکھے۔ اور اپنا کوئی وقت بھی ضائع ہونے نہ دے۔ اس لئے کہ جس وقت کو ضائع و برباد کر رہا ہے شاید وہی وقت اس کے لئے سعادت ابدی کے حصول کا ہو۔

انسان کی زندگی کا ہر لمحہ بلکہ اس کی ہر ایک سانس ایک ایسا نفیس موتی ہے جس کا کوئی بدل نہیں۔ ایسی سانس کو یہ صلاحیت حاصل رہتی ہے کہ انسان کو ہمیشہ کی شقاوت (بدبختی) سے نکال کر ابدی سعادت میں داخل کر دیتی ہے۔ اگر اپنی سانس کو ضائع و برباد کر دیا تو اس کے نقصان ظاہر ہیں۔ کیونکہ شریعت کا سارا دارومدار مجاہدہ پر ہے۔

نقل ہے کہ رسول اکرم حضرت محمد ﷺ نے قربت حق سے سرفراز ہونے، عاقبت کے تمام خوف وڈر سے محفوظ رہنے اور تاج عصمت سے نوازے جانے کے باوجود اتنے مجاہدے کئے، بھوک و پیاس کی شدت برداشت کی۔ روزۂ وصال رکھے اور رات رات بھر اس طرح عبادت میں مشغول رہے کہ آپ کے پائے مبارک سوج جاتے۔ جسم کے چمڑے پھٹ جاتے ان سے خون جاری ہو جاتا۔ یہاں تک کہ رب کائنات کی جانب سے یہ فرمان آیا کہ اے میرے محبوب! میں نے آپ کو قرآن دے کر اس لئے نہیں بھیجا ہے کہ آپ اپنے کو ہلاکت میں ڈال دیں۔

مرد کو چاہئے کہ مجاہدے میں لگا رہے اور اپنے معمولات پر اچھی طرح کاربند رہے۔ مجاہدہ حق سبحانہ تعالیٰ کو پانے کا سبب نہیں ہے اس سے تو راہِ حق کھلتا ہے اور راہِ حق خواہشات کے گرد وغبار سے پاک ہوتا ہے۔

اگر مرد ایک سانس بھی خواہشات میں مبتلا ہو گیا تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس کو راہ

حق نصیب نہیں ہوا۔ یہ اچھی طرح معلوم رہے کہ حق سبحانہ تعالیٰ تک پہنچنا دوسری چیز ہے اور اس کی راہ تک پہنچنا کچھ اور ہے۔ بہت سارے لوگ راہ حق تک پہنچ کر رہ گئے حق تک نہیں پہنچ سکے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ راہ کے ذریعہ اس تک پہنچا جا سکتا ہے جس کا کوئی مکان ہوتا ہے اور حق سبحانہٗ تعالیٰ مکان سے پاک و بے نیاز ہے۔ لہٰذا یہ بات صحیح و درست ہے کہ حق سے حق تک پہنچا جا سکتا ہے۔ چنانچہ جو شخص خواہشات سے پاک ہو گیا وہ راہ حق تک پہنچ گیا۔ لیکن یہاں پر ہوشیار رہنا چاہئے راہِ حق کو حق سمجھ کر وہیں اٹک نہ جائیں۔

در گردن دیں داراں زنار چہ خوب آید

(اہل دین کی گردن میں زنار زیب نہیں دیتا)

حق تک پہنچنا اپنے آپ سے بے نیاز ہونا اور فہم و گمان کو گم کر دینا ہے۔ جب کوئی بھی مخلوق اس کے سر میں نہیں رہا تو وہ حق تک پہنچ گیا۔ اسی کو عالم وحدت کہتے ہیں۔

قوله: قال علی رضی اللّٰہ عنه ینبغی للمومنین أن یکون له أربع ساعات من النهار ساعة یناجی فیها ربه و ساعة یحاسب فیها نفسه و ساعة یاتی فیها العلماءُ الذین ینصرونه بأمر اللّٰہ و ینصحونه و ساعة یخلی بین نفسه و لذاتها فیها یحل و یحمل.

(ارشاد شیخ ہے) حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا مومن کو چاہئے کہ وہ اپنے اوقات کو چار حصوں میں تقسیم کر لے۔

ایک حصہ اپنے رب کے ساتھ مناجات میں گذارے۔

ایک حصہ میں اپنے نفس کا محاسبہ کرے۔

ایک حصہ ان علماء کی خدمت میں بسر کرے جو اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی سیکھنے میں اس کی مدد کریں اور اچھی باتیں سکھائیں۔ اور۔

ایک حصہ اس خلوت میں لگائے جہاں شریعت کے مطابق نفس کو جائز حلال اور اچھی

لذتوں سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملے۔

شرح: شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت علی کے اس قول کو بھی اس بات کے لئے بطور دلیل لایا ہے کہ اپنے اوقات کسی نہ کسی خیر میں لگائے رکھے۔ بیکار اور خالی نہ جانے دے۔ جیسا کہ اس قول میں آیا اسی کے مطابق اپنے اوقات کو چار حصوں میں منقسم کرلے اور ہر حصہ کو اسی کام میں لگائے رکھے۔

بزرگوں نے فرمایا ہے کہ نفس کی ایک صفت یہ ہے کہ جب تک اس کو کسی باطل کام میں لگایا نہ جائے قرار نہیں آتا۔ لہٰذا اس کو ہمیشہ قید و بند میں رکھا جائے تا کہ وہ باطل کی بلاؤں میں گرفتار نہ ہو جائے۔ اور اس کے لئے قید و بند یہ ہے کہ اس کو طاعت و عبادت اور کسی ایسے کار خیر میں مشغول رکھا جائے جو کل قیامت کے دن کام آئے۔ جب اس طرح کی مشغولی ہوگی تو پھر اس کو فرصت کہاں ملے گی کہ کسی کو باطل کاموں میں لگا دے۔

لیکن ہاں! یہاں پر نفس کے افعال کو سمجھنا ہوگا۔ جب تک افعال نفس کی شناخت نہیں ہوگی نفس کی شرارتوں سے بچنا مشکل ہے۔ اور نفس کے افعال کی شناخت و پہچان یہ ہے کہ جو چیز نفس کو پسند آئے اور اچھی لگے اس کو نہیں کیا جائے۔ اس سے بچنا چاہئے۔ مثلاً اگر مرید اپنے کو بھوکا رکھ کر کمزور اور لاغر کر دیتا ہے اور لوگ اس کو روزہ دار کے نام سے یاد کرتے ہیں تو اس تعریف سے نفس موٹا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر مرید شب بیداری کر کے اپنی کمر کو جھکا دیتا ہے تو نفس لوگوں کی زبانی تعریفیں سن کر اس کو برباد کرنے کے دوسرے اسباب مہیا کر دیتا ہے۔

مرید کا جو معاملہ بھی ہوتا ہے اور وہ جو کام بھی کرتا ہے نفس اس کے مقابلہ میں ایک دوسری چیز سامنے لا کر رکھ دیتا ہے۔ جس چیز کی وجہ سے اس کا سارا عمل باطل اور برباد ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ طاعت کی راہ سے نکال کر معصیت کی راہ میں داخل کر دیتا ہے۔ یعنی طاعت کو گناہ بنا دیتا ہے۔ اس کو یوں سمجھئے کہ ایسی طاعت و عبادت جس میں ریا کاری اور دکھاوا شامل ہو جائے وہ طاعت نہیں گناہ ہے۔ اس لئے کہ طاعت تو وہ ہے جس میں اخلاص ہو۔

نفس تو اپنا قبلہ و کعبہ مخلوق کو بنائے ہوئے ہے۔ وہ بڑے بڑے پہاڑوں کو بغیر کسی

تکلیف وکراہیت کے نگاہوں میں بسا لیتا ہے لیکن حق سبحانہ تعالیٰ کے لئے ایک ذرہ کو بھی کھینچ نہیں سکتا۔ ادھر سے رخ پھیر کر بھاگ جاتا ہے۔

لہٰذا طالب اور مرید کو چاہئے کہ وہ نفس کے معاملات میں ہوشیار اور چوکس رہے۔ نفس کے مکروفریب اور اس کے افعال کی شناخت ضروری ہے۔

قوله: قال الحریری دخلت علی الجنید وھو مھتم فقلت له مالک قال فاتنی شیء من وردی فقلت له اعده فقال کیف اعیده وھی اوقات معدودة.

(ارشاد شیخ ہے) حریری نے فرمایا میں ایک روز حضرت جنید کی خدمت میں حاضر ہوا دیکھا وہ غمگین بیٹھے ہیں۔ میں نے عرض کیا آخر آپ کو کیا ہوگیا ہے جو اس طرح غمزدہ دکھائی دے رہے ہیں؟۔ حضرت جنید نے فرمایا میرا کچھ ورد چھوٹ گیا ہے۔ میں نے عرض کیا اس کو پورا کرلیجئے۔ فرمایا اب کیسے پورا ہوگا اس لئے کہ اوقات تو گنے ہوتے ہیں۔

شرح: حضرت شیخ نے اس حکایت کو بھی اس بات کے لئے بطور دلیل لایا ہے کہ جو وقت گذر گیا اس کا دوبارہ حاصل ہونا ممکن نہیں۔

مردان حق کی راہ میں پڑنے والے پہلے قدم کی جو بات کہی گئی اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر پہلا ہی قدم صحیح ودرست نہیں رہا تو پھر آخری قدم کی آرزو وتمنا نادانی ہے۔ اور اگر کوئی اس کا دعویٰ کرتا ہے تو یہ جہالت کے سوا کچھ نہیں۔ اگر راہ حق کو طے نہیں کرسکتا تو کم از کم سچ تو بولے۔

جو اس راہ میں سچے ہیں وہی مرد ہیں۔ دوسروں کے روٹی پانی سے اپنے پیٹ کو بھرنے سے ان کے لئے کہیں آسان ہے جان کی بازی لگانا۔ اپنے لئے مردان حق کے حالات کا دعویٰ کر کے جواں مردوں کی باتوں کا مذاق نہ اڑایا جائے۔

قوله: من سبق بخطوة علی احد من اھل السلوک لایدرک المسبوق علی السابق وان کان صادقا فی طلبه

(ارشادِ شیخ ہے) اور جو شخص اہل سلوک میں سے کسی ایک سے ایک قدم بھی آگے بڑھ جاتا ہے تو مسبوق اپنی طلب میں صادق ہوتے ہوئے بھی اس اگلے تک نہیں پہنچ سکتا ہے۔

شرح: اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے اپنے وقت کو ضائع کر دیا ہے اور یہ بات کہی جا چکی ہے کہ جو وقت گذر گیا اس کو پانا ناممکن ہے۔ اس لئے وقت کو غنیمت سمجھنا چاہئے۔ ایسا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کی رضا فوت ہو جائے۔

مردان صادق جن ریاضتوں میں بھی اپنے نفس کو لگاتے ہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ اس کے ذریعہ حق سبحانہ تعالیٰ کے حقوق کو پانا چاہتے ہیں۔ لیکن حق کو حق ہی سے پا سکتے ہیں۔ اگر لاکھوں چلّے کئے جائیں اور لاکھوں طریقے سے مجاہدے ہوں تو یہ مجاہدے اور چلے اللہ تعالیٰ کو پانے کی علت اور سبب نہیں بن سکتے کہ ان کے ذریعہ اللہ تک رسائی ہو جائے۔

لیکن مجاہدے سے کنارہ کش ہونا بھی درست اور صحیح نہیں۔ اس لئے کہ جس طرح موت سے چھٹکارا نہیں اسی طرح مجاہدے کے بغیر چارہ نہیں۔

قوله: والمريد بحب أن لا يخلو ظاهرة من الأوراد و باطنه من الارادة الى ان يرد عليه الواردات فيحنئذ يكون مع الواردات ولا مع الأوراد ولا مع الارادة.

(ارشادِ شیخ ہے) مرید کو چاہئے کہ وہ اس بات کو پسند کرے کہ اس کا ظاہر اوراد سے اور اس کا باطن ارادت سے خالی نہ ہو۔ یہاں تک کہ اس پر واردات کا نزول ہو اور جب واردات کا نزول ہونے لگے تو اس وقت نہ اوراد سے منسلک رہے اور نہ ارادت سے۔

شرح: وارد اس چیز کو کہتے ہیں جو خواطر محمودہ سے دل میں اترے۔ اب وہ وارد سرور ہو یا وارِد حزن، وارِد قبض ہو یا وارِد بسط وغیرہ۔

حاصل کلام وہی بات ہے جو پہلے کہی گئی کہ جب مرید کے کام ظاہری معاملات سے

نکل کر دل کے معاملات تک پہنچ جاتے ہیں تو اعضاء و جوارح کو آرام مل جاتا ہے۔ یعنی اس کے بعد مرید کا کام یہ ہے کہ وہ دل کی تعمیر میں لگ جائے اور اوراد و وظائف کو مختصر کر کے فرائض وسنن پر اکتفا کرے۔ سارے اوراد کو بند کر کے صرف ایک وظیفہ کو اپنالے اور وہ وظیفہ یہ ہو کہ دل پورے طور پر اللہ تعالیٰ کے ذکر میں لگا رہے۔ اور ان ساری مشغولیتوں سے دست بردار ہو جائے۔ جو دل کو اپنی طرف مائل کر لیں چاہے وہ خرقہ میں پیوند کاری ہو یا روٹی پکانی ہو، یا پانی بھرنا ہو، یا کئی فرسنگ چلنا ہو، یا دروازہ کو کھولنا و بند کرنا ہو غرض یہ کہ ہر وہ کام جو دل کو اپنی طرف مشغول کر لے اس کو ترک کر دے۔ اور کسی چیز کی فکر بھی اپنے دل میں آنے نہ دے۔ یہاں تک کہ اگر صبح کی نماز ادا کر لی تو ظہر کی نماز کے لئے فکر مند نہ رہے اس لئے کہ ظہر تک زندہ رہے گا کہ نہیں۔ اس کی کوئی ضمانت نہیں۔ جب نماز کے معاملہ میں ایسی بات ہے تو پھر دوسرے کاموں کے بارے میں کیا کہا جائے۔ اور بعض لوگوں نے تو یہاں تک کہا ہے کہ اگر کوئی اوراد و وظائف میں رعایت کر سکتا ہے تو یہ اس کے لئے کامل ترین بات ہوگی۔

اور ترک ارادت سے مراد شاید ان خواہشات کا ترک کرنا ہے مثلاً ہوا میں اڑتے یا پانی پر چلتے یا دریا کو پار کر جاتے یا خشک درخت میں ہاتھ لگانے پر پھل آ جاتا یا حق سبحانہ تعالیٰ کے خاص بندوں میں شمار ہو جاتے یا لوگوں کے پیشوا و مقتدا بن جاتے یا بزرگوں کو جو فضیلت و کرامت حاصل تھی وہ مل جاتی۔ یہ ساری باتیں دل کے لئے حجاب اور نفس کی رعونت کے اسباب ہیں بلکہ نفس کی چراگاہ کے لئے باغ و بوستاں کی حیثیت رکھتے ہیں۔

جو مرد ہیں ان کو ان باتوں پر نگاہ رکھنی چاہیے تا کہ صادقوں میں شمار ہو کاذبوں میں نہیں۔ نفس کے لئے ایسے ایسے باغ و چمن بہت سارے ہیں۔ چنانچہ جو مرد اس کے جال میں گرفتار نہیں ہوتا وہی ہلاکت سے محفوظ رہتا ہے۔ وگرنہ اس باغ و چمن کا کام ہی ہلاک کرنا ہے۔

نفس سے نکل کر دل تک پہنچنے کے لئے مرد کے پاس بہت سارے کام نہیں۔ یہاں دل سے وہ دل مراد نہیں ہے جس کو ہر شخص برا بھلا کہہ رہا ہے کہ میرے دل نے ایسا کہا اور ایسا فرمایا۔ دل تو وہ ہے جو دنیا کی محبت، جاہ و مرتبہ، لوگوں کے ذریعہ تکمیل مقاصد، اسباب دنیا کے

آنے جانے کی فکرمندی۔ لوگوں کی ستم ظریفی اور وفا شعاری سے آلودہ نہ ہو۔ اور نفس ان چیزوں سے ضرور آلودہ ہوتا ہے۔

جو نفس کا فرماں بردار ہے اس کو بہت زیادہ مجاہدہ کی ضرورت ہے۔ یہاں تک کہ وہ ان چیزوں کو اپنے آپ سے دور کردے۔ مردان حق جن کو اس کام میں استقامت حاصل ہوگئی وہ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ یہ کام ہر دعویدار سے نہیں ہوسکتا ہے۔ جس کو اس کام کے لئے منتخب کرتے ہیں اس کی وہاں تک خود رسائی ہوجاتی ہے۔

قوله: رای بعض المشائخ سبحة فی یدمرید فقال ماتعمل بها قال اعد التسبیحات فقال علیک تعدالسیّات.

(ارشاد شیخ ہے) بعض مشائخ نے جب مرید کے ہاتھ میں تسبیح دیکھی تو دریافت فرمایا کہ اس سے کیا کام لیتے ہو۔ اس مرید نے جواب دیا تسبیحات کو گنتا ہوں۔ یہ سن کر فرمایا تم پہ لازم تھا کہ اپنے گناہوں کو گنتے۔

شرح: اس لئے جماعت صوفیا کے بعض حضرات نے تسبیح کو مکروہ کہا ہے۔ حضرت امیر المومنین عمرؓ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ تسبیح پر کچھ گن رہا ہے۔ فرمایا کیا تو اللہ تعالیٰ کو وہ چیز بتا رہا ہے جو وہ نہیں جانتا۔ یعنی تجھے جس چیز کو پڑھنے کی توفیق ملی ہے اس کو اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ تونے سو بار پڑھا یا ہزار بار پڑھا۔ اس کا اجر و ثواب مل جائے گا۔ گننے کا کوئی فائدہ نہیں۔ گننے کا فائدہ تو وہاں ہوتا ہے جہاں اگلے کو خبر نہیں۔ گن کر اس کو بتایا جائے گا۔

ہاں! حضور نبی کریم ﷺ سے تسبیح گننے کی جو روایت آتی ہے اس سے تسبیح کے دانے پر گننا مقصود نہیں ہے بلکہ دل کو اغیار کی طرف سے پھیرنا خداوند جبار کی بارگاہ میں دل کو حاضر کرنا۔ اور خداوند غفار سے گناہوں کی معافی چاہنا مطلوب ہے۔ جیسا کہ کسی نے کہا ہے:

سبحہ در دست تو همی گوید ... دل بگر داں مرا چہ گردانی

تو درون نماز و دل بیروں ... گشتہامی کند بمہانی

این چنیں حالت پریشاں را ... شرم بادا نماز می خوانی

(تسبیح کے دانے تم سے کہہ رہے ہیں کہ مجھے کیا گھمارہے ہو اپنے دل کو پھیرو۔ تم نماز میں ہو اور دل نماز سے باہر ہے تم اس طرح گھوم رہے ہو جیسے دعوت میں جارہے ہو۔ تمہیں شرم آنی چاہئے کہ ایسی منتشر حالت کے ساتھ نماز پڑھ رہے ہو۔)

اسی طرح کی نقل حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی آئی ہے کہ انہوں نے ایک شخص کے ہاتھ میں تسبیح دیکھ کر فرمایا کہ اپنے گناہوں کا شمار کرو اور گناہوں کی معافی کے لئے دعائیں کرو۔ تسبیح کے دانے گننے کی کیا ضرورت ہے۔

چنانچہ انہیں وجوہات کی بنا پر بزرگوں نے فرمایا ہے کہ آج لوگوں نے سجادہ اور تسبیح درست کر لینے کو تصوف سمجھ رکھا ہے۔ حالانکہ ایسی بات نہیں۔ تصوف تو وہ بلند مقام ہے جس پر فائز ہونے والے کو اپنی پروا نہیں رہتی۔ سجادہ و تسبیح کی فکر کہاں ہوگی۔ جب خدا کی معرفت حاصل ہوگئی اور اس کے یکتا و یگانہ ہونے کی تصدیق کر دی تو اس کے علاوہ کسی غیر کو دیکھیں یہ ان کے لئے شرم کی بات ہے۔ چاہے وہ بہشت و دوزخ ہی کیوں نہ ہو۔ جب بہشت و دوزخ کی پروا نہیں تو پھر ان کی ہمت کے آگے دنیا کیا چیز ہے۔ جس کا ذکر ان کی زبان پر آئے۔

حق سبحانہ تعالیٰ نے اپنے اوپر یقین کرنے کی ایسی دولت ان کو عطا فرمادی ہے کہ جس کی وجہ سے ان کا یہ حال ہوگیا ہے کہ اگر ساتوں طبق آسمان ٹکڑے ٹکڑے کر کے ان کے سر پر گرا دیا جائے تو اس کی طرف ہرگز مشغول نہ ہوں کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ ان کا نفس اللہ تعالیٰ کے احکام کا اسیر ہوگیا ہے۔ اور ان کا سر حضرت رب العزت پر ایسا موقوف ہے کہ پلک مارنے بھر بھی دوست سے محجوب نہیں ہوتے۔

قوله: وينبغي ان يغتنم خدمة الاخوان و يقدمها على النوافل.

(ارشاد شیخ ہے) مرید کے لئے ضروری ہے کہ وہ بھائیوں کی خدمت کو غنیمت سمجھے اور اس خدمت کو نوافل پر مقدم جانے۔

شرح: وہ طاعت و عبادت جو وظائف سے زیادہ ہو اس سے زیادہ بہتر خدمت ہے۔ خدمت کو جو خصوصیت حاصل ہے اور اس کے جو فائدے ہیں وہ کسی دوسری عبادت کو میسر

نہیں۔ خدمت سے نفس مردہ ہوتا ہے نخوت اور تکبر دور ہوتا ہے۔ خدمت کرنے والے میں عاجزی و تواضع کی صفت پیدا ہوتی ہے۔ اخلاق حمیدہ سے وہ آراستہ ہوتا ہے۔ نفس کی تاریکی و گرانی دور ہوتی ہے۔ لطافت و سبک روحی حاصل ہوتی ہے۔

اسی لئے بعض حضرات اپنے مریدوں کو بیت الخلاء کی صفائی اور نجس و ناپاک جگہوں میں جھاڑو لگانے کی خدمت پر مامور کردیتے ہیں۔ چونکہ سجادہ پر بیٹھنے میں نفس کو راحت ملتی ہے اور وہ حالت استراحت میں کشادگی چاہتا ہے اس لئے آرام طلب راہ کو اس کے لئے جلد از جلد بند کردیا جائے۔ جانتے ہیں اس راہ میں پہلا قدم کیا ہے۔ پہلا قدم ہے اپنی فکر کو ترک کرنا۔ اگر مرید کو محنت و مشقت کے کام میں نہیں لگایا جائے گا تو مرید اس مقام تک نہیں پہنچ سکتا۔ کیا کروں، کیا کھاؤں اور کیا پہنوں اس طرح کی فکر سے مریدی بہت دور ہے۔ اگر ہر مکلفِ اس بات میں صحیح و درست ہوگیا تو یہ راہ اس طرح خالی نہیں رہے گی۔

مرید اگر جوان ہے تو اس کے لئے خدمت کرنے سے زیادہ فائدہ بخش کوئی دوسرا کام نہیں۔ شیخ ابوالعباس رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے انہوں نے فرمایا جس مرید نے کسی ایک خدمت کو بھی اپنالیا ہے تو اس کا یہ عمل سو رکعت نفل نمازیں پڑھنے سے کہیں بہتر ہے۔ اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ خدمت کی فضیلت کو رسول اللہ ﷺ سے یوں روایت کرتے ہیں کہ ایک بار ہم لوگ حضور ﷺ کے ساتھ سفر میں تھے ہمارے ساتھیوں میں کچھ لوگ روزہ دار تھے اور بعض لوگوں نے گرمی اور تپش کی وجہ سے روزہ نہیں رکھا تھا۔ ایک مقام پر ہم لوگوں نے پڑاؤ ڈالا۔ بعض لوگ سورج کی گرمی سے بچنے کے لئے سایہ کا انتظام کرنے لگے اور اپنے اپنے کپڑوں کے سایہ میں چلے گئے۔ جو روزہ دار تھے وہ تو حیران و پریشان ہو رہے تھے اور جن لوگوں نے روزہ نہیں رکھا تھا وہ خیمے لگا رہے تھے۔ لوگوں کے اونٹ اور گھوڑے کو پانی پلا رہے تھے۔ یہ دیکھ کر حضور ﷺ نے فرمایا جن لوگوں نے آج روزہ نہیں رکھا ہے ان کو بھی پورا پورا اجر ملے گا۔

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ خدمت کو نوافل عبادت پر فضیلت حاصل ہے۔

قوله: وقد روی عن عائشة رضی اللّٰه عنها أنها قالت ماروی

رسول اللّٰہ ﷺ فارغاً فی اهله اما ان یخصف نعل المسکین و یخیط ثوبا لارملة.

(ارشاد شیخ ہے) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے بیشک انہوں نے فرمایا رسول اللہ ﷺ اپنے گھر والوں کے درمیان کبھی بے کار نہیں دیکھے گئے۔ کبھی کسی مسکین کا جوتا سیتے یا کبھی کسی بیوہ کا کپڑا درست کر۔ ۔۔

شرح: حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو بھی اس بات کی دلیل میں پیش کیا ہے کہ خدمت نوافل پر مقدم ہے۔ اس لئے حضور نبی کریم ﷺ جو نوافل عبادتوں پر حریص تھے اس کے باوجود خدمت میں لگے رہتے۔ اس سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ خدمت نوافل پر مقدم ہے اور اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نوافل سے جو فائدے حاصل ہوتے ہیں ان سے زیادہ فائدے خدمت میں ہیں۔

قوله: حکی عن ابی عمرون الزجاجی انه قال اقمت عندالجنید مدة مدیدة فما رانی قط الاو انا مشتغل بنوع من العبادة فما کلمنی حتّی کان یوماً من الأیام خلا الموضع من الجماعة، فقمت و نزعت ثیابی و کنست الموضع و نظّفته و رششته و غسلت موضع الطّهارة، فرجع الشّیخ فرأی علیّ أثر الغبار فدعالی و رحّب لی ودعالی وقال احسنت بها ثلثا.

(ارشاد شیخ ہے) حضرت ابی عمر زجاجیؒ کی حکایت بیان کی گئی ہے کہ بیشک انہوں نے فرمایا میں حضرت جنید کی خدمت میں ایک طویل عرصے تک رہا۔ انہوں نے مجھے ہمیشہ عبادت میں مشغول دیکھا۔ اور کبھی مجھ سے گفتگو نہیں کی۔ یہاں تک کہ ایک روز جب میں نے اس جگہ کو لوگوں سے خالی دیکھا تو میں اٹھا اپنے کپڑے اتارے اس جگہ کو جھاڑا، صاف کیا، جھاڑو

لگائی، پانی چھڑکا، طہارت کی جگہ کو دھویا۔ جب حضرت شیخ واپس آئے اور مجھے گرد وغبار میں اٹا دیکھا تو مجھے بلایا عزت وتکریم سے پیش آئے دعائیں دیں اور تین بار فرمایا احسنت بھا۔ احسنت بھا۔ احسنت بھا۔ یعنی تم اس خدمت کی وجہ سے بہت اچھے ہو شاباش! شاباش۔

شرح: یہ حکایت بھی اس بات کی دلیل ہے کہ خدمت کو تمام دوسرے کاموں پر فضیلت حاصل ہے اور اس حکایت میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ مرید کو خدمت سے جو نعمت حاصل ہوتی ہے وہ نعمت کسی بھی دوسرے نوافل سے حاصل نہیں ہوتی۔

حضرت خواجہ ابو سعید ابوالخیر رحمتہ اللہ علیہ سے منقول ہے انہوں نے فرمایا جب میں علم و عمل کی دولت سے سرفراز ہوگیا تو میں نے درویشوں کی خدمت اختیار کرلی۔ میں ان کی خدمت کرتا، ان کی قیام گاہوں میں جھاڑو لگاتا، ان کے منبروں کو پاک وصاف کرتا۔ یہاں تک کہ ان کے لئے بھیک مانگنے نکل جاتا۔ لوگ مجھے دیکھ کر درم و دینار دے دیتے کچھ دنوں تک یہ سلسلہ جاری رہا لیکن کچھ دنوں کے بعد لوگ دانگ (پیسے) دینے لگے۔ پھر یہ سلسلہ بھی ختم ہوگیا۔ اور لوگوں نے خرما دینے پر اکتفا کرلیا۔ پھر یہ سلسلہ بھی بند ہوگیا اور لوگوں نے کچھ نہیں دیا۔ آخر میں نے اپنی دستار بیچ دی اور پھر اپنی چپل بھی فروخت کردی۔

یہ بات بھی اس بات کی دلیل ہے کہ لوگوں کی خدمت اور ان کے دلوں کو آرام وسکون پہنچانا وظیفہ سے زائد نوافل کی ادائیگی سے افضل ہے۔

قولہ: یکرہ للمرید مفارقۃ أستاذہ قبل انفتاح عین قلبہ بل علیہ ان یصبر تحت امرہ و نھیہ فی خدمتہ۔

(ارشاد شیخ ہے) مرید کے لئے یہ بات مکروہ ہے کہ وہ دل کی آنکھ روشن ہونے سے پہلے اپنے استا (پیر) کی صحبت چھوڑ دے۔ بلکہ اس پر تو واجب ہے کہ پیر کی خدمت میں رہ کر اس کے اوامر ونواہی کو برداشت کرتا رہے۔

شرح: حضرت شیخ نے ترک صحبت کو مکروہ لکھا ہے۔ لیکن امام قشیری رحمتہ اللہ علیہ

لکھتے ہیں کہ مرید کے فرائض حالی میں سے ایک فرض یہ بھی ہے کہ وہ پیر کی جدائی اختیار نہ کرے۔ پیر کو چھوڑ کر اس وقت تک دوسری جگہ نہ جائے جب تک راہ سلوک میں اس کی مقبولیت نہ ہو جائے اور اس کے مشاغل دل تک نہ پہنچ جائیں۔ جس مرید نے بھی اپنے غیر وقتوں میں سفر کیا وہ اپنی منزل امید تک نہیں پہنچا۔ **السفر للمریدین فی غیر وقتہ سمّ قاتلٌ**. (مریدوں کا بے وقت سفر کرنا ان کے لئے زہر قاتل ہے۔)

اگر مرید سے کہا جائے کہ وہ اپنی ساری ملکیت پیش کر دے تو وہ ہرگز انکار نہ کرے۔ اس راہ کے مرد ایسے عالی ہمت ہوتے ہیں کہ اگر کوئی ساری دنیا و آخرت ان کی خدمت میں ہدیہ کر دے تو وہ اسے منجانب اللہ سمجھتے ہیں۔

حاصل کلام یہ کہ جب کوئی ارادت کے دروازے سے داخل ہو گیا تو وہ اپنے تمام تصرفات سے نکل گیا۔ اس وقت اس کے لئے یہ بات پسندیدہ ہو جاتی ہے کہ ہفتوں سوکھی روٹی اس کی غذا ہو جائے یا ساری عمر ستر پوشی کے لئے ایک ٹکڑہ کپڑا مل جائے یا سونے کے لئے ایک پہلو بھر جگہ حاصل ہو جائے۔ جو مرید کھانے اور پہننے کی آرزو و تمنا میں رہتا ہے وہ ارادت کی شرط سے باہر ہے۔

مرید کو مرید اسی لئے کہتے ہیں کہ اس کی اپنی کوئی مراد نہیں ہوتی۔ جو کچھ کرتا ہے پیر کے حکم پر کرتا ہے۔ اپنی خواہش پر ہزار روزہ رکھنے سے کہیں بہتر ہے کہ پیر کی خواہش سے صرف ایک روزہ رکھے اسی طرح پیر کے حکم سے دو رکعت نماز پڑھنا اپنی خواہش سے ہزار رکعت نماز پڑھنے سے کہیں اچھا ہے۔ اور پیر کے حکم سے ایک درم صدقہ کرنا اپنی خواہش سے ہزار درم صدقہ کرنے سے بہتر ہے۔

اللہ تعالیٰ جب کسی مرید کے ساتھ خیر کا معاملہ کرتا ہے تو سب سے پہلے اس کی ارادت کو مستحکم فرماتا ہے۔ اور جب کسی مرید کے ساتھ شر کا معاملہ ہوتا ہے تو اسی پہلی حالت اور پہلے مقام کی طرف لوٹا دیتا ہے جہاں سے وہ خرقہ کے لئے نکلا تھا۔ اور یہ جو میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ سب سے پہلے ارادت کو درست کرتا ہے یہ بات مرید حقیقی کے بارے میں ہے۔ مرید حقیقی کو جو خرقہ

پہننا ہے وہ خرقۂ ارادت ہے۔

خرقہ دو ہے۔ ایک خرقۂ ارادت ہے اور دوسرا خرقۂ تبرک۔ اور خرقہ ارادت ہی اصل خرقہ ہے۔ خرقۂ تبرک تو ان لوگوں کے لئے ہے جو مشابہت اختیار کرتے ہیں۔ کہ **من تشبہ بقوم فھو منھم** جس نے جس قوم کی مشابہت اختیار کی وہ انہیں میں سے ہے۔

ایسے لوگوں کے لئے نہ محبت کی شرط ہے اور نہ وہ کسی مطالبہ کے لئے گرفت میں آتے ہیں بلکہ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنے اوپر حدود شریعت کو لازم کر لیتے ہیں اور ارباب شریعت کے مطابق اپنی زندگی گذارتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی برکت سے ایسا فیضیات ہوتے ہیں اور ایسے مؤدب ہو جاتے ہیں کہ حرقۂ ارادت کی اہلیت ان میں پیدا ہو جاتی ہے۔

خرقۂ تبرک تو ہر طالب کو دیا جا سکتا ہے لیکن خرقۂ ارادت صرف صداقت کے ساتھ رغبت رکھنے والوں کو دینا چاہئے۔

قولہ: وقال بعض المشائخ من لم یتأدب بأوامر الشیوخ و تأدیبھم فلا یتادب بکتاب و لا بسنۃ.

(ارشاد شیخ ہے) بعض مشائخ نے فرمایا ہے کہ جو پیروں کے حکم دینے اور ادب سکھانے کے باوجود باادب نہیں ہوگا وہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے بھی ادب نہیں سیکھ سکتا۔

شرح: التادیب-تعلیم الادب کے معنیٰ میں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مشائخ کے دلوں کو اپنے اسرار کا خزانہ اور کان بنایا ہے۔ اور امت کے درمیان انہیں حضرات کو اپنے انوار کی روشنی و تابانی کے لئے مخصوص کر لیا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو لوگوں کی فریاد سنتے ہیں۔ ان کی نگاہ لوگوں کے لئے دوا ہے۔ ان کی گفتگو امراض قلبی کے لئے شفا ہے۔ یہی حضرات لوگوں کے درمیان دعوت حق کی ذمہ داریاں ادا کرنے کے لئے نائب رسولؐ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

لہٰذا جو مشائخ کے ذریعہ دیئے گئے اوامر و نواہی سے ادب نہیں سیکھتا وہ اللہ تعالیٰ کی

کتاب اور رسول اللہ ﷺ کی سنت سے اکتساب ادب کہاں کر سکتا ہے۔ مشائخ اللہ رب العزت کے احکام کی بجا آوری اور حضور ﷺ کی سنت کی پیروی کے صدقہ وطفیل میں خواہشات اور ہوا، ہوس کے گرد وغبار سے پاک ہوتے ہیں۔

اگر ایسے شیخ مل جائیں تو ان کی اقتدا اور پیروی کا طوق اپنی گردن میں ڈال دو۔ اس لئے کہ شیخ خدا کے لشکر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس بات کے لئے نامزد کر لیا ہے کہ ان کے ذریعہ مریدوں کی رہبری ورہنمائی ہو اور جو ظالم ہو ان کی ہدایت ہو۔ اور اگر ایسے شیخ نہ ملیں تو اللہ تعالیٰ کی کتاب کو مضبوطی سے پکڑ لو اور خیر البشر یعنی اللہ کے رسول ﷺ کی سنت کو اپنے اعمال کے لئے کسوٹی بنالو۔ خواہشات نفسانی اور بدعت سے اپنے دین کو محفوظ رکھو۔

قولہ: وقیل علامة المرید السمع والطاعة لاالتذلیل وترک التصبر عندالطبیب.

(ارشاد شیخ ہے) اور کہا گیا ہے کہ مرید یعنی مرید حقیقی کی پہچان یہ ہے کہ وہ احکام کو سننے والا اور ان پر عمل کرنے والا ہو۔ وہ پیر کے احکام واشارے کو حقارت کی نظر سے نہ دیکھے۔ اور طبیب کے نزدیک صبر کو ترک نہ کرے یعنی برداشت سے کام لے۔

شرح: یعنی پیر کے ارشاد گرامی کو سنے اور وہ جو حکم دیں اس پر عمل کرے۔ اسی کو سمع وطاعت کہتے ہیں۔

حاصل کلام یہ کہ اگر کوئی مرید پیر کے اشارے کی خلاف ورزی شروع ہی میں کرتا ہے تو اس کے لئے یہ بہت بڑے نقصان کا پیش خیمہ ہے۔ اس لئے کہ ابتدائی عمل پوری زندگی کے لئے دلیل کی حیثیت رکھتا ہے۔ لہٰذا اگر شروع ہی میں پیر کے احکام کو سننے اور ان پر عمل کرنے کو اپنی زندگی کا لائحہ عمل نہیں بناتا تو یہ صاف ظاہر ہے کہ زندگی بھر ان پر عمل نہیں کر سکتا۔ اور اختلاف یعنی خلاف ورزی سے نہ پیری درست ہوگی نہ مریدی۔

لاالتذلیل وترک التصبر عندالطبیب کی جو بات کہی گئی اس کا معنی یہ ہے کہ

پیر کے احکام اور اشارے کو ذلت کی نظر سے نہ دیکھے اور طبیب یعنی پیر کے نزدیک صبر کو ترک نہ کرے۔ تصبر کے معنیٰ ہیں بلایا محنت و مشقت کی پریشانی کے وقت سکوت یعنی برداشت سے کام لینا۔

بعض نسخہ میں لاالتذلیل کی جگہ لاالتدلیل ہے۔ اگر دال کے ساتھ پڑھا جائے تو معنی یہ ہوگا کہ مرید پر یہ حق ہے کہ وہ شیخ کے فرمان اور اس کے اشارے کو سنے اور عمل کرے۔ نہ یہ کہ اس پر ناز وفخر کرے اس لئے کہ ناز وفخر نفس کی رعونت ہے۔

کہتے ہیں کہ جس شخص نے کسی پیر کی صحبت اختیار کی اور اس پیر پر دل سے اعتراض بھی کیا تو یقیناً اس نے صحبت کے بندھن کو توڑ دیا۔ ایسے شخص پر توبہ واجب ہوگیا۔ بلکہ بزرگوں نے فرمایا ہے حقوق الاستاذین لا توبة عنها. پیر کے حقوق کی نافرمانی ایسی چیز ہے جس کی وجہ سے توبہ بھی قبول نہیں ہوتی۔

قوله: وقال بعض المشائخ اذا رایتَ المرید قائما مع الشهوات طالباً لحظوظ النفس فاعلم أنه کذاب.

(ارشاد شیخ ہے) بعض مشائخ نے فرمایا ہے کہ جب تم کسی مرید کو دیکھو کہ وہ اپنی شہوات پر قائم ہے اور اپنے نفس کی مراد ولذتوں کا طالب ہے تو یہ اچھی طرح سمجھ لو کہ وہ یقیناً جھوٹا ہے۔

شرح: یعنی وہ اپنے دعوئ مریدی میں جھوٹا ہے۔ اس لئے کہ اس کے حق میں صدق کی علامت یہ ہے کہ وہ نفسانی خواہشات کا مخالف اور اپنی مرادوں کا تارک ہو۔ جب یہ علامت اس میں نہیں پائی جاتی تو یقیناً وہ اپنے دعوے میں جھوٹا ہے۔

مریدی دل کی صفت ہے اور دل کی صفت محسوس نہیں کی جاسکتی۔ جس کے ذریعہ اس کا ادراک نہیں ہوتا۔ ہم اگر ضرورتاً اس کو جاننا چاہیں تو معلوم نہیں کر سکتے۔ ہاں! اگر وہ علامتیں پائی جائیں تو ہم سمجھ جاتے ہیں کہ وہ سچا ہے اور اگر وہ علامتیں نہیں ملتیں تو سمجھ جاتے کہ وہ جھوٹا ہے۔

شہوت دو طرح کی ہے ایک شہوت کا تعلق شرم گاہ سے ہے اور دوسری شہوت پیٹ کی

شہوت ہے۔لوگوں نے کہا ہے کہ کوئی شخص بھی ان دونوں شہوتوں سے نجات حاصل نہیں کر سکتا۔ ان دونوں شہوتوں سے نجات اسی حال میں ممکن ہے کہ اپنے نفس کو ذبح کر دیا جائے اور نفس کو ذبح کرنے کے لئے بھوک کی تلوار اور صبر کی چھری چاہئے۔ یہ توفیق پر منحصر ہے جس کو توفیق مل جائے۔

حضرت خواجہ عطا سلیمی رحمتہ اللہ علیہ کے بارے میں منقول ہے کہ سات دنوں تک انہوں نے کچھ نہیں کھایا اور ان کے پاس کھانے کی کوئی ایسی چیز بھی نہیں تھی۔اس عالم میں ان کو ایسی خوشی حاصل ہوئی کہ خوش ہو کر کہنے لگے خداوند! اگر تو مجھے مزید تین روز کچھ کھانے کو نہ دے تو میں ہزار رکعتیں نماز پڑھوں گا۔

حضرت خواجہ فتح موصل رحمتہ اللہ علیہ کے بارے میں منقول ہے کہ ایک روز عشاء کی نماز کے وقت جب گھر آئے تو کھانے پینے کی کوئی چیز گھر میں موجود نہ تھی بلکہ چراغ بھی نہیں تھا۔ بارگاہ الٰہی میں پہلے حمد وثنا کی اس کے بعد یوں مناجات کی کہ الٰہی! آخر کس وسیلہ اور فضیلت کی وجہ سے مجھے اپنے اولیاء کا درجہ عطا فرمایا۔

اس طرح کے معاملات اسی کے ہو سکتے ہیں جو اپنے نفس کا دشمن ہو گیا ہے وہی مرد ہے جس نے اپنے نفس کی تمام خواہشات سے رخ موڑ لیا ہے۔

کہتے ہیں کہ جس مرید نے اپنے نفس کو سرکشی و نافرمانی میں فرعون کے جیسا نہیں سمجھا اس نے توحید میں صدق کا حق ادا نہیں کیا۔

نفس کا فرتو وہ ہے جو دن رات میں کئی بار اپنی طرف بلاتا ہے۔مرد کے لئے اپنے نفس کو دشمن بنانے کے سوا اور کوئی دوسری صورت نہیں۔ جو مرید اپنے نفس کا دشمن ہو گیا اس کی علامت یہ ہے کہ وہ حصول مراد میں ناکامی پر اتنا ہی زیادہ خوش ہو جتنی خوشی اسے مراد پانے میں ہوتی۔

قولہ: واذا رائیت المتوسط غافلا عن حفظ قلبه و مراعات احواله فاعلم أنه كذاب.

(ارشاد شیخ ہے) اور جب کسی مرید متوسط کو دیکھو کہ وہ اپنے دل کی

حفاظت سے غافل اور اپنے احوال کی رعایت یعنی نگہداشت سے خالی ہے
تو سمجھ لو کہ وہ یقیناً جھوٹا ہے۔

شرح: یہ بات اس لئے کہی گئی کہ اس مرید کے صدق کی علامت یہ ہے کہ وہ اپنے دل کی حفاظت کرے اور احوال کی رعایت رکھے۔ اگر اس میں یہ بات نہیں ہے تو یقیناً وہ اپنے دعویٰ میں جھوٹا ہے۔ صادقوں کی راہ یہی راہ ہے۔ اس راہ میں صدق کے ساتھ چلا جائے کذب کے ساتھ نہیں۔ اس راہ کی روش نفس کی مراد کے برعکس ہے۔ نفس کی مراد حجابِ راہ ہے۔ چنانچہ جو شخص نفس کی مراد پر چلتا ہے وہ حق کی مخالفت کر رہا ہے۔ مرد کو چاہئے کہ وہ نفس کے مکروفریب سے ڈرتا رہے۔ اس لئے کہ نفس جو نافرمان ہے وہ لوگوں کو اپنی توجہ کا مرکز بنائے رکھتا ہے۔

قوله: فاذا رأيت من يشير الى المعرفة يميز بين المدح والذم والقبول والرد فاعلم أنه كذاب.

(ارشاد شیخ ہے) جب تم کسی کو دیکھو کہ وہ معرفت کا دعویٰ کرتا ہے اور لوگوں کی تعریف وتوہین، قبول ورد میں تمیز سے کام لیتا ہے تو سمجھ لو کہ بیشک وہ جھوٹا ہے۔

شرح: جو شخص اپنے قول وفعل کو عام معرفت سے منسوب کرتا ہے یعنی وہ اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ وہ ایک عارف ہے۔ اور اس کا حال یہ ہے کہ وہ لوگوں کی تعریف وتذلیل کو اس حد تک اہمیت دیتا ہے کہ ان کی تعریف سے خوشی ہوتی ہے اور تذلیل سے تکلیف پہنچتی ہے۔ اس طرح لوگوں کے درمیان مقبول ہونے اور مردود ہونے میں اس حد تک فرق کرتا ہے کہ لوگوں کے درمیان مقبول ہونے سے خوشی محسوس کرتا ہے اور ان کے رد کر دئے جانے سے رنج ہوتا ہے۔

ایسے شخص کو سمجھ جاؤ کہ یقیناً وہ جھوٹا ہے۔ اس لئے کہ جو عارف ہیں ان کی صداقت کی پہچان یہ ہے کہ لوگوں کی تعریف وتذلیل اور رد وقبول کے درمیان کوئی فرق نظر نہ آئے۔ اس پر یہ بات اچھی طرح واضح رہے کہ جو لوگوں کے درمیان مقبول ہے وہ مقبول نہیں اور جس کو لوگ برا کہتے ہیں وہ برا نہیں۔ بلکہ جس کو حق سبحانہ قبول فرمائے وہی مقبول ہے اور جس کو وہ برا کہہ دے وہی

برا ہے۔ جو لوگوں کے ذریعہ کی جانے والی تعریف وتذلیل اور قبول ورد میں فرق وتمیز کرتا ہے اس کا شمار عام لوگوں میں ہوگا۔ اور جب یہ علامت اس میں نہیں پائی جائے گی تو وہ اپنے دعویٰ میں جھوٹا ہے۔

اس لئے کہ صرف دعویٰ قابل اعتبار نہیں۔ یوں تو سارے لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم کو دنیا وآخرت کی معرفت حاصل ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی معرفت بھی حاصل ہے۔ معرفت دل کی صفت ہے اور صفاتِ دل تک حس کی رسائی نہیں۔ لہٰذا حس کے ذریعہ یہ معلوم نہیں کیا جاسکتا کہ کس کو معرفت حاصل ہے اور کس کو معرفت حاصل نہیں۔

صفات سے افعال کا صدور ہوتا ہے۔ تمام افعال صفات سے پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ افعال کو دیکھ کر صفات کا علم ہوتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی کہتا ہے کہ میں درزی ہوں یا کاتب ہوں اور سلائی وکتابت کا فن اس کو معلوم ہے تو وہ سچ اور درست کہتا ہے اور اگر وہ اس فن سے نابلد ہے تو وہ جھوٹ بولتا ہے۔

جو دنیا، آخرت اور اللہ تعالیٰ کی معرفت کا دعویٰ کرتا ہے اس کے اندر ترک کی صفت ہونی چاہئے یہی اس کی پہچان ہے۔ جس کے اندر ترک کی صفت ہوگی اس کے بارے میں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اس کو دنیا، آخرت اور اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہے۔ اور جو ترک کی صفت سے خالی ہے اس کے بارے میں پورے یقین اور غالب گمان کے ساتھ یہ سمجھ لینا ہے کہ یہ شخص معرفت کی نعمت سے محروم ہے۔ اس لئے تارک کو عزیز الوجود اور کبریت احمر (لال گندھک) کہتے ہیں یعنی جس کے بارے میں سنا جاتا ہے مگر دیکھنے میں نہیں آتا۔

حضرت خواجہ جنید رحمتہ اللہ علیہ سے لوگوں نے پوچھا اگر اس راہ کا چلنے والا اور سالک اگر دونوں جہاں کو طے کرلے اس کے باوجود اس کی کوئی ایک مراد بھی باقی رہ جائے تو ایسے شخص کے بارے میں کیا حکم ہے؟

حضرت نے فرمایا۔ **المکاتب عبدوان بقی علیه درهم**. اگر مکاتب پر ایک درہم بھی بقایا رہ جائے تو وہ غلام ہی رہے گا آزاد نہیں ہوگا۔

سارا جہاں ترک کا دعویٰ کر رہا ہے لیکن غور سے دیکھو گے تو کوئی بھی تارک نظر نہیں آتا۔ سب کے سب متروک ہیں اور جہالت کا یہ حال ہے کہ تارک کس کو کہتے ہیں یہ سمجھتے ہی نہیں۔

قوله: وقال الجنید لو لا العلامات لادّعیٰ کل انسان سلوک الطریقة قال الله تعالیٰ فلعر فتهم بسیماهم ولتعرفنّهم فی لحن القول.

(ارشادِ شیخ ہے) حضرت خواجہ جنید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اگر یہ علامتیں نہ ہوں تو ہر شخص سلوک طریقت کا دعویدار ہوتا۔ جیسا کہ فرمایا اللہ تعالیٰ نے بھی فلعرفتهم بسیماهم ولتعرفنهم فی لحن القول. (آپ پہچان تو چکے ہیں ان کو ان کے چہرے سے اور آپ ضرور پہچان لیا کریں گے انہیں ان کے انداز گفتگو سے۔) (سورہ محمد/۳۰)

شرح: حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت شریف کو بطور دلیل پیش کیا ہے کہ اے محمد ﷺ! آپ یقیناً ان منافقوں کو پہچانتے ہیں ان کی علامتوں اور نشانیوں سے اور آپ پہچان لیں گے ان کے انداز گفتگو سے۔ اَللَّحنُ ھُوَ الْعُدُوْلُ عَنِ الصَّوَابِ. طرز آواز اور انداز گفتگو صحیح غلط کو واضح کر دیتا ہے۔

اس آیت سے پہلے کی آیت یہ ہے وَلَوْ نَشَآءُ لَاَرَیْنٰـکَھُمْ فَلَعَرَفْتَھُمْ. اے محمد ﷺ ہم اگر چاہیں تو آپ کو دکھا دیں یہ لوگ اور آپ ان کو یقیناً پہچان لیں ان کی علامتوں سے۔

اس آیت کا نزول مدینہ منورہ میں ہوا تھا۔ ابھی اسلام اپنے ابتدائی حال میں تھا۔ اس وقت تک اللہ تعالیٰ نے اپنی مشیت سے لوگوں کے حال کو رسول اللہ ﷺ سے پوشیدہ رکھا تھا۔ آخر میں حضور ﷺ کو وحی کے ذریعہ ان لوگوں کا سارا حال معلوم ہو گیا۔

حاصل کلام یہ کہ جو دل کی صفت ہے اور جس صفت کا دعویٰ کوئی کرتا ہے اس صفت کو کس کے ذریعہ معلوم نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں! علامتوں کے ذریعہ ان کو معلوم کیا جا سکتا ہے۔ جو شخص

دنیا میں مبتلا ہے، اور جاہ و مرتبہ کا خواہشمند بھی ہے اس سے صوفیانہ لباس پر فریفتہ نہیں ہونا چاہئے۔ اور نہ اس کی شہرت اور ناموری پر مغرور ہونا چاہئے اگر ایسا شخص حقیقت کے عنوان پر گفتگو کرے تو اس کو اہمیت نہیں دی جائے۔ وہ جو کچھ کہے پہلے اس کی حقیقت کا اس سے مطالبہ کیا جائے۔ اس لئے کہ بہت ساری عورتیں اپنے مقصد کو پانے اور اپنی مراد کی تکمیل کے لئے مردوں کا لباس پہن لیتی ہیں۔

اسی طرح کے فتنے جو لوگوں کے درمیان پائے جا رہے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا سے اتنی زیادہ محبت ہوگئی ہے کہ آخرت سے دل نابینا ہے۔ ہاں! زبانوں پر آخرت کا ذکر تو خوب ملے گا۔

جس مرید کی رغبت آخرت کی جانب ہوتی ہے اس کی توجہ دنیا، اسباب دنیا اور معاملات دنیا کی طرف نہیں ہوتی وہ کھانے پہننے کی فکر میں وقت نہیں لگاتا۔ جو دانشمند و سمجھدار ہے وہ کسی کے عبا و دستار، جبہ و پگڑی یا تقریر پر فریفتہ نہیں ہوتا۔ دنیا کی دوستی سب کے لئے حرام ہے۔ چاہے وہ معرفت والے ہوں یا جبہ و دستار والے۔

اس وقت جاہلوں اور جھوٹے دعویٰ داروں کی ایک جماعت نکل آئی ہے جو لوگوں کو راستے سے اچک لیتی ہے۔ جو اہل معنیٰ ہیں وہ ان دعوئ داروں اور جاہلوں کے درمیان روپوش ہوگئے ہیں۔ اہل معنی وہ ہیں جن کی گفتگو حق کے لئے ہوتی ہے۔ یہ حضرات جب لوگوں کو دنیا اور رسم دنیا میں مبتلا دیکھتے ہیں تو سمجھ جاتے ہیں کہ یہ لوگ حق باتیں سننے کو تیار نہیں۔ ایسے میں کیا کریں۔ خود کو ان لوگوں سے محفوظ اور سلامت کر لیتے ہیں۔

اگلے بزرگوں کے یہاں تقریر نہیں تھی بلکہ عمل تھا۔ دعویٰ نہیں تھا بلکہ اصلیت اور معنی تھا۔ اور آج صرف گفتار ہے کردار نہیں، دعوی ہے معنی نہیں۔ لیکن دنیا خالی بھی نہیں کچھ لوگ ویسے ابھی بھی ہیں اور جب تک ان میں سے کوئی ایک بھی رہے گا ان کے صدقہ میں اللہ تعالی دنیا کو تباہ و برباد ہونے سے بچائے رکھے گا۔ اس لئے کہ یہ اللہ تعالی کی طرف سے لوگوں کے لئے وجہ امن و امان ہوتے ہیں۔

قوله: ویجب أن یعلم أنه لا یصح له مقام ولا حال ولا عبادة الا بالاخلاص وهی تصفیتهامن رویة الخلق.

(ارشادِ شیخ ہے) مرید کے لئے یہ جاننا واجب ہے کہ اس کا مقام، حال اور عبادت اس وقت تک درست وصحیح نہیں جب تک اخلاص نہ ہو اور اخلاص یہ ہے کہ وہ لوگوں کے دیکھنے سے پاک وصاف ہو۔

شرح: مرید کی عبادت کا مقصد اور مراد صرف اللہ رب العزت کی قربت ہو کوئی دوسرا مقصد نہ ہو۔ کوئی بھی عبادت اس لئے نہ کی جائے کہ لوگ دیکھیں گے، تعریفیں کریں گے، لوگوں کے درمیان عزت ہوگی۔ دنیاوی جاہ ومرتبہ کے حصول کا سبب بنے گی یا اس طرح کی اور کوئی وجہ سامنے نہ ہو بلکہ صرف تقرب الی اللہ کے مقصد سے عبادت کی جائے۔

جب تک مرید کو معرفت یعنی اس کی پہچان حاصل نہیں ہوگی اس وقت تک ایسی آلائشوں سے پاک وصاف نہیں ہوسکتا۔ نفس کی برائیاں بہت زیادہ ہیں اسی لئے کہتے ہیں کہ جب تک نفس کا ایک ذرہ بھی انسان میں موجود ہے وہ راہِ حق کو طے نہیں کرسکتا۔ جب راہ حق طے کرنے کے لئے اتنے معاملات سے گزرنا ہے تو حق سبحانہ تعالے تک پہنچنے کے لئے کامل معرفت کی ضرورت ہے۔

نقل ہے کہ خراسان کے درویشوں میں سے ایک درویش حضرت ابوبکر قحطی کے پاس آئے اور انہوں نے کہا آپ کے شیخ نے آپ کو کیا حکم دیا ہے؟ انہوں نے بتایا کہ میرے شیخ نے مجھ سے کہا ہے کہ طاعت وعبادت زیادہ کرو اور اپنے کو اس طاعت میں کمتر سمجھو۔ اس درویش نے فرمایا اِنَّمَا یَا مُرُکُم بِا لمَجُوسِیَۃَ الْمَحُضَہِ یعنی آپ کو صرف آتش پرستی بتائی گئی ہے۔ حاصل کلام یہ کہ مغ یعنی آتش پرست کے یہاں دو کا تصور ہے الہ اور اہرمن۔ ابوبکر قحطی کا کہنا ہے کہ اپنے کو طاعت وفرماں برداری میں کم سمجھو اور اس درویش کا کہنا ہے کہ جب اپنے کو طاعت میں کم دیکھو گے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ طاعت پر نظر ہوگی۔ پہلے طاعت پر نظر ہوگی پھر اس کی کمی دکھائی دے گی۔ طاعت اللہ تعالے کے علاوہ چیز ہے اور اللہ تعالے کے علاوہ کسی چیز کو دیکھنا

اور اللہ تعالے کو دیکھنا یہی تو دو کو دیکھنا ہے اور یہ آتش پرستوں کے عقیدہ کے مطابق ہے جو دو صانع کے قائل ہیں۔ مومن کے یہاں تو توحید ہے۔ توحید ایک دیکھنا ہے۔ مومن کے لئے اخلاص ہے اور اخلاص ایک ہونے کو کہتے ہیں۔ اگر چاہتے ہو کہ موحد اور مخلص ہو جائیں تو اپنے کو اور اپنی عبادت کو نہ دیکھو۔ طاعت وعبادت کو اللہ رب العزت کی عنایت سمجھو جب اس کے احسانات کے نظارے میں رہو گے تو اپنی طاعت وعبادت کے نظارے میں خلوص نہیں برتو گے۔ نفس میں عجب یعنی غرور وتکبر کی جو صفت پیدا ہوتی ہے وہ اپنے آپ کو دیکھنے اور اپنے عمل پر نظر ڈالنے سے ہوتی ہے۔ جب نہ خود پر نگاہ ہوگی اور نہ اپنا عمل دکھائی دے گا تو اس وقت نفس میں عجب کہاں سے پیدا ہوگا۔ اسی لئے کہتے ہیں نماز یا کسی دوسری عبادت کی حالت میں جانوروں کا مشاہدہ ہو یا کسی دوسری مخلوق کا ایک ہی بات ہے کوئی فرق نہیں۔

قوله: وقد روی عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم أنہ قال یقول اللہ أنا أغنی الشرکاء عن الشرک من عمل لی عملاً أشرک فیہ معی غیری فانا بریٌ منہ ومن عملہ.

(ارشاد شیخ ہے) نبی کریم ﷺ سے روایت ہے بے شک آپ نے فرمایا اللہ تعالے فرماتا ہے میں تمام شریکوں میں شرک سے سب سے زیادہ بے نیاز ہوں۔ جس نے میری لئے ایسا کوئی عمل کیا جس میں میرے علاوہ کسی اور کو بھی شریک کرلیا تو میں اس سے اور اس کے عمل سے بے زار ہوں۔

شرح: اس حدیث شریف میں جو لفظ شرکاء آیا ہے۔ وہ جمایت کے اس شک اور گمان کے لئے آیا ہے۔ جس میں وہ اللہ تعالے کے لئے شرکا کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔

بعض نسخے میں أنا أغنی الأغنیاء بھی آیا ہے۔ جس کا معنی یہ ہوگا کہ میں شرکت کے اعتبار سے تمام بے نیازوں میں سب سے زیادہ بے نیاز ہوں۔ اس لئے کہ دوسرے لوگ جو بے نیازی کے باوجود کسی نہ کسی وقت اللہ تعالے کے علاوہ کسی اور کے محتاج ہو جاتے ہیں۔ اور اللہ تعالے کسی وقت بھی اور کسی حال میں بھی کسی شرک کا محتاج نہیں۔ شرک سے وہ بالکل پاک اور

مقدس ہے۔

نقل ہے کہ اللہ تعالے جب قیامت کے دن اپنے بندوں کے اعمال کا بدلہ دے گا تو اس وقت ریاکاروں سے کہے گا جاؤ ان لوگوں کی طرف جن کو تم دنیا میں اپنے اعمال دکھا رہے تھے۔ جب وہ اس طرف نگاہ ڈالیں گے تو سوچیں گے کہ کون ہے جو ان کے اعمال کا بدلہ دے گا۔ یہ بات بطور تنبیہ آئی ہے ایسا نہیں کہ کوئی اور ہوگا جو ان کے اعمال کا بدلہ دے سکتا ہے۔

ریا: دین میں ریا کی بہت ساری قسمیں ہیں۔ کوئی اپنے جسم کو دبلا اور اپنے چہرے کو زرد کر کے لوگوں کو یہ بتانا چاہتا ہے کہ بہت زیادہ مجاہدے، دین کے لئے حزن وملال اور آخرت کے خوف سے اس کا یہ حال ہو گیا ہے۔ اور اس کے ذریعہ وہ لوگوں کو یہ بھی بتانا چاہتا ہے کہ کھانے پینے میں کمی کرنے سے وہ دبلا ہو گیا ہے۔ اور بہت زیادہ شب بیداری کی وجہ سے اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا ہے۔ اسی طرح کچھ لوگ بال بکھرا کر ریاکاری کا مظاہر کرتے ہیں تاکہ لوگ یہ سمجھیں کہ دین میں یہ اتنا ڈوبا ہوا ہے کہ اس کو کنگھی کرنے کی فرصت نہیں ملتی۔ جب اس طرح کی باتیں ظاہر ہوتی ہیں اور لوگوں کے دل پر اس کی عظمت کا سکہ بیٹھ جاتا ہے تو اس کے نفس کو بے انتہا خوشی حاصل ہوتی ہے۔ اسی پر اور دوسری ریاکاریوں کو قیاس کرنا چاہئے۔

نفس کی دونوں انکھیں لوگوں کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ جب تک لوگ اس کی نظر سے ساقط نہ ہو جائیں۔ ریا سے نکل کر اخلاص میں داخل نہیں ہو سکتا۔ اور یہ ریا بہت بڑی گھاٹی ہے، ہر لمحہ اللہ رب العزت سے پناہ کا طلب گار رہنا چاہئے۔ اور یوں دعا کرنی چاہئے کہ اے بادشاہ! میں اپنے نفس کافر کے ہاتھوں عاجز اور مجبور ہو چکا ہوں۔ تیری رحمت کو تیری بارگاہ میں شفیع لاتا ہوں مجھے نفس کے قبضے سے نجات دے دے اپنی پاکبازی کی قید میں اس کو باندھ دے۔ اور وہ بندھن میرے ہاتھ میں دے دے تاکہ میں خوشی کے ساتھ زندگی بسر کروں۔

قولہ: وقال بعضهم كل حق شاركه الباطل فقد خرج من قسمة الحق الىٰ قسمة الباطل فان الحق غيور.

(ارشاد شیخ ہے) بعض صوفیا نے کہا ہے کہ ہر وہ حق جس میں باطل شریک

ہو جائے یقیناً وہ حق سے نکل کر باطل کے حصے میں داخل ہو جاتا ہے بے

شک حق سبحانہ تعالے غیور (غیرت مند) ہے۔

شرح: یہاں باطل سے مراد ریا ہے اور ریا حرام ہے۔ ریا کرنے والا اللہ تعالے کے نزدیک دشمن ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں تم لوگوں کے حق میں شرک اصغر سے ڈرتا ہوں۔ لوگوں نے عرض کیا یارسول اللہ شرک اصغر کیا ہے؟ ارشاد ہوا ریا شرک اصغر ہے۔

فَاِنَّ الْحَقَّ غیورٌ ۔ بے شک اللہ تعالے غیور ہے۔

مخلوق کے حق میں غیرت کا معنی یہ ہوگا کہ لوگ اپنے محبوب و مطلوب میں کسی غیر کی شرکت کو پسند نہیں کرتے۔ اور اسی غیرت کو جب خالق کائنات کی صفت کے لئے استعمال کریں گے تو اس کا معنی یہ ہوگا کہ وہ رب کائنات اپنے لئے کسی غیر کی شرکت کو پسند نہیں کرتا۔ یعنی بندہ کی جو طاعت، وعبادت ہے وہ صرف اللہ کے لئے ہو اس میں کسی دوسرے کا حق نہیں۔ اگر اللہ تعالے کی غیرت کو اس کے کاموں میں دیکھا جائے تو معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالے کے کام شرکت کو قبول نہیں کرتے۔

حضرت خواجہ سہیل رحمتہ اللہ علیہ سے لوگوں نے پوچھا کون سی چیز ہے جو نفس کے لئے بہت سخت ہے۔ فرمایا وہ اخلاص ہے جس میں نفس کا کوئی حصہ نہیں۔

ایک بزرگ نے فرمایا لاالـہ الااللّـہ کہنے والے بہت لوگ ہیں لیکن ان میں ارباب خلوص بہت کم ہیں۔

حضرت خواجہ ذولنون مصری رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا اخلاص کی تین علامتیں ہیں۔

۱۔ لوگوں کی تعریف وتذلیل کا برابر ہونا۔

۲۔ اپنے اعمال کو فراموش کر دینا۔

۳۔ آخرت میں کسی ثواب کی طلب نہ کرنا۔

قوله: ولا بـاس بما يظهر من أحواله وعباداته من غير قصدٍله في اظهاره.

(ارشاد شیخ ہے) اگر کسی مرید کے احوال وعبادات میں سے کوئی چیز بغیر قصد وارادے کے ظاہر ہو جائے تو اس میں کوئی خوف اور مضائقہ نہیں۔

شرح: حضرت شیخ کے اس قول کو سوال وجواب کے ذریعہ سمجھا جاسکتا ہے۔ حضرت شیخ نے فرمایا کہ مرید کے لئے کوئی بھی مقام اور حال درست نہیں جب تک اس میں اخلاص نہ ہو۔ اور اخلاص کہتے ہیں اپنی عبادت کو دوسروں کی نظر سے بچا کر رکھنا۔

سوال- یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر مرید کے احوال وعبادات لوگوں پر بغیر قصد کے ظاہر ہو جائیں یعنی ظاہر کرنے کا ارادہ نہ ہو اور بے ارادہ ظاہر ہو جائے تو وہاں پر کیا حکم ہوتا ہے؟

جواب- حضرت شیخ نے جواب دیا کہ اگر بغیر ارادہ ہو جائے تو کوئی خوف اور مضائقہ نہیں۔ جاہ ومرتبہ کی عظمت کو پانے کے لئے بندہ کی جانب سے کوئی لالچ نہ ہو اور اس کے زوال پر کسی طرح کا رنج وملال نہ ہو تو نقصان دہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ رسول اکرم ﷺ سے بلند مرتبہ کس کا ہوگا اور آپ ﷺ کے بعد خلفائے راشدین اور ان کے بعد علماء دین لیکن ان حضرات گرامی کو بارگاہ رب العزتؐ سے جو مرتبہ ملا تھا اس میں ان کی طلب خواہش اور ارادہ کو دخل نہیں۔ لہذا ان کے لئے کسی نقصان کا سبب نہیں بنا اس سے معلوم ہوا کہ قصداً جاہ ومرتبہ کی طلب کرنا دین میں نقصان کا سبب ہے کیوں نکہ جاہ ومرتبہ کی خواہش نفس کی مراد ہے۔

مرید صادق جو گفتار میں نہیں بلکہ کردار وعمل میں لگا رہتا ہے جب نفس کے پوشیدہ مکرو فریب اس پر ظاہر ہو جاتے ہیں تو اس وقت وہ ایسا بے چین اور مجبور ہوتا ہے کہ نفس کافر کے ہاتھوں نہ اس کو سکون ملتا ہے اور نہ قرار۔ اسی عالم میں وہ آدھی رات کو بارگاہ الہی میں یوں نالہ و فریاد کرتا ہے کہ اے رب تعالے! تیری بارگاہ کا بھاگا ہوا بندہ تیری دوستی کے جال میں گرفتار ہو کر حاضر آیا ہے۔ تو خوب جانتا ہے کہ میرا مقصد تیری نافرمانی نہیں تھی۔ لیکن نفس کے مکر وفریب سے مجبور ہو گیا۔ میری فریاد سن لے۔

قوله: ولا یصح له الا خلاص الا بمعرفة مقادیر الخلق و ضعفهم وقلة لقعهم و ضرهم کما وصفه الخلیل لِمَ تعبدُ مالَا یسمعُ

وَلاَ يُبْصِرُ وَلاَ يغني عَنکَ شيئاً.

(ارشاد شیخ ہے) مرید کے لئے اخلاص اس وقت تک درست نہیں ہوتا ہے جب تک لوگوں کے قدر ان کے ضعف اور قلت نفع ونقصان کا اچھی طرح علم نہ ہو جائے جیسا کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے فرمایا۔ تم اس چیز کو کیوں پوجتے ہو جو نہ سن سکتا ہے نہ دیکھ سکتا ہے اور جو نہ تم کو کسی چیز سے بے نیاز کر سکتا ہے۔

شرح: یعنی اس بات کو اچھی طرح جاننا اور سمجھنا چاہئے کہ اگر ساری مخلوق جمع ہو کر کسی کو نفع پہنچانا چاہے اور اللہ تعالے کی مرضی نہ ہو تو نفع نہیں پہنچ سکتا ہے۔ اسی طرح اگر ساری مخلوق جمع ہو کر کسی کو نقصان پہنچانا چاہے اور اللہ کی مرضی نہ ہو تو نقصان نہیں پہنچ سکتا ہے۔

جب نفع ونقصان پہنچانے میں انسان کی مجبوری و کمزوری واقع ہو گئی تو اس کی نگاہ دوسروں کی طرف نہیں اٹھتی بلکہ اس کی نظر اللہ کی طرف ہوتی ہے وہ یہ جانتا ہے کہ نقصان پہنچانے والا اگر ہے تو وہی، نفع بخش اگر ہے تو وہی، عطاء و بخشش کرنے والا ہے تو وہی اور روکنے والا ہے تو وہی۔

اس علم کے بعد اخلاص درست وصحیح ہوگا۔

اس معنی میں حضرت شیخ رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے اس واقعہ کو دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔ انہوں نے اپنے باپ سے کہا لِمَ تَعْبُدُ مَالَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِیْ عَنکَ شَيْئاً (سورہ مریم/۴۲)

تم اس چیز کو کیوں پوجتے ہو جو نہ سن سکتا ہے، نہ دیکھ سکتا ہے اور جو نہ تم کو کسی چیز سے بے نیاز کر سکتا ہے۔ یعنی جب تم کو کوئی حاجت پیش آتی ہے تو اس حاجت وضرورت کو پورا کر کے تم کو بے نیاز نہیں کر سکتا۔ لہذا اس کی عبادت و پرستش کرو جس کو پکارو تو وہ سن لے تمہاری طرف وہ اس طرح متوجہ ہے کہ تم کو جب کوئی حاجت ہو تو اس حاجت سے بے نیاز کر سکے، اور۔ یہ سب کام صرف ایک ہی سے ہو سکتا ہے اور وہ ہے اللہ تعالیٰ۔

جب اس پر نگاہ ہوگی تو ہر طرف سے رخ موڑ کر اسی کی بارگاہ میں سر تسلیم خم کر دینا ہے۔ نعمت میں جب اس پر نظر ہو تو بلا میں بھی اسی پر نظر ہو۔

مرد کو قضاء و قدر کے آگے زمین کی طرح ہونا چاہئے۔ جس طرح زمین پر اگر بہت بڑا پہاڑ بھی رکھ دیا جائے تو اس کو بے چینی و پریشانی نہیں ہوتی۔ اسی طرح جو مرد ہیں ان پر بھی لازم ہے کہ حق سبحانی تعالیٰ کی جانب سے اس کے لئے جو حکم بھی آئے اس کو اسی طرح بغیر کسی اضطراب و پریشانی کے اپنے کو بے اختیار سمجھتے ہوئے برداشت کرے۔ اور پہاڑ سے بھی ہزار گنا وزنی کوئی معاملہ آئے تو اس پر چون و چرا نہ کرے۔ اس لئے کہ رب تعالیٰ جو کچھ کرتا ہے اپنے ارادے اور اپنی خواہش سے کرتا ہے۔ ایسی بھی کوئی چیز اگر ہے جو اللہ تعالیٰ کے اختیار سے باہر ہے تو انکار کر دے، اور حق تعالیٰ کی طرف رخ نہ کرے۔ (اور اللہ تعالیٰ کے اختیار سے باہر تو کچھ ہے نہیں۔)

جب مرد خدا کو یہ معرفت حاصل ہوگئی تو ساری بلاؤں کے ہوتے ہوئے بھی وہ رب تعالیٰ کے دیدار میں لگ جاتا ہے۔

قولہ: وقال النبی ﷺ لا یجد احدکم حلاوۃ الایمان حتی یعلم ان ما اصابہ لم یکن لیخطیہ و ما اخطاہ لم یکن لیصیبہٗ.

(ارشاد شیخ ہے) نبی کریم ﷺ نے فرمایا تم میں سے کوئی شخص ایمان کی حلاوت نہیں پا سکتا جب تک کہ وہ یہ نہ جان لے کہ جو کچھ اسے پہنچنے والا ہے وہ اسے پہنچ کر رہے گا۔ ایسا نہیں کہ نہ پہنچے اور جو نہیں پہنچنے والا ہے وہ کبھی بھی نہیں پہنچے گا۔

شرح: یعنی اللہ تعالیٰ نے جو کچھ قضاء قدر میں طئے کر دیا ہے اس میں کسی طرح کی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اور اس کے حکم کو کوئی رد نہیں کر سکتا۔ اگر اس نے تقدیر میں لکھ دیا کہ ملے گا تو اس میں کسی طرح کا شک و شبہ نہیں وہ ضرور مل کر رہے گا۔ اسی طرح اگر اس نے مقدر میں لکھ دیا ہے کہ نہیں ملے گا تو یقیناً اور بلا شک نہیں ملے گا۔

اگر ساری مخلوق، انسان، جن، فرشتہ ایک ساتھ تم کو کوئی ایسی چیز دینا چاہیں جو رب

تعالیٰ دینا نہیں چاہتا تو ہرگز نہیں دے سکتے۔ اسی طرح اگر اللہ تعالیٰ کچھ دینا چاہتا ہے اور ساری مخلوق ایک ساتھ جمع ہوکر اس بات کی کوشش کرے کہ وہ چیز تم کو نہ ملے تو اس میں کامیابی نہیں مل سکتی۔ اور بغیر رکاوٹ کے وہ چیز تم کو مل جائے گی۔

جب بندہ کو یہ علم ہوگیا کہ لوگوں کے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے تو وہ جب مانگے گا اللہ سے مانگے گا، جب مدد چاہے گا تو اللہ سے چاہے گا۔ اس کی نظر میں لوگوں کا وجود اور عدم دونوں ایک ہوگا۔ اس کا سارا اعتماد اللہ پر ہوگا۔ چاہے وہ روٹی کھلا کر زندہ رکھے یا بغیر روٹی کے زندہ رکھے۔ بندہ کی نیستی ہستی پر غالب ہے۔ اس وقت بڑی سے بڑی سلطنت بھی اس کی نظر کے سامنے بے قدر ہو۔ ایسا مرید جب حق کے سامنے ہوگا تو درویش بن کر آئے گا۔ وہ لوگوں سے بے نیاز رہے گا۔ اس کا دل دنیا اور دنیا والوں کی فکر سے خالی رہے گا۔ اس کے نفس کو لوگوں سے کوئی لالچ نہیں ہوگی۔ روٹی رہے یا نہ رہے، خرقہ میسر ہو یا نہ ہو وہ اپنے کو بادشاہوں سے اونچا اور بادشاہوں و امراء سے تو انگر سمجھے گا۔ جب لوگوں سے کوئی لالچ نہیں ہوتی تو آدمی تو انگر ہو جاتا ہے۔

قوله: وقال النبی ﷺ ان من ضعف الیقین ان ترضی الناس بسخط الله و ان تحمد هم علی رزق الله و ان تذمهم علی مالم یأتیک الله.

(ارشاد شیخ ہے) نبی اکرم ﷺ نے فرمایا بیشک یہ ضعف یقین کی بات ہوگی کہ تم لوگوں کو ان چیزوں سے خوش کرو جن سے اللہ تعالیٰ ناخوش ہو۔ اللہ تعالیٰ کے رزق دینے کے باوجود دوسروں کی تعریف کرنا اور اللہ تعالیٰ نے جو چیز نہیں دی ہیں ان کے لئے دوسروں کی برائی کرنا۔ یہ ضعف یقین کی باتیں ہیں۔

شرح: اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور سے منفعت طلب کرنا یا کسی غیر کے نقصان پہنچانے سے خائف رہنا ایمان کی کمزوری ہے۔ جس کا ایمان قوی ہوتا ہے وہ اس بات کو اچھی طرح سمجھتا ہے کہ نفع پہنچانے والا اور نقصان پہنچانے والا عطا و بخشش کرنے والا اور عطا و نوازش کو

روکنے والا ایک ہی ہے اور وہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہے۔ جس کو ایمانی قوت حاصل رہتی ہے اس کو نہ کسی سے رغبت ہوتی ہے اور نہ کسی سے خوف ہوتا ہے۔ ایمانی قوت کا ربط اللہ تعالیٰ پر اعتماد رکھنے کے ساتھ ہے۔ اور صحت اعتماد کا رابطہ اس پر ہے کہ یہ بات منکشف ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی فاعل نہیں۔ جو کچھ موجود ہے چاہے وہ خلق ہو یا رزق ہو، عطا ہو یا منع ہو، زندگی ہو یا موت ہو، امیری ہو یا فقیری ہو سب کو پیدا کرنے والا اور وجود بخشنے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ اور ان کاموں میں اس کا کوئی شریک نہیں۔ جب یہ معنی کسی پر کھل جاتا ہے تو وہ کسی غیر کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ بلکہ ڈر ہوتا ہے تو اسی کا، امید ہوتی ہے تو اسی سے اور اعتماد ہوتا ہے تو اسی پر ہے۔ اس لئے کہ فاعل وہی ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ سب اسی کے تابع ہیں۔ وہ اپنے ارادے اور مرضی سے آسمان وزمین میں ایک ذرہ کو بھی ہلا نہیں سکتے۔ چنانچہ بندہ عطاء وبخشش اور منع ورکاوٹ کے لئے کسی غیر کی طرف ملتفت ومتوجہ نہیں ہوتا۔

جو غیر کی طرف دیکھتے ہیں ان کی مثال یہ ہے کہ اگر کسی شخص کو قتل کی سزا ہو جائے اور بادشاہ اس کے معافی نامہ پر منظوری کا دستخط کرے اور وہ اپنی رہائی کے لئے اس دوات، قلم اور کاغذ کے تذکرہ میں مشغول رہے جس سے معافی کے حکم نامہ پر دستخط ہوا تھا بلکہ وہ یہاں تک کہنے لگے کہ اگر قلم نہیں ہوتا تو مجھے رہائی نہیں ملتی یعنی وہ اپنی نجات کا ذریعہ قلم کو سمجھے قلم چلانے والے کو نہیں سمجھے یہ انتہائی جہالت کی بات ہوگی۔

ہاں! جو یہ سمجھتا ہے کہ قلم کو اپنے آپ میں کوئی اختیار نہیں وہ تو کاتب تحریر کے ہاتھ کا تابع ہے وہ اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتا اور کاتب تحریر کے سوا کسی دوسرے کا شکر گذار نہیں رہتا بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ رہائی کی خوشی اور معافی نامہ پر دستخط کرنے والے بادشاہ کے شکر ادا کرنے میں ایسا مدہوش ہو جاتا ہے کہ قلم، دوات اور کاغذ اس کو یاد بھی نہیں رہتا۔

لیکن شیطان چھوڑتا نہیں۔ وہ آتا ہے اور کہتا ہے کہ سب چیزوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے ہو۔ حالانکہ آدمی اپنے اختیار سے تمہیں روزی دیتا ہے اگر آدمی چاہے تو دے اور نہیں چاہے تو نہیں دے۔ ایسی صورت میں آدمی سے کیوں امید نہیں لگاتے۔

ان باتوں کو سن کر اکثر لوگوں کے قدم پھسل گئے ہیں مگر جو حق سبحانہ تعالیٰ کے خواص ہیں ان پر شیطان کا قبضہ نہیں ہوتا اس لئے کہ وہ نور بصیرت سے یہ دیکھ لیتے ہیں کہ کاتب تحریر خود تابع ہے اور مجبور ہے۔

جو لوگ قلم کو تابع نہیں سمجھتے وہ غلطی پر ہیں اور ان کی غلطی چیونٹی کی غلطی کی طرح ہے مثلاً اگر چیونٹی کاغذ پر چلتی ہے اور وہ دیکھتی ہے کہ قلم کاغذ کو سیاہ کر رہا ہے اس کی نظر لکھنے والے کے ہاتھ کی انگلیوں کو نہیں دیکھتی بلکہ وہاں تک اس کی نظر ہی نہیں جاتی اس لئے وہ اس غلط فہمی میں پڑ جاتی ہے کہ قلم کاغذ کو سیاہ کر رہا ہے۔اس کی اس غلط فہمی میں اس کی بینائی کا قصور ہے آنکھ کی پتلی چھوٹی ہونے کی وجہ سے اس کی نظر نوک قلم سے آگے جاتی ہی نہیں۔

اسی طرح جب کسی کا دل اللہ تعالیٰ کی معرفت کے نور سے روشن اور منور نہیں ہوتا تو آسمان وزمین اور ساری کائنات کے خالق کو دیکھنے سے اس کی بصیرت قاصر رہتی ہے۔

جو راہ تک اٹک کر رہ جاتا ہے اس کی نظر قلم سے آگے نہیں جاتی اور یہ سراسر جہالت ہے۔

سوال: توحید جسے کہتے ہیں وہ ظاہر ہے اور اسباب وذرائع جو تابع ہیں وہ بھی ظاہر ہیں پھر آدمی میں جو حرکت وسکون کی کیفیت ہے وہ کیا ہے۔آدمی جب چاہتا ہے تو متحرک ہو جاتا ہے۔اسی طرح جب چاہتا ہے سکون میں آجاتا ہے۔اس حال میں اس کو تابع کیسے کہیں گے؟

جواب: کسی کام کے ہونے یا نہ ہونے کو آدمی کی مرضی اور خواہش پر منحصر کرنا سراسر غلط اور قدم کی لغزش کہی جائے گی۔لیکن سمجھنا یہ ہے کہ اس کا حرکت وسکون اللہ کی مرضی ومشیت پر موقوف ہے وہ چاہے یا نہ چاہے۔

سوال: اگر کوئی کہے کہ یہ تو سراسر جبر ہے اور جبر اختیار کے مخالف ہے پھر مجبور مختار کیسے ہوگا؟

جواب: اگر سامنے سے پردہ اٹھ جائے تو یہ معلوم ہو جائے کہ اختیار ہوتے ہوئے بھی وہ مجبور ہے۔اس بات کو درج ذیل مثال سے سمجھا جا سکتا ہے کہ جب سوئی سے کسی کی آنکھ کا آپریشن کیا جاتا ہے تو اس وقت پلکوں کو ضرورتاً اس طرح پکڑ لیا جاتا ہے کہ اگر چاہے

کہ اس کو متحرک کرے تو نہیں کرسکتا۔ حالانکہ پلکوں کو گرانا اور اٹھانا اختیاری فعل ہے۔

حضرت خواجہ سری رحمتہ اللہ علیہ سے لوگوں نے پوچھا یقین کسے کہتے ہیں؟ تو انہوں نے فرمایا جب سینہ میں مختلف کیفیات موجزن ہوں تو اس وقت دل کا پرسکون رہنا یقین ہے اور اس بات کا یقین پختہ ہو کہ تمہارے اضطراب و بے چینی سے کوئی فرق پڑنے والا نہیں اس لئے کہ جو مقدر ہو چکا ہے وہ ہو کر رہے گا۔

ایک دوسرے بزرگ سے جب پوچھا گیا کہ یقین کیا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا دل میں کل کی فکر کا نہ ہونا یقین ہے۔

کہتے ہیں کہ جب کوئی شخص اس راہ میں قدم رکھتا ہے تو اس وقت تک اس کو استقامت حاصل نہیں ہوسکتی جب تک وہ یقین کی دولت سے مالا مال نہ ہو اور یقین یہ ہے کہ اللہ جل شانہ نے جو وعدہ کیا ہے اس کو ان وعدوں پر مضبوط و مستحکم سمجھے یہ یقین معرفت سے حاصل ہوتا ہے۔ جب انسان اللہ تعالیٰ کو پہچانے گا تو اس کے کیے ہوئے وعدوں میں کسی طرح کا شک نہیں کرے گا۔ اور اپنی مرادوں میں کامیابی کے لئے کسی تردد کا شکار نہیں ہوگا۔ مرید اگر تردد کا شکار رہے گا تو پھر اس راہ کو طے نہیں کرسکتا۔ اس لئے کہ تردد (شک وشبہات) نفس کی پیداوار ہے۔ تردد کے حال میں کبھی کہتا ہے کہ یہ مجھ سے نہیں ہوسکتا اور جب یقین کی کیفیت ہوتی ہے تو کہتا ہے اگر آسمان وزمین بھی میرے سر پر ڈال دیں اور ٹکڑے ٹکڑے کردیں تو مجھے بندگی کے سوا اور کچھ نہیں چاہئے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے صرف بندگی کے لئے پیدا کیا ہے اور مجھ سے اسی کا مطالبہ ہے۔ اگر مجھ سے اس کام کا مطالبہ نہیں ہوتا تو پھر مجھے اس کام کا حکم ہی نہیں دیتا۔ یہی علم یقین ہے۔ ہاں! یقین کا ثمرہ یہ ہے کہ اس کو ہستی میں جو قوت حاصل ہوتی اس سے زیادہ قوت نیستی میں ہو۔ اس لئے کہ وہ یہ جانتا ہے کہ حق سبحانہ تعالیٰ نیست کو ہست کرسکتا ہے، عزیز کو ذلیل اور ذلیل کو عزیز بنا سکتا ہے۔ اپنے بندہ کو روٹی کے بغیر قوت دے سکتا ہے اور بارش کے بغیر سبزہ اگا سکتا ہے۔ چنانچہ وہ مرید جس کو یقین سے حصہ مل چکا ہے اس کی نگاہ اپنے نفس کے افعال پر ہوتی ہے، دنیا اور ساری مخلوق سے وہ اپنا تعلق منقطع رکھتا ہے۔ وہ ملک الموت علیہ السلام کی آمد کا منتظر رہتا ہے۔ یقین

میں اس کا یہ حال ہو جاتا ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قیامت قائم کردی ہے۔ اور وہ بندہ میدان حشر میں کھڑا ہے۔ ہر ظالم سے مظلوم کو حق دلایا جارہا ہے۔ دشمنوں کی گرفت ہو رہی ہے اور اس بندہ کے ہاتھوں میں اس کا نامۂ اعمال دیا جارہا ہے تاکہ وہ اپنے اعمال کو دیکھ لے۔ جب مرید اس صفت کے ساتھ راہ طئے کرتا ہے تو اللہ تعالے اس کو یقین کی ایسی دولت عطا فرمادیتا ہے کہ وہ اللہ تعالے پر مکمل اعتماد کر لیتا ہے اور اسی پر توکل رکھتا ہے۔

قوله: اَنَّ رِزْقَ اللّٰه لاَ یَجُرَّہُ حِرْصُ حَرِیْصٍ وَلاَ یَدْفَعُهُ کَرَاهَةُ کَارِهٍ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی وَ اِن یَّمْسَسْکَ اللّٰهُ بِضُرٍ فَلاَ کَاشِفَ لَهٗ اِلَّا هُوَ وَ اِنْ یُّرِدْکَ بَخِیْرٍ فَلاَ رَآدَّ لِفَضْلِهٖ۔

(ارشاد شیخ ہے) یقیناً اللہ تعالے کی دی ہوئی روزی کو نہ کسی حریص کا حرص اپنی طرف کھینچ سکتا ہے اور نہ کسی ناپسند کرنے والے کی کراہت اس کو روک سکتی ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالے نے فرمایا اگر پہنچائے مجھے اللہ تعالے تکلیف تو نہیں کوئی دور کرنے والا اسے بجز اس کے اور اگر ارادہ فرمائے تیرے لئے کسی بھلائی کا تو کوئی رد کرنے والا نہیں اس کے فضل کو۔

شرح: یعنی لیس لاحد فی رزقک تصرف سوی اللّٰه تعالیٰ لا سوقا ولا رادا انما السائق والمانع هو اللّٰه تعالیٰ۔

(تمہیں روزی دینے کا اختیار اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو نہیں۔ نہ کوئی دے سکتا ہے اور نہ کوئی روک سکتا ہے۔ دینے والا اور روکنے والا وہی اللہ تعالیٰ ہے۔)

جیسا کہ اللہ جل شانہ نے فرمایا:

وَاِنْ یمسسک اللّٰه بضر فلا کاشف له الا هو وان یردک بخیر فلا راد لفضله [سورہ یونس/۱۰۷] کا حاصل معنی یہ ہوگا کہ اگر وہ رب تعالیٰ چاہے کہ کسی کو نقصان پہنچ جائے تو اس نقصان سے بچانے والا اس کے سوا کوئی نہیں اسی طرح اگر وہ چاہے کہ کسی کو کچھ مل جائے تو اس کے فضل و کرم کو کوئی روکنے والا بھی نہیں۔ اس نے اپنے بندوں پر یہ حقیقت پہلے واضح

کر دی ہے کہ عطاو بخشش کرنے والا اور نفع پہنچانے والا اگر کوئی ہے تو میں۔ اسی طرح روکنے اور محروم رکھنے والا نقصان پہنچانے والا اگر کوئی ہے تو میں۔ اس آیت سے پہلے جو آیت آئی ہے وہ یہ ہے وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ مَالَا یَنفَعُکَ وَلَا یَضُرُّکَ [سورہ یونس/۱۰۶] (اور نہ عبادت کر اللہ تعالیٰ کے سوا اس کی جو نہ نفع پہنچا سکتا ہے تجھے اور نہ ضرر پہنچا سکتا ہے تجھے)۔ یعنی میری عبادت کرو اس لئے کہ رنج و تکلیف دینے والا میں ہوں۔ فَلَا کَاشِفَ لَہٗ اِلَّا ھُوَ اور اس رنج و تکلیف کو دور کرنے والا بھی میں ہی ہوں۔ اگر میں تمہیں خیر و عافیت سے رکھنا چاہوں اور فائدہ پہنچانا چاہوں تو کوئی بھی ایسا نہیں جو میرے فضل و کرم کی بارش کو روک دے۔ المقدور کائن والھم فضل ای لغوٌ لا فائدۃ فیہ (جو مقدر میں لکھا جا چکا ہے وہ ہو کر رہے گا، پھر فکر مند رہنا فضول اور لغو ہے۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں)۔ اگر کسی چیز کا ہونا تقدیر میں ہے تو وہ خود ہو کر رہے گی۔ اس کے لئے فکر مند ہونے سے وہ ہونے والی بات ٹلنے والی نہیں۔ اسی طرح اگر کسی چیز کا نہ ہونا مقدر میں لکھ دیا گیا ہے تو وہ چیز خود نہیں ہوگی اس کے لئے فکر کرنا اور رنج و غم میں مبتلا رہنا بے کار اور لا حاصل ہے۔

جب بندے کو اس کا علم ہو گیا تو ساری مخلوق بھی رخ موڑ لے اور اس کو چھوڑ دے تو کسی طرح کی وحشت نہ ہو، اسی طرح وہ تمام لوگوں میں مقبول ہو جائے تو اس سے کوئی انسیت پیدا نہ ہو۔ اس لئے کہ اس کو یہ یقین ہو چکا ہے کہ اگر سارے لوگ رخ پھیر لیں تو بھی جو قسمت میں ہے وہ ہر گز فوت نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح اگر سب لوگوں کی نظر میں وہ مقبول بن جائے اس کے باوجود جو چیز اس کی قسمت نہیں ہے وہ ہر گز اس کو نہیں مل سکتی۔

فصل-١٦

رعایت نفس اوراس کے آداب

قولہ: ویجتھد فی مراعاتِ نفسہ و معرفۃ اخلاقھا فانھا لامارۃ باالسوء.

(ارشاد شیخ ہے) اپنے نفس کی نگہداشت اوراس کے اخلاق کی معرفت حاصل کرنے میں کوشش کرتا رہے۔ یقیناً نفس برائی کی طرف حکم دیتا ہے۔

شرح: یعنی نفس برائی کا مطالبہ کرتا ہے اور برائی کے سوا کوئی دوسرا حکم نہیں دیتا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں فرمایا **وَمَاۤ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ** (سورہ یوسف/۵۳) (اور میں اپنے نفس کی برات کا دعویٰ نہیں کرتا، بیشک نفس تو حکم دیتا ہے برائی کا) جب ایک پیغمبر اپنے بارے میں ایسا فرمائیں تو پھر کون ہے جو نفس سے محفوظ ہے۔

شرح آداب المریدین میں یہاں سے کوئی الگ فصل قائم نہیں کی گئی ہے۔ لیکن آداب المریدین عربی میں الگ فصل کا عنوان ہے۔ جس کو مترجم نے یہاں قائم رکھا ہے۔

نفس کے اخلاق کی بنیاد دس چیزوں پر ہے۔

بخل، تکبر، عجب، ریا، حسد، تیز چشمی (بری نظر) کھانے کی لالچ، بولنے یعنی تقریر کا شوق، مال و دولت سے محبت، عزت و مرتبہ سے محبت۔

نفس کی مخالفت کے سوا ان بیماریوں کا کوئی علاج نہیں۔

☆ اگر نفس کو اچھا کھانا پسند آرہا ہے تو فاقہ کرے اور وہ لذیذ کھانا کسی دوسرے کو دیدے۔

☆ اگر بہترین لباس پسند ہے تو وہ قیمتی کپڑا کسی دوسرے کو دیدے اور خود معمولی کپڑا پہنے۔

☆ اگر گفتگو پسند ہے تو خاموشی اختیار کرے۔

☆ اگر خاموشی پسند ہے تو گفتگو کرے۔

☆ اگر شب بیداری اچھی لگتی ہے تو سو جائے۔

☆ اگر نیند اچھی لگتی ہے تو شب بیداری کرے۔

اس طرح کی اور بھی بہت ساری مثالیں و ترکیبیں ہیں جن سے نفس کی مخالفت کی جاسکتی ہے۔

مرد کو چاہئے کہ نفس جتنے راستوں سے حملہ کرتا ہے ان راستوں کی پہچان حاصل کرے اور نفس جدھر مائل کرے ادھر مائل نہ ہو کر اس کے برعکس راستے کو اختیار کرے۔ نفس سے محفوظ رہنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ہے...... نفس کی مخالفت......

لفظ نفس معنوی اعتبار سے بہت سارے معانی پر مشتمل ہے۔ نفس اس اسم کو کہتے ہیں جو جامع معانی رکھتا ہے اور وہ ہے آدمی کے اندر پائی جانے والی قوت غضب و شہوت...... صوفیا زیادہ تر اسی معنیٰ میں استعمال کرتے ہیں اور نفس سے انسان کے اندر پائی جانے والی تمام بری صفات مراد لیتے ہیں۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ جس طرح موت سے چھٹکارا نہیں اسی طرح نفس کو مجاہدے میں لگانے، اس سے جنگ کرنے اور اس کو شکست دینے کے سوا چارہ نہیں۔ ایک بزرگ نے مجاہدہ کو مشاہدہ کی علت (ذریعہ) کہا ہے کہ **المجاھدات مواریث المشاھدات.**

اور دوسرے بزرگوں نے فرمایا ہے کہ جس طرح موت سے فرار نہیں اسی طرح مرید کیلئے مجاہدہ کے بغیر گذر نہیں لیکن مجاہدہ نفس سے حق نہیں ملتا ہے۔ بلکہ راہ حق ملتی ہے اور راہ حق خواہشات نفسانی سے پاک ہے۔

مرید کا کسی ایک نفسانی خواہش میں بھی مبتلا ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ اسے راہ حق بھی نصیب نہیں۔ ہمیشہ اس بات کی کوشش میں لگا رہے کہ نفسانی خواہشات کو پست کردے تاکہ اس کے لئے راہ حق ہموار ہوجائے۔ راہ حق ایک ہے اور اس میں چلنے والے بہت سارے ہیں یہ اسی بات کی طرف اشارہ ہے جو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **اعدو عدوک نفسک التی بین جنبیک** تمہارے دشمنوں میں سب سے بڑا دشمن تمہارا وہ نفس ہے جو تمہارے دونوں پہلوؤں کے درمیان ہے۔

اسی وجہ سے لوگوں نے کہا ہے کہ معرفت اور توحید کے بعد جو چیز بندہ پر واجب ہوتی ہے وہ ہے نفس کی آفتوں کو جاننا اور پہچاننا کہ نفس ہے کیا- اور یہ بھی معلوم کرنا ہے کہ اس کو کس طرح کی ریاضت میں لگایا جائے۔ سب سے پہلے نفس کی جانکاری لینی ہے اس لئے کہ بندہ کا سب سے قریبی دشمن نفس ہی ہے۔ مرید جب تک قریبی دشمن کو سر نہیں کرے گا دور کے دشمن کو کیسے قبضہ میں لے سکتا ہے۔ اور جب تک نفس کے افعال کی شناخت حاصل نہیں ہوگی اس کا مقابلہ اور اس سے جنگ کیسے کرسکتا ہے۔ اس کو پہچاننے کی صورت یہ ہے کہ جو چیز اس کو پسند آئے اس کو ترک کردے۔ نفس کی تمام مرادوں کو پائمال کردے اور اس کی مراد پر ایک قدم بھی نہیں چلے اگرچہ وہ طاعت ہی کیوں نہ ہو۔ اس لئے کہ نفس مرید کو طاعت کے راستے معصیت یعنی گناہ میں داخل کردیتا ہے اور وہ اس طرح کہ طاعت وعبادت میں ریا کو شامل کردیتا ہے۔

نفس کی دونوں آنکھیں لوگوں کی طرف لگی رہتی ہیں۔ لوگوں کو دکھانے کے لئے بڑے بڑے پہاڑ کو بغیر کسی محنت ومشقت کے اپنی آنکھوں میں کھینچ لیتا ہے اور حق کے لئے ایک ذرہ کو بھی نہیں کھینچ سکتا۔ رخ موڑ کر بھاگ جاتا ہے۔

نفس اندرونی دشمن ہے، اور انسان کا معاملہ اسی باطنی دشمن سے ہے اس لئے ہر لمحہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں فریاد کی جائے کہ خداوندا! میں نفس کے مکروفریب سے عاجز ومجبور ہوچکا ہوں۔ میری دست گیری فرما اور میری فریاد سن لے۔

اس طرح اللہ تعالیٰ اس کو وہ معرفت عطا فرمائے گا جس کے ذریعہ نفس کے افعال کو

معلوم کرلے گا اور نفس کے عیوب اس پر ظاہر ہو جائیں گے۔

اگر کسی نے حصول علم کے بعد نفس کو سیدھا نہیں کیا تو علم کا وبال اس پر بہت زیادہ ہوگا۔ اس لئے کہ نفس علم ہی کے ذریعہ سر بلند ہوتا ہے اور علم ہی کے ذریعہ عزت کا تاج اس کے زیب سر ہوتا ہے۔

نفس کو تمام چیزوں کے ذریعہ نرم کرنا بہت آسان ہے مگر عزت و مرتبہ کے زوال کے ذریعہ نرم کرنا آسان نہیں ہے بلکہ سخت ہے۔

دین اور دنیاوی جاہ و مرتبہ ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔ بندہ کو جتنا زیادہ عزت و مرتبہ حاصل ہوگا دین میں اتنا ہی نقصان ہوگا اور کمی آئے گی۔

جب نفس کو ریاضت میں لگائیں گے تو اس وقت نہ ذلت کا ڈر ہوگا اور نہ لوگوں کی ملامت کا خوف ہوگا۔ اس وقت یہ امید لگائے گا کہ اس سے کوئی کام ہو جائے اس لئے کہ مخلوق ایک مشکل حجاب ہے، سب لوگ اس مرید پر ملامت کریں گے اور کہیں گے کہ آخر تجھے کیا ہو گیا ہے جو بھوکے رہ کر اور رات رات بھر جاگ کر اپنے کو پریشانیوں میں ڈال رہا ہے۔ کوئی بھی اپنے قدموں کے سہارے اپنی قبر میں نہیں گیا ہے۔ حریص اور لالچی لوگوں کی مثال دیں گے اور درویشی کے نام سے ڈرائیں گے۔

قوله: وَلَا یغفل عَنهَا وَ اِنْ نتهی فِی الْمَعرِفَةِ الیٰ النهابة فَاِنَّ النَّبِیﷺ کان مُرَا عِیَا لَهَا وَ مُسْتَعِیْذًا بِاللّٰهِ تَعَالیٰ مِنْ شَرِّهَا.

(ارشاد شیخ ہے) اور کسی حال میں بھی نفس اور اس کے فتنوں سے غافل نہ رہے اگرچہ معرفت میں انتہائی درجہ پر کیوں نہ پہنچ جائے۔ کیونکہ بیشک نبی کریم ﷺ ہمیشہ نفس کی نگہداشت میں لگے رہتے۔ اور نفس کی شرارتوں سے محفوظ رہنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے پناہ کے طلب گار رہتے۔

شرح: یعنی اہل معرفت شیطانی بلا سے زیادہ نفس کی بلا سے ڈرتے ہیں۔ یہ حضرات نفس کی تمام خواہشات اور مرادوں کو پائمال کر دیتے ہیں۔ نفس کی مراد پر ایک قدم بھی

نہیں چلتے۔ نفس کی مراد پر حق کی مراد کو مقدم رکھتے ہیں۔ نفس ہوتے ہوئے بھی بے نفس ہوتے ہیں۔ نفس ان سے جدا نہیں ہوتا لیکن نفسانی خواہشات، شہوات اور مرادوں کو اپنے قدموں سے روند دیتے ہیں تا کہ دل کے اوپر سے نفس کا حجاب اٹھ جائے۔

جب حجاب نفس دل سے اٹھ جاتا ہے تو ان پر نہ شیطان کی گذر ہوتی ہے، نہ دنیا کی اور نہ دنیا والوں کی- اس لئے کہ سب کی اصل نفس ہے۔

حضرت شیخ نے جو یہ فرمایا **فان النبی ﷺ کان مراعیا لها و مستعیذا بالله تعالیٰ من شرها** اس کا مفہوم یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہمیشہ نفس کی نگہداشت میں لگے رہتے۔ اس کی شرارتوں اور آفتوں سے محفوظ رہنے کے لئے اللہ تعالیٰ سے پناہ کے طلبگار رہتے۔ اسی لئے جو لوگ نفس سے جنگ کی بات کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ جنگ سے مراد یہ نہیں ہے کہ دشمن پر قبضہ کرلیا جائے بلکہ دشمن سے جنگ اس معنی میں ہے کہ دشمن سے اپنے کو محفوظ رکھا جائے۔

نفس کی مخالفت تمام عبادتوں کا راز ہے۔ ایک بزرگ سے کسی نے پوچھا اسلام کیا ہے؟ انہوں نے فرمایا مخالفت کی تلوار سے نفس کو ذبح کردینے کا نام اسلام ہے۔ اس کی مخالفت یہ ہے کہ شہوات کو ترک کردیا جائے۔ بندہ کو نفس کے مکروفریب سے ڈرنا چاہئے۔ نفس بندہ کے ساتھ چشم زدن میں جو کردیتا ہے وہ سارے جہان کے لوگ اگر ایک ساتھ مل کر کرنا چاہیں تو نہیں کرسکتے۔ اس لئے سالک کو ہوشیار رہنا چاہئے تا کہ نفس کے مکروفریب کی بلاؤں سے محفوظ رہے۔ جو ناموری وشہرت، لوگوں کے اعتراضات اور کل کی فکر کے لئے پریشان ہے اس سے یہ سب کام نہیں ہوسکتے۔ اس لئے کہ یہ خطرناک راہ ہے۔ بلاؤں سے بھری۔ اس کی سب سے معمولی بلا یہ ہے کہ طلب کی نعلین اپنی جان سے بنانا چاہئے۔ اور نامرادی کا جام نوشِ جاں کرنا چاہئے۔ اگر ایسا نہیں کیا گیا تو ہر نااہل اسی راہ میں قدم رکھ دے گا۔ مقامِ تصوف کا دعویدار ہو جائے گا۔ اور فقر کے نعرے لگانے لگے گا۔

قوله: وَکان علی بن ابی طالب رضی اللّٰہ عنه یقول ما انا ونفسی الاکرا

عی غنم کلما اضمها من جانب انتشرت من جانب آخر.

(ارشاد شیخ ہے) حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے آپ نے فرمایا میں اور میرے نفس کی مثال بکریوں کے چرواہے کی ہے۔ جب وہ بکریوں کو ایک طرف سے جمع کرتا ہے تو وہ دوسری طرف سے نکل جاتی ہیں۔

شرح: حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ جملہ اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ بندہ کے لئے نفس کی شرارتیں اور آفتیں بہت ہی سخت ہیں اور اس کو ریاضت میں لگانا بندہ کے لئے بہت زیادہ مشکل ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے نفس کی شرارتوں کو عاجزی وانکساری کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ اسی سے سمجھنا چاہئے کہ نفس کی شرارتیں کہاں تک ہیں اور اس کی کیا حد ہے۔ بعض سالکین نے جو زنار باندھ لیا ہے اور بت خانہ چلے گئے ہیں اس میں نفس کے مکر و فریب اور اس کی شرارتوں کا ہاتھ رہا ہے۔ اسی کو کسی نے یوں کہا ہے ؎

ازین کافر کہ مارا در نہاد است　　مسلمان در جہاں کمتر فتاد است

(وہ نفس کافر جو ہماری سرشت میں ہے۔ بہت کم مسلمانوں کو اس سے واسطہ پڑا ہو گا۔)

قوله: وقال ابو بکرن الوراق النفس مرائية على جميع الأحوال منافقة فی أكثر الأحوال مشركة فی بعض الأحوال.

(ارشاد شیخ ہے) حضرت ابو بکر وراق رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا نفس تمام احوال میں ریاکار، زیادہ تر، احوال میں منافق اور بعض احوال میں مشرک ہے۔

شرح: الوراق۔ کراسہ نویس یعنی کاتب کو کہتے ہیں۔

یہ جو کہا گیا کہ نفس تمام احوال میں ریاکار ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ریا لوگوں کو اعمال و افعال کر کے دکھانے یا اعمال و افعال کو ترک کر کے دکھائے جانے کو کہتے ہیں۔ نفس کی دونوں آنکھیں لوگوں کی تعریف اور ان کی مقبولیت کی طرف لگی رہتی ہیں۔ لوگوں کے درمیان مقبول

ہو جائیں اور خوب خوب تعریف وتوصیف ہو اس کے لئے بھوک و پیاس اور برہنگی کی ہزاروں شدتوں کو بندہ برداشت کرسکتا ہے۔ لیکن حق سبحانہ تعالیٰ کے لئے ایک لقمہ کم نہیں کرسکتا۔ بندہ اللہ تعالیٰ کی بندگی کا دعویٰ کرے اور مخلوق کی بندگی میں گرفتار رہے۔ اس سے بڑا شرک اور کیا ہو سکتا ہے۔

زیادہ تر احوال میں منافق ہے اس سے مراد یہ ہے کہ بندہ اپنی نیکیوں کو دکھانا چاہتا ہے اور اپنی برائیوں کو چھپانا چاہتا ہے۔ اگر کسی رات دو رکعت نماز پڑھ لی، یا قرآن کریم کے چند پارے تلاوت کر لئے یا تھوڑی دیر شب بیداری کر لی تو بندہ یہ چاہتا ہے کہ اس کے یہ اعمال سب لوگوں کو معلوم ہو جائیں۔ اور اسی کے برعکس اگر کسی رات سینکڑوں گناہ اور معصیت کے کام کرتا رہے تو نہیں چاہتا کہ کسی کو معلوم ہو۔

اور بعض احوال میں مشرک ہے اس سے مراد شرک خفی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں سے ڈرنا اور امید رکھنا یا کسی غیر سے نفع ونقصان کی توقع کرنا یہ سب اوصاف واخلاق نفس میں موجود ہیں۔ اہلِ سلوک اور صاحب ریاضت ومجاہدہ سلوک میں ان سب کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اور اپنے مشاہدہ کے مطابق دوسروں کو باخبر بھی کرتے ہیں تاکہ جو طالب ہیں وہ ہوشیار ہو جائیں۔ اور معانی سے محروم دعویداروں کے لئے ڈانٹ و پھٹکار کا سبب ہو۔

قوله: وقال الواسطی النفس صنم والنظر الیها شرک والنظر فیها عبادة.

(ارشاد شیخ ہے) حضرت واسطیؒ نے فرمایا نفس بت ہے اس کی طرف دیکھنا شرک ہے۔ اور اس میں نظر ڈالنا عبادت ہے۔

شرح: گویا حضرت واسطیؒ کہتے ہیں کہ نفس بت ہے۔ اس کی طرف نظر (التفات) شرک ہے اور اس کی جانب نظر (احتساب) عبادت ہے۔

یعنی اس کے افعال وحرکات پر بے چون وچرا سر جھکا دینا ایمان واطاعت کے مانند ہے۔ اور اس کے افعال وحرکات میں نظر احتساب ڈالنا عبادت ہے۔ اور یہ دو طرح کی ہے

نفس کو عزت و بڑائی والا سمجھنا ایسی نگاہ اس کی عبادت جیسی ہے اور ایسی ہی نگاہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے **وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ** اپنے آپ کو ہلاک نہ کرو یعنی وہ کہتا ہے **ولا تقتلوا باستحسانکم شیئا منھا** نفس کی ذرہ برابر بھی کسی چیز کی تعریف و تحسین کرکے اپنے آپ کو ہلاک مت کرو۔

اور دوسری قسم ہے نفس کی برائیوں کو حقارت کی نظر سے دیکھنا۔ اس نظر سے دیکھنا حق سبحانہ تعالیٰ کی عبادت ہے۔ نفس کے عیوب بہت سارے ہیں۔ جیسے لوگوں سے عزت و مرتبہ کی طلب کرنا، حق کی مخالفت اور باطل کی موافقت کرنا، لوگوں کے درمیان مقبول ہونے سے خوش ہونا اور لوگوں کے درمیان ناپسند کیے جانے سے رنج ہونا، دنیا والوں سے ساز باز رکھنا، بہت زیادہ کی طلب کرنا، مختصر اور کم پر راضی نہ ہونا، اپنے کو دوسروں سے اچھا سمجھنا، معاملات میں تاویل اور رخصت تلاش کرنا، غرض یہ کہ اس طرح کے بہت سارے عیوب ہیں جن کو لکھا جائے تو کئی جلدیں سیاہ ہو جائیں پھر بھی مکمل نہ ہوں۔ یہی وہ بت ہے جو تمہارے پیراہن میں چھپا ہوا ہے۔

برہمن را بت اندر خانہ باشد من بتر زویم
کہ سر پوشیدہ بت اندر دل بد کیش من باشد

(برہمن کا بت اس کے گھر میں ہوتا ہے میں تو اس سے بھی برا ہوں کہ میرا بت میرے بدطینت دل میں چھپا ہے)

قولہ: وقیل مثلھا فی ابداء الحسن و اخفاء القبح مثل الجمرۃ لونھا حسن و انھا لتحرق ان عوقبت تشوقت الیٰ التوبۃ وتمنت الادویۃ وان عوفیت لکسبت ھوا ھاو اعرضت قال اللہ تعالیٰ: وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَا بِجَانِبِهٖ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُوْ دُعَآءٍ عَرِيْضٍ (حم السجدہ/۵۱)

(ارشاد شیخ ہے) اور کہا گیا ہے کہ خوبیوں کو ظاہر کرنے اور برائیوں کو چھپانے میں

اس کی مثال انگارے کی ہے جس کا رنگ دیکھنے میں اچھا لگتا ہے مگر اس کا کام جلانا ہے اگر نفس کو سختیوں میں ڈالا جائے تو وہ توبہ کی طرف مائل ہوتا ہے اور دواؤں کا خواہشمند رہتا ہے۔ اور اگر اس کو صحت و عافیت کے ساتھ رکھا جائے تو وہ اپنی خواہشات کی تکمیل میں لگ جاتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا جب ہم آدمی کو نعمت دیتے ہیں تو وہ روگردانی کرتا ہے اور پروردگار کی فرمانبرداری سے دور ہو جاتا ہے اور جب اسے کوئی پریشانی آجاتی ہے تو وہ لمبی لمبی دعائیں کرنے لگتا ہے۔

شرح: اسی لئے بزرگوں نے کہا ہے کہ دونوں جہان کی بھلائی نفس کی مخالفت میں ہے مرید کو نفس کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کرنا چاہئے جیسا وہ اپنے باپ کے قاتل کے ساتھ کرتا ہے۔ دوسروں کو آرام سے خوشی ہوتی ہے اس کو رنج و تکلیف میں خوشی ہو، دوسرے لوگ نعمت ملنے پر مسرور ہوتے ہیں اس کو محنت میں مسرت حاصل ہو۔ دوسروں کو دولتمندی میں اپنی عزت نظر آئے اور یہ درویشی میں اپنی عزت سمجھے۔ یہاں تک کہ اس کی زندگی دوسروں کی زندگی سے مختلف اور برعکس ہو جائے۔ حضرت شیخ نے اپنی اس بات کے لئے اللہ تعالیٰ کی اس آیت وَاِذَا اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَا بِجَانِبِهٖ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُوْ دُعَآءٍ عَرِيْضٍ (حم السجدہ ۵۱/) کو پیش کیا ہے۔ یعنی جب وہ آدمی کو نعمت دیتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رخ موڑ کر اس کی عبادت سے دور ہو جاتا ہے اور جب اس کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ طول طویل دعائیں کرنے لگتا ہے۔

حاصل کلام یہ کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جب میں آدمی پر انعامات کے ذریعہ احسان کرتا ہوں تو وہ باغی ہو جاتا ہے، ذکر، طاعت، شکر اور قبول و انکار سے رخ موڑ لیتا ہے اور جب آدمی کو کوئی تکلیف، غم اور نقصان پہنچتا ہے تو وہ لمبی چوڑی دعائیں کرنے لگتا ہے اور بہت زیادہ دعائیں کرتا ہے۔ بے چین ہو کر گریہ وزاری شروع کر دیتا ہے یعنی پریشانی کے وقت نہ صبر سے کام لیتا ہے اور نہ نعمت ملنے پر شکر ادا کرتا ہے۔ اى تباعد بجانبه و هو فى المعنى.

الاعراض – پہلوتہی کا معنی اعراض ہے۔

یعنی ایسا شخص جو تکبر کرتا ہے، روگردانی کرتا ہے اور اللہ تبارک و تعالیٰ سے دوری اختیار

کرتا ہے اس کے باوجود مسلمانی کا دعویٰ کرتا ہے جب تک اس کا امتحان نہ لے لیا جائے اس پر یقین نہیں کیا جائے۔ایسی مسلمانی تو پورب سے پچھم تک پھیلی ہوئی ہے۔اسی کو کسی نے یوں کہا ہے

صوفی و سیر پوش و شیخ چلہ دار　　این جملہ شدی و لے مسلماں نشدی

(تم صوفی بھی ہو گئے سیر پوش بھی ہو گئے چلہ میں بیٹھنے والے شیخ بھی بن گئے لیکن مسلمان نہ ہوئے)

قوله: وقيل مثل النفس مثل ماءٍ صاف رائق ان حركة تبين ماتحة من الحمائة والنتن و تعلم أنها طلبت ان تكون لله ضدا فى دعواها و ندافى مطالبتها وذلك أن الله تعالىٰ طالب عباده بالثناء عليه والمدح له فطلبت النفس ذلك وطالب الله العباد ان لا يخالفوا امره ونهيه فطلبت النفس ذلك وطالبهم ان يصفوه بالسخاء والكرم فطلبت النفس ذلك وطالبهم ان يكون هوالمرغوب اليه والمرهوب منه فطلبت النفس ذلك.

(ارشاد شیخ ہے) اور کہا گیا ہے کہ نفس کی مثال صاف وشفاف پانی کی ہے جو ایک جگہ ٹھہرا ہوا ہے۔اگر حرکت دی جائے تو اس کے نیچے جو گندگی اور بدبو ہے وہ ظاہر ہو جائے۔یہ جاننا چاہئے کہ نفس اپنے دعویٰ میں اللہ تعالیٰ کا ضد اور اپنے مطالبہ میں اللہ تعالیٰ کا مثل بننا چاہتا ہے۔اس کو یوں سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں سے مطالبہ ہے کہ لوگ اس کی حمد وثناء کریں اور نفس چاہتا ہے کہ اس کی تعریف کی جائے۔اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں سے مطالبہ ہے کہ اس کے اوامر و نواہی پر عمل کریں اور اس کے حکم کو مانیں اور نفس ان چیزوں کو اپنے لئے طلب کرتا ہے۔اللہ تعالیٰ کا مطالبہ ہے کہ بندے اس کے سخاوت و کرم کی تعریف کریں۔اور نفس کہتا ہے کہ میری سخاوت و کرم نوازی کی تعریف کرو۔اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ لوگوں کی رغبت اس کی طرف ہو اور اسی سے ڈرو

خوف ہو۔لیکن نفس ان چیزوں کو اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

شرح: **الرائق الماء الذی یشرب علی الریق عدوۃ ولا یقال للماء،** (وہ عمدہ پانی جو پیا جاتا ہے اس کو رائق کہتے ہیں برخلاف اس کے ریق ہے جس کا اطلاق پانی پر نہیں ہوتا)۔یعنی نفس وہ لطیف چشمہ ہے جو دل سے نکلتا ہے اگر اس کو دوبارہ طلب کیا جائے تو اس کی جو بری صفات ہیں وہ ظاہر ہو جائیں گی۔اس کی ہر صفت دوزخ کی طرف لے جانے والی ایک راہ ہے۔آج آدمی جس رنج وغم میں مبتلا ہے وہ انہیں صفات کی وجہ سے ہے اسی لئے کہا گیا ہے کہ دنیا میں اگر دوزخ کا نمونہ دیکھنا چاہتے ہو تو نفس کو دیکھو جہاں خوشی نام کی کوئی چیز نہیں۔

وتعلم انها طلبت .... الیٰ آخرہ تمہیں یہ جاننا چاہئے کہ یہ سچ اور درست ہے کہ نفس اپنے دعویٰ میں اللہ تعالیٰ کا ضِد اور اپنے مطالبہ میں اللہ تعالیٰ کا مثل بننا چاہتا ہے۔اور وہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ کا مطالبہ ہے کہ بندے اس کی حمد وثنا کریں اور اسی کی تعریف کریں۔اور نفس کا مطالبہ یہ ہے کہ لوگ اس کی تعریف کریں اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ بندے اس کے اوامر ونواہی کی خلاف ورزی نہ کریں۔اور نفس کا مطالبہ ہے کہ لوگ اس کے اوامر ونواہی کے خلاف نہ کریں۔اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ بندے اس کی سخاوت اور کرم کی تعریف کریں۔اور نفس کا مطالبہ ہے کہ لوگ اسکی سخاوت وکرم نوازی کی تعریف کریں۔اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ بندوں کی رغبت اس کی طرف ہو اور خوف بھی اسی سے ہو،اور نفس کا مطالبہ ہے کہ رغبت ہو تو اس کی طرف اور ڈر ہو تو اس سے۔

یہ ساری صفتیں اللہ تبارک تعالیٰ کی ہیں نہ کہ بندہ کی۔جب بندہ میں نفس کی یہ صفتیں کار فرما ہوتی ہیں تو وہ رب ہونے کا دعویٰ کرنے لگتا ہے۔کیا دیکھا نہیں کہ جب فرعون نے اپنے کو کچھ سمجھ لیا اور ان صفتوں سے اپنے کو آراستہ کیا تو انا ربکم الأعلیٰ کا دعویٰ کر دیا۔اگر یہ سمجھتا اور دیکھتا کہ میں کچھ نہیں ہوں اور یہ ساری صفتیں اللہ تعالیٰ کی ہیں تو وہ اپنے رب ہونے کا دعویٰ ہرگز نہیں کرتا۔چوں کہ نفس کی یہ ساری صفتیں اس میں موجود تھیں اس لئے خدائی کا دعویٰ کر بیٹھا۔

ہاں! یہ بھی معلوم رہے کہ یہ صفات سب میں موجود ہیں۔اگر اللہ تعالیٰ کی جانب سے

حفاظت اور عصمت نصیب نہ ہوتو ہر شخص اسی خدائی کا دعویٰ کرنے لگے جو فرعون نے کیا تھا اس گمان میں نہیں رہنا چاہئے کہ یہ صفتیں فرعون میں تھیں مجھ میں اور تجھ میں نہیں ہیں۔ تمام نفوس میں یہ صفتیں پوشیدہ ہیں۔ اس نے اعلانیہ خدائی کا دعویٰ کردیا اس لئے کہ اس کو قتل کئے جانے کا کوئی خوف اور ڈر نہیں تھا۔ اس سے بڑا اور برتر اس زمین پر کوئی تھا ہی نہیں جو اس کو سزا دیتا۔ اور آج ہر شخص کا نفس قتل کئے جانے کے خوف سے فرعون کی طرح اعلانیہ خدائی کا دعویٰ نہیں کر رہا ہے۔ اس کی فرعونیت عیاں تھی۔ اور ہماری نہاں ہے۔ اس کی ظاہر تھی اور ہماری پوشیدہ ہے۔

جب تک نفس ہے یہ ڈر لگا ہوا ہے۔ اسی لئے بزرگوں نے برسوں زندگی گذاری لیکن نفس کی مراد پر ایک قدم بھی نہیں چلے۔ ہمیشہ حق کے لئے اپنے نفس سے جھگڑتے رہے، نفس کے لئے حق سے جھگڑا نہیں کیا۔ ان حضرات نے اپنے نفس سے ایسی جنگ کی ہے جہاں صلح نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ سے ایسی صلح کی ہے جس میں کوئی جنگ نہیں۔ انہوں نے اپنے رب تعالیٰ کی پہچان اور معرفت حاصل کی ہے۔ نفس کافر اور اس کی شرارتوں اور مکروفریب کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔ برسوں کی زندگی میں بھی نفس کی خواہش سے اس کو ایک لقمہ بھی نہیں دیا۔ اور اس کی خواہش پر ایک قدم بھی نہیں چلے۔ رو، رو کر بھوکے پیاسے رہ کر اور نامرادیوں کے ذریعہ اس کو ہلاک کیا ہے۔ ساری زندگی دنیا بھر کی نعمتیں رہتے ہوئے بھی ایک کمبل اور ایک گدڑی پر اکتفا کیا ہے۔ اور گھاس کی پتیاں کھا کر رہ گئے ہیں۔ ایسے لوگوں نے یقیناً سرورِ کائنات، فخر دو جہاں ﷺ کی پیروی کی، قارون، نمرود اور فرعون کی پیروی نہیں کی۔ حدیث شریف میں ہے کہ تمام عبادتوں کی بنیاد مخالفتِ نفس پر ہے، اور تمام گناہوں کی جڑ نفس کی موافقت ہے۔ ہرگز ہرگز اس کی موافقت نہیں کرنا بلکہ ہمیشہ اس کی مخالفت میں لگے رہنا۔

قولہ: **وقيل النفس لطيفة مودعة فی هذا القالب وهی محل الأخلاق المذمومة والروح لطيفة مودعة فی هذا القالب وهی محل الصفات المحمودة كما ان البصر محل الروية**

والأذن محل السمع والأنف محل الشم.

(ارشاد شیخ ہے) کہا گیا ہے کہ نفس ایک لطیفہ ہے جوانسان کے قابل میں سپرد کردیا گیا ہےاوروہ لطیفہ برے اخلاق کا محل ہے۔اور روح بھی ایک لطیفہ ہے جوانسان کے قالب میں ودیعت کردیا گیا ہےاور یہ اچھی صفات کا محل ہے۔جیسے آنکھ دیکھنے کا محل ہے،کان سننے کا محل ہے،ناک سونگھنے کا محل ہے۔

شرح: یعنی اخلاق مذمومہ سے افعال مذمومہ کا صدور ہوتا ہے اور صفات محمودہ سے افعالِ محمودہ کا۔

جماعتِ صوفیہ کے یہاں صفاتِ مذمومہ کو صفاتِ محمودہ سے بدلنا سب سے اہم کام ہے۔ جب تک صفاتِ محمودہ سے تبدیل نہیں کریں گے برے افعال واقوال اچھے افعال واقوال میں تبدیل نہیں ہوسکتے۔ اور مقام توبہ حاصل نہیں ہوسکتا اسی کو گردش کہتے ہیں۔اور یہی توبہ کی حقیقت ہے۔

روح اورنفس دونوں قالب میں لطیفے ہیں۔جس طرح عالم میں شیاطین،فرشتے اور بہشت ودوزخ ہیں۔ہاں!ایک خیر کا محل ہےاوردوسرا شر کا محل ہے۔اسی طرح نفس وروح میں روح نیکیوں کا محل ہےاورنفس برائیوں کا محل ہے۔جس طرح ظاہر میں آنکھ دیکھنے کا محل ہے،کان سننے کا محل ہےاورناک سونگھنے کا محل ہے۔

نفس بھی ایک لطیفہ ہے،روح بھی ایک لطیفہ ہے۔لیکن دونوں لطافت میں وہی فرق ہے جوشیاطین کی لطافت اورفرشتوں کی لطافت میں فرق ہے۔بعض لوگوں نے کہا ہے کہ روح بہشت میں رہے گی اورنفس دوزخ میں۔

اور یہ جو کہا گیا کہ روح وہ لطیفہ ہے جوانسان کے قالب میں ودیعت کردیا گیا ہے یہ وہی بات ہے جس کی خبر اللہ تعالیٰ نے اپنے قرآن مجید وفرقان حمید میں دی ہے۔

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّىْ وَمَا اُوْتِيْتُمْ مِنَ الْعِلْمِ اِلَّا

قَلِیْلاً (بنی اسرائیل/۸۵)

(یہ دریافت کرتے ہیں آپ سے روح کے متعلق، آپ انہیں بتایئے روح میرے رب کے حکم سے ہے اور نہیں دیا گیا تمہیں علم، مگر تھوڑا سا)

روح امر ربانی سے ہے۔ بہت سارے عقول واوہام نے اس کی اصلیت تک پہنچنے کی کوشش کی مگر سب کے سب ناکام ومجبور رہے۔ علم معاملہ روح کے صفات واحوال کی معرفت کا محتاج ہے اس کی حقیقت کو جاننے کا محتاج نہیں ہے۔ روح کے متعلق جو بھی ذکر آیا ہے وہ اس کے احوال و صفات ہی تک محدود ہے۔ اس کی حقیقت کا بیان نہیں ہوا ہے۔ اس لئے کہ وہ ایسا لطیفہ ہے جو دراصل آدمی کی حقیقت ہے عالم ہے تو وہی عارف ہے تو وہی، مخاطب ہے تو وہی، مطالب ہے تو اسی کی، عنایت ہے تو اسی پر۔ قالب اس کا آلہ، سواری اور طلسم ہے۔ ظاہراً یہی ہے کہ الانسان هو الروح والجسد انسان روح اور جسد کا نام ہے۔ حشر اور ثواب وعتاب کا تعلق، اسی سے ہے۔ واللہ اعلم۔

حضرت عین القضاۃ رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ قل الروح من امر ربی میں مکمل شرح ہے۔ لیکن اہل معرفت ہوں یا مختشان کسی کی اس تک پہنچ نہیں۔ اگر شریعت کی جانب سے دیوانگی کی زنجیر سامنے نہیں ہوتی تو میں بتاتا کہ روح کیا ہے۔ لیکن غیرت الوہیت چھوڑنے والی نہیں۔ ان اللّٰه غیور (اللہ تعالیٰ غیور ہے) روح کی شرح کرنا اسی غیرت کی وجہ سے حرام کردیا گیا ہے۔

حضرت امام قشیری رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ میں لکھا ہے کہ الارواح مخلوقة ومن قال بقدمها فهو مخطئ خطاء عظيما (تمام ارواح مخلوق ہیں اور جس نے بھی انہیں قدیم بتایا اس نے بہت بڑی غلطی کی)۔

قوله: وقيل الروح معدن الخير والنفس معدن الشر والعقل جيش الروح والهواء جيش النفس والتوفيق من الله مدد الروح والخذلان مدد النفس والقلب فى اغلب الجيشين.

(ارشاد شیخ ہے) اور کہا گیا ہے کہ روح خیر یعنی بھلائی کا معدن ہے اور

نفس شر یعنی برائی کا مخزن ہے۔ عقل روح کا لشکر اور خواہشات نفس کی فوج ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے توفیق روح کی مدد ہے۔ اور ذلت و خواری نفس کی مدد ہے۔ قلب ان دونوں لشکروں میں سے اس لشکر کے ساتھ ہے جو غالب ہوتا ہے۔

شرح: روح خیر کا معدن اور نفس شر کا مخزن ہے یہ اسی معنی میں ہے جو میں نے پہلے کہا ہے کہ روح صفاتِ محمودہ کا محل ہے اور افعال محمودہ اسی سے پیدا ہوتے ہیں۔ نفس صفاتِ مذمومہ کا محل ہے اور افعال مذمومہ اسی سے صادر ہوتے ہیں۔ جیسے بہشت و دوزخ ہے۔ ہر طرح کا آسائش و آرام بہشت میں ہوگا۔ اور ہر طرح کی تکلیف و عذاب دوزخ میں رہے گا۔ لہٰذا جو نفس سے باہر نکل آیا وہ دوزخ سے نکل گیا۔ اور جو نفس کا شکار رہا وہ دوزخ میں گرفتار رہا۔

اور یہ جو کہا گیا کہ عقل روح کا لشکر ہے، خواہشات نفس کا لشکر ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے توفیق روح کی مدد ہے اور ذلت وخواری نفس کی مدد ہے۔ ان دونوں میں سے جو غالب ہوتا ہے دل اسی کے ساتھ ہوتا ہے اور اگر خواہشات جو نفس کی فوج ہے اس کا غلبہ ہوتا ہے تو دل اسی کا ساتھ دیتا ہے۔ توفیق کے معنیٰ کام کے لائق بتانا اور خذلان کے معنی ذلت وخواری میں ڈال دینا۔

حاصل کلام یہ کہ دل شیطان اور فرشتہ کے لئے پر کشش ہوتا ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دل میں دو جماعتیں ہوتی ہیں یعنی دو کیفیتیں ہوتی ہیں۔ ایک فرشتہ والی جس میں خیر کا وعدہ اور اللہ تعالیٰ کی تصدیق ہوتی ہے اور دوسری شیطان والی جس میں شر اور اللہ تعالیٰ کی تکذیب ہوتی ہے۔ ان دونوں میں ایک دوسرے کو دفع کرنے کی صلاحیت رہتی ہے۔ دل ان دونوں لشکروں کی زور آزمائی کا میدان ہوتا ہے۔ ملکوتی لشکر اور شیطانی لشکر میں ہمیشہ جنگ رہتی ہے۔ یہاں تک کہ کسی ایک کو فتح حاصل ہوتی ہے۔ اکثر دلوں کو شیطانی لشکر نے جیتا ہے۔ اور وہی دلوں کا مالک بن گیا ہے۔ ایسے دل شیطانی وسوسوں کی وجہ سے باغی ہوگئے۔ یہ شیطانی وسوسہ ہے جو آخرت پر دنیا کو ترجیح دینے کی رغبت دلاتا ہے۔

ان ساری باتوں سے یہی ظاہر ہوا کہ تمام شرارتوں اور بلاؤں کی اصل نفس کافر ہے اور کافر کو قتل کرنا غزوہ (جہاد) ہے ؎

نفس گیرے سرکش است و کشتنِ گیراں غزا است
تا کشندہ نفس چوں میرد بجز مردار نیست
گو حیات خوب خواھی نفس را گردن بزن
زانکہ از وے خود قومی ترھیچ دشمن دار نیست

(نفس ایک سرکش آتش پرست یعنی باغی کافر ہے اس کو قتل کرنا جہاد ہے باغی نفس جب قتل کر دیا جائے تو مردار کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اگر خوش گوار زندگی چاہتے ہو تو نفس کی گردن مار دو اس لئے کہ اس سے زیادہ طاقت ور کوئی دسرا دشمن نہیں ہے)

رسول اکرم ﷺ کے اشاد گرامی میں اسی بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا **رجعنا من الجهاد الاصغر الى الجهاد الاكبر قيل يارسول الله ما الجهاد الاكبر قال الاوهى مجاهدة النفس** میں سب سے چھوٹے جہاد سے سب سے بڑے جہاد کی طرف لوٹ رہا ہوں۔ لوگوں نے عرض کیا یارسول اللہ! جہاد اکبر کیا ہے؟ فرمایا مجاہدہ نفس سب سے بڑا جہاد ہے۔

نفس پوشیدہ دشمن ہے جس کو محسوس نہیں کیا جا سکتا۔ کافر کو تلوار کے ذریعہ اپنے سے دور کیا جا سکتا ہے، شیطان کو لاحول سے بھگایا جا سکتا ہے لیکن اس کافر کو اپنے قریب سے ہٹانے کی کوئی صورت نہیں۔ اور اس کی شرارتوں سے کوئی محفوظ نہیں۔ نفس کے مکرو فریب سے اللہ کے سوا کوئی دوسرا نکال نہیں سکتا۔ اگر سو سال تک نفس پر قہر ڈھاتے رہے اور صرف ایک بار اس کی مراد پر چل پڑے تو تمہارے اسلام کو زمین پر پٹخ دے گا۔

محبوب رب العالمین حضرت محمد رسول اللہ ﷺ جو حق تعالیٰ کی قربت سے سرفراز ہیں۔ عاقبت کا امن و سکون جن کے نام ہے اور عصمت و پاکبازی کے تاج کو جن کے فرق مبارک پر زیب دینے کا شرف حاصل ہے بارگاہِ رب العزت سے اتنی سربلندیوں کے باوجود بھوکے رہ کر

روزہ وصال رکھ کر شب بیداری کر کے ایسے ایسے مجاہدے کئے کہ فرمان آیا اے میرے محبوب! کیا میں نے قران دے کر اسی لئے بھیجا ہے کہ آپ اپنے کو ہلاکت میں ڈال دیں۔

جب کسی نے اس کافر نفس کو مجاہدہ تلوار سے قتل کر دیا اور اس پر فتح و کامرانی حاصل کر لی تو اس کو وصول حق کے لئے علت اور سبب نہیں سمجھے اس لئے کہ جو حق سبحانہ تعالیٰ تک پہنچتا ہے وہ فضل و کرم سے پہنچتا ہے......... اور فضل و کرم کو اعمال و انعام سے کیا سروکار...... مجاہدہ تو نفس کی تطہیر و پاکی کے لئے ہے حقیقت قرب کے لئے نہیں ہے۔ مجاہدہ کی طرف رجوع ہونا بندہ کا کام ہے اور حق کو پانا حق کے حوالہ ہے۔ یہ محال ہے کہ مجاہدہ حق سبحانہ تعالیٰ کو پانے کا سبب بن جائے۔

قولہ: **ویعلم أن جملةَ الأمور ثلثة أمر بأن رشده ظَاهِرٌ فيجب متابعته وأمر بأن غيه واضِحٌ فيجب مجانبته وامر مشتبه فيجب متاركته الى ان تبين الرشدمن الغى من جهة العلم اومن جهة العقل.**

(ارشاد شیخ ہے) اور جاننا چاہئے کہ تمام کاموں کا انحصار تین قسمون پر ہے۔

۱ ایک کام وہ ہے جس کا صحیح و درست ہونا ظاہر ہے ایسے کاموں کی اطاعت واجب ہے۔

۲ دوسرا کام وہ ہے جس کی گمراہی واضح ہے۔ ایسے کاموں سے دور رہنا لازم ہے۔

۳ اور تیسرا کام وہ ہے جو مشتبہ ہے اس کا اس وقت تک ترک کرنا ضروری ہے جب تک اس کی صحت و گمراہی، علم و عقل کے رو سے ظاہر اور واضح نہ ہو جائے۔

شرح: حضرت شیخ کے قول کے لئے اس آیت کو بطور دلیل پیش کر رہا ہوں،

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ الْعِلْمُ، (بنی اسرائل/۳۶) (اور نہ پیروی کرو اس چیز کی جس کا تمہیں علم نہیں) یہیں سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے یہ دعا کی ہے۔

اَللّٰھُمَّ اَرِنِی الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنِی اِتِّبَاعَهٗ وَاَرِنِی الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنِی اِجْتِنَابَهٗ وَلَا تَجْعَلْهُ عَلَیَّ مُتَشَابِهًا فَاَتَّبِعَ الْهَوٰی	اے اللہ! مجھے حق کو حق بنا کر دکھا دے اور اس کی اتباع و پیروی کی دولت سے نواز دے۔ اے اللہ! مجھے باطل کو باطل بنا کر دکھا دے اور اس سے گریز و پرہیز کی دولت سے بہرہ ور فرما دے اور مجھ پر راہ راست اور گمراہی کے درمیان اشتباہ کی کیفیت نہ ہو کہ میں خواہشِ نفس اور ہوا و ہوس کی پیروی میں مبتلا ہو جاؤں۔

جس طرح اہل ایمان کفر سے ڈرتے ہیں یہ حضرات خواہشاتِ نفسانی کی پیروی سے ڈرتے ہیں۔ اور کیوں خائف نہ ہوں۔ کہا گیا ہے کہ **لیس بینک و بین مولاک الاھواک۔** تمہارے اور تمہارے مولیٰ کے درمیان تمہاری خواہشات حائل ہیں اور اس آیت **اَفَرَاَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ** (الجاثیہ/۲۳) (ذرا اس کی طرف تو دیکھو جس نے بنالیا ہے اپنا خدا اپنی خواہش کو) کی تنبیہ ان کی جان پر وہ کرتی ہے جو دوزخ کافروں کے ساتھ کرے گی۔ **ونعوذ باللہ من متابعۃ الھوی** اور ہم بارگاہِ خداوندی سے خواہشات نفسانی کی اتباع سے پناہ کی درخواست کرتے ہیں۔

ایسا شخص جس کے حرکات وسکنات خواہشات ہوں اور اس کی اتباع و پیروی سے راضی و خوش ہو کر وہ کعبہ میں ہوتے ہوئے بھی حق سے دور ہے۔ اسی کے برعکس ایسا شخص جو خواہشات سے دور ہو اور اس کی اتباع و پیروی سے نفرت وہ بت خانہ میں ہوتے ہوئے بھی حق سے قریب ہے۔ ؎

با تو دل در مسجد ست و بے تو باشد در کنشت

بے تو دل در دوزخ است و با تو باشد در بہشت

(اگر میرا دل آپ کے ساتھ ہے تو میں مسجد میں ہوں اور آپ کے بغیر یہ دل بت خانہ ہے۔

اگر دل آپ سے غافل ہے تو یہی دوزخ ہے اور اگر دل آپ کے ساتھ ہے تو یہی میری جنت ہے)

قولہ: وقیل اذا عرض لک امران شککک فی خیرھما فانظر فی ابعدھما من ھواک فانہ خیر.

(ارشادِ شیخ ہے) اور کہا گیا ہے کہ جب تمہارے سامنے ایسے دو کام آجائیں جن کے خیر ہونے میں تم مشکوک ہو جاؤ کہ کون کام اچھا ہے تو تم کو دیکھنا چاہئے کہ دونوں کاموں میں سے کون سا کام تمہاری خواہشات نفسانی سے دور ہے جو دور ہے وہی بہتر اور اچھا کام ہے

شرح: اس کو یوں سمجھئے کہ اگر ایسا کھانا ہے جو شریعت کے رو سے جائز ہے لیکن عزیمت (نیت) کے اعتبار سے جائز نہیں ہے تو یہاں پر عزیمت کے اعتبار سے عمل کیا جائے اس لئے کہ وہ خواہشات سے زیادہ دور ہے۔ اسی طرح اور دوسری باتوں کو سمجھا جائے۔

بندہ کے اندر یعنی اس کے دل میں اس وقت تک شیطان کی گذر نہیں ہو سکتی ہے۔ جب تک اس میں گناہ کی خواہش پیدا نہ ہو۔ جب بندہ کو خواہشات نفسانی کی پونجی حاصل ہو جاتی ہے تو شیطان اس کو گھیر لیتا ہے اس کے دل کو سجاتا ہے، سنوارتا ہے اور پورے طور پر اس کے دل پر جلوہ فگن ہو جاتا ہے، اسی کو وسواس کہتے ہیں۔ یعنی ابتدا خواہشات سے ہوتی ہے والبادی اظلم گناہ کی ابتدا کرنے والا سب سے بڑا ظالم ہے۔

شیطان نفس کی حقیقت اور بندہ کی خواہشات پر ہوتا ہے جیسا کہ سرورِ کائنات محمد ﷺ نے فرمایا کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس پر شیطان نے غلبہ نہیں کیا ہے یعنی ہر شخص کی خواہشات اس پر غالب ہے سوائے (حضرت) عمر کے۔ انہوں نے خواہشات پر غلبہ حاصل کر لیا تھا۔

خواہشات سے طینت آدم کی ترکیب ہوتی ہے اور فرزندانِ آدم کی جان کے لئے راحت کا سامان ہے۔

حضرت خواجہ جنید رحمۃ اللہ علیہ سے لوگوں نے پوچھا **الوصل قال ترک ارتکاب الھوی.** جو شخص وصلِ حق کی عزت و تکریم سے سرفراز ہونا چاہتا ہے اس سے کہہ دیا جائے کہ وہ

اپنی خواہشات کی مخالفت کرے۔ خواہشات کی مخالفت سے بڑی عبادت کوئی نہیں ہے۔ ناخن سے پہاڑ کھودنا آدمی کے لئے آسان ہے لیکن خواہشات کی مخالفت آسان نہیں۔

حکایت: حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا میں نے ایک شخص کو ہوا میں اڑتے دیکھا تو اس سے پوچھا یہ درجہ آپ کو کیسے ملا؟ انہوں نے جواب دیا کہ میں نے ہوا و ہوس پر قدم رکھ دیا اور ہوا میں اڑنے لگا۔ (یعنی جب خواہشات کو پائمال کیا تو یہ درجہ ملا)۔

حضرت امام شبلی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے انہوں نے فرمایا حق تعالیٰ مجھے بہشت و دوزخ میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کی اجازت دیتا تو میں دوزخ کو اختیار کرتا اس لئے کہ وہ خواہشات سے دور ہے۔ جب حضرت شبلی کی یہ بات حضرت خواجہ جنید رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچی تو انہوں نے فرمایا **ھذا کلام الاطفال**۔ یہ بچوں کی باتیں ہیں۔ لوگوں نے عرض کیا حضور اس معاملہ میں کیا فرماتے؟ ارشاد ہوا! اگر مجھے اختیار دیا جاتا تو میں کہتا میں تو بندہ ہوں اور بندہ کو کوئی اختیار کہاں کہ وہ اپنی مرضی کو دخل دے۔

مرید کا پہلا کام یہی ہے کہ ہر وہ کام جس میں خواہشات کی مخالفت ہو اسے اختیار کرے اور جو خواہشات کے موافق ہو اور جس سے نفس کو لذت ملے اس کی طرف مائل نہ ہو۔ جب کہ حضرت شبلی کے حال سے ظاہر ہوا بندگی کا کمال اور اس کی بلوغیت یہ ہے کہ وہ اپنی جانب سے کچھ اختیار نہ کرے بلکہ اسی کو اختیار کرے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے مقرر کیا ہے جیسا کہ حضرت خواجہ جنید کے حال سے ظاہر ہوا۔

قوله: وعلى المريد ان يجتهد فى تبديل أخلاق النفس كالكبر والغل والحرص و طول الأمل والحسد والمراء والمنازعة والغيبة والتهول و سوء الظن والوقاحة وغير ذالک من الاخلاق الذميمة يضدها عن الأخلاق الحميدة.

(ارشاد شیخ ہے) مرید پر واجب ہے کہ وہ نفس کے اخلاق کو بدلنے کی پوری پوری

کوشش کرے جیسے تکبر، خیانت، لالچ، لمبی لمبی امیدیں، حسد، دشمنی، جنگ و جدال، غیبت، اختلاف، بدگمانی، بے شرمی وغیرہ۔ یہ سب اخلاق ذمیمہ ہیں ان کو اخلاق حمیدہ سے بدلنا ہے۔

شرح: اخلاق مذمومہ کو اخلاقِ حمیدہ سے بدلنا ہے جیسے تکبر کو تواضع سے بدل دے، خیانت کو امانت داری سے بدل دے، لالچ کو قناعت سے بدل دے، درازی امید کو کوتاہی عمر سے بدل دے اس حد تک کہ جب صبح ہو تو یہ سمجھے کہ شام تک نہیں رہے گا اور جب شام ہو تو سوچے کہ صبح تک نہیں رہے گا۔ طول طویل امیدیں آخرت کی زندگی کو فراموش کر دیتی ہیں۔ اور موت کی تیاری سے غفلت میں ڈال دیتی ہیں۔ اسی طرح بدخواہی کو خیر خواہی سے بدل دے۔ کسی دنیاوی چیز کے لئے کسی سے حسد نہ ہو۔ اس لئے کہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتی ہے جس طرح آگ لکڑی کو۔ لڑائی جھگڑا اور دشمنی کو صلح سے بدل دے۔

المجادلہ: دین حق میں جنگ و جدال نہ ہو۔ ہاں! حجت یعنی دلیل قائم کرنے کے لئے ہو سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص ثبوتِ حق کے لئے دلیل طلب کرے اور اس کے دلیل پیش کرنے سے حق ظاہر ہو جائے تو ایسے شخص کو مجادل یعنی جھگڑالو نہیں کہیں گے۔ جھگڑے کو تسلیم سے بدل دے۔ قطع تعلق اور غیبت کو ایمان والوں کی تعریف و ستائش سے بدل دے۔ دو آدمیوں کے درمیان نفرت دلانے کو دونوں کے درمیان صلح کرانے سے بدل دے۔ التھریش الاغراء بین الناس۔ بدگمانی کو خوش گمانی سے بدل دے اور بدگمانی سے پرہیز کرے۔ کسی کا نقصان نہ چاہے۔ بلکہ نقصان اور خلل کو اپنی طرف سے سمجھے۔ اپنے کو تمام لوگوں میں سب سے برا سمجھے۔ دوسروں کو اپنے سے اچھا نیک اور صالح سمجھے، اگر کسی کی برائی کو دیکھے تو اس برائی کو اپنے تک محدود رکھے، اگر کسی کو کچھ پریشانی آجائے تو اس کی پریشانی کو اپنی طرف منسوب کرے۔ اگر کسی کو کچھ فائدہ پہنچے تو اس فائدہ کا ذریعہ دوسروں کو سمجھے۔ شوخی (بے شرمی) کو شرم سے بدل دے۔

اسی طرح سارے برے اخلاق کو اچھے اخلاق سے بدل دے۔ یہ کلام طریقت میں مرید کے لئے اسی طرح ہے جس طرح وضو نماز کے لئے۔ بغیر وضو نماز نہیں ہو سکتی اسی طرح

طریقت میں اخلاق مذمومہ کو اخلاق محمودہ سے تبدیل کئے بغیر سلوک طئے نہیں ہوسکتا۔ صفات، افعال کا مصدر ہے یعنی افعال، صفات سے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر اندرونی صفات برے ہیں تو ظاہری افعال اچھے کیسے ہوں گے۔ اگر اندرونی صفات اچھے ہیں تو ظاہری افعال برے کیسے ہوں گے۔ کل اناءٍ یترشح بمافیه. برتن سے وہی نکلتا ہے جو اس میں ہوتا ہے ؎

گفتیم بر دھنت ذکر لبش هر چه رود　　　می تراود چه کنم در اوند من است

(میں نے جب اس سے کہا کہ تمہارے لبوں پر صرف اسی کا ذکر رہتا ہے تو اس نے کہا میں کیا کروں میرے برتن میں جو ہے وہی باہر آتا ہے)

جب تک کوئی صفات مذمومہ کو صفات محمودہ سے تبدیل نہیں کرے گا اس کے برے افعال نیک افعال سے تبدیل نہیں ہوں گے۔ مرید جب اس کام میں لگا رہے گا تو اس کے بارے میں کہا جائے گا کہ وہ سلوک میں لگا ہے اور اپنے میں مشغول ہے۔ حق کے ساتھ اس کی مشغولیت نہیں ہے۔ ہاں! وہ حق کے ساتھ مشغول ہونے کی تیاری میں ہے۔ جیسے کوئی وضو بنا رہا ہے اس وقت وہ نماز میں نہیں ہے لیکن نماز کی مشغولیت کی تیاری میں ضرور ہے۔

لہٰذا جس کو یہ کام نصیب ہو گیا یعنی برے اخلاق کو اچھے اخلاق میں بدلنے کی توفیق ہوگئی تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ یہ دولت اس کے نام لکھ دی گئی اور جس کو یہ کام نصیب نہیں ہوا اور یہ توفیق نہیں ملی تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ یہ دولت اس کے نام نہیں لکھی گئی ہے۔ مصیبت کی خاک اس کو اپنے سر پر ڈالنا چاہئے۔ اس کے سوا کیا کرسکتا ہے المعلوم لایتغیر والمقسوم لایزید ولاینقص. علم الٰہی میں کوئی تبدیلی نہیں آتی اور تقدیر یعنی اللہ نے جو مقدر کردیا ہے اس میں کمی بیشی نہیں ہوتی۔

وصل خاصاں راست من رانیشاں ندام بخت بد　　　بھر من اندازۂ ادبار من کارے بہ بیں

(وصل تو خاص لوگوں کا حصہ ہے مجھ بدنصیب کا شمار ان لوگوں میں کہاں ہوسکتا ہے۔ میری بداقبالی کا اندازہ میرے کاموں سے لگالیا جائے)

اگر بری صفتوں میں سے کوئی ایک صفت بھی آدمی کے اندر موجود ہے تو سمجھ جائے کہ وہ شیطان کے لئے کھلا راستہ ہے۔ جس سے شیطان اس تک پہنچ جاتا ہے۔ اور وسوسہ ڈالتا ہے۔ جب تک کوئی ایک بری صفت بھی باقی ہے وسوسہ باقی ہے۔ اور جب بری صفتوں کو اچھی صفتوں سے بدل دے گا تو شیطانی وسوسہ کی راہ منقطع ہو جائے گی تحقیقاً للابتلاء۔

منقطع ہو جانے سے مراد یہ ہے کہ اس پر وسوسہ کا نفاذ نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ نفس وسوسہ میں انبیاء، اولیاء، اور سارے لوگ برابر ہیں۔ مگر انبیاء اور اولیا پر شیطان کے وسوسہ کا نفاذ نہیں ہوتا۔ یعنی وسوسہ کا جادو ان پر نہیں چلتا۔ کیونکہ یہ حضرات اللہ تعالٰی کے احکام اور فرمان کو شیطانی وسوسہ پر مقدم رکھتے ہیں۔ اسی کے برعکس عوام ہیں جو شرعی احکام پر اپنی خواہشات کو اولیت دیتے ہیں۔ اور اس وجہ سے شیطان کے وسوسہ کا جادو ان پر چل جاتا ہے۔ انبیاء اولیا کے وسوسہ اور عوام کے وسوسہ میں یہی فرق ہے۔

جماعتِ صوفیا کے نزدیک اخلاق کی تبدیلی کو گردش کہتے ہیں۔ اس کی اصل یہی ہے۔ گردش کے بغیر بزرگی کی روشنی نمودار نہیں ہوتی۔ اور جب تک نفس کافر کو مخالفت کی تلوار سے ذبح نہیں کرتے یہ گردش حاصل نہیں ہوتی۔ اسی وجہ سے کہتے ہیں کہ سالکین نے اپنے نفس کے ساتھ ایسی جنگ کی ہے۔ جس میں صلح نہیں۔ برسوں گذر جانے کے باوجود نفس کی ایک بھی نفسانی خواہش پوری ہونے نہیں دیتے۔ اور ایک قدم بھی اس کی خواہش کے مطابق نہیں چلتے۔ نفس کی تذلیل و تحقیر کی جتنی بھی صورتیں ہو سکتی ہیں سب کو برتنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب تک صفاتِ مذمومہ میں سے کوئی ایک صفت بھی باقی ہے بت و زنار باقی ہے۔ طالب کے لئے جو حجاب ہے وہ بت و زنار ہی ہے اور اس کے لئے کوئی ضروری نہیں کہ پتھر کی مورت ہی ہو۔

SHARH-E-ADAB-UL-MUREEDEEN

By:

Makhdoom-e-Jahan Sheikh Sharafuddin Ahmad Yahiya Maneri

Maktabah-i-Sharaf, Khanaqah Hazart-i-Makhdoom-i-jahan, Biharsharif, Nalanda (Bihar)

Designed & Printed by : PARAS PUBLICATION PVT. LTD., Hajipur Industrial Area, Hajipur (Vaishali). Mo. 9386123483